قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 26 ✿ شمارہ 12 ✿ جنوری 2017ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمود ضان خان 0333-2168391
رانا محمد حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ✿ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

CPNE

قارئین کرام!

السلام علیکم!

کچھ افسانچے دل کو چھو لیتے ہیں۔ آج بھی ایک افسانچہ نظر نواز ہوا جسے پڑھ کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں، افسانچہ یوں ہے کہ گاؤں کی اس مسجد کے تین دعوے دار کھڑے ہو گئے تھے۔ تینوں اس مسجد کو اپنی جاگیر بتا رہے تھے۔ گاؤں کے بڑوں نے بہت سمجھایا لیکن وہ کسی کی سننے کو روادار نہ تھے۔ مسجد کے تین طرف تین گلیاں تھیں۔ بڑوں نے مسجد کے اندر دیوار اٹھا کر تین حصے کر دیے کہ الگ الگ گلیوں سے آنے والے اپنے حصوں سے آتے رہیں۔ مسجد کی ہر چیز تقسیم کر دی گئی۔ تسبیح، ٹوپیاں، سیپارے، رحلیں، جائے نمازیں، ہوارے بانٹ دیئے گئے۔ آخر میں بڑوں نے پوچھا۔ "اب ایسی کوئی چیز رہ تو نہیں گئی جسے تقسیم کیا جائے۔" مسجد میں جمع بھیڑ سے ایک آواز آئی۔ "رہ گیا ہے۔" بڑوں نے پوچھا۔ "کیا رہ گیا؟" اس نے جواب دیا۔ "رب تقسیم ہونے سے رہ گیا ہے۔" اس کی بات سن کر سب کو پتا نہیں کیوں ایک چپ سی لگ گئی۔

مجھے بھی پتا نہیں کیوں یہ منظر حقیقی لگ رہا ہے۔ ایک چپ سی لگ گئی ہے۔ کیا اگلے مرحلے میں ہم بھی رب کو بانٹنے نہیں لگ جائیں گے؟ کیا اسی دن کے لیے ہمارے بزرگوں نے پاکستان بنایا تھا کہ کوئی زبان، کوئی فقہ کوئی کچھ اور کوئی کچھ کو بنیاد بنا کر خود کو الگ جتانا شروع کر دے؟ بقول اسد اعوان

کچھ تو ہم خود بھی بنے اپنی تباہی کا سبب
اور بربادیِ جاں حاصلِ تقدیر بھی ہے

معراج رسول

محسن اردو ادب

اس کے خاندان کی قسمت میں ہجرت لکھ دی گئی تھی۔اس کا خاندان نیشاپور ایران سے ہجرت کر کے ہند آیا تھا۔شاہی حکم نامے کے تحت اس کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کو بادشاہ ہند نے لکھنو کے مضافات میں جاگیر عطا کی تھی اور ''بند ہائے چوکی خاص'' کا اعزاز ملا ہوا تھا۔حکیم سید مرتضیٰ حسین تک پہنچتے پہنچتے جاگیر کافی چھوٹی رہ گئی۔سید مرتضیٰ علی نے حکمت کو بطور پیشہ اپنا رکھا تھا۔ہاتھ میں شفا تھی۔آمدنی معقول تھی۔اب وہ لوگ اودھ کے ضلع اناؤ ہجرت کر آئے تھے لیکن یہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے اور وہ بہرائچ کی جانب کوچ کر گئے۔بہرائچ میں انہوں نے خوب شہرت حاصل کر لی تھی۔یہیں ان کے ہاں 15 محرم 1311ھ بمطابق 26 جولائی 1893ء کو ایک بچے نے جنم لیا۔جب وہ بچہ چار سال چار مہینے چار دن کا ہوا تو بڑی دھوم دھام سے رسم بسم اللہ ادا ہوئی اور عربی فارسی کی تعلیم دی جانے لگی۔والد کا خیال تھا کہ اسے بھی حکمت کی تعلیم میں طاق کریں گے لیکن اس خواب کو تعبیر دینے سے قبل ہی وہ چل بسے۔اس وقت بچے کی عمر صرف دس سال تھی۔اس وقت گھر میں کوئی ایسا بزرگ بھی نہ تھا جو اس کے تعلیمی مصارف کا بوجھ اٹھاتا۔آمدن بھی کم ہو کر رہ گئی تھی۔ایسے وقت میں بیوہ ماں نے عنانِ زندگی کو اپنی طرف کر لیا اور اسے تعلیمی میدان میں مہمیز دینے لگیں۔انہوں نے بیٹے کے دل میں تعلیمی شوق کو پیدا کرنے کے لیے امکان بھر کوشش کی۔اسے نزدیکی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔وہ بھی تعلیم میں خصوصی دلچسپی لینے لگا تھا۔تعلیم کے راستے میں وہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔اس نے آٹھویں جماعت کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا جو مڈل کہلاتا تھا۔مڈل بورڈ میں اتنے نمبروں سے پاس کرنا بہت بڑا اعزاز تھا۔اسی دوران ایک عجیب ایذا نے اسے گھیر لیا۔ہر ایک دو دن بعد سر درد ہونے لگا۔مختلف حکیم اور ڈاکٹروں سے علاج کرایا گیا مگر شفا نہ ملی پھر بھی وہ تعلیم کے میدان کو سر کرتا رہا۔1917ء میں اس نے کنگ کالج لکھنو سے بی اے کی سند حاصل کی۔بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے ایم اے کی تیاری شروع کر دی۔انگلش ادبیات کا پہلا سال مکمل کیا تھا کہ اسے میعادی بخار کے مہلک مرض نے گھیر لیا۔زندگی تو بچ گئی مگر وہ امتحان نہ دے سکا۔اسی دوران یونائیٹڈ پروینس (یوپی) کی حکومت کے محکمہ تعلیم میں ایک نئی جگہ نکالی گئی۔اس اسامی کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ صوبہ بھر میں جتنی کتابیں شائع ہوں ان کی تفصیل جمع کر کے حکومت کے اخبار یوپی گورنمنٹ گزٹ میں شائع کرائے۔اپریل 1918ء میں اس نے یہ نوکری شروع کی۔دس برس تک وہ لکھنو میں رہ کر اس نوکری کو چلاتا رہا پھر وہ لکھنو سے الہ آباد منتقل ہو گیا۔اس زمانے میں ہر سال صوبہ بھر میں ڈھائی تین ہزار کتابیں چھپتی تھیں۔ان تمام کتابوں پر اسے نظر ڈالنی ضروری تھی۔اس طرح اسے مطالعہ کا چسکا سا پڑ گیا تھا۔اس طرح اسے علم کا خزانہ حاصل ہوتا چلا گیا۔اسی دوران اس نے محکمہ سے دس مہینے کی رخصت لی اور ٹیچر ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخلہ لے لیا۔1922ء میں اسے ایل ٹی کی سند مل گئی۔اسی سال جولائی کے مہینے میں اسے گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ میں تدریس کی نوکری مل گئی لیکن اسے تو اپنی زبان سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔چھوٹے درجے کے تدریسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔اس نے یونیورسٹی میں لیکچرار کی نوکری کے لیے عرضی داخل کر دی۔وہاں سے فوراً بلاوا آ گیا اور وہ سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے کر یونیورسٹی میں جونیئر لیکچرار کی نوکری کرنے لگا۔ابھی صرف چار سال گزرے تھے کہ اکتوبر 1926ء میں تنخواہ کے علاوہ پچیس روپے ماہوار کا پرسنل الاؤنس بھی ملنا شروع ہو گیا پھر 1927ء میں سینئر لیکچرار کی اسامی مل گئی۔اس کے تین سال بعد 1930ء میں اسے ریڈر مقرر کر دیا گیا۔اسی دوران ہند کی سیاسی فضا میں ہلچل مچ گئی اور ملک تقسیم ہو گیا۔تعصب کی وجہ سے اس کی راہ میں مسلسل رکاوٹیں آنے لگیں مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔بالآخر 1954ء میں اسے ریٹائر کر دیا گیا۔تب تک اس کی علمی شہرت ہندوپاک میں پھیل چکی تھی۔اس کی تصنیف و تالیف کی فہرست کافی طویل ہو چکی تھی۔امتحانِ وفا، فرہنگِ امثال، ہماری شاعری، فیضِ میر، مجالسِ رنگین، دبستانِ اردو، روحِ انیس، نظام اردو، جواہر سخن، شاہکار انیس، اردو زبان اور اس کا رسم الخط، دیوانِ فائز، متفرقاتِ غالب، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، ازم نامہ انیس، لکھنو کا شاہی اسٹیج، لکھنو کا عوامی اسٹیج، تذکرہ نادر، فسانہ عبرت، آئینہ سخن فہمی کے علاوہ سیکڑوں تحقیقی و تنقیدی مضامین ہندوپاک کے ادبی جرائد میں چھپ کر اس کی علم فہمی کا سکہ جما چکے تھے۔1975ء میں وہ اس دنیا سے ہجرت کر گئے۔ہم سب انہیں مسعود حسن رضوی کے نام سے پہچانتے ہیں اور محسن اردو ادب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

شہرِ خیال

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ ’’پُراسرار نمبر سے شروع ہونے والا 2016ء اپنے آغاز سے اختتام تک اپنی کثیر تحریروں میں اسرار لیے ہوئے تھا۔ آپ کے بارہ اداریوں میں ہمارے ملک کے اداروں کی پُراسرار سرگرمیوں کی کہانیاں بھی تھیں اور قوم کی زبوں حالی کے کھلتے اسرار بھی تھے اور رہبر و رہنماؤں کا یہ اصرار بھی کہ سب اچھا ہے۔ ’’سراب‘‘ کا ہمارا سفر مکمل ہونے کے قریب ہے اور یہ خدشہ بھی کہ تکمیل سفر کے بعد بھی تشنگی برقرار رہے گی۔ سال بھر جن تحریروں نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا ان میں ’’شمشال سے ٹورنٹو تک‘‘ سرِفہرست ہے۔ ’’نانگا پربت‘‘ کے بعد ندیم اقبال صاحب نے سفری داستان گو ہونے کا حق ادا کردیا۔ کہیں سے نہیں لگتا کہ وہ ایک پروفیشنل فوٹوگرافر ہونے کے باوجود لکھنے کے شہ سوار بھی ہیں۔ صائمہ اقبال نے تو حد ہی کردی۔ ہر ماہ ایسے ایسے لوگوں سے ملوا رہی ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی بارہ تحریروں کو دیگر لکھاریوں کے ساتھ مقابلے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ قصیدہ گو ہو، سکندر ثانی ہو، صاحب دل ہو یا فیض رساں سب کے سب شاندار تھیں۔ انور فرہاد بھی جناب علی سفیان آفاقی کی جانشینی کا حق ادا کررہے ہیں۔ ’’ذرہ بنا آفتاب‘‘ اداکارہ رنگیلا کو خراج تحسین پیش کرنے کا منفرد انداز تھا۔ دسمبر میں انہوں نے موہنی آوازوں کو یادوں کے دریچے میں لا بٹھایا۔ گلوکار اخلاق احمد اور بشیر احمد بھلائے نہ بھولیں گے۔ منظر امام صاحب نے ’’تاریخ عالم‘‘ کے ذریعے ہمیں پورے عالم سے روشناس کروایا جس کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ یہ موضوع ابھی بھی اپنے اندر وسیع کینوس لیے ہوئے ہے جس پر مزید معلومات کے کئی اور رنگ بھی بکھیرے جاسکتے ہیں۔ بعد از مرگ کاشف زبیر کی کرکٹ دیوانی اس خوب صورت کھیل پر مکروہ سازشوں کو آشکار کرتی ہوئی جاندار تفصیل تھی۔ (فعل ماسٹر کاشف زبیر کی نہیں امیر حسین چمن کی تھی۔ چمن صاحب کرکٹ کی دنیا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس فن پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں)۔ شاہد جہانگیر شاہد کی ’’مس کو پڑ‘‘ پر دوبارہ پڑھنے پر اور زیادہ بھائی۔ خدا شاہد صاحب کو غریق رحمت کرے، (آمین)۔ شکور پٹھان نے ’’نگینے لوگ‘‘ لکھ کر کراچی کے نگینوں پر پڑی وقتی دھول ہٹا کر ان کی قدرتی چمک دمک کے ساتھ ہماری خدمت میں پیش کرکے احسان کیا جو ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ دسمبر میں شکیل صدیقی دل آوارہ میں بلراج ساہنی جیسے شاندار فنکار کی فنکاریوں کا تذکرہ کررہے تھے لیکن ہمیں ڈھونڈے سے بھی ان کی فلم کابل والا اور کندن کا تذکرہ نہیں ملا۔ اسی طرح ’’سکندر ثانی‘‘ میں جولیس سیزر نے بھی موجودہ عیسوی کلینڈر جو اس کے کلینڈر کی ترمیم شدہ صورت ہے کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ’’ترپ کا پتا‘‘ کامیاب ہوکر شو ہوگیا۔ یہودیوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کی ملی بھگت بھارت کے نریندر مودی اور امریکا کے ڈونلڈ ٹرمپ کی صورت میں سامنے آگئی ہے اور ہمارے حکمران مودی کی دوستی کے بعد امریکا کے نئے صدر کی خوشنودی کے لیے مرے جارہے ہیں۔ ’’شہرِ خیال‘‘ میں سال بھر میں چھ ماہ، ناصر حسین رند، اعجاز حسین سٹھار اور عبدالجبار رومی چھائے رہے۔ یعنی اوج ثریا پر بیٹھ کر ہمیں تاؤ دلاتے رہے اور یہی حرکت کچھ کم ہی سہی لیکن صداقت حسین ساجد، عمران خان جونانی، فلک شیر، انور عباس شاہ، وحید ریاست بھٹی اور فرہم یعنی آفتاب احمد نصیر اشرفی سے بھی سرزد ہوئی اور ہمارے بے شمار ساتھی اس سے متاثر ہوئے اور ہم اس بات سے متاثر ہوئے کہ ’’شمشال سے ٹورنٹو‘‘ کے ندیم اقبال اور ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری صاحبہ ہمارے درمیان آگئے اگر بشریٰ افضل صاحبہ بھی آجائیں تو محفل میں مزید روشنی ہوجائے گی۔ آخر میں تمام ساتھیوں اور اراکین ادارہ کو سلام اور نیا سال مبارک۔‘‘

☆ اعجاز حسین سحٔار کا خط نور پور تھل سے۔ ''محفل دوستاں میں خود کو مسند صدارت پر فائز دیکھ کر خوش ہونا فطری بات ہے جب تک رسالہ ہاتھ میں رہے گا تو غرور بھی رہتا ہے۔ طاہرہ گلزار بہنا! میں نے بھلا کس سے ناراض ہونا ہے۔ 35 سال سے مسلسل تبصرے لکھ رہا ہوں۔ قلمی دوستیاں کیں، ملنا ملانا بھی رہا۔ یہاں آپ کا اعتراض صحیح ہے جسے آپ میری سستی سمجھ لیجیے۔ میں محفلوں میں خوش رہنے والا بندہ ہوں۔ آپ نے میری کوتاہی کی نشاندہی کی جس کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔ بھکر والے محض حاضری لگوانے آتے ہیں، تبصروں نے مزہ نہیں دیا۔ قیصر خان شاید شادی کے چکر میں الجھے ہوئے ہیں اس لیے غیر حاضر ہیں جب یہ لڈو کھا لیا تو سالوں بعد خبر ملے گی۔ ''طفل ماسٹر'' مختصر پیرائے میں ہے اس لیے حسب توقع مزہ نہیں آیا۔ ''دسمبر کی شخصیات'' نے سابقہ کی پوری کر دی۔ بابرہ شریف، دانش کنیریا، معین اختر، مائرہ خان روشن آرا بیگم، بے نظیر بھٹو، میاں نواز شریف اور ثقلین مشتاق سے متعلق معلومات نے دل خوش کر دیا ہے۔ خاص طور پر بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کتنے خوش قسمت تھے کہ جوانی میں وزیراعظم بنے اگر مرحومہ زندہ رہتیں تو تین بار وزیراعظم کا ریکارڈ برابر کر چکی ہوتیں لیکن قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں جو ہماری بہتری کے لیے ہوتے ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں اب الجھاؤ آ گیا ہے۔ ایک ٹھہراؤ سا آ گیا ہے اگر دوسرے قارئین شوق و ذوق سے پڑھ رہے ہیں تو میری انفرادی رائے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ جمہور کا فیصلہ ماننا پڑے گا۔ ''سراب'' کا اختتام قریب آ پہنچا ہے۔ نئے سلسلے ''ناسور'' کے اعلان کے ساتھ ہمارے من پسند شاہکار کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ پورے دس سال تک ساتھ رہا۔ ایک ایک پیراگراف، سطر بلکہ لفظ لفظ دل کی نظر سے پڑھا ہے۔ شہباز کو دکھ پہنچا، بھائی قتل ہوا یا قید و بند اور تشدد برداشت کیا تو ہم نے تکلیف محسوس کی، اسے کامیابی ملی، دشمن کو زیر کیا اور کسی مشن میں من پسند نتیجہ حاصل کیا تو ہم خوش ہوئے، ذہن کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ نئی کہانی کیسی ہوگی، بند پٹاری سے کیا خبر کیا برآمد ہو، پیش گوئی مناسب نہیں ہے۔ انتظار کی سولی ہے وہی نتیجہ ملے گا جو جوا میں داؤ کا ہوتا ہے۔ اب ہماری آنکھیں یہ پڑھنے کو ترس گئی ہیں کہ شہباز اور سویرا کی شادی ہو گئی ہے۔ تب اندر کا غبار ایک ہی سانس میں خارج ہو جائے گا۔ اب سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''مرد کی غلامی'' کے عنوان کی رعایت سے اسے مردوں کے مظالم، ضد، انا، ہٹ دھرمی، ناانصافی اور عورت کی مظلومیت، گھٹ گھٹ کر جینا اور خواہشوں، خوابوں کے خون ہونے کی کہانی سمجھ رہا تھا لیکن یہاں شادی سے پہلے کے حالات، والدین کی پریشانیاں، مجبوریاں اور مسائل کو ڈسکس کیا گیا ہے، یوں ایک طرح سے یہ تحریر ان مراحل سے گزرنے والے خاندانوں کو رہنمائی کا کام دے گی۔ نورین کے خدشات خود ساختہ اور غیر فطری تھے۔ شادی سے پہلے مرد کا رویہ فدویانہ ہوتا ہے جب شادی کے بعد لڑکی عورت بن جاتی ہے بال و پر کٹ جاتے ہیں اڑان بھرنے کے قابل نہیں رہتی، والدین پہلے ہی زیر بار ہو کر فرض ادا کر کے سکھ کا سانس لینے کے قابل ہوتے ہیں تو اس کمزوری کو کیش کراتے ہوئے مرد ہاتھ پیر پھیلانا شروع کرتا ہے تو لڑکی والدین کو صدمے سے بچانے کے لیے بات سہتے ہوئے عادی ہو جاتی ہے پھر جیسے تیسے رشتہ نبھانا پڑتا ہے اور مرد شیر بن کر مکمل کچھار سے باہر آ جاتا ہے کچھ قسمت کا چکر ہوتا ہے کہیں معمولی شکل اور کمزور خاندان کی لڑکی بھی راج کر رہی ہوتی ہے۔ ''ادھورا آدمی'' میں مرزا صاحب نے اپنا بھرم بنایا ہوا تھا۔ خیالی دنیا اور خوش فہمی میں دن گزار رہے تھے۔ ''اللہ کی مرضی'' کے شیراز کمینگی کی انتہا تک چلے گئے اور حمائلہ کے والدین کو اپنی ظاہری امارت سے متاثر کر کے منگنی پر آمادہ کر لیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ حمائلہ اس کے کزن کی پسند ہے۔ وہ خود غرضی اور رقیب کو نیچا دکھانے کے چکر میں یہ بھول گیا تھا کہ اصل فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں اور کبھی یقینی موت بھی ٹل جاتی ہے۔''

☆ حکیم سید محمد رضا شاہ نے تورنگ تحصیل ضلع میانوالی سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت اس مرتبہ جلد 28 نومبر کو مل گیا۔ ''معبر خیال'' میں اعجاز حسین سحٔار کرسی صدارت پر نظر آئے۔ ہمارے ضلع کے پرانے تبصرہ نگار ہیں۔ اس کے بعد طاہرہ گلزار کا محبت نامہ پڑھا۔ مجھے اور دیرینہ ساتھیوں کو شہر خیال میں آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ ایک مرتبہ پھر مرد حضرات سے خفا نظر آئیں اور مردوں کے خوب لتے لیے ہیں۔ میں نے بہن طاہرہ کو کئی دفعہ کہا ہے کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ وفادار بھی ہوتے ہیں جیسے ہم اپنی ایک بیگم صاحبہ سے عرصہ چالیس سال سے ساتھ نبھا رہے ہیں وہ میرا اور میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ ہم پوتے اور نواسی والے بھی ہو گئے ہیں اگر مرد حضرات میں خامیاں ہیں تو صنف نازک بھی اپنی بشری کمزوریوں سے مبرا نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ بہن طاہرہ کی زندگی خوشیوں سے بھر دے۔ دریا خان (بھکر) کے انور عباس شاہ، جی آیاں نوں۔ سید مسرت حسین رضوی، عامر ساحل، عبدالجبار رومی، فقیر غلام حسین ضیا، سعید احمد چاند، رضا احمد اعوان، ڈاکٹر روبینہ نفیس، خالد قریشی، سید محمود حسین کے محبت نامے پڑھے اور خاص کر ہمارے نزدیکی ضلع بھکر کے نئے آنے والے تبصرہ نگاروں کو خوش آمدید۔ علی سفیان آفاقی مرحوم، مختار آزاد مرحوم، کاشف زبیر مرحوم اور محی الدین نواب مرحوم کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے، (آمین)۔ لکھاری ہونے کے ناطے ان کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ ماضی قریب کے یہ حضرات عظیم لکھاری تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ''سکندر ثانی'' ایک زرخیز تحقیق ہے۔ لعل ماسٹر محمد حنیف بھی کرکٹ تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ ان کے

بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ اسرائیلی جاسوس ایلی کوہن کے بارے میں معلومات دینے کا شکریہ جی۔ ایلی کوہن کے بارے میں تو یہ مشہور ہوا کہ وہ شام کے وزیر دفاع بننے والے تھے کہ شامی انٹیلی جنس کی نظر میں آگئے اور گرفتار ہو گئے۔ شام کے ملکی حالات دگرگوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملک شام میں امن کے حالات پیدا کرے۔ ''دسمبر کی شخصیات'' میں اسماعیل گل جی، چوہدری محمد علی، بابرہ شریف، دانش کنیریا، معین اختر، مائرہ خان، روشن آرا بیگم، ثقلین مشتاق کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ فلم نگری میں اخلاق احمد اور بشیر احمد، گلوکاروں کی مفید باتیں تحریر ہیں۔ دل آوارہ بلراج ساہنی کے بارے میں ایک مستند دستاویز ہے۔ ندیم اقبال کا ''شمشال سے ٹورنٹو'' ایک دلچسپ سفرنامہ ہے۔ ''بڑے لوگ'' بھی پسند آئی۔ ''ترپ کا پتا'' میں امریکن نئے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی صدارتی مہم کی کہانی ہے۔ یقیناً ٹرمپ نے صدارتی الیکشن جیت کر دنیا کو حیران کر دیا۔ اب دیکھیں نئے امریکی صدر دنیا میں امن کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ ٹرمپ پر مضمون معلوماتی ہے۔ ''سراب'' کا اختتام قریب ہے۔ ایک تہلکہ خیز سلسلہ تھا۔ سچ بیانیوں میں سب کہانیاں بہتر ہیں۔ ''مرد کی غلامی'' میں نورین صاحبہ نے نازک موضوع کو چھیڑا ہے۔ یقیناً مرد حضرات منکوحہ عورت کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ ''ادھورا آدمی'' انسانی اور خاص کر ازدواجی حالات پر نفسیاتی کہانی ہے۔ کبیر احمد عباسی نے ''اللہ کی مرضی'' میں اور شکیل حسین کاظمی نے ''آتش گزیدہ'' میں ایک معاشرتی پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ کس طرح دوسروں کا نقصان سوچنے والے خود اپنے لیے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ شیراز نے حمائلہ کی شادی اپنے کزن سے کرا کر اپنی غلطیوں کا ازالہ کر دیا اور ''آتش گزیدہ'' میں صغیر احمد اپنے غلط دوستوں کی محفل میں اپنا گھر جلا بیٹھا۔ سید شکیل حسین کاظمی کو اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ برادرم اعجاز احمد راحیل کی کہانی ''انوکھی جیت'' بھی ایک بہترین اور اچھی کہانی ہے مگر سمجھ نہیں آتی کہ جشن شادی میں اگر کنوارہ مرد ایک غیر شادی شدہ لڑکی کا انتخاب کر لے اور پھر ان کی شادی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایک شادی شدہ عورت کو ساتھ لے جانا......! یہ بات ہضم نہیں ہوتی جی۔''

☆ سید محمود حسن کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ''اپنا خط سرگزشت کے صفحات پر دیکھ کر خوشی ہوئی، جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ ہمیشہ کی طرح سے ماہنامہ سرگزشت بہترین کہانیاں، معلوماتی تحریریں اور سچ بیتیاں اپنے دامن میں لیے ہوئے تھا۔ سکندر ثانی نہایت دلچسپ پیرائے میں دل نشیں تحریر تھی۔ اسی طرح ''لعل ماسٹر'' بھی متاثر کن تحریر تھی، فلم نگری سے من موہنی آوازیں، دل آوارہ اور پھر سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' مشرقی اور مغربی روایات کا احاطہ کرتی تحریر ہے۔ سچ بیتی میں ''انوکھی جیت'' اور ''اللہ کی مرضی'' سبق آموز اور ایثار قربانی کے جذبات کی عکاسی کرتی ہوئی تحریریں تھیں۔ اسی طرح ''شعلے اور موتی'' بھی ایک دکھی اور اچھی تحریر تھی۔ ''یہ کون بولا'' نہایت اچھی اور اصلاح آموز کہانی ہے۔ ''برائی کا فیشن'' آج کل کے معاشرے کی کھلی تصویر پیش کرتی کہانی ہے۔ ایک کہانی ''سزا'' جو کہ قانون قدرت اور مکافات عمل پر مشتمل کہانی ہے۔ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ نوک پلک سنوار کر شائع فرما دیں گے۔''

☆ سید مسرت حسین رضوی کی آمد کراچی سے۔ ''معراج رسول صاحب کی کہانی پڑھ کر دکھ ہوا۔ نشریاتی ادارے بعض دفعہ تو بہت غلط تلفظ کرتے ہیں، اس سلسلے میں مرحوم رئیس امروہوی جو میرے روحانی استاد تھے، انہوں نے اردو کے بارے میں تحریر کیا تھا۔ ''اردو کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے۔'' شہر خیال میں طاہرہ گلزار کی تحریر پسند آئی۔ میرے تبصرے کو پسند کیا ان کا بہت شکریہ۔ ایک بات کہوں جب تبصرہ لکھنے لگتا ہوں تو یہ پتا ہی نہیں لگتا کہ کیا لکھ رہا ہوں، پین کی نوک سے جو کچھ نکلتا ہے وہ ورق پر منتقل ہوتا رہا ہے اس میں میرا اختیار نہیں ہوتا اور دوسری بات کہ سرگزشت میں سچ بیانی نے میری توجہ حاصل کی اور تبصرہ لکھنے کا حوصلہ میری بیگم نے دیا تو اس محفل میں آ گیا۔ قارئین کا خلوص ہے کہ جو میں کچھ نہ کچھ لکھ لیتا ہوں ورنہ تو زندگی میں تلخیاں بہت ہیں۔ نزاہت افشاں آپ کا بھی بہت شکریہ۔ رہا مسئلہ کہانیاں لکھنے کا تو ایک کوشش کی تھی مگر الفاظ کو سجا سنوار نہ سکا۔ خواہش تو بہت ہے کہ لکھوں اور میرے ساتھ واقعات بھی کافی پیش آئے۔ چاہتا تھا کہ لکھ کر سرگزشت کو دوں مگر افسوس پہلی کوشش ہی ناکام ہوگئی۔ صرف تبصرہ ہی لکھ رہا ہوں جس سے دل کے زخموں میں کچھ جلن کم ہو جاتی ہے۔ عبدالجبار رومی انصاری آپ کی ہمت افزائی کی وجہ سے میں مسلسل تبصرہ لکھنے کی طرف راغب ہوا۔ سعید احمد چاند اور رضا احمد اعوان کا بھی مشکور ہوں جو انہوں نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ طاہرہ گلزار کی تجویز پسند آئی جو دو دو سلسلہ وار کہانی کے بارے میں ہے۔ ''مرد کی غلامی'' نورین صاحبہ کی کہانی میں تمام حقائق خود نورین ہی نے بیان کر دیے جو قابل توجہ اور آج کے معاشرے کے مطابق ہے اتنی جدوجہد اور تحقیق کے بعد بات سمجھ میں آ گئی، یہ بھی بڑی بات ہے۔ بی بی قدرت نے مرد کو بالاتر رکھا تو اس میں اللہ کی مصلحت ہے جو کام مرد کر سکتا ہے وہ عورت نہیں کر سکتی چاہے وہ کتنی ہی پڑھی لکھی، باکمال ہو مرد پر برتری حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ الگ بات کہ مرد ذات میں بھی ہزاروں برائیاں ہیں مگر پھر بھی یہ قدرت کا نظام ہے جو رد نہیں کیا جا سکتا۔ مردوں میں بھی سب ایک جیسے نہیں ہوتے اور نہ برے ہوتے ہیں۔ اچھے و باکردار مرد بھی موجود ہیں جو

عورت کے حقوق کو مانتے ہیں اور برابری کا حق دیتے ہیں۔ ہر مرد ظالم نہیں ہوتا اور نہ ہر عورت ظالم ہوتی ہے۔ نیک سیرت عورتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ پرکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔ ''ادھورا آدمی'' بہت کم ایسا ہے، اللہ مرضی۔ کبیر احمد عباسی کی کہانی دوستی، رشتہ داری اور قربانی کے جذبہ سے پُر تھی۔ واقعی صبر عظیم جذبہ ہے جس کا انعام ملتا ضرور ہے چاہے جلد یا بدیر۔ ''سکون'' امجد انصاری کی تحریر جذباتی تھی۔ سانحہ پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ قابلِ افسوس ہے اور رہے گا ملک کا آدھا حصہ غداروں کی وجہ سے ختم ہوا نہ تو مشرقی پاکستان ہی کہلاتا۔ ''شعلے اور موم'' شمیم غوری کی تحریر نے بہت متاثر کیا۔ شعلے کی بے بسی پر بہت افسوس ہوا اور اندر تک دکھ بھر گیا۔ کہانی پسند آئی۔ ''یہ کون بولا'' فرمان علی کی کاوش اچھی لگی۔ شیزوفرینیا کے کئی مریض میرے سامنے آئے اور یہی کیفیت ان کی تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت اچھے انداز میں پیش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے بہت ساری دیارِ غیر کی باتوں کا حالات اور موسموں کا علم ہو رہا ہے۔ ''ترپ کا پتا'' نئے امریکی صدر کے مطابق کافی کچھ اخبارات میں آ رہا ہے مگر اس سلسلے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آنے والا وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ صدر امریکا کیسے ثابت ہوتے ہیں۔''

☆فقیر غلام حسین ضیاء نے لکھا ہے۔ ''مشیرِ خیال میں حاضری قبول فرمائیے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے دسمبر کے شمارے میں نورین صاحبہ کی کہانی ''مرد کی غلامی'' کو انتخاب کیا ہے اگرچہ اس کہانی کا انجام واضح ہے۔ بے چاری عورت کو کافی سوچ بچار کے بعد آخر مرد کی غلامی قبول کرنا ہی پڑی تھی۔ یہ لفظ غلامی کچھ مناسب نہیں لگتا کیوں کہ بحیثیت مسلمان نکاح سنتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے اور عورت و مرد کے سرپرست خوب دیکھ بھال کر رشتہ طے کرتے ہیں۔ حسب نسب کی خوب جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں پڑھی لکھی خواتین نے مساوی حقوق کی رٹ یورپ سے مستعار لی ہے۔ یورپی کلچر اور پاکستانی کلچر میں بڑا فرق ہے۔ بحیثیت مسلمان والدین ہمارے نوجوان بچوں کے رشتے طے کرتے ہیں۔ لو میرج یا کورٹ میرج میں ان والدین کو اندھیرے میں رکھ کر شادی کرنا بہت بڑی زیادتی ہے اور والدین جنہوں نے بچوں کو پالا پوسا اعلیٰ تعلیم دلائی سب رشتوں کو نظرانداز کر کے اپنے شوہر کے ساتھ گھر سے بھاگ جانا، آزادی حقوقِ نسواں نہیں بلکہ والدین کو زندہ درگور کرنے والی بات ہے۔''

☆نزابت افشاں کی مہورہ فتح جنگ سے تشریف آوری۔ ''معراج صاحب اس بار بھی انتہائی سنجیدہ اور تلخ حقیقت سامنے لائے۔ قومی زبان سے ہمارا یہ سلوک انتہائی قابلِ افسوس ہے۔ ہماری آنے والی نسل شاید خالص اور صاف ستھری اردو کو ترس جائے گی اور غالب و اقبال کو سمجھنا تو شاید اس نسل نو کے لیے ممکن ہی نہ رہے گا۔ ''مشیرِ خیال'' میں اعجاز صاحب صدارت مبارک ہو۔ میری انتہائی قابلِ احترام آپی گل کا تبصرہ بھی اس بار خوب تھا اور نوک جھوک سے بھرپور بھی، انور عباس شاہ، سید مسرت حسین رضوی عمدہ تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ رومی صاحب یاد کرنے کا شکریہ۔ سیف اللہ بھائی آپ کا تبصرہ بھی ٹھیک ہوتا ہے لیکن طاہرہ آپی پر تنقید کرنے سے پہلے یہ ضرور یاد رکھیں کہ وہ اردو ادب میں ماسٹرز ہیں۔ سعید احمد چاند، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اس بار آپ نے اپنے خطے میں لکھا کہ ''روبینہ نفیس انصاری کا محکمۂ ڈاک سے شکوہ بے جا ہے۔'' میرے خیال میں ''بے جا'' کی جگہ ''بجا'' (بمعنی درست) ٹھیک رہے گا۔ رضا احمد اعوان شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ یک صفحی سرگزشت مکیش اکبر آبادی، سکندر ثانی، ایلی کو بن اس کے علاوہ پورا شمارہ 2016ء کا آخری خاص الخاص تحفہ تھا۔ ''مرد کی غلامی'' اچھی تحریر تھی۔ ''سراب'' کو جلد بازی میں اختتام کی طرف لایا جا رہا ہے۔ ''بیت بازی'' میں منشی محمد عزیز میمن، فرام گجرات، نیلوفر شاہین، نسیم شاہ، ہادیہ ایمان، اشرف عباس دبئی اور نسرین مشتاق جھنگ کے عمدہ اشعار تھے۔ ''دسمبر کی شخصیات'' اس بار پھر کئی اہم شخصیات شامل نہیں تھیں۔ خصوصاً ناصر کاظمی جو 8 دسمبر 1925ء کو پیدا ہوئے اور صرف 47 سال کی عمر میں 2 مارچ 1972ء کو دنیا سے رخصت ہوئے لیکن ناصر نے انتہائی نایاب شاعری سے اردو ادب کو نوازا۔''

☆مور شاہد حسین نے قمبر شہدادکوٹ سے لکھا ہے۔ ''ماہنامہ سرگزشت کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ اس کا معیار بہت ہی اعلیٰ ہے اور یہ ڈائجسٹ معلومات کا خزانہ ہے۔ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے کسی ایک رائٹر کا نام لینا دوسروں سے زیادتی ہے۔ دسمبر 2016ء کا شمارہ دل کو بھا گیا ہر تحریر دل کی آنکھ سے پڑھی۔ ایسا بے مشکل شمارہ مہیا کرنے پر بے حد نوازش۔ اس بار اگر جنوری 2017ء کے شمارے میں جگہ ملی تو انشاء اللہ ہر ماہ شرکت کروں گا۔ آخر میں عرض یہ ہے کہ تین ماہ پہلے میں نے یعنی مور شاہد حسین، ایک کہانی بعنوان ''ایسی غلطی مت کرنا'' بھیجی تھی براہ مہربانی بتا دیں کہانی ملی یا نہیں۔ (کہانی سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے) اور میرے محترم استاد امجد علی نظام نے حضرت سید عبدالقادرؒ جیلانی کی شان میں چند اوراق لکھ کر بھیجے تھے وہ تحریر بھی قابلِ اشاعت ہے (ادھوری معلومات سرگزشت میں نہیں لگتی)۔''

☆طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''اس بار سرگزشت کے دو تبصرہ نگار قیصر خان اور اعجاز حسین سنحار سے بات ہو گئی ہے۔ اللہ

تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں صحت کاملہ عطاء ہو۔ ہمارے ایک اور پیارے سے دوست بھائی عمران جونانی کی والدہ فوت ہوگئی ہیں۔ سب دوست مغفرت کی دعا کریں۔ اس بار معراج رسول انکل نے اردو زبان کی دکھتی رگ پکڑی ہے۔ نام کو تو آئین 1973ء میں بھی اردو قومی زبان ہے لیکن نظر تو کچھ اور آتا ہے۔ کیا اردو صرف قلموں تک محدود رہ گئی ہے۔ اب تو واقعی اردو بازاری زبان بنتی جارہی ہے۔ ہمارے مقابلے میں انگریزوں کو دیکھیے کہ انہوں نے انگلش کو کس مقام تک پہنچایا ہے، چین کو دیکھیں کہ چینی زبان دنیا میں انگلش کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ پاکستانی قوم صرف ایک نقال قوم ہے۔ دوسروں کے وہ رسومات اور روایات پسند کرتے ہیں جن سے ہمارا قومی اور مذہبی نقصان ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوان کو غلط راستوں پر ڈالنے کی پالیسی غیروں نے شروع کی ہے اور اپنوں نے بھی۔ اس ملکِ خداداد کے عوام اور حکمران اگر اب بھی نہیں سمجھیں تو وہ دن دور نہیں کہ قہر الٰہی نازل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین ثما آمین)۔ یک تکی میں میکش اکبرآبادی کے بارے میں اتنا جامع اور مختصر تحریر سے ان کے بارے میں علم ہوا جب کہ حقیقت میں، میں نے ان کا نام پہلی بار پڑھا۔ سرگزشت کے طفیل، ''شعبِ خیال'' کے دروازے پر دستک دی تو سامنے ہی اپنے بہت پیارے اور نفیس بھائی اعجاز حسین سحّار سے ملاقات ہوگئی۔ اللہ میرے اس بھائی کو ہر تکلیف سے آزاد کردے اور صحت کاملہ عطاء کرے (آمین)۔ بھائی مبارکاں آپ کا تبصرہ تو ہمیشہ ہی بہت جامع، شاندار اور تفصیلی ہوتا ہے۔ اس بار بھی بہت اچھا تبصرہ ویلڈن۔ انور عباس شاہ بھی بہت زبردست تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ ویری گڈ آپ نے تو پولیس کی وہ خوبیاں بیان کیں جو ہم ہمیشہ خواب میں دیکھتے ہیں ہاہاہا۔ سید مسرت حسین نے بہت جذباتی اور دردِ دل تبصرہ لکھا ہے۔ بھائی سرگزشت شمع ہے اور ہم سب اس کے پروانے بہت ہی دل سوز تبصرہ بھائی دل دکھی کردیا۔ انشاءاللہ پاکستان کے دشمنوں کا منہ ہمیشہ کالا ہوگا۔ واہ اس بار تو رانا محمد شاہد بھائی بھی حاضر تھے۔ مجھ پر بھرپور طنز کے ساتھ۔ خوشی ہوئی آپ کی تحریر بھی پڑھنے کو ملے گی۔ بھائی ہمت بھی ہے اور آپ لوگوں اور سرگزشت سے محبت بھی ہے۔ بہت ہی شاندار تبصرہ رانا محمد شاہد بھائی اللہ آپ کی والدہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطاء کریں (آمین ثما آمین)۔ اس بار تو ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحبہ ماشاءاللہ اتنا لمبا اور محبت بھرا تبصرہ لے کر حاضر تھیں۔ ہم تو خوش ہیں کہ آپ واپس آگئیں۔ آپ کی کمی ہمیں بہت محسوس ہوتی تھی۔ اللہ آپ کو اور ثاقب بھائی کو صحت کاملہ عطا کرے۔ (آمین)۔ ہائے اس بار تو اپنی سویٹ سی سسٹر سدرہ بانو غائب تھی محفل سے۔ اللہ خیر کرے کہ خیریت سے ہوں۔ امیر حسین چمن کی تحریر ''لعل ماسٹر'' پڑھ کے بہت ہنسی آئی۔ حنیف محمد نے اپنے ساتھ گزرے وہ واقعات سنائے کہ حیرت بھی ہوئی کہ وہ اتنی وہمی بھی تھے۔ ویلڈن امیر حسین چمن صاحب۔ عبداللہ احمد حسن کی تحریر ''ایلی کوہن'' بہت معلوماتی تحریر تھی۔ واقعی یہودیوں، روسیوں اور انگریزوں کا جاسوسی نظام بہت مضبوط ہے۔ واہ بہت خوب اس بار انور فرہاد صاحب قلم نگری میں میرے فیورٹ گلوکار اخلاق احمد پر تحریر لائے ویلڈن جناب۔ سو اب اس بار تو یہ قسط بہت تیز ایکشن لے کر آئی۔ شہباز نے مرشد پر وار تو بہت سخت کیا لیکن بظاہر تو انجام برا ہوا۔ مرتجس ایک اعلیٰ مقصد پر قربان ہوا اور شہید ہوا۔ سفیر بے ہوش ہے اور شہباز ایک بار پھر جذبات کے نرغے میں۔ لگتا ہے کہ بس اب ''سراب'' چند لمحوں کا مہمان ہے کیونکہ اب لگتا ہے۔ مرشد کا دیا ہوا زخم ناسور بن گیا ہے۔ ''آتش گزیدہ'' اس معاشرے میں بہت سے لوگ شیطانی صفت رکھتے ہیں۔ دوسروں کو تکلیف دیتے وقت بھول جاتے ہیں کہ ایسا ہمارے یا ہمارے پیاروں کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ ''انوکھی جیت'' اعجاز احمد راحیل بہت اچھی کہانی ہے۔ مردان کے ذکر پر آپ کو بھی بہت کچھ یاد آیا ہوگا۔ آپ تو کافی وقت مردان میں گزار چکے ہو۔ ''شمشال سے نورنتو'' اس بار تو ندیم صاحب نے بہت دلچسپ انداز میں نسرین سے دوستی کا اقرار کیا ہے۔ سرجی اور شہباز کی دوستی اچھی لگی۔ آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا۔''

☆ انور عباس شاہ، بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ''معراج رسول صاحب نے اس دفعہ پھر ایک اہم نکتے کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ یعنی اردو زبان سے بے پروائی اردو ہماری قومی زبان ہی نہیں ہماری ثقافت ہماری پہچان بھی ہے۔ افسوس ہم اس کی قدر کھوتے جارہے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر تو خبروں کے علاوہ سرخیاں بھی کچھ اس قسم کی چلائی جاتی ہیں جن کا مطلب ہمیں خود اخذ کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ دور میں اگر ذوالفقار علی بخاری جیسی قابل شخصیات موجود ہوتیں تو ٹی وی چینلز اس قسم کے نہ ہوتے۔ ''شعبِ خیال'' میں اعجاز حسین سحّار کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ بے حد جاندار تھا۔ عزت افزائی کا بے حد شکریہ، خداوند کریم آپ کو بمع آپ کے اہل و عیال کے حفظ و امان میں رکھے (آمین)۔ ہماری دعائیں ہر دم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہردلعزیز بہن آپی طاہرہ گلزار اپنے جامع تبصرے کے ساتھ ''شعبِ خیال'' کی زینت بنیں۔ باجی گل خداوند کریم آپ کو ہزاروں خوشیاں عطا فرمائے۔ سید مسرت حسین رضوی کا خط ہمارے معاشرے کی عکاسی کررہا تھا۔ سچ کہتے ہو بھائی ہمارے ملک کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ دہشت گردی جیسے تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی بلکہ اس میں تو دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ رانا محمد شاہد بھی حاضرِ محفل تھے۔ حسب معمول اچھا لگا۔ رانا صاحب آپ کی والدہ محترمہ کی وفات کا دن ہمیں یاد ہے۔ ایک دفعہ پھر خداوند کریم کے حضور دعاگو ہیں کہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین ثما آمین)۔ اس کے علاوہ آنسہ محمد عامر ساحل، نزاہت اقبال، سیف اللہ، عبدالجبار رومی

انصاری، سعید احمد چاند کے تبصرے، بھی خوب تھے۔ رضا احمد اعوان خداوند کریم آپ کی پریشانیاں دور کرے۔ بھائی نومبر کے شمارے میں، میں تو حاضر تھا اور کرسی صدارت پر براجمان تھا۔ آپ کو کیسے نظر نہیں آیا۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب حاضر تھیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ نے تو اتنی معذرت کرلی کہ ہمیں شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ خداوند کریم آپ کو قدم قدم پر ہزاروں خوشیاں عطا فرمائے اور نیک صالح اولا دِ نرینہ عطا فرمائے۔ (آمین)۔"

☆ غلام سبحانی، عیسیٰ خیل نوشہرہ سے لکھتے ہیں۔ "عرصہ دراز سے سرگزشت کا خاموش قاری ہوں۔ آج اتفاقاً دل نے چاہا کہ آپ کو خط لکھوں اور قسمت آزماؤں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے قدر دان بلکہ ممنون بھی ہیں کہ ان کے توسط سے بڑی بڑی شخصیات سے تعارف ہوجاتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سچ بیانی میں زویا اعجاز کی تحریر نے کافی افسردہ کیا۔ خاص کر صفحہ نمبر 194 پر ان کا یہ جملہ اچھا نہ لگا "صنفِ مخالف کا وجود اس کے لیے ایک ٹشو پیپر سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ تھا"۔ اب ذکر کرتا ہوں ایک مختصری کہانی "سینہ زوری" کا جسے ناظم بخاری آف لودھراں نے تحریر کیا ہے۔ کتنے شگفتہ اور باریک بینی سے اختلافات کے دائرے میں سرگزشت کے صفحات پر رقم کر کے ہماری داد حاصل کی ہے۔ زہے نصیب۔ ناظم بخاری خود تحریر کرتے ہیں۔ "الفاظ کو موتیوں سے سجا کر پیشِ خدمت ہے" تو جناب ناظم صاحب آپ کے موتیوں کی ہم نے قدر کی اور اسے پہلا نمبر دیتے ہیں۔ خوش ہوجایئے۔ انور فرہاد یادداشت کے سلسلے میں کمپیوٹر کو بھی مات دے چکے ہیں۔ ماشاء اللہ علی سفیان آفاقی مرحوم کے سچے اور کھرے قلم البدل میں اس بار انہوں نے ایک ہندوستانی اداکارہ سمیتا پاٹل کی نہایت الم ناک موت کا ذکر کیا ہے جسے پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا اس لیے کہ موجودہ ہندوستانی فلموں میں میری یہ سب سے پہلی اور آخری فلم ہے جو میں نے دیکھی یعنی "نمک حلال" اس میں ان کی بے ساختہ اداکاری کا جواب نہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں بھی ایک اداکارہ جوانی میں موذی بیماری کینسر کا شکار ہو کر ابدی نیند سوگئی تھیں۔ طاہرہ نقوی دونوں کی درد بھری کہانی ملتی ہے۔ بہرحال یہی زندگی ہے اور زندگی تا حال جاری ہے۔"

☆ اویس شیخ کا خط ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ "ہماری خوب صورت زندگی کا ایک سال اور منہا ہوگیا۔ شاہد جہانگیر شاہد کی رخصتی ملال کر گئی۔ دعا ہے اللہ کریم انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ (آمین)۔ دوسرا دل کے نہاں خانے میں مچلتی ایک خواہش کا تقاضا ہے، کیا آپ "بیتا نا بیتا نمبر 2" شائع نہیں کرسکتے ہیں؟ کیونکہ "بیتا نا بیتا" نمبر کی ہر تحریر بلند پایہ، فصاحت اور برجستگی کا نمونہ تھی۔ اداریہ میں

آپ نے اردو زبان پر خدشات ظاہر کیے۔ انکل! ابھی اردو زبان پر اتنا کڑا وقت نہیں آیا، جب تک سید علی رضا عابدی، مستنصر حسین تارڑ، عطاء قاسمی، بشریٰ رحمن اور آپ جیسے ایڈیٹرز اتنی خوب صورت اردو لکھنے والے موجود ہوں۔ اردو ہمارا فخر ہی رہے گی۔ یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ میڈیا میں جب سے سنسنی اور ریٹنگ کا بھوت سوار ہوا ہے، اردو زبان کی اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا۔ میکش کا تذکرہ معلوماتی تھا۔ ''شہر خیال'' میں سب سے پہلے اعجاز صاحب کا خوب صورت خط پڑھنے کو ملا۔ اولین سطور میں انہوں نے اپنے جذبات شیئر کیے، یقین مانیے میری کیفیت بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ چاند، اعوان اور ڈاکٹر صاحبہ کی تشریف آوری سرگزشت سے لگن اور چاہت کا ثبوت ہے۔ افشال بھائی! میں نے کئی کہانیاں دیکھیں ایک بھی شائع نہیں ہوئی تو بددل ہو کر دیکھنا چھوڑ دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سرگزشت سے قربت پیدا کر دی اور یہیں دل لگ گیا۔ رانا صاحب! بھارتی بربریت اور ظلم و جبر بیان کرنے کے لیے تو آکسفورڈ ڈکشنری میں بھی الفاظ نہیں ہے۔ ''سکندر ثانی'' صرف جنگ میں ہی نہیں بلکہ قسمت کے میدان کا بھی لاثانی ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ادبی شہ پارہ تحریر کیا جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ پوپی کا کردار بھی مجھے بہت پسند آیا۔ بیزر کا عبرتناک انجام بہت افسوسناک تھا۔ ''ایلی کوہن'' حیران کن شخصیت کا مالک تھا۔ جو شخص بااثر خاندانوں کی ستر خوب صورت خواتین کے ساتھ تعلقات استوار کر سکتا تھا، اس سے اس شخص کی شاطرانہ چالوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ''سوچتا دیدی'' آہ! سقوط ڈھاکا اور سانحہ پشاور غور کریں تو کتنی گہری مماثلت ہے۔ نریندر مودی سن لو! ہمیں تنہا کرنے اور بوند بوند ترسانے کی باتیں کرنے سے پہلے صرف اپنے ایک...... جی ہاں صرف ایک سکم ریپ بٹی پر توجہ دو۔ پھر یہ اپنی اخلاقیات سے عاری گفتگو دنیا والوں کو سنانا۔ صائمہ اقبال سے گزارش ہے تاریخی شخصیات کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنائیں۔ ''بڑے لوگ'' بہترین معلوماتی تحریر تھی۔ اگر امام احمد بن حنبلؒ کا تذکرہ شامل ہوتا تو تحریر مزید بہتر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان پر بادشاہ نے بہت ظلم و ستم ڈھائے۔ ''ٹرمپ کارڈ'' پڑھی۔ سرگزشت نے جس انداز سے ڈونلڈ کا تعارف کروایا، مزہ آگیا پڑھ کر۔ انسان خوبیوں اور اچھائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، بسا اوقات اس کی خامیاں شخصیت کے اعتبار سے اچھی بھی ہیں۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کی آمد ملیر کراچی سے۔ ''پھر نیا سال آپہنچا ہے جو کچھ پچھلے سال جنوری میں ہوا تھا پھر وہی دن آپہنچے گویا ہم سب کو اپنا آموختہ دہرانا ہے۔ سیاستدانوں کے بیان آنے والے ہیں کہ ہم یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے اسے اٹھائیں گے اسے بٹھائیں گے۔ حکمرانوں کے دعوے کہ ملک کو اگلی صدی کے برابر لے جائیں گے جب کہ اپوزیشن کے دعوے کہ اگلی باری ہماری ہو گی اور ہم آتے ہی عوام کے لیے دودھ اور شہد کی نہریں بہا دیں گے مختلف رسائل و جرائد کے خصوصی ایڈیشن شائع ہوں گے۔ آتشبازی کی جائے، ہیپی نیو ایئر کے پیغامات سے فون کمپنیوں کی چاندی ہو گی۔ پروڈکٹ کمپنیوں کی طرف سے نئے سال کی مبارک کے ساتھ نئی پروڈکشن کی بھرمار ہو گی جو صارفین کی جیب پر بار کا سبب بنے گی۔ لہٰذا اس سال بھی بجٹ مہینے کے ابتدائی دنوں میں وہی ختم ہو جائے گا۔ دوسری طرف ہم لوگ ہیں وہی وعدے اور دعوے جو پچھلے سال ہم نے اپنے آپ سے کیے تھے اور جو غلطیاں کوتاہیاں اگلے سال نہ کرنے کے عہد کیے تھے پھر وہی وعدے اور دعوے دہرائیں گے اور پھر وہی جنوری، فروری اور دسمبر آجائے گا نئے دعوے اور نئے دعوؤں کے ساتھ۔ سرگزشت البتہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ اپنے پچھلے سال کا کھلا احتساب کرتا ہے۔ گزرے دنوں کے ایک ایک لمحے پر نظر رکھتا ہے تحریروں کی یاددہانی کراتا ہے کس نے کتنا لکھا اس بات کو دہراتا ہے۔ شہر خیال کے لوگوں کے خطوط کا تذکرہ کرتا ہے۔ نئے سال کے آغاز پر نئے انداز اپنانے کی بات کرتا ہے اور نہ صرف بات کرتا ہے بلکہ اسے نبھاتا بھی ہے ان سب باتوں کے ساتھ آپ سب کو پچھلے سال کی طرح نیا سال مبارک! اداریہ انکل نے خوب لکھا زیڈ اے بخاری کی شرمندگی نے ہمیں بھی شرمندہ کر دیا۔ نشریاتی ادارے جو کچھ کر رہے ہیں وہ انہیں کرنے دیجیے عقل و شعور کی کمی اردو زبان کی گمنامی کا سبب بن رہی ہے مگر ہمیں مایوسی کے بجائے اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ فضاؤں میں سلیقے سے خوشبو گھول سکتے ہیں ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں جو اردو بول سکتے ہیں۔ اب آتے ہیں شہر خیال کی طرف۔ بارہواں خط شائع کرانے کی حسرت دم توڑ گئی۔ خط تو بھیجا تھا پر راستے میں کہیں کھو گیا۔ ابن کبیر نے ٹرمپ کا ایک نیا چہرہ دکھایا۔ اس چہرے میں سادگی بھی تھی بے باکی بھی تھی اور کچھ کر دکھانے کا جنون بھی نمایاں تھا اور یقیناً یہی جنون تھا کہ جس نے ٹرمپ جیسے فنکار کو امریکا کی تاریخ کا اہم ترین کردار بنا دیا۔ سلمٰی اعوان ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی اداس کر گئیں۔ شوہر کی دھتکاری اور ماں کی ممتا میں تڑپتی سوچتا دیدی کے خوابوں اور ارمانوں کی کرچیاں دلوں کو زخم زخم کر گئیں۔ سقوط مشرقی پاکستان کے المیہ نے آس و امید کی ساری پرچھائیاں ریزہ ریزہ کر دیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' دلچسپ رہی۔ ندیم بھائی آپ کا سفرنامہ اتنا شاندار ہے کہ شاید اس سے پہلے ہم نے اتنا بہتر سفرنامہ کہیں نہیں پڑھا ہو گا۔ ندیم بھائی شہباز اور سرجی پر ہاتھ تھوڑا ہلکا رکھیں کیونکہ ٹورنٹو کی رونقیں انہی کے دم سے ہیں اور شہباز اور مایا کا ملن کروا ہی دیں۔ ورنہ شہباز بے چارے کے ٹوٹے دل کو سنبھالنا آپ کے لیے بہت ہی مشکل ہو جائے گا۔ ''اللہ کی مرضی'' سلیقے سے لکھی گئی قدرت کے فیصلے بھی خوب ہوئے مگر ٹنڈ کروانے کا عظیم ترین نسخہ مسکراہٹوں سے سرشار کر گیا۔ برائی کا فیشن میں واصف حسین نے ایک اہم

نقطے کو موضوع گفتگو بنایا والدین اور بزرگ حیران بھی ہیں اور پریشان بھی مگر ہماری موجودہ نسلیں انٹرنیٹ اور موبائل کی دنیا کی دلدل میں اس قدر دھنس چکی ہیں کہ واپس پلٹنے کے سارے راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ بے حیائی اس قدر کہ عقل و شعور جیسے کہیں کھو سا گیا ہے برائی کو فیشن اور اچھائی کو ٹینشن سمجھنے والوں کا انجام شاید اسی طرح کا ہوتا ہے۔''

☆ امیر حمزہ اشرف نے بستی کوٹ رب نواز ملتان سے لکھا ہے۔ ''پہلی بار شہر خیال میں آنے کی جسارت کر رہا ہوں اُمید ہے خوش آمدید کہا جائے گا۔ معراج رسول انکل نے سرگزشت جیسا معیاری رسالہ نکال کر ہم پر ایک احسان عظیم کیا ہے جس میں ہمیں ہر رنگ کے پھول ملتے ہیں انکل اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور صحت و تندرستی سے نوازے، آمین۔ شہر خیال کے تمام دوستوں کے خطوط شوق و باقاعدگی سے ہر ماہ پڑھتا ہوں۔ باجی طاہرہ گلزار، باجی سدرہ بانو ناگوری، باجی بشریٰ افضل، باجی روبینہ ثاقب، بھائی اعجاز حسین سحار، منشی عزیز مئے، ناصر حسین رند، عمران جونانی، سیف اللہ ملک، اویس شیخ، نزاہت افشاں، عبدالجبار رومی انصاری، رانا محمد شاہد میرے فیورٹ تبصرہ نگار ہیں۔ اللہ آپ سب کو صدا سلامت رکھے، (آمین)۔ اب دسمبر کے شمارے پر ہلکا پھلکا تبصرہ بھی ہو جائے۔ معراج انکل ہمیشہ کی طرح موتی بکھیر رہے تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی ''سکندر ثانی'' پڑھی۔ سیزر جولین کا انجام بہت برا ہوا۔ منزل پر پہنچتے ہی بے چارے کو موت نے آ دبوچا۔ صائمہ اقبال کی ''دسمبر کی شخصیات'' پڑھی۔ ماہرہ خان واقعی ایک پرکشش اداکارہ ہیں۔ سچ بیانیوں میں پہلے نورین صاحبہ کی ''مرد کی غلامی'' پڑھی۔ نورین کی شرائط بہت زیادہ بے باک تھیں اس لیے کچھ کچھ ناقابل قبول تھیں میرے خیال میں۔ ''اللہ کی مرضی'' پڑھی جو بس سو سو تھی۔ انور سجاد کی ''ادھورا آدمی'' پڑھی۔ مرزا صاحب پر بہت ترس آیا۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔''

☆ غلام مرتضیٰ کا پیام فیصل آباد سے۔ ''فاتحین تو دنیا میں بہت سے گزرے ہیں مگر میرے خیال میں جتنا کچھ ''سیزر'' کے بارے میں لکھا گیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ خاص کر انگریزی فلمیں اور ان کے یادگار ڈائیلاگ اور مکالمے انسانی ذہن کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بہرحال ڈاکٹر ساجد امجد نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کے خطرناک جاسوس ''ایلی کوہن'' پر کیا تبصرہ کیا جائے! جب کہ بقول کسے شام کی زمین ہی ایسی ہے جیسی رعایا ویسے ہی حکمران۔ یہ حقیقت ہے کہ شام ہی کی زمین پر قیامت برپا ہوگی۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ محترمہ سلمٰی اعوان کی تحریر یعنی قصہ دل پذیر پڑھا اور دل بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے۔ اب اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اگر اب ہمیں ہوش نہ آیا تو پھر خدا ہی ہمارا حافظ ہے۔ اس لیے کہ حالت جوں کی توں ہے یعنی خود غرض بیورو کریسی اقتدار کے بھوکے عقل سے عاری لیڈر اس بدقسمت ملک کا مقدر ہے۔ ہاں یاد آیا ''سوہنا دیدی'' نامی یہ داستان عبرت پڑھتے وقت ہم نے جی بھر کر پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد جیسا مزہ پایا۔ خدا جانے سلمٰی اعوان نے کہاں کہاں سے انگریزی ہندی، سنسکرت، اردو ڈکشنریوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ اعجاز احمد راحیل کی کہانی ''انوکھی جیت'' مستنصر حسین تارڑ کے ڈراما ''کالاش'' کی کاپی لگ رہی تھی۔ دوسری غلطی یہ کی کہ کالاش کے لوگوں کو پٹھان قرار دیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ چترال کا ایک مشہور قدیم قبیلہ ہے۔ یہ لوگ یونانی النسل ہیں اور سکندر اعظم کی فوج کی باقیات ہیں کالاش لوگوں کی زبان ''کٹی'' کہلاتی ہے۔ ان کا فربے دین اور مذہب بیزار لوگوں کے عقائد عجیب و غریب ہیں یہاں کی آبادی چار پانچ لاکھ کے قریب تھی اب بمشکل تین چار ہزار تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پہلی سچ بیانی میں نورین کی کہانی ''مرد کی غلامی'' پڑھی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اب بھی معاشرے میں عورت کا بڑا درجہ اور مقام ہے۔ ''بڑے لوگ'' میں شیراز خان نے چند معروف ہستیوں کا ذکر کیا ہے۔ بے شک صوفیاء و مشائخ ہمارے لیے قابل احترام ہیں مگر جب آئمہ کرام نے اجتہاد کے دروازے بند کر دیے ہیں تو پھر گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟ ابن کبیر کی تحریر ''ترپ کا پتا'' امریکا کے نومنتخب صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے متعلق ہے۔ ان کی شخصیت اگرچہ متنازعہ ہے مگر آدمی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ افسوس ہمیں ہیلری کلنٹن سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ بہرحال اب کیا ہو سکتا ہے؟''

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط

ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری (بھکر)، احسان سحر (میانوالی)، قیصر عباس خان (بھکر)، سیف اللہ (ملک وال)، عبدالجبار رومی (لاہور)، ناصر حسین چیمہ (گجرات)، آصف خان (چنیوٹ)، عباس انعام (ڈیرہ غازی خان)، وکیل احمد (کراچی)، فتح خان (کوئٹہ)، انصار حسین (سرگودھا)، ابرار احمد (حیدرآباد)۔ ارشد نیاز، چیچہ وطنی۔ نغمہ یاسین، دینہ جہلم۔ فروہ حسن، لاہور۔ ابرار علی سید، مہوش ممتاز، فہد حسن صدیقی، اسلام آباد۔ کلیم اللہ، پشاور۔ نعمان بشیر، ٹیکسلا۔ کاظم علی کاظمی کوئٹہ۔ نیاز احمد، ڈی آئی خان۔ انیس حیدر، پیوا ڑپارہ چنار۔ زاہد فاروقی، حیدرآباد۔ نگار محسن، ایبٹ آباد۔ سلیم نیازی، شیخوپورہ۔ انیس نیاز ڈوٹو، میرپور آزاد کشمیر۔

اعلیٰ حضرت

ڈاکٹر ساجد امجد

ایسے وقت میں جب برصغیر پر غلامی کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ انگریزوں کی سازش تھی کہ مسلمانوں کو مزید پستی میں دھکیل دیا جائے اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو مذہب سے دور کردیا جائے، اس کے لیے ایک سازش تیار کی گئی۔ لوگوں کو ملحد بنانے کی پوری کوشش ہونے لگی، ایسے پُر آشوب دور میں بریلی شریف سے ایک دبنگ آواز اٹھی اور اندر و باہر کے دشمنوں کو سہماتی چلی گئی۔ ایک ہی وقت میں انہوں نے چومکھی مقابلہ کیا اور مذہب سے دور ہوتے مسلمانوں کو پھر سے قریب لانے کا باعث بنے۔

ربیع الاول کے مہینے کی مناسبت سے ایک اہم تحریر

بھارت کے شہر بریلی کے ایک محلہ جسولی کے اس گھر میں رات کے کھانے کا دسترخوان اٹھایا جاچکا تھا۔ عام طور پر اس وقت تک مردانہ کی بیٹھک میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بند ہوجاتا تھا لیکن اس ناوقت ملازم نے دو اشخاص کی آمد کی اطلاع دی۔ یہ دونوں حضرات اسی محلے کے تھے اور شناسا تھے اس لیے مروت نے اجازت نہ دی کہ لوٹایا جائے۔ مردانہ مکان کے دروازے کھول دیئے گئے۔ مولانا شاہ نقی علی خاں صاحب نے پاؤں میں جوتیاں ڈالیں اور مہمانوں سے ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔ ان کے والد شاہ رضا علی خاں نے تکیے پر سر رکھ دیا تھا لیکن اس خیال سے اٹھ بیٹھے کہ کتنی بے مروتی ہے کہ کوئی دروازے پر آیا ہے اور میں سو جاؤں۔ کیا خبر آنے والا کس پریشانی میں آیا ہے۔ شاید میری ضرورت پڑے۔ وہ بھی مردانہ مکان میں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر شاہ نقی علی اور دونوں مہمان اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

''حضرت آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔''

''واہ جناب! اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ گھر پر کوئی مہمان آئے اور میں استقبال نہ کروں۔''

''ہم کہاں کے مہمان۔ یہ تو ہمارا اپنا گھر ہے۔ بس شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے چلے آئے تھے۔'' ان دونوں حضرات نے مولانا شاہ نقی علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس وقت آپ کا آنا خالی از علت نہیں ہوسکتا۔ کوئی بات ضرور ہے۔''

''ہم ابھی ابھی رامپور سے آرہے ہیں۔ وہاں بڑی تشویش آمیز خبریں سنی ہیں۔''

''ضرور سنی ہوں گی۔'' مولانا شاہ رضا علی خاں نے کہا۔ ''ہندوستان کے مستقبل پر تشویش تو مجھے بھی ہے۔ مغلوں کے کمزور قدم جیسے تیسے 1856ء تک تو آگئے اس سے آگے جاتے نظر نہیں آتے۔ آپ نے دیکھا نہیں ان انگریزوں نے لکھنو کے نواب کے ساتھ کیا کیا۔ دہلی کے لال قلعے پر مغلوں کا پرچم لہرا ضرور رہا ہے لیکن حکومت تو

انگریز کررہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر تو وظیفہ خوار ہیں بادشاہ کہاں سے ہوئے۔ مذہبی حالات آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ دین اسلام میں طرح طرح کے خیالات شامل کیے جارہے ہیں۔ لوگوں نے قرآن اٹھا کر طاق میں رکھ دیا ہے۔ احادیث پر اعتراض ہورہے ہیں۔ نئے نئے فرقے سامنے آرہے ہیں۔ یہی حال رہا تو سب کے سب کرسٹان بن جائیں گے۔ انگریز پادری برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ غضب خدا کا انگریزی پھیلائی جارہی ہے۔ فارسی اور عربی سے لوگ نابلد ہوتے جارہے ہیں۔ دیہاتوں میں سادہ لوح مسلمانوں کو ورغلا کر عیسائی بنایا جارہا ہے۔ انگریز تو اب یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہندوستان پر قبضہ جمالے اور یہاں کی دولت برطانیہ منتقل کرکے ہمیں مفلس بنادے۔ ہندوؤں کا کیا ہے، وہ تو انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اب تو کسی مجدد ملت کی ضرورت ہے جو آئے اور مذہب اسلام کی حفاظت کرے۔ مجھے یقین ہے اس صدی کے مجدد کا ظہور ہونے ہی والا ہے۔ یہ آفتاب ہدایت کس آنگن میں اترے۔ غیب کا حال اللہ ہی جانتا ہے لیکن یہ ہونا ضروری ہے۔''

''آپ کی زبان اللہ مبارک کرے۔'' آنے والوں نے کہا۔ ''اس وقت تو ہم کچھ اور ہی سن کر آئے ہیں۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ انگریزوں کو ہندوستان بدر کرنے کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔''

''اب یہ ناممکن ہے۔ انگریزوں کے قدم جم چکے ہیں۔ ان کی فوج موجود ہے جو جدید سامان سے لیس ہے۔''

''رام پور میں یہ خبریں سینہ بہ سینہ چل رہی ہیں کہ ہندوستانی فوج میں بے دلی پھیل گئی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی اور بغاوت کی شکل اختیار کرلے گی۔''

''خدا کرے ایسا ہو لیکن اس کے نتیجے میں جو خون خرابہ ہوگا خدا کی پناہ۔''

''ہم تو دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔''

''کس بات کا شکریہ صاحبو۔'' مولانا محمد رضا نے فرمایا۔

''رام پور سے آتے ہوئے ہماری بیل گاڑی دلدل میں پھنس گئی تھی۔ کسی صورت نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پھر ہم نے آپ کا واسطہ دے کر اللہ سے مدد مانگی۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک بزرگ کہیں سے نمودار ہوئے اور بیل گاڑی کو دلدل سے نکال دیا۔ ہم اندھیرے میں انہیں دیکھ نہیں سکے۔''

''یہ سب اللہ کی مدد سے ہوا ہے۔''

''نہیں آپ اللہ کے ولی ہیں۔ آپ کا واسطہ ہمارے کام آگیا۔ اللہ ہم اہل محلہ پر آپ کا سایہ سلامت رکھے۔''

''اللہ سب کی سنتا ہے۔'' مولانا شاہ نقی علی خاں نے فرمایا۔ ''رات بہت ہوگئی ہے۔ اب آپ لوگ بھی اپنے اپنے گھروں پر جاکر آرام فرمائیے اور ابا حضور کو بھی آرام فرمانے دیں۔''

''ہم لوگوں نے آپ کے آرام میں خلل ڈالا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔'' مہمانوں نے قدم بوسی کی اور رخصت ہوگئے۔

یہ مہمان جس گھر سے اٹھ کر گئے تھے وہ مکان معمولی سہی لیکن خاندان معمولی نہیں تھا۔ اس خاندان کا آبائی پس منظر نہایت شاندار تھا۔ دنیاوی اعتبار سے بھی بے مثال دینی لحاظ سے بھی لاجواب۔

اس خاندان کے مورث اعلیٰ والیان قندھار (افغانستان) کے خاندان سے تھے۔ والی قندھار کے صاحبزادے سعید اللہ خاں سلاطین مغلیہ کے دور میں سلطان محمد نادر شاہ کے ہمراہ لاہور آئے تھے۔ بادشاہ دہلی کی طرف سے ان کی مہمان نوازی کا حکم ہوا اور لاہور کا ''شیش محل'' ان کی رہائش کے لیے عطا کیا گیا۔

سعید اللہ خاں شاہی مہمان نوازی سے بہلنے والے نہیں تھے۔ جانتے تھے کہ یہ مہمان نوازیاں کتنے دن چلیں گی۔ اگر ہندوستان ہی میں رہنا ہے تو اپنے مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ تلاش روزگار لاہور سے دہلی کی طرف لے آئے۔ یہاں بھی عزت و وقعت سے ہم کنار ہوئے یہ صاحب سیف تھے لہٰذا چند ہی دنوں میں فوج کے بڑے عہدے (شش ہزاری) پر فائز ہوئے اور دربار شاہی کی طرف سے ''شجاعت جنگ'' کا خطاب ملا۔

سعید اللہ خاں کے صاحبزادے سعادت یار خاں تھے جنہیں ایک بغاوت فرو کرنے کے لیے حکومت مغلیہ نے ''روہیل کھنڈ'' بھیجا۔ انہوں نے نہایت دلیری اور خوبی سے اس بغاوت کو کچل دیا۔ اس فتح یابی کے صلے میں انہیں بریلی کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔ سعادت یار خاں نے شہر بریلی کو مستقل سکونت کے لیے پسند کیا۔ اس کے بعد یہ خاندان بریلی کے سر کا تاج بن کر یہیں قیام پذیر ہوگیا۔

سعادت یار خاں عیش و فراغت کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن آپ کے صاحبزادے محمد اعظم خاں نے حکومت و وزارت کو خیر باد کہہ کر فقیری اختیار فرمالی۔ اس دن سے اس خاندان کا رنگ ڈھنگ ہی تبدیل ہو گیا۔ شاہی فقیری میں بدل گئی۔ محمد اعظم خاں حکومت وقت کی طرف سے ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے ہر عیش کو خیر باد کہا اور زہد و ریاضت میں مشغول ہو کر بریلی کے محلے ''معماران'' سے متصل ایک میدان میں ڈیرہ لگا لیا۔ یہ جگہ بعد میں ''شہزادے کا تکیہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

انہی محمد اعظم خاں کے ایک صاحبزادے حافظ کاظم علی خاں شہر بدایوں کے تحصیل دار تھے۔ دو سو سواروں کی فوج خدمت میں رہا کرتی تھی۔ حافظ کاظم علی خاں نے کوشش فرمائی تھی کہ سلطنت مغلیہ اور انگریزوں میں جو نزاع ہے وہ ختم ہو جائے۔ یہی کاظم علی خاں لکھنو کے آصف الدولہ کے یہاں وزیر بھی رہے۔ انہی کاظم علی خاں کی کئی اولادوں میں سے ایک مولانا شاہ رضا علی تھے۔ یہی وہ ہستی تھی جس کے دم قدم سے یہ خاندان مستقلاً علم فقر اور درویشی سے مشرف ہو گیا۔ آپ نے صرف 22 سال کی عمر میں جملہ متداولہ علوم کی تکمیل کر لی۔ آپ کے علم و فضل کی شہرت دور دراز مقامات تک پھیلی علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی ذات سے کئی کرامات ظہور میں آئیں۔

ایک مرتبہ آپ ہندوؤں کے تہوار ''ہولی'' کے موقع پر بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک ہندو عورت نے آپ پر رنگ ڈال دیا۔ ایک جوشیلے نوجوان نے مارنا چاہا تو آپ نے فرمایا۔ ''کیوں تشدد کرتے ہو۔ اس نے مجھے رنگا اللہ عزوجل اسے رنگے۔'' اس کلام میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ وہ عورت فوراً آپ کے قدموں میں آ گری۔ معافی مانگی اور مشرف بہ اسلام ہوئی۔

ایک مرتبہ ایک صاحب حاضر خدمت ہوئے اور آپ سے کچھ رقم قرض مانگی۔ آپ نے فرمایا دیکھو بے جا خرچ نہ کرنا۔ وہ صاحب آزاد مزاج تھے۔ رقم لے کر طوائف کے ہاں چلے گئے۔ دیکھا کہ حضرت کا عصا اور چھتری رکھی ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ صاحب الٹے پاؤں واپس آ گئے۔ دوسری طوائف کے یہاں گئے وہاں بھی یہی حال دیکھا۔ تیسری کے یہاں گئے وہاں بھی یہی حال دیکھا اب سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ اسی وقت خدمت میں حاضر ہوئے اور دل سے توبہ کی۔

ان کے بیٹے شاہ نقی علی خاں تھے۔ آپ زبردست عالم دین، کثیر التصانیف بزرگ اور بڑے پائے کے عاشق رسولؐ تھے۔

☆......☆

شاہ نقی علی خان ''تہجد'' کے لیے اٹھے تو کچھ دیر پہلے کا دیکھا ہوا خواب آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ انہوں نے کچھ دیر اس خواب پر غور کیا اور تہجد کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز کے بعد وظائف وغیرہ سے فارغ ہوئے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ والد صاحب (مولانا شاہ رضا علی خاں) بھی مسجد جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ دونوں گھر سے نکلے اور خاندانی مسجد میں نماز ادا کی۔

نماز ادا کرنے کے بعد انہوں نے والد گرامی کو مسجد ہی کے ایک گوشے میں بٹھا لیا اور رات کا دیکھا ہوا خواب گوش گزار کیا۔ والد گرامی اس خواب کو دیکھ کر کچھ دیر مسکراتے رہے پھر آپ نے اس خواب کی تعبیر فرمائی۔

''خواب مبارک ہے۔ بشارت ہو کر پروردگار عالم تمہاری پشت سے ایک ایسا فرزند صالح و سعید پیدا کرے گا جو علوم کے دریا بہائے گا اور اس کی شہرت مشرق و مغرب میں پھیلے گی۔''

یہ سن کر شاہ نقی علی خاں کی مسرت و خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ کی زوجہ اُمید سے تھیں اور ولادت کے دن قریب تھے۔ لہٰذا یہ خواب بامعنی نظر آتا تھا۔

وہ بے چینی سے انتظار فرمانے لگے کہ کب اس خواب کی تعبیر سامنے آتی ہے۔ بالآخر وہ ساعت سعید آ ہی گئی جس کا انتظار تھا۔ 10 شوال المکرم 1272ھ بمطابق 14 جون 1856ء بروز ہفتہ ظہر کے وقت ان کا گھر روشنیوں سے بھر گیا۔ وہ بچہ دنیا میں تشریف لایا جو آیندہ چل کر فکری انقلاب کا بے باک نقیب بننے والا تھا۔

اس بچے کا پیدائشی نام ''محمد'' رکھا گیا۔ والدہ ماجدہ پیار سے ''امن میاں'' فرمایا کرتی تھیں، دیگر اعزہ ''احمد میاں'' کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ دادا نے آپ کا اسم شریف احمد رضا رکھا۔ تاریخی نام المختار تھا۔

خاندان کے لوگ امتیاز و تعارف کے طور پر اپنی بول چال میں انہیں ''اعلیٰ حضرت'' کہتے تھے۔ معارف و کمالات اور فضائل میں اپنے معاصرین کے درمیان برتری کے لحاظ سے یہ لفظ اپنے ممدوح کی شخصیت پر اس طرح منطبق ہو گیا

کہ آج ملک کے عوام وخواص ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی زبان پر چڑھ گیا۔ قبول عام کی نوعیت یہاں تک پہنچ گئی کہ اعلیٰ حضرت کہے بغیر شخصیت کی تعبیر ہی مکمل نہیں ہوتی۔

اعلیٰ حضرت خود اپنے نام سے پہلے عبدالمصطفیٰ لکھا کرتے تھے۔

خوف نہ رکھ رضا ذرا تو تو ہے عبد مصطفیٰ
تیرے لیے امان ہے تیرے لیے امان ہے

شاہ نقی علی خاں نے جب اس بچے کو دادا کی گود میں ڈالا تو آپ نے فرمایا۔

''یہ میرا بیٹا عالم ہوگا۔''

یہ الفاظ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئے۔ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آپ کے ظاہری و باطنی علوم ومعارف سے ماحول پر چھائی ہوئی جہالت و نادانی الحاد و ارتداد کی تمام تاریکیاں دور ہوگئیں۔ حق وصداقت کا آفتاب جگمگا اٹھا اور اس کے انوار وتجلیات سے صرف بریلی کی سرزمین ہی نہیں ہندوسندھ، عراق وافغانستان وغیرہ کا چپہ چپہ بقعہ نور بن گیا۔

عالم الغیب نے اس بچے کا سینہ علوم ومعارف کا گنجینہ بنا کر اسے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ اس کا عرفان اس کے بڑوں کو اس وقت ہوا جب وہ گھر کے پاکیزہ ماحول میں چند برس گزارنے اور قلب وروح کو ایمان ویقین کے مقدس فکر و شعور اور پاکیزہ احساس وتخیل سے لبریز کرنے کے بعد رسم بسم اللہ کی ادائی کے لیے استاد محترم کے سامنے بیٹھا۔ اس سادہ سی تقریب میں جب استاد نے حسب دستور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد حروف تہجی آپ کو پڑھانے شروع کیے۔ استاد کے بتانے کے بعد آپ پڑھتے گئے۔ جب ''لام الف'' کی نوبت آئی۔ استاد نے فرمایا کہو ''لام الف'' تو آپ خاموش ہو گئے اور لام الف نہیں پڑھا۔ جب استاد نے زور دے کر کہا کہ پڑھو تو آپ نے فرمایا۔ یہ دونوں حروف تو میں پڑھ چکا ہوں۔ الف بھی پڑھا اور لام بھی۔ اب دوبارہ کیوں پڑھایا جارہا ہے۔ دادا جان قریب ہی بیٹھے تھے۔ انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔

''بیٹا، استاد کا کہا مانو، جو کہتے ہیں پڑھو۔''

اعلیٰ حضرت نے حکم کی تعمیل کی، لام الف پڑھا ضرور لیکن دادا کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں ہزار سوال پوشیدہ تھے۔ دادا بھی کوئی معمولی انسان نہیں تھے۔ صاحب کرامت بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنی فراس ایمانی سے بھانپ لیا کہ گویا ننھا بچہ کہہ رہا ہے کہ آج کے سبق میں تو حروف مفردہ کا بیان ہے پھر ان کے درمیان ایک مرکب لفظ کیسے آگیا۔ اگرچہ بچے کی ننھی عمر کے اعتبار سے لام کے ساتھ الف ملانے کی وجہ بیان کرنا قبل از وقت بات تھی مگر حضرت جد امجد نے نور باطنی سے ملاحظہ کیا کہ یہ لڑکا فضل ربانی سے اقلیم علم وفن کا تاجدار ہونے والا ہے لہٰذا اس کی ننھی عمر کے باوجود اس سے دقیق مسائل پر بات کی جاسکتی ہے۔ حضرت نے سمجھانا شروع کیا۔

''بیٹا! شروع میں سب سے پہلا حرف جو تم نے پڑھا ہے وہ حقیقت میں ہمزہ ہے الف نہیں ہے اور اب لام کے ساتھ جو حرف ملا کر پڑھ رہے ہو وہ الف ہے لیکن چونکہ الف ہمیشہ ساکن رہتا ہے اور ساکن حرف کو کسی طرح پڑھا نہیں جاسکتا اس لیے لام کے ساتھ الف کو ملا کر اس کا بھی تلفظ کرایا جاتا ہے۔''

اعلیٰ حضرت کا بچپن شاید اس جواب سے پوری طرح مطمئن نہ ہوا۔ پھر سوال کیا۔

اگر یہی بات تھی تو اسے کسی بھی حرف کے ساتھ ملا سکتے تھے مثلاً ب یا جیم یا دال کے ساتھ بھی ملا کر الف کا تلفظ کرایا جاسکتا تھا لیکن ان سارے حرفوں کو چھوڑ کر صرف لام کے ساتھ لام الف ملا کر اس کی ادائیگی کرائی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ لام سے الف کا خاص رشتہ کیا ہے؟

اب رسم بسم اللہ کی یہ تقریب مباحثہ کی صورت اختیار کر گئی۔ ایک بچہ جس کی ابھی رسم بسم اللہ ہو رہی تھی کسی عالم کی طرح سوال جواب کررہا تھا۔

اس کے دلائل سن کر دادا نے جوش محبت میں اس لائق پوتے کو گلے سے لگا لیا۔ دعاؤں کے ہار پہنائے پھر اس ننھے عالم کو مطمئن کرنے کے لیے دلائل کی چندنئی اشرفیاں اس کے سامنے ڈھیر کردیں۔

''بیٹا، لام اور الف کے درمیان صورت اور سیرت کے اعتبار سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ لکھنے میں دونوں کی صورت اور شکل ایک دوسرے کی طرح ہے یعنی ''لا'' اور سیرت کے اعتبار سے یوں تعلق ہے کہ لام کا قلب الف ہے اور الف کا قلب ''لام'' ہے یعنی ل ام کے بیچ میں الف اور ال ف کے بیچ میں لام۔''

بہ ظاہر یہ ایک سبق تھا جس میں اعلیٰ حضرت کے دادا نے اس الف لام کے مرکب لانے کی وجہ بیان فرمائی مگر باتوں ہی باتوں میں اسرار وحقائق، رموز واشارات کے

دریافت و ادراک کی صلاحیت بھی آپ کے قلب و دماغ میں بچپن ہی سے پیدا فرمادی۔

تعلیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ دستور کے مطابق پہلے قرآن پاک پڑھنا تھا۔ اس ابتدائی تعلیم کے لیے ایک مولوی صاحب گھر آنے لگے۔ اس تعلیم کے دوران بھی ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے سب کو یہ سوچنے کے لیے مجبور کردیا کہ یہ کوئی معمولی بچہ نہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مولوی صاحب کسی آیہ کریمہ میں بار بار ایک لفظ آپ کو بتاتے تھے مگر آپ کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ وہ "زبر" بتاتے تھے آپ "زیر" پڑھتے تھے۔ جب آپ کے دادا جان حضرت مولانا رضا علی خان نے یہ کیفیت دیکھی تو آپ کو اپنے پاس بلایا۔ "جب مولوی صاحب زبر بتا رہے ہیں تو تم زیر کیوں پڑھ رہے ہو؟"

"میرے چاہنے کے باوجود میری زبان سے "زیر" ہی نکل رہا ہے جیسے یہی صحیح ہو۔"

"مولوی صاحب تو قرآن سے دیکھ کر پڑھا رہے ہیں۔"

"جی ہاں، قرآن میں تو یہی لکھا ہے۔"

"پھر آپ پڑھتے کیوں نہیں؟"

"میں نے عرض کیا نا کہ میری زبان سے "زیر" ادا ہو رہا ہے۔"

"ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ ماجرا کیا ہے۔" مولانا رضا علی خاں نے فرمایا اور کلام پاک منگوا کر دیکھا تو اس میں کاتب نے غلطی سے "زیر" کی جگہ "زبر" لکھ دیا تھا۔ "زیر" ہی صحیح تھا جو اعلیٰ حضرت کی زبان سے نکل رہا تھا۔

حضرت جد امجد نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔ "جس طرح مولوی صاحب پڑھاتے تھے تم اس طرح کیوں نہیں پڑھتے تھے۔"

آپ نے پھر فرمایا۔ "میں تو ارادہ کرتا مگر زبان پر قابو نہ پاتا تھا۔"

حضرت جد امجد نے تبسم فرمایا اور مولوی صاحب سے فرمایا۔ "یہ بچہ صحیح پڑھ رہا تھا حقیقتاً کاتب نے غلط لکھ دیا تھا۔"

حافظہ ایسا قوی پایا تھا کہ طویل سے طویل سبق ایک مرتبہ سن کر زبانی یاد ہو جاتا۔ استاد جب سبق پڑھا چکتے تو آپ ایک دو مرتبہ کتاب دیکھ کر بند کر دیتے۔ جب سبق سنتے تو حرف بہ حرف لفظ بہ لفظ سنا دیتے۔ روزانہ یہ حالت دیکھ کر

سوانحی خاکہ

معروف لقب: اعلیٰ حضرت

اسم شریف: احمد رضا

پیدائشی نام: محمد

تاریخی نام: المختار

پیار کے نام: امن میاں، احمد میاں

تاریخ پیدائش 10 شوال 1272ھ

والد گرامی: مولانا شاہ نقی علی خان

دادا حضور: مولانا شاہ رضا علی خاں

پہلی تقریر: 1861ء

پہلی عربی تصنیف: 1868ء

آغاز فتویٰ نویسی: 1869ء

دستار فضیلت: 1869ء

شادی: 1874ء

صاحبزادے: مولانا احمد رضا خاں، مولانا محمد مصطفیٰ رضا

صاحبزادیاں: مصطفائی بیگم، کنیز حسن، کنیز حسین، کنیز حسنین، مرتضائی بیگم

مرشد گرامی: سید شاہ آل رسول مارہروی

اساتذہ کرام: مولانا شاہ نقی علی خاں، مرزا غلام قادر بیگ، مولانا عبدالعلی رام پوری، شاہ آل رسول

اساتذہ حرمین: مفتی شافعیہ احمد زین دحلان مکی، مفتی حنفیہ شیخ عبدالرحمٰن سراج مکی

وصال پر ملال: 25 صفر 1340ھ / 28 اکتوبر 1921ء

استاد کو سخت تعجب ہوا۔ ایک دن وہ اعلیٰ حضرت سے کہنے لگے۔ "احمد میاں! یہ تو بتاؤ تم آدمی ہو یا جن کہ مجھے پڑھانے میں دیر لگتی اور تم کو یاد کرتے دیر نہیں لگتی۔"

"خدا کا شکر ہے میں انسان ہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال ہے۔" آپ نے فرمایا۔

چھوٹی چھوٹی شرعی غلطی پر آپ بچپن ہی میں بلا تکلف بول دیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غلطی کی صحیح قدرت نے ان کی عادت ثانیہ بنادی تھی۔ اسباب ظاہری کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ایسے گھر میں پیدا کیا تھا جہاں قال اللہ قال الرسول ہی روز مرہ تھا اور آپ کو اس صحبت کا شوق بھی تھا۔ آپ اپنے والد ماجد کی صحبت میں زیادہ بیٹھتے اور مسائل بغور سنتے اور انہیں اپنے دماغ میں محفوظ رکھتے اور وقت پر

بڑی جرأت سے بتا دیتے کہ یہ مسئلہ یوں ہے۔
ایک دن آپ کے استاد گرامی بچوں کو تعلیم دے رہے تھے کہ ایک لڑکے نے سلام کیا۔ استاد صاحب نے جواب میں فرمایا۔ ''جیتے رہو۔''
''یہ تو جواب نہ ہوا۔'' اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ''آپ کو وعلیکم السلام کہنا چاہیے تھا۔''
اس جواب پر استاد گرامی نہایت مسرور ہوئے اور آپ کو دعاؤں سے نوازا۔
اس سن و سال میں اس جواب سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ آگے چل کر رب العزت کو آپ سے یہی کام لینا تھا۔
قدرت جب کسی کو کچھ بنانا چاہتی ہے تو اسے درسیات سے زیادہ اپنے فضل و کرم سے آشنا کرتی ہے۔ یہی حال اعلیٰ حضرت کا تھا۔ بچپن میں پیش آنے والے سیکڑوں واقعات سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت انہیں تعلیم سے آراستہ کر رہی ہے۔
عمر شریف چار سال کے قریب ہوگئی۔ آپ اپنی مسجد کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک صاحب اہل عرب کے لباس میں جلوہ فرما ہوئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا گویا عرب سے ہیں۔ انہوں نے ان سے عربی زبان میں گفتگو کی۔ یہ کم سنی اور عربی میں فصیح گفتگو جب کہ مادری زبان اردو تھی۔ عربی کی چند ابتدائی کتابیں ہی پڑھی ہوں گی۔
عمر شریف چھ سال کی تھی کہ پہلی مرتبہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ بہت بڑا مجمع آپ کے سامنے تھا اور آپ علم و عرفان کے دریا بہا رہے تھے۔ یہ تقریر کم و بیش دو گھنٹے جاری رہی۔ سامعین پر وجد طاری تھا۔ اس عمر میں عام بچے اپنے وجود سے بھی بے خبر ہوتے ہیں اور آپ علوم و معارف کے دروازے کھول رہے تھے۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایک کم سن بچہ ایسی گراں بار باتیں کر سکتا ہے۔ کہنے والے صرف اتنا کہہ سکتے تھے کہ آخر ہے کس خاندان کا چشم و چراغ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رب العالمین اپنے جس بندے کو اپنی معرفت کی دولت سے سرفراز کرنا چاہتا ہے اس کی حیات پاک کی ایک ایک گھڑی میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات عام انسانوں کے فہم و ادراک سے باہر ہوتے ہیں۔ خاصانِ خدا کے سینے علوم و معرفت کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ کیا بچپن کیا بڑھاپا۔
جب آپ نے پہلا روزہ رکھا تو روزہ کشائی کی تقریب نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ گرمی کا رمضان تھا اور اعلیٰ حضرت خورد سال تھے۔ جب دوپہر ہوئی اور سورج رنگ دکھانے لگا تو آپ کی حالت غیر ہونے لگی۔ والد ماجد انہیں آزمانے کے لیے کمرے میں لے گئے اور فیرنی کا ایک ٹھنڈا پیالہ اٹھا کر دیا۔ ''لو یہ کھالو۔''
''میرا تو روزہ ہے۔''
''بچوں کے روزے یوں ہی ہوا کرتے ہیں۔ کمرا بند ہے نہ کوئی آسکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔''
''کوئی نہیں دیکھ سکتا مگر جس کا روزہ رکھا ہے وہ تو دیکھ رہا ہے۔'' اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔
اس پر باپ آبدیدہ ہوگئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا کے عہد کو یہ بچہ کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ شاہ نقی علی خاں کمرے سے باہر آئے تو ایسے شاداں تھے جیسے اس بچے کی صورت میں انہیں ان کی بخشش کا خزانہ مل گیا ہو۔
اب انہیں اس گل تازہ کی تربیت اس انداز سے کرنی تھی کہ اس کے اندر چھپے ہوئے جوہر توانا ہو کر ظہور پذیر ہوں۔
علم حاصل کرنے کا شوق ایسا تھا کہ جمعہ کا دن جب مدرسے کی چھٹی ہوتی تھی بے چینی سے اور ٹہل ٹہل کر گزارتے تھے کہ کس طرح یہ دن گزرے اور وہ مدرسے جائیں۔ حافظے کا عالم یہ تھا کہ ایک دو مرتبہ کتاب کو پڑھتے اور پوری کتاب یاد ہو جاتی۔ اسی لیے ابتدائی منزلیں بڑی تیزی سے طے کرلیں۔
ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد مرزا غلام قادر بیگ کی خدمت میں پہنچے اور چند عربی و فارسی کتب کی تکمیل کی۔
جب عربی کی ابتدائی کتب سے فارغ ہو گئے تو تمام درسیات کی تکمیل اپنے والد ماجد سے تمام فرمائی اور کم از کم اکیس علوم پڑھے۔
علم قرآن، علم تفسیر، علم حدیث، اصول حدیث، کتب فقہ حنفی، کتب فقہ شافعی و مالکی و حنبلی، اصول فقہ، جدل مہذب، علم العقائد والکلام، علم نحو، علم صرف، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم منطق، علم مناظرہ، علم تکسیر، علم ہیئت، علم حساب، ابتدائی علم ہندسہ۔
یہ علوم تو وہ تھے جو آپ نے بالکل ابتداء میں والد ماجد سے حاصل کیے۔ بعد میں کسی استاد کی مدد کے بغیر خود اپنی کوشش سے 55 سے زیادہ علوم و فنون کی تکمیل کی۔ ان علوم میں اپنی خداداد ذہانت اور صلاحیت سے کمال حاصل کیا۔

جدید تحقیق کے مطابق ایسے تمام علوم وفنون جن پر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کو کمل عبور حاصل تھا ان کی تعداد تقریباً 71 ہے۔ ان میں سے بعض علوم تو ایسے ہیں کہ دورِ جدید کے بڑے بڑے محقق اور ماہران کے ناموں سے بھی آگاہ نہیں۔

سید ریاست علی قادری نے تو اپنے ایک مقالے میں یہ ثابت کیا ہے کہ اعلیٰ حضرت کو ایک سو پانچ علوم وفنون پر دسترس ومہارت کاملہ حاصل تھی۔

''امام احمد رضا نے ایک ہزار کے لگ بھگ کتب و رسائل تصنیف کیے جن میں ایک سو پانچ سے زیادہ علوم کو احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں کتابوں پر حواشی لکھے جو ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔'' (سید ریاست علی قادری)

ان علوم کی کثیر تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے خصوصاً اس وقت جب آپ کے اساتذہ کی تعداد بھی چھ یا سات سے زیادہ نہیں۔ پھر جتنے کمالات حاصل کیے قدرت کی دین ہی تو تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا شاہ محمد ہدایت رسول صاحب، اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں حاضر تھے دیگر علماء بھی موجود تھے کہ دنیا کی مشنریوں کی ایجاد کا تذکرہ نکل آیا۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ''بفضلہٖ تعالیٰ بارگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فقیر کو ایسی مشین عطا ہوئی ہے جس میں کسی بھی علم کا سوال کسی بھی زبان میں ڈال دیجیے چند منٹ کے بعد اس کا صحیح جواب حاصل کر لیجیے۔

''حضور! وہ مشین مجھے بھی دکھایئے۔'' مولانا ہدایت نے عرض کیا۔

''پھر کسی موقع پر دیکھ لیجیے گا۔'' اعلیٰ حضرت نے ٹالنے کے لیے کہا لیکن مولانا ہدایت مچل گئے۔ ان کے بے حد اصرار پر اعلیٰ حضرت نے اپنے انگرکھے کے بند کھولے پھر صدری اور کرتے کے بٹن کھول کر سینۂ انور کی زیارت کرائی۔ ''وہ مشین یہ ہے جس کے لیے فقیر نے کہا۔''

صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ کمالِ قدرت ہے جس نے مجھے یہ سبق پڑھائے ہیں۔

☆......☆

آٹھ سال کی عمر تھی کہ ان کی ایک تحریر نے یہ ظاہر کر دیا کہ آیندہ چل کر فتویٰ نویسی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ ہوگا۔ والد صاحب کی غیر موجودگی میں کہیں سے وراثت کا

خلفائے پاک وہند

حامد رضا خاں، مصطفیٰ رضا خاں، امجد علی اعظمی، محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا ظفر الدین بہاری، سید احمد اشرف کچھوچھوی، شاہ عبدالعلیم صدیقی، ضیاء الدین احمد مدنی، شاہ عبدالسلام جبل پوری۔ قاری بشیر الدین، عبدالباقی برہان الحق، سید سلیمان اشرف، سید محمد دیدار علی، سید احمد قادری، مولانا جمیل الرحمٰن قادری، محمد شریف محدث، مولانا محمد امام الدین کوٹلوی، حسنین رضا خان، مختار صدیقی میرٹھی، شاہ ہدایت رسول قادری، عبدالاحد پیلی بھیتی، عبدالحق پیلی بھیتی، شاہ محمد حبیب اللہ قادری وغیرہ۔

خلفائے عرب وافریقا

سید اسماعیل خلیل مکی، الشیخ اسعد بن احمد الدہان مکی، سید ابوبکر بن سالم البھارا العلوی، مولانا شیخ بکر رفیع، شیخ حنا اجمی، حسین جمال بن عبدالرحیم، حسین بن سید عبدالقادر مدنی، سالم بن عید روس علوی الحضرمی، شیخ عابد بن حسین، شیخ عبداللہ بن ابوالخیر سردار عبداللہ مکی، شیخ علی بن حسین مکی، سید علوی بن حسن الکاف الحضرمی، شیخ مامون البری المدنی، سید محمد ابراہیم مدنی، محمد بن عثمان محمد سعید بن محمد باالصبیل مفتی شافعیہ وغیرہ۔

خدام اعلیٰ حضرت

حاجی کفایت اللہ، حاجی نذیر احمد، ذکاء اللہ خاں، حاجی خدا بخش، سعید ایوب علی رضوی۔

تلامذہ

مولانا شاہ ابوالخیر غلام محمد، سید عبدالرشید، حکیم عزیز غوث، مولوی واعظ الدین، مولوی سلطان الدین سلہٹ، مولوی نور احمد بنگال، نواب مرزا طوسی، مولوی حسن رضا خاں، محمد رضا خاں، حامد رضا خاں، مولوی منور حسین، سید عبدالکریم، مولانا سید شاہ احمد اشرف، سید محمد محدث وغیرہ۔

ایک سوال آ گیا۔ آپ نے اس کا جواب تحریر فرمایا۔ جب والد صاحب تشریف لائے تو فرمایا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ امن میاں (امام احمد رضا) نے لکھا ہے۔ ان کو ابھی لکھنا نہیں چاہیے مگر ہمیں اس جیسا کوئی لکھ کر دکھائے تو ہم جانیں۔''

اس عمر میں فن نحو کی مشہور کتاب ''ہدایت النحو'' پڑھی اور خداداد علم کے زور کا یہ عالم تھا کہ اس کی شرح عربی میں لکھ ڈالی۔

دس سال کی عمر تھی کہ آپ اپنے والد سے ''مسلم الثبوت'' پڑھ رہے تھے کہ والد صاحب کا تحریر کردہ اعتراض و جواب نظر سے گزرا جو انہوں نے ''مسلم الثبوت'' پر کیا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اس اعتراض کو رفع فرمایا اور متن کی ایسی تحقیق فرمائی کہ سرے سے اعتراض ہی وارد نہ ہوتا تھا۔ جب پڑھاتے وقت والد صاحب کی نظر اعلیٰ حضرت کے لکھے ہوئے حاشیے پر پڑی تو اتنی مسرت ہوئی کہ اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور فرمایا۔ ''احمد رضا! تم مجھ سے پڑھتے نہیں ہو بلکہ پڑھاتے ہو۔''

یہی وقت تھا جب اولیائے وقت کی توجہ آپ کی طرف مرکوز ہونے لگی۔ ایک روز کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اعلیٰ حضرت کی عمر اس وقت دس برس تھی، باہر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک بزرگ فقیر منش کھڑے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ''آؤ!'' آپ تشریف لے گئے۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا۔ ''تم بہت بڑے عالم بنو گے۔''

بریلی میں ایک مجذوب ایک مسجد میں رہا کرتے تھے۔ جو کوئی ان کے پاس جاتا کم سے کم پچاس گالیاں سناتے۔ اعلیٰ حضرت کو کمسنی کے باوجود ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق ہوا۔ والد ماجد کی ممانعت تھی کہ کہیں باہر بغیر آدمی کے ساتھ لیے نہ جانا۔ ایک روز رات کے گیارہ بجے تھے کہ وہ گھر سے نکلے اور اکیلے ان کے پاس پہنچے اور فرش پر جا کر بیٹھ گئے۔ مجذوب بشیر الدین اپنے حجرے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ اعلیٰ حضرت کو بہ غور پندرہ بیس منٹ تک دیکھتے رہے آخر ان سے پوچھا۔ ''تم مولوی رضا علی کے کون ہو؟''

''میں ان کا پوتا ہوں۔'' اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

یہ سنتے ہی حجرے سے باہر آئے۔ فرش سے اٹھایا اور چارپائی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ ''آپ یہاں تشریف رکھیے۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا مقدمہ لے کر آئے ہو۔''

''میں صرف دعائے مغفرت کے لیے آیا ہوں۔''

وہ قریب آدھے گھنٹے تک برابر کہتے رہے اللہ کرم کرے، اللہ کرم کرے، اللہ رحم کرے، اللہ رحم کرے۔

تیرہ برس کی عمر میں دستار فضیلت سے نوازے گئے۔ اسی سال منصب افتا (فتویٰ نویسی) عطا ہوا۔ یعنی اب وہ فتویٰ لکھ سکتے تھے۔ یہ اس کم سنی میں ان کی قابلیت کا اعتراف تھا۔ عمر کم تھی۔ جسم بھی ایسا دبلا پتلا تھا کہ عمر سے بھی کم معلوم ہوتے تھے۔ کوئی شخص دیکھتا تو مشکل ہی سے یقین کرتا کہ صاحبزادے فتویٰ نویسی کرتے ہوں گے کیونکہ فتویٰ وہی جاری کر سکتا ہے جو کم از کم فقہ و حدیث سے بخوبی واقف ہو۔ آپ کی عمر مبارک دیکھ کر کوئی مشکل ہی سے یقین کر سکتا تھا کہ یہ بظاہر طالب علم فتویٰ دینے کا اہل ہے۔ پہلی نظر میں لوگ دھوکا کھا جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص رامپور سے حضرت اقدس مولانا نقی علی خاں کی شہرت سن کر بریلی آیا اور رامپور کے مولانا ارشاد حسن کا فتویٰ جس پر اکثر علماء کے دستخط تھے، پیش خدمت کیا۔ مولانا نقی علی خاں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''کمرے میں مولوی صاحب ہیں ان کو دے دیجیے جواب لکھ دیں گے۔''

وہ شخص کمرے میں گیا ضرور لیکن فوراً ہی باہر آ گیا۔

''کمرے میں مولوی صاحب تو نہیں ہیں فقط ایک صاحبزادے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

''انہی کو دے دیجیے وہ لکھ دیں گے۔''

''حضرت وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں تو جناب کا شہرہ سن کر حاضر ہوا تھا۔''

''آج کل وہی فتویٰ لکھا کرتے ہیں۔ وہی لکھیں گے۔''

مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ شخص کمرے میں گیا اور یہ فتویٰ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت نے جو اس فتوے کو دیکھا تو ٹھیک نہ تھا۔ آپ نے اس جواب کے خلاف جواب تحریر فرما کر اپنے والد ماجد کی خدمت میں پیش کیا۔ والد نے بھی ان کے لکھے ہوئے جواب کی تصدیق کر دی۔

وہ صاحب اس فتوے کو لے کر رامپور پہنچے (یہ فتویٰ دراصل نواب آف رام پور ہی کی طرف سے تصدیق کے لیے بھیجا گیا تھا)۔ جب نواب رام پور نواب کلب علی خاں کی نظر سے یہ فتویٰ گزرا تو شروع سے آخر تک اسے پڑھا اور مولانا ارشاد حسین صاحب کو بلا لیا۔ ''ذرا یہ فتویٰ تو ملاحظہ

کیجیے۔ اس میں آپ کی رائے سے اختلاف کیا گیا ہے اور بریلی سے آیا ہے۔''

مولانا ارشاد حسین نے جواب ملاحظہ کیا اور بے اختیار کہہ اٹھے۔ ''سبحان اللہ! وہی حکم صحیح ہے جو بریلی سے آیا ہے۔ میں غلطی پر تھا۔''

''آپ کیسے غلطی پر تھے لیکن اتنے علماء نے آپ کے جواب کی تصدیق کس طرح کردی۔''

''ان حضرات نے مجھ پر میری شہرت کی وجہ سے اعتماد کیا اور میرے فتوے کی تصدیق کردی۔ ورنہ حق تو وہی ہے جو مولانا احمد رضا نے لکھا۔''

اس شخص کے علم وفضل کا میں قائل ہوگیا جو آپ کی شہرت سے مرعوب نہ ہوا اور بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کردیا۔

نواب صاحب کو شوق ہوا کہ ایسے عالم شخص سے ملاقات کی جائے۔ انہوں نے کسی ذریعے سے اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلوی کو طلب کرلیا۔ بریلی سے رام پور دور ہی کتنا تھا۔ اعلیٰ حضرت رام پور پہنچے اور نواب صاحب سے ملاقات کے لیے گئے۔ نواب صاحب نے مولانا احمد رضا خاں کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرلیا تھا۔ ان کے علم وفضل کو سامنے رکھتے ہوئے ایک بھاری بھرکم شخصیت کا تصور ابھرا تھا لیکن جب انہوں نے ایک دبلے پتلے لڑکے کو اپنے سامنے دیکھا تو سخت حیرت ہوئی۔ سادہ وضع، چوڑی مہری کا پاجاما، ململ کا چھوٹا کرتہ، معمولی ٹوپی۔ یہ تھے احمد رضا خاں بریلوی۔

''ہم نے تو مولانا احمد رضا خاں کو طلب کیا تھا۔''

''احمد رضا میں ہی ہوں۔''

''کیا واقعی، اگر آپ ہیں تو تشریف رکھیے۔'' نواب کلب علی خاں نے سونا جڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''سونے کا استعمال مرد کو حرام ہے۔'' اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

یہ سن کر نواب صاحب کچھ خفیف سے ہوگئے اور اپنے پلنگ پر بٹھالیا اور نہایت لطف ومحبت سے باتیں کرنے لگے۔ دوران گفتگو نواب صاحب نے مشورہ دیا کہ ماشاء اللہ آپ فقہ ودینیات میں بہت کمال رکھتے ہیں۔ بہتر ہو کہ مولانا عبدالحق خیرآبادی (مولانا شاہ فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے) سے منطق کی اوپر کی کتابیں پڑھ لیں۔

آپ نے فرمایا۔ ''والد ماجد نے اجازت دی تو آپ کے حکم کی ضرور تعمیل کروں گا۔''

اتفاقِ وقت کہ گفتگو کے دوران ہی مولانا عبدالحق بھی تشریف لے آئے۔ نواب صاحب نے ان سے اعلیٰ حضرت کا تعارف کرایا اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''میں نے مولانا احمد رضا خاں کو مشورہ دیا ہے کہ آپ سے منطق کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں تو تیار ہوں۔ ان سے پوچھ لیں بلکہ ٹھہریے میں خود پوچھ لیتا ہوں۔'' مولانا عبدالحق نے اعلیٰ حضرت کو مخاطب کیا۔ ''کیوں جناب منطق کی کتابیں کہاں تک پڑھی ہیں؟''

''قاضی مبارک تک۔'' اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

''شرح تہذیب پڑھ چکے ہیں؟'' مولانا عبدالحق نے طنزیہ انداز میں پوچھا کیونکہ اعلیٰ حضرت کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ منطق قاضی مبارک تک پڑھی ہوگی۔

''کیا آپ کے یہاں قاضی مبارک کے بعد شرح تہذیب پڑھائی جاتی ہے؟'' اعلیٰ حضرت نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

یہ جواب سن کر مولانا عبدالحق نے خیال کیا کہ ہاں یہ بھی کچھ ہیں۔ اس لیے اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسرا سوال کیا۔ ''بریلی میں آپ کا کیا شغل ہے؟''

''تدریس، افتا، تصنیف۔''

''کس فن میں تصنیف کرتے ہیں؟''

''جس مسئلہ دینی میں ضرورت دیکھی۔''

دوران گفتگو کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ اعلیٰ حضرت کبیدہ خاطر ہوگئے۔ مولانا عبدالحق بھی سمجھ گئے کہ کس سے پالا پڑا ہے۔

''اگر ایسی حاضر جوابی میرے مقابلے میں رہی تو مجھ سے پڑھنا نہیں ہوسکتا۔''

''آپ کی باتیں سن کر میں نے پہلے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ ایسے شخص سے منطق پڑھنی علمائے اہل سنت کی توہین ہوگی لہٰذا اسی وقت آپ سے پڑھنے کا خیال رد کردیا تھا۔ اسی لیے آپ کی بات کا ایسا جواب دیا تھا۔''

☆......☆

بریلی میں ان دنوں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ دیوبند اور گنگوہ کے مدارس کی بڑی شہرت تھی۔ یہاں سے فارغ ہونے

والے طلبہ کے ذریعے ان کے مذہبی عقائد نہایت تیزی سے پھیل رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے محسوس کیا کہ ایسے طلبہ بریلی میں بھی تیار ہوں جو ان کے خاص عقائد کے محافظ ہوں۔ باقاعدہ مدرسہ قائم کرنے کی سکت نہیں تھی یا اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ انہوں نے مسجد ہی کو مدرسہ بنایا اور تدریس کا آغاز کردیا۔ بریلی میں ان کے علم و فضل کی ایسی شہرت تھی کہ صاحبانِ علم اور مشتاقان تعلیم جوق در جوق خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ یہ شہرت ایسی بڑھی کہ دور دور سے طلبہ دوسرے مدرسوں کو چھوڑ کر یہاں حاضر ہوتے اور اس چشمہ علم و نظر سے فیض یاب ہوتے۔ ایک دن تین طالب علم نئے آئے اور اعلیٰ حضرت سے پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ان طالب علموں کی ملاقات مولوی محمد شاہ خاں سے ہوئی کہ ان کے توسط سے اعلیٰ حضرت تک پہنچ سکیں۔

''آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟ اس سے پہلے کہاں پڑھتے تھے؟'' مولانا محمد شاہ خاں نے پوچھا۔

''کچھ دن دیو بند میں رہے پھر گنگوہ چلے گئے اور اب یہاں آئے ہیں۔''

''اکثر لائق طلبہ بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک جگہ جم کر نہیں پڑھتے لیکن یہ عموماً ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں کی تعریف انسان سنتا ہے۔ جن جگہوں کا آپ نے نام لیا وہ بڑے مدارس ہیں۔ ہر فن کے علماء وہاں موجود ہیں۔ پھر آپ کو بریلی کا خیال کیوں آیا؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ان طلبہ نے کہا۔ ''اختلاف مذہب و اختلاف خیال کی وجہ سے اکثر تو بریلی کی برائی ہی ہوا کرتی تھی مگر یہ بھی کہا جاتا تھا کہ احمد رضا خاں قلم کے بادشاہ ہیں۔ جس مسئلے پر قلم اٹھا دیا پھر کسی کی مجال نہیں کہ ان کے خلاف کچھ لکھ سکے۔ یہی دیو بند میں سنا یہی گنگوہ میں۔ یہ باتیں سن سن کر ہمارے دلوں میں شوق ہوا کہ وہیں چل کر علم حاصل کرنا چاہیے جس کی گواہی مخالفین بھی دیتے ہیں۔''

اعلیٰ حضرت نہایت خاموشی سے ایسے سپاہی تیار کرتے رہے جو ان کے خیالات کی تبلیغ کا باعث بن سکتے تھے۔

درس و تدریس کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ شاہ نقی علی خاں کا رام پور جانا ہوا۔ وہ جب بھی رام پور جاتے تھے شیخ فضل حسین کے گھر ٹھہرتے تھے جہاں ان کی بہن بیاہی گئی تھیں۔ شیخ فضل حسین صاحب رام پور کے ڈاک خانے میں اعلیٰ افسر تھے۔ نہایت اثر و رسوخ کے آدمی تھے اور نواب صاحب کے مقربین میں سے تھے۔

شاہ نقی علی خاں ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی شیخ فضل حسین کے مہمان بنے۔ ان کی بیٹی ارشاد بیگم پر نظر پڑتی ہی رہتی تھی لیکن اس مرتبہ اسے دیکھ کر اپنے بیٹے احمد رضا کا خیال آیا۔ یہ لڑکی صورت کی بھی پاکیزہ ہے، عبادت گزار اور خدمت گزار بھی ہے اگر امن میاں کی شادی اس لڑکی سے ہو جائے؟ یہ خیال آتے ہی انہوں نے شیخ فضل حسین پر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ شیخ صاحب کی تو جیسے دلی مراد پوری ہو گئی ہو۔

''بھائی صاحب! اس سے زیادہ خوش قسمتی میری اور کیا ہو گی ہماری قرابت داری بھی ہے۔ امن میاں کے علم و فضل کا بھی قائل... ہوں۔ میری ارشاد آپ کی ہے جب چاہیں آکر لے جائیں۔''

''یہ تو میرا خیال تھا۔'' شاہ نقی علی خاں نے کہا۔ ''میں امن میاں کی والدہ سے اور تذکرہ کردوں۔ وہ مخالفت تو نہیں کریں گی لیکن پھر بھی بتانا ضروری ہے۔ ہم باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گے۔''

''بے شک! میرے دروازے آپ پر ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔''

شاہ نقی علی خاں بریلی واپس چلے گئے۔ بریلی پہنچ کر انہوں نے امن میاں کی والدہ سے ذکر کیا۔ دوسرے رشتہ داروں کی رائے لی۔ احمد رضا خاں کی مرضی بھی پوچھنی ضروری تھی۔ وہ باپ کی کسی رائے سے اختلاف کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے فوراً سر جھکا دیا۔

''آپ جہاں فرمائیں گے میں شادی کرلوں گا لیکن میری ایک شرط ہے۔ آج کل شادی بیاہوں میں ہندوانہ رسوم کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے۔ میں چاہوں گا یہ شادی نہایت سادگی سے ہو۔ کوئی بات شریعت مطہرہ کے خلاف نہ ہو۔ میں نہ صرف اس کی پاسداری اپنے گھر میں کروں گا بلکہ پھوپا جان سے بھی چاہوں گا کہ وہ اپنے گھر میں بھی کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں خصوصاً ناچ گانے کو تو میں بہت ہی برا سمجھتا ہوں۔''

''مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ تمہارا یہ پیغام تمہاری سسرال والوں تک پہنچا دیا جائے گا۔''

شیخ فضل حسین کو بھی معلوم تھا کہ وہ کسے اپنا داماد بنا

رہے ہیں لہٰذا انہوں نے اس پیغام کو خوش دلی سے قبول کیا اور اس شادی میں کوئی بات شریعت مطہرہ کے خلاف نہ ہونے دی۔

☆......☆

1294ھ جمادی الاخریٰ کا واقعہ ہے کہ ایک روز اعلیٰ حضرت شب بسری کے لیے بستر استراحت پر تشریف لے گئے تھے کہ نہ جانے کس خیال سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایسی بے اختیاری ہوئی کہ ہچکی بندھ گئی۔ روتے روتے سو گئے تو خواب میں دیکھا کہ آپ کے جد امجد حضرت مولانا شاہ رضا علی خاں صاحب تشریف لائے۔ ایک صندوقچی عطا فرمائی اور فرمایا عنقریب وہ شخص آنے والا ہے جو تمہارے درد دل کی دوا کرے گا۔

اشارہ واضح تھا لیکن مبہم بھی تھا۔ کون شخص آئے گا اور کس درجہ دل کی دوا عطا کرے گا کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ اسی بے چینی اور انتظار میں کئی دن گزر گئے کہ ایک روز محبّ رسول حضرت مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی تشریف لائے۔ دوران گفتگو بیعت وخلافت کا تذکرہ بھی نکل آیا۔

''آپ کے علم وفضل کا تو بہت چرچا ہے۔ آپ کسی سے بیعت بھی ہوئے ہیں؟'' مولانا عبدالقادر نے دریافت کیا۔

''دل میں تمنا ضرور ہے لیکن ایسا ہاتھ بھی تو ملے جس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دوں۔''

''دنیا نیک بندوں سے خالی نہیں ہے۔ کیا آپ نے خاتم الاکابر حضرت سیدنا مخدوم سید شاہ آلِ رسول قادری برکاتی کا اسم مبارک نہیں سنا؟''

''مجھ تک یہ نام پہنچا تو ہے لیکن ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔''

''مرشد گرامی مادرزاد ولی ہیں۔ عالم فاضل فقیہہ اور محدث ہیں۔ کامل صوفی بزرگ۔ آپ کے شایان شان ایسے ہی کامل بزرگ کی ضرورت ہے۔''

''آپ نے کچھ اس انداز سے تعریف فرمائی ہے کہ سید شاہ آلِ رسول اور مارہرہ کے بارے میں کچھ اور جاننے کی آرزو مچلنے لگی۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ''مجھے جو کچھ معلوم ہے گوش گزار کیے دیتا ہوں۔'' مولانا عبدالقادر نے فرمایا۔ ''مارہرہ شریف کے بارے میں کچھ عرض کیے دیتا ہوں۔ مارہرہ مطہرہ کے سادات کرام حضرت سیدنا زید شہیدؓ سے رشتہ نسب رکھتے ہیں۔ حضرت زید شہید، حضرت امام

چند یادگار سنین

پہلی عربی تصنیف: 1868ء

پہلی اردو تصنیف: 1877ء

پہلی فارسی تصنیف: 1882ء

علمائے ہند کی طرف سے خطاب

مجدد مائۃ حاضرہ: 1900ء

تاسیس دارالعلوم منظر اسلام بریلی: 1904ء

کراچی آمد: 1906ء

کنزالایمان (ترجمہ قرآن): 1912ء

نیوٹن اور آئن اسٹائن کے نظریات کے خلاف تحقیق: 1919ء

علامہ اقبال کا خراجِ عقیدت: 1932ء

ایک مکتوب اعلیٰ حضرت

برادرم مولانا عرفان علی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولیٰ تعالیٰ آپ کے ایمان، آبرو، جان ومال کی حفاظت فرمائے۔ بعد عشاء 111 بار طفیل حضرت دستگیر دشمن ہوئے، زیر پڑھا کیجیے۔ اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ آپ کے والد ماجد کو مولیٰ تعالیٰ سلامت باکرامت رکھے۔ ان سے فقیر کا سلام کہیے۔ یہی عمل وہ بھی پڑھیں۔ نیز آپ دونوں صاحب ہر نماز کے بعد ایک بار آیۃ الکرسی اور علاوہ نمازوں کے ایک ایک بار صبح وشام سوتے وقت بھی آیۃ الکرسی پڑھ لیجیے۔ ہر بلا سے حفاظت رہے گی۔

دوپہر ڈھلے سے سورج ڈوبنے تک شام ہے اور آدھی رات ڈھلے سے سورج چمکنے تک صبح۔ اس بیچ میں ایک ایک بار علاوہ نمازوں کے ہوجایا کرے اور ایک بار سوتے وقت۔ آپ کے والد ماجد کو سلام۔

فقیر احمد رضا قادری عفی عنہ

5 ذی الحجہ 39ھ

زین العابدینؒ کے بڑے چہیتے فقیہہ، شجاع اور صاحب بصیرت شہزادے تھے۔ آپ کی اولاد میں سے حضرت سید حسین نے افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان کا رخ کیا اور قصبہ بلگرام کو اپنے قدموں سے آباد کیا۔ آپ کی اولاد میں سے حضرت سیدنا میر عبدالواحد بلگرامی بڑے مشہور بزرگ ہیں۔ بلگرامی بزرگوں میں سب سے پہلے آپ کا مارہرہ مطہرہ سے گزر ہوا جب کہ آپ اپنے پیر و مرشد کی زیارت کے لیے سکندر آباد تشریف لے جا رہے تھے۔

مارہرہ مطہرہ کی خاک رہروان عشق کے لیے ہمیشہ پُرکشش رہی۔ اس کا محل وقوع ہی ایسا ہے کہ دلکشی آپ ہی اس پر فدا ہوا چاہتی ہے۔ گنگا اور جمنا کے درمیان اس دوآبہ میں قدرت نے ایسی زرخیزی رکھی ہے کہ ہر سمت ہریالی نظر آتی ہے۔ یہاں کے پھل اور آم اور بیر دور دور تک شہرت رکھتے ہیں۔

یہ نہایت پُرسکون علاقہ ہے اور یادِالٰہی کے واسطے بہت موزوں ہے۔

سید شاہ آلِ رسول مارہروی کا خمیر اسی خاک سے اٹھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت اپنے والد سیدنا شاہ آلِ برکات کی آغوشِ شفقت میں ہوئی اور انہی کی نگرانی میں نشوونما ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حضرت عین الحق شاہ عبدالمجید بدایونی اور حضرت سلامت اللہ کشفی بدایونی سے خانقاہ برکاتیہ میں حاصل کی بعد ازاں فرنگی محل کے علماء مولانا انوار احمد، مولانا عبدالواسع اور مولانا شاہ نورالحق سے کتب معقولات، علم کلام فقہ و اصول فقہ کی تکمیل فرمائی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے درس حدیث میں بھی شریک ہوئے۔

حضرت کو خلافت و اجازت حضور سید آلِ احمد (اپنے تایا جان) سے تھی۔ والد ماجد نے بھی اجازت فرمائی تھی۔ آپ کا شمار اس صدی کے اکابر اولیاء میں سے ہے۔

"آپ ولی اللہ ہیں تو آپ کی ذات سے کرامات بھی ظہور میں آئی ہوں گی۔ ذرا اس کے بارے میں بھی بتائیے تاکہ میرا شوق فزوں تر ہو۔"

"آپ کی ذات سے کئی کرامات منسوب ہیں صرف ایک کا ذکر کیے دیتا ہوں اگر آپ حضرت سے منسوب ہو گئے تو باقی آپ خود مشاہدہ کر لیجیے گا۔"

مولانا شاہ عبدالقادر نے شاہ آلِ رسول کی ایک کرامت بیان فرمائی۔

"بدایوں کے ایک صاحب جو آپ کے مرید خاص تھے۔ وہ ایک مرتبہ سوچنے لگے کہ معراج شریف چند لمحوں میں کس طرح ہو گئی۔ آپ اس وقت وضو فرما رہے تھے۔ فوراً اس سے کہا، میاں ذرا اندر سے تولیہ تو لاؤ۔ موصوف جب اندر گئے تو ایک کھڑکی نظر آئی۔ اس جانب نگاہ دوڑائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پُرفضا باغ ہے۔ یہاں تک کہ اس میں سیر کرتے ہوئے ایک عظیم الشان شہر میں پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے کاروبار شروع کر دیا۔ شادی بھی کی اولاد بھی ہوئی۔ یہاں تک کہ بیس سال کا عرصہ گزر گیا۔ جب اچانک حضرت نے آواز دی تو گھبرا کر کھڑکی میں آئے اور تولیہ لیے ہوئے دوڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ابھی وضو کے قطرات حضرت کے چہرے پر موجود ہیں۔ دست مبارک بھی تر ہے وہ انتہائی حیران ہوئے آپ نے تبسم آمیز لہجے میں فرمایا۔ میاں وہاں بیس برس رہے اور شادی بھی کی اور یہاں ابھی تک وضو خشک نہیں ہوا۔ اب تو معراج کی حقیقت سمجھ گئے ہو گے۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد مولانا عبدالقادر بدایونی نے فرمایا۔ "یہ ہے شاہ آلِ رسولؒ کی شانِ مبارک۔ اب تو یقین ہے آپ بیعت کے لیے مارہرہ تشریف لے چلیں گے۔ ایک ولی کا ہاتھ دوسرے ولی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔"

یہ واقعات سن کر اعلیٰ حضرت بے تاب ہو گئے اور مارہرہ چلنے کی ضد کرنے لگے۔ چند روز کی تیاری کے بعد مولانا بدایونی اور والد گرامی کے ہمراہ مارہرہ تشریف لے گئے۔

سفر کی گرد سے کپڑے اٹے ہوئے تھے۔ اسٹیشن پر اترتے ہی اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ "مرشد کامل کی خوشبو آ رہی ہے۔" بے تابی ضرور تھی لیکن اس حالت میں مرشد کے حضور پہنچنا بھی بے ادبی تھی۔ اس لیے قریبی سرائے میں ٹھہر گئے۔ کچھ دیر تھکن اتاری، پھر نہا دھو کر کپڑے پہنے اور خانقاہ برکاتیہ پہنچ گئے ادھر بھی چشم طریقت تمام تیاریوں سے باخبر بھی سید آلِ رسول صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا۔ "ہم تو کئی روز سے انتظار کر رہے تھے۔"

اسی وقت بیعت فرمائی اور اسی وقت تمام سلاسل کی اجازت بھی عطا فرما دی اور خلافت بھی بخش دی۔ نیز جو عطیات سلف سے چلے آ رہے تھے وہ سب بھی عطا فرما دیے اور ایک صندوقچی جو وظیفہ کی صندوقچی کے نام سے منسوب تھی عطا فرمائی۔

ان عنایات کو دیکھ کر اعلیٰ حضرت کو اپنا خواب یاد آ گیا

جس میں جدِامجد نے ایک صندوقچی دیتے ہوئے فرمایا تھا عنقریب وہ شخص آنے والا ہے جو تمہارے دردِ دل کی دعا عطا کرے گا۔

یہ عنایات دیکھ کر مریدین کو جو حاضر تھے تعجب ہوا۔ حضرت کے پوتے نے فرمایا۔ ''دادا حضور! بائیس سال کے ان صاحبزادے پر یہ کرم کیوں ہوا جب کہ آپ کے ہاں خلافت و اجازت اتنی عام نہیں۔ برسوں آپ ریاضتیں کراتے ہیں۔ منزلیں طے کراتے ہیں۔ تب جا کر ایک یا دو سلاسل کی اجازت فرماتے ہیں۔''

مرشد کامل نے فرمایا۔ ''اے لوگو! احمد رضا کو کیا جانو۔ میں متفکر تھا کہ اگر قیامت کے دن رب العزت نے پوچھا کہ آلِ رسول تو دنیا سے میرے لیے کیا لایا تو میں احمد رضا کو پیش کردوں گا۔ دوسرے لوگ جو آتے ہیں وہ اپنے قلوب کو زنگ آلود لے کر آتے ہیں۔ ان کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ یہ اپنے قلب کو مجلیٰ و مصفا لے کر آئے تھے۔ ان کو تو صرف نسبت کی ضرورت تھی۔''

جب مریدین مطمئن ہوگئے تو اس سے بھی بڑی نعمت محبت کی تھالی میں رکھ کر عنایت کردی۔

میری اور میرے مشائخ کی تمام تصانیف مطبوعہ غیر مطبوعہ جب تک مولانا احمد رضا کو نہ دکھالی جائیں شائع نہ کی جائیں جس کو یہ بتائیں کہ چھپے وہی چھاپی جائے جو عبارت یہ بڑھادیں وہ میری اور میرے مشائخ کی جانب سے بڑھی ہوئی سمجھی جائے اور جس عبارت کو کاٹ دیں وہ کٹی ہوئی سمجھی جائے۔

اس کے بعد دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ جب اعلیٰ حضرت مرشد گرامی کے ساتھ خانقاہ کے دروازۂ سنگینی سے برآمد ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت شاہ آلِ رسول مارہروی عنفوان شباب میں رونق افروز ہیں۔ فقط داڑھی کی سفیدی اور سیاہی سے شاہ آلِ رسول اور مولانا احمد رضا خاں میں امتیاز کیا جاسکے۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ مرشد گرامی نے ''توجہ تشبیہی'' سے بھی سرفراز کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت کی عمر صرف بائیس سال تھی لیکن ان کا قلب مبارک ایسا روشن ہو چکا تھا کہ بارگاہ عالی میں ایسی عزت افزائی ہوئی۔ ایک تو فوراً خلافت عطا کی گئی دوسرا امتیاز یہ ملا کہ روزِ قیامت اپنی کمائی پیش کرنے کا موقع آیا تو فرمایا احمد رضا کو پیش کروں گا۔

اعلیٰ حضرت نے بھی اس مریدی کی ایسی لاج رکھی، عقیدت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ کسی مرید نے کیا کیا ہوگا۔ جب بھی مارہرہ جانا ہوتا تو اسٹیشن سے خانقاہ برکاتیہ تک پیدل تشریف لے جاتے۔ صرف مرشد کا ہی نہیں مرشد کے گھرانے کے دیگر افراد کا بھی بہت ادب کیا کرتے۔ جب بھی سجادہ نشین مارہرہ شریف ''بریلی'' آتے یا ان کی گاڑی اسٹیشن سے گزرتی تو آپ خود چل کر اسٹیشن پر انہیں ملنے کے لیے جاتے۔

مرشد کامل سیدنا شاہ آل رسول مارہروی کے ذریعے اعلیٰ حضرت کو محبوب سبحانی، قطب ربانی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی غلامی و نسبت کا شرف حاصل ہوا۔ اسی نسبت غلامی کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ اپنی ہر مشکل میں غوث پاک ہی کو پکارا کرتے اور ان سے مدد طلب کیا کرتے۔

شیر ربانی حضرت پیر روشن ضمیر میاں شیر محمد شرقپوری نقشبندی کو ایک مرتبہ شہنشاہ بغداد سرکار غوث اعظم کی خواب میں زیارت ہوئی۔ انہوں نے پوچھا حضور! اس وقت دنیا میں آپ کا نائب کون ہے تو فرمایا کہ احمد رضا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے صبح ہی سے سفر کی تیاری شروع کردی۔ مریدوں نے عرض کیا حضور ہم کو بھی اجازت ہو تو ہم بھی چلیں اور ان کی زیارت کریں۔ آپ نے اجازت فرمائی۔

یہاں بریلی میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ آج شیخ پنجاب تشریف لا رہے ہیں۔ اوپر والے کمرے میں ان کے قیام کا انتظام کیا جائے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ اس وقت ہوا جب مولانا شاہ خواجہ احمد حسین نقشبندی مجددی امروہوی کو سرکار غوثیت سے اشارہ ہوا کہ مولانا شاہ احمد رضا خاں سے ملاقات کیجیے۔ لہٰذا حضرت خواجہ احمد حسین ملاقات کے لیے بریلی پہنچے۔

خواص ہی نہیں عوام کو بھی بارہا اعلیٰ حضرت کے مقام کے بارے میں سرکار غوث کی طرف سے اشارے ملتے رہے۔

بریلی کے اسٹیشن پر ایک سرحدی پٹھان کہیں سے اترا۔ متصل ہی نوری مسجد میں اس نے صبح کی نماز ادا کی۔ نماز سے فراغت کے بعد اس نے جاتے ہوئے نمازیوں کو روک کر پوچھا۔ ''یہاں مولانا احمد رضا خان نامی کوئی بزرگ رہتے ہیں؟ ان کا پتا بتادیجیے۔''

ایک شخص نے جواب دیا۔ ''یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر سوداگران نامی ایک محلہ ہے وہیں رہتے ہیں۔ کسی سے بھی پوچھ لینا۔''

پٹھان اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اسی نمازی نے سوال کیا۔
''کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''
اس پٹھان نے جواب دیا۔ ''سرحد کے قبائلی علاقے سے میرا تعلق ہے۔ وہیں پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں جہاں میرا آبائی گھر ہے۔''
''آپ مولانا احمد رضا خاں کی تلاش میں کیوں آئے ہیں؟''
اس سوال پر اس کے جذبات کے ہیجان کا عالم قابل دید تھا۔ آبدیدہ ہو گیا۔ ''یہ سوال نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔'' کہہ کر خاموش ہو گیا۔
اس پُراسرار جواب سے پوچھنے والوں کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ جب لوگ زیادہ مصر ہوئے تو اس نے بتایا۔ ''میں نے گزشتہ شب جمعہ کو نیم بیداری کی حالت میں ایک خواب دیکھا جس کی لذت میں کبھی نہیں بھولوں گا اس دن سے میں اس مردِ مومن کی زیارت کے لیے بے تاب ہو گیا ہوں۔''
یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا محلہ سوداگران کی طرف چل دیا۔

☆......☆

ایک مرتبہ ایک صاحب مرید ہونے کے لیے حاضر ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے بہ طریقہ بیعت اپنے روبرو دوزانو بٹھایا اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے دست حق پرست پر لے کر کلمات بیعت تلقین فرمانا شروع کیے۔ جس وقت یہ الفاظ کہلوانا چاہے کہ ''میں نے اپنا ہاتھ حضور پُرنور سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے دست حق پرست میں دیا۔'' تو مرید نے ان الفاظ کے بجائے یہ کہا۔ ''میں نے اپنا ہاتھ اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا احمد رضا خاں کے دست حق پرست پر دیا۔''
اعلیٰ حضرت نے پھر حضرت بڑے پیر صاحب کا اسم گرامی لیا لیکن مرید نے پھر اعلیٰ حضرت کا نام لیا۔ آپ نے تیسری بار سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہمارے اکابر کا یہی طریقہ کار ہے۔ یونہی کہتے ہیں۔ مرید نے کہا یہ تو خلاف واقعہ ہوگا اور پھر اعلیٰ حضرت ہی کا نام لیا۔ اس وقت اعلیٰ حضرت کے چہرے پر جلال نمایاں ہوا۔ آپ نے آنکھیں بند کر کے کچھ لبوں کو جنبش دی اور دست راست اپنی ران پر مارا اور اس ہاتھ کی پشت ان صاحب کے سینے پر ماری۔ سینے پر ضرب پڑتے ہی وہ چت گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے اور اعلیٰ حضرت کھڑے ہو کر ٹہلنے لگے اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھتے رہے۔ بہت دیر تک یہی منظر رہا۔ اس کے بعد آپ نے مسجد کی فصیل سے لوٹا اٹھا کر پانی کا چھینٹا دیا۔ اب جو انہیں ہوش آیا تو یہ کہتے ہوئے بے تابانہ اعلیٰ حضرت کی طرف آئے کہ میں نے اپنا ہاتھ حضور پُرنور غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی کے دست حق پرست میں دیا۔''
آپ کی اس شانِ ولایت کا اثر تھا کہ ہندوستان بھر کے جید بزرگانِ دین آپ کی قدر و منزلت کا اظہار برملا کرنے لگے۔
حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت کا مراد آباد جانا ہوا۔ مولانا شاہ فضل الرحمٰن نے آپ کی آمد سے مطلع ہو کر آپ کو ان الفاظ سے یاد کیا۔
''آج ایک شیر حق آرہا ہے۔''
قصبے سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا اور خانقاہ رحمانیہ میں ایک مخصوص حجرے میں ٹھہرایا۔ عصر کے بعد کی مجلس میں شاہ صاحب نے حاضرین سے فرمایا۔ ''مجھے آپ میں نور ہی نور نظر آرہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی ٹوپی آپ کو اڑھا دوں اور آپ کی ٹوپی خود اوڑھ لوں۔'' یہ کہہ کر واقعی اپنی ٹوپی اعلیٰ حضرت کو اوڑھائی اور حضرت کی ٹوپی خود اوڑھ لی۔
اعلیٰ حضرت کی عمر اس وقت بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی جب کہ شاہ صاحب گنج مراد آبادی کی عمر 84 سال تھی لیکن ایک اللہ کے ولی نے اپنی نگاہ ولایت سے پہچان لیا کہ اس نوجوان کا آفتاب ولایت ایک وقت میں طلوع ہو کر چمکے گا اور اپنی نورانیت سے عالم کو منور کرے گا۔
حاجی سید وارث علی شاہ بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت نے سید وارث علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ فرمایا۔ یہ بھی آپ کی نوجوانی کے دن تھے۔ آپ سید صاحب کی زیارت کے لیے دیوا شریف پہنچے۔ اعلیٰ حضرت اور سید وارث علی شاہ کا اس وقت تک آپس میں کوئی تعارف نہیں تھا۔ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔ پیر صاحب رونق افروز تھے۔ مریدین آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ جب اعلیٰ حضرت پہنچے تو سید صاحب فوراً سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ ''مولانا اعلیٰ حضرت آگئے۔''
حضرت سید وارث علی شاہ کے پاس بڑے بڑے علماء

آتے تھے۔ آپ کسی کو مولانا نہیں کہتے تھے اور نہ ہی اعلیٰ حضرت کہتے تھے۔ پہلی مرتبہ آپ نے جس کو مولانا اور اعلیٰ حضرت کہا تو وہ سیدی امام احمد رضا خاں تھے۔

بریلی کے ایک رمالی (علم رمل جاننے والے) تھے۔ وہ پیلی بھیت اکثر جایا کرتے تھے۔ وہاں کے جنگل میں ایک فقیر رہتے تھے۔ وہ رمالی ان کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن اس فقیر سے ملاقات ہوگئی۔ اس رمالی نے انہیں سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور کہا۔ ''بچہ یہاں کہاں آیا ہے۔ بھاگ بھاگ یہ شیروں کا جنگل ہے۔'' اتنے میں ایک شیر آتا نظر آیا۔ وہ شخص چیخا، حضرت! بچایئے شیر آرہا ہے۔ اس فقیر نے شیر کی طرف دیکھا تو شیر وہیں کھڑا رہ گیا۔

''تو یہاں سے چلا جا۔ تیرا حصہ یہاں نہیں ہے۔'' اس فقیر نے کہا۔

''میرا حصہ کہاں ہے۔ میری تو دلی تمنا یہی ہے کہ آپ ہی سے بیعت ہوں۔'' اس شخص نے کہا۔

''بریلی محلہ سوداگراں میں ایک قطب مولوی ہے۔ تیرا حصہ وہاں ہے۔'' اس فقیر نے کہا۔

''حضرت نام تو بتایئے۔ بریلی میں تو بہت سے مولوی ہیں۔ میں انہیں کہاں تلاش کروں گا۔''

''تو بریلی میں رہتا ہے اور انہیں نہیں جانتا۔ مولوی احمد رضا کو نہیں جانتا۔ وہیں جا اسی سے مل وہیں تیرا حصہ ہے۔''

وہ شخص حیران تھا کہ بریلی میں رہتے ہوئے اعلیٰ حضرت کے مرتبے سے واقف نہ ہوسکا۔

یہ تھی امامِ اہل سنت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی کی شانِ اعلیٰ۔

☆......☆

حج بیت اللہ کی تڑپ کس مسلمان کے دل میں دھوم نہیں مچاتی۔ کس کا دل نہیں چاہتا کہ اس رکن عظیم کو ادا کرلیا جائے۔ اعلیٰ حضرت کے دل میں بھی کعبہ مطورہ میں جبہ سائی کا شوق اور دیارِ رسول کی حاضری کی تڑپ ایک مدت سے چٹکیاں لے رہی تھی۔ آپ کی یہ دلی تمنا 1295ھ (1878ء) میں پوری ہوئی جب آپ کی عمر 23 سال تھی۔ والد گرامی کی جانب سے خوش خبری ملی۔ ''احسن میاں اس سال حج کی تیاری کرلو، بلاوا آگیا ہے۔''

''حضور کب سے آرزو تھی۔''

کلامِ اعلیٰ حضرت

نعت شریف

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
دھارے چلتے ہیں عطا کے وہ قطرہ تیرا
اغنیا پلتے ہیں در سے وہ ہے باڑا تیرا
اصفیا چلتے ہیں سر سے وہ ہے رستا تیرا
میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا
تیرے قدموں میں جو ہیں غیر کا منہ کیا دیکھیں
کون نظروں پہ چڑھے دیکھ کے تلوا تیرا
ایک میں کیا مرے عصیاں کی حقیقت کتنی
مجھ سے سو لاکھ کو کافی ہے اشارا تیرا
تیرے صدقے مجھے ایک بوند بہت ہے تیری
جس دن اچھوں کو ملے جام چھلکتا تیرا
تیری سرکار میں لاتا ہے رضا اس کو شفیع
جو مرا غوث ہے اور لاڈلہ بیٹا تیرا

☆☆

نعت مبارک

چمک تجھ سے پاتے سب پانے والے
مرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے
برستا نہیں دیکھ کر ابر رحمت
بدوں پر بھی برسا دے برسانے والے
مدینے کے خطے خدا تجھ کو رکھے
غریبوں فقیروں کو ٹھہرانے والے
تو زندہ واللہ تو زندہ ہے واللہ
مرے چشم عالم سے چھپ جانے والے
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے
ترا کھائیں تیرے غلاموں سے الجھیں
ہیں منکر عجب کھانے غرانے والے
رضا نفس دشمن ہے دم میں نہ آنا
کہاں تم نے دیکھے ہیں چندرانے والے

"آرزو تو ہوتی ہی ہے۔ بات تو بلاوے کی ہے۔"

خوش خبری ملتے ہی تیاری شروع کر دی۔ ظاہری تیاری کے تو وہ قائل ہی نہیں تھے۔ تیاری یہ تھی کہ کثرت سے عبادت کرنے لگے۔ وظائف کا دورانیہ بڑھا دیا۔ ہر دم یہ احساس رہنے لگا کہ جس کے دربار میں جا رہے ہیں وہاں کپڑے اور بدن ہی نہیں دل بھی صاف ہونا چاہیے۔ اس قابل تو ہو جاؤں کہ اس عظیم سعادت کا اہل ہو جاؤں۔

ڈرتے کانپتے جہاز میں قدم رکھا اور سوئے حرم روانہ ہوئے۔ عشق رسولؐ نے زور باندھا۔ سارے راستے آنسو کی جھڑی لگی رہی۔

مکہ مکرمہ پہنچتے ہی آپ کو علمائے عرب کی مردم شناس نظروں نے پہچان لیا۔ ایک روز نماز مغرب کے بعد امام شافعیہ شیخ حسین بن صالح بغیر کسی سابقہ تعارف آگے بڑھے اور آپ کا ہاتھ تھام لیا اور نہایت اصرار کے ساتھ اپنے دولت کدے پر لے گئے اور دیر تک آپ کی پیشانی پکڑ کر بار بار کہتے رہے۔ "بے شک! میں اللہ کا نور اس پیشانی میں پاتا ہوں۔"

پھر حضرت شیخ حسین بن صالح نے آپ کو صحاح ستہ کی سند اور سلسلہ قادریہ کی اجازت اپنے دستخط خاص سے عنایت فرمائی اور فرمایا۔ "آج سے آپ کا نام ضیاء الدین احمد ہے۔"

اعلیٰ حضرت نے بہ ایمائے حضرت شیخ صالح ان کی تصنیف کا اردو ترجمہ کیا اور ایک شرح دو دن میں تحریر فرمائی۔ جس وقت اس ترجمے اور شرح کو حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کیا حضرت شیخ بہت خوش ہوئے اور بہت تعریف فرمائی اور ساتھ ہی تعجب فرمایا کہ اس کم عمری میں علم و فضل کا عالم یہ ہے۔

جب آپ مکہ معظمہ سے مدینہ روانہ ہوئے تو درد دل اشعار میں ڈھل کر بے اختیار کاغذ پر اتر آیا۔ آپ نے دوران سفر یہ اشعار تخلیق کیے۔

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو
زیر میزاب ملے خوب کرم کے چھینٹے
ابر رحمت کا یہاں روز برسنا دیکھو
خوب آنکھوں سے لگایا ہے غلاف کعبہ
قصر محبوب کے پردے کا بھی جلوہ دیکھو
واں مطیعوں کا جگر خوف سے پانی پایا
یاں سیہ کاروں کا دامن یہ مچلنا دیکھو
دھو چکا ظلمت دل بوسہ سنگ اسود
خاک بوسی مدینہ کا بھی رتبہ دیکھو
بے نیازی سے وہاں کانپتی پائی طاعت
جوش رحمت پہ یہاں ناز گنہ کا دیکھو
ملتزم سے تو گلے لگ کے نکالے ارماں
ادب و شوق کا یاں مل کے الجھنا دیکھو
غور سے سن تو رضا کعبہ سے آتی ہے صدا
میری آنکھوں سے مرے پیارے کا روضہ دیکھو

☆......☆

منیٰ شریف کی مسجد میں بھی ایک روح پرور واقعہ پیش آیا۔ مغرب کی نماز کے بعد جب نمازی چلے گئے تو اعلیٰ حضرت وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ مسجد کے اندرونی حصے میں دیکھا کہ ایک اور صاحب بھی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ یکا یک ایک آواز گنگناہٹ کی سی اندر مسجد کے معلوم ہوئی جیسے شہد کی مکھی بولتی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ذہن میں فوراً یہ حدیث پاک آئی۔ "اہل اللہ کے قلب سے ایسی آواز نکلتی ہے جیسے شہد کی مکھی بولتی ہے۔"

اعلیٰ حضرت نے وظیفہ چھوڑا اور ان صاحب کی طرف چلے جہاں سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ نیت یہ تھی کہ اپنے لیے مغفرت کی دعا کرائیں۔ ابھی دو ہی قدم چلے تھے کہ ان بزرگ کو القا ہو گیا۔ بغیر کچھ پوچھے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ "الٰہی میرے اس بھائی کی مغفرت فرما۔" اعلیٰ حضرت سمجھ گئے کہ بزرگ فرماتے ہیں ہم نے تیرا کام کر دیا۔ اب تو ہمارے کام میں مخل نہ ہو۔ آپ ملاقات کیے بغیر لوٹ آئے۔

جب حج کی تکمیل کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا تو راستے میں سمندری طوفان نے جہاز کو گھیر لیا۔ طوفان ایسا شدید تھا کہ جہاز کے بچنے کی اُمید نہ رہی۔ لوگوں نے کفن پہن لیے۔ اعلیٰ حضرت کی والدہ سخت گھبرا رہی تھیں۔ ان کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے بے ساختہ آپ کی زبان سے نکلا۔ "آپ اطمینان رکھیں۔ خدا کی قسم یہ جہاز نہ ڈوبے گا۔"

اتنی بڑی بات آپ نے یونہی نہیں کہہ دی تھی۔ آپ کو اس وقت ایک حدیث یاد آ گئی تھی۔ اسی حدیث کے اطمینان پر انھوں نے والدہ کو تسلی دی تھی۔ اس حدیث میں کشتی پر سوار ہوتے وقت غرق سے حفاظت کی دعا ارشاد ہوئی ہے۔

آپ نے وہ دعا پڑھ لی تھی۔

اس دعا کی برکت تھی کہ وہ مخالف ہوا جو تین دن سے شدت سے چل رہی تھی دو گھڑی میں بالکل موقوف ہوگئی اور جہاز سے نجات پائی۔

آپ کی والدہ اس ناگہانی آفت سے اتنی زیادہ خوف زدہ ہوگئی تھیں کہ گھر پر قدم رکھتے ہی آپ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''حج فرض اللہ تعالیٰ نے ادا فرما دیا۔ اب میری زندگی پھر دوبارہ ارادہ نہ کرنا۔''

ان کی والدہ کو اپنی ہی نہیں بیٹے کی جان بھی عزیز تھی۔ اس حکم کے ذریعے گویا انہیں بھی تنبیہہ کردی کہ حج فرض ادا ہوگیا اب تم بھی نفلی حج کا ارادہ نہ کرنا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک میں زندہ ہوں۔

بات آئی گئی ہوگئی۔

☆......☆

عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا کہ روز بروز دل میں گھر کرتا چلا جارہا تھا۔ دیار حبیبؐ سے واپسی کے بعد جب وصال کی گھڑیاں ہجر کے ذائقے سے آشنا ہوئیں تو قلب طاہر کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ حیات کا واحد مقصد ہی عشق رسولؐ بن گیا۔ آنکھوں میں عشق رسولؐ کے جلوے تھے۔ مقصد زندگی ہی یہ بن گیا کہ پرچم عظمت رسالت کو بلند کیا جائے۔

عشق رسولؐ نے جذبات دلی کو متحرک کیا تو لامحالہ شاہراہ شاعری کشادہ ہوگئی۔ شاعری کا تعلق چونکہ جذبات سے ہے اس لیے لازمی تھا کہ جذبات دلی کو اشعار کا جامہ پہنایا جائے۔ جب حضرت رضا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد میں بے چین و بے قرار ہوتے، صبر و شکیبائی ساتھ چھوڑ دیتے تو بے ساختہ آپ کے جذبات نعتیہ اشعار کی صورت میں زبان پر مچلنے لگے۔

اے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سستے
جو آگ بجھا دے گی وہ آگ لگائی ہے
طیبہ نہ سہی افضل مکہ ہی بڑا زاہد
ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے
یاد حضور کی قسم غفلت عیش ہے ستم
خوب ہیں قید غم میں ہم، کوئی ہمیں چھڑائے کیوں
ہو نہ ہو آج کچھ مرا ذکر حضوری ہوا
ورنہ مری طرف خوشی دیکھ کے مسکرائی کیوں

جان و دل ہوش و خرد و سب تو مدینہ پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا!
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے
نصیب دوستاں گر ان کے در پہ موت آنی ہے
خدا یوں ہی کرے پھر تو ہمیشہ زندگانی ہے

☆......☆

آپ کے نعتیہ فن پارے آپ کے دلی جذبات کے آئینہ دار تھے۔ دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ اس فن شریف میں آپ کا کوئی استاد نہیں تھا۔

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

☆......☆

نعت ایک مشکل مگر بہترین صنف سخن ہے اور باعث فخر و ثواب ہے۔ زور قلم اور جولانی طبع کے تحت اس فن میں قدم قدم پر خطرات کا سامنا ہے۔ وہ ذات مقدس جس کی سرکار میں دانستہ و نادانستہ ذرا بھی سوئے ادب اعمال کے ضائع ہو جانے کا سبب بن جائے اس کی مدح و نعت بڑے ہوش و حواس کا کام ہے۔ آپ کا علمی پس منظر آپ کی رہنمائی کررہا تھا۔ نعتیہ اشعار میں خلاف شریعت کسی بات کا اشارہ تک نہیں آسکتا تھا۔ ان کا تو دعویٰ ہی یہ تھا۔ ''قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی''۔

آپ نے اپنی نعت نویسی کے لیے قرآن و حدیث کو ہی شمع راہ بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا نعتیہ کلام افراط و تفریط کے عیب اور تخیل کی بے راہ روی سے پاک تھا۔ سینکڑوں استادان سخن ہندوستان میں موجود تھے لیکن آپ پیروی کررہے تھے تو حضرت حسان کی جن کی نعتیں سن کر خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محظوظ ہوتے تھے۔

اردو شاعری کا آفتاب پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، تسلیم، حالی کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ خصوصاً داغ کی شہرت تو آسمان کو چھو رہی تھی۔ داغ کی زبان وانی زبان زد خاص و عام تھی۔ ان کی زبانی قلعہ کی زبان سمجھی جاتی تھی اور قلعہ معلیٰ کی زبان اردو کے لیے سند تھی۔ اعلیٰ حضرت کے اپنے بھائی حضرت حسین بریلوی استاد داغ کے شاگرد تھے۔ داغ کی شہرت نے ان کے رنگ کو ٹکسالی بنا دیا تھا۔ بڑے بڑے تھے شاعروں نے داغ کے رنگ کی تقلید کی۔ اعلیٰ حضرت، داغ سے فیض یاب

نہیں ہو سکتے کیونکہ داغ نعت کے آدمی نہیں تھے۔ اس کے باوجود اعلیٰ حضرت کے سامنے داغ اور ہم عصروں کی شاعری تھی ضرور جس سے وہ فیض اٹھا رہے تھے۔ اردو کی کلاسیکی شاعری کے وہ سارے اوصاف جن پر اہل زبان کو ناز تھا۔ اعلیٰ حضرت نے ان تمام زیوروں سے اپنی نعتوں کو آراستہ کیا اور نعت گوئی کو صرف ثواب کا ذریعہ نہیں رہنے دیا بلکہ ادب کا حصہ بنا دیا۔

وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہو گئے

یہی کہتی ہے بلبل باغ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصف شاہ ہدیٰ مجھے شوخی طبع رضا کی قسم

☆......☆

اعلیٰ حضرت کے ہم عصر شعراء اپنی نعت میں زبان کا وہ رنگ اور نکھار اور صفائی پیدا نہ کر سکے جو ان کی عشقیہ شاعری کا حسن تھا مگر اعلیٰ حضرت کی فکر رسا جس انداز میں چاہتی نعت رسول کو فردوس گوش بناتی جب کہ یہ مسلم ہے کہ ہر مضمون اور ہر موضوع اپنی بلندی و رفعت کے تقاضے کے اعتبار سے الفاظ کا انتخاب چاہتا ہے۔ جس کا اعلیٰ حضرت نے بہ حد کمال اہتمام کیا۔ ان کو زبان کا وہ ملکہ اور وہ قدرت بیان حاصل تھی کہ جب زبان کی بے ساختگی و سلاست کو نعت شریف کے رفیع و وقیع مضامین میں سے ہم آہنگ نہ پاتے تو انہیں مطلقاً تکلف نہ ہوتا کہ وہ شکوہ الفاظ، فارسی تراکیب وغیرہ سے آراستہ کریں۔ وہ جب نعت گوئی کی طرف مائل ہوتے تو ان کا قلم کمال علمی کے نئے انداز سے گلدستے سجاتا۔ اشعار نعت علمی اور تلمیحات دینی کا مرقع بن جاتے۔

محمد مظہر کامل ہے حق کی شانِ عزت کا
نظر آتا ہے اس کثرت میں کچھ انداز وحدت کا
ذرے مہر قدس تک تیرے توسط سے گئے
حد اوسط نے کیا صغریٰ کو کبریٰ نور کا
بے سہیم و قسیم و عدیل و مثیل
جو ہر فرد عزت پہ لاکھوں سلام
پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفیٰ کہ یوں
کیف کے پر جلے جہاں کوئی بتائے کیا کہ یوں
قصرِ دنیٰ کے راز میں عقلیں تو گم ہیں جیسی ہیں
روح قدس سے پوچھیے تم نے بھی کچھ سنا کہ یوں

☆......☆

اعلیٰ حضرت کا یہ علمی کمال ہے کہ جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ اس سے نعت نبی کے لیے مضمون پیدا کر لیتے ہیں اور ان کی فکر و لے کی بلند پروازی مدح حبیب میں کیسی کیسی معنی آفرینی کرتی ہے لیکن زبان و بیان کی خوبی اسے چیستاں نہیں بننے دیتی۔ اس صورتِ حال کے علاوہ اعلیٰ حضرت نے یہ تمام و کمال سلاست زبان و بیان کو ملحوظ رکھا اور زبان کی روانی اور بندش کی چستی کا اہتمام کر کے زبان دانی کے جوہر دکھائے۔

تیرے ٹکڑوں پہ پلے غیر کی ٹھوکر پہ نہ ڈال
جھڑکیاں کھائے کہاں چھوڑ کے صدقہ تیرا
دل عبث خوف سے پتا سا اڑا جاتا ہے
پلہ ہلکا سہی بھاری ہے بھروسا تیرا
تو جو چاہے تو ابھی میل مرے دل کا دھلے
کہ خدا دل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا
کس کا منہ تکیے کہاں جائے کس سے کہے
تیرے ہی قدموں پہ مٹ جائے یہ پالا تیرا

طرز ادا کا بانکپن بھی خوب ہے۔

نام مدینہ لے دیا چلنے لگی نسیم خلد
سوزش غم کو ہم نے بھی کیسی ہوا بتائی، کیوں؟
رخ انور کی تجلی جو قمر نے دیکھی
رہ گیا بوسہ دۂ نقش کف پا ہو کر

سادگی بھی لاجواب ہے۔

اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہو گا
رو رو کے مصطفیٰ نے دریا بہا دیے ہیں

نعت کے مضامین، سنگلاخ زمینوں کے باوجود سہولت سے ادا کرنا اعلیٰ حضرت ہی کا حصہ ہے۔

طور کیا عرش جلے دیکھ کے وہ جلوۂ گر
آپ عارض ہوں مگر آئینہ دار عارض

مشق سخن اتنی بڑھی کہ ان کی شاعری دلی اور لکھنؤ کی معیاری شاعری کے نمونے پیش کرنے لگی۔

اے رضا سب چلے مدینے کو
میں نہ جاؤں ارے خدا نہ کرے

کیوں رضا آج گلی سونی ہے
اٹھ مرے دھوم مچانے والے

شب بھر سونے ہی سے غرض تھی
تاروں نے ہزار دانت پیسے

ان کی علمیت نے ان کی نعتوں کو ایک رنگ یہ بخشا کہ

اردو کے مصرعوں میں عربی فارسی کی پیوند لگا کر چمنستان کا سماں پیدا کر دیتے ہیں بلکہ ایک نعت میں تو اس کے ہر شعر میں عربی، فارسی، ہندی اور اردو کے پیوند لگا کر کمالِ فن کا ثبوت دیا۔

لم یاتِ نظیرک فی نظرٍ مثلِ تو شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہہ دوسرا جانا

اعلیٰ حضرت کے منجھلے بھائی حسن بریلوی فن شاعری میں داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جب چند نعتیں جمع ہو جاتی تھیں تو اپنے صاحبزادے حسنین رضا کے ہاتھ اپنے استاد داغ دہلوی کے پاس اصلاح کے لیے روانہ فرماتے۔ اس وقت بھی وہ ان نعتوں کو لے کر دہلی جا رہے تھے کہ اعلیٰ حضرت کی نظر ان پر پڑی۔

''صاحبزادے! کہاں کی تیاری ہے؟''

''دہلی جا رہا ہوں۔''

''خیریت؟''

''ابا حضور کا کلام اصلاح کی غرض سے استاد داغ کے پاس لے جا رہا ہوں۔''

''ہم نے بھی ایک نعت پاک پچھلے دنوں قلم بند کی ہے۔ اسے بھی لیتے جاؤ۔ استاد کو دکھا لینا۔ دیکھو کیا رائے دیتے ہیں۔''

یہ وہی مشہور نعت تھی جس کا مطلع ہے

ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیے ہیں
جس راہ چل دیے ہیں کوچے بسا دیے ہیں

''ابھی اس نعت کا مقطع نہیں ہو سکا ہے۔ تمہیں جلدی ہے لہٰذا اسے اسی حالت میں لے جاؤ۔''

حسنین رضا خاں دہلی پہنچے اور استاد داغ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور والدِ گرامی کا کلام پیش کیا۔ داغ دہلوی نے اس کی اصلاح کی۔

جب اصلاح فرما چکے تو اعلیٰ حضرت کا کلام پیش کیا۔

''چچا جان اعلیٰ حضرت نے چلتے وقت دیا تھا اور فرمایا تھا کہ دکھاتے لائیے گا۔''

داغ نے ایک نظر ڈالی اور پھر ایک شعر گنگنا گنگنا کر پڑھنے لگا۔ حالت یہ تھی کہ جھوم رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بڑی مشکل سے اپنی حالت پر قابو پایا اور فرمایا۔

اس نعت پاک میں تو کوئی ایسا حرف بھی مجھے نظر نہیں آتا جس میں کچھ قلم لگا سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کلام لکھا ہوا معلوم ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ کلام تو لکھوایا گیا۔ اس کلام کی فن کے اعتبار سے کیا کیا خوبیاں بیان کروں بس میری زبان پر تو یہ آ رہا ہے۔

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

''اس نعت میں مقطع تھا بھی نہیں۔ لیجیے مقطع بھی ہو گیا۔''

اسی وقت اعلیٰ حضرت کے نام خط تحریر کیا جس میں لکھا تھا۔

''اس نعت پاک کو اپنے دیوان میں اس مقطع کے ساتھ شامل کریں۔ اس مقطع کو علیحدہ نہ کریں اور نہ دوسرا مقطع کہیں۔''

اعلیٰ حضرت کی شاعری نعت غزل تک محدود نہیں تھی۔ وہ قصیدے جیسی مشکل صنف میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہ ان کا جذبہ عشق ہی تھا جس نے ان کے زور کلام کو باقاعدہ شاعری کرنے والے شعراء سے بھی آگے بڑھا دیا۔

محسن کاکوروی نعت گوئی میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے جب ''قصیدہ معراج'' لکھا تو سنانے کی غرض سے اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ یہ ''لامیہ'' قصیدہ تھا جس کا مطلع تھا۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پر لائی ہے صبا گنگا جل

صرف دو شعر سنائے گئے تھے کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ طے یہ ہوا کہ عصر کے بعد سنایا جائے گا۔ عصر کے بعد اعلیٰ حضرت نے اپنا طویل قصیدہ معراجیہ سنایا جس کا مطلع تھا

وہ سرور کشور رسالت جو عرش پہ جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے عرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لیے تھے

اس عظیم و جلیل قصیدے کو سننے کے بعد محسن کاکوروی نے اپنا قصیدہ جیب میں رکھ لیا۔

''حضرت اب اس کے بعد میں اپنا قصیدہ نہیں سنا سکتا۔ معراج پر آپ نے ایسی طبع آزمائی فرمائی اور اپنے طبع رواں کا ایک ایسا جوہر دکھایا ہے جس کی مثال سے اردو شاعری کا دامن خالی ہے۔''

اعلیٰ حضرت کے ایک خلیفہ مو[illegible] یہ الدین مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھے۔ وہاں انہوں نے مصر کے فاضل علمائے کرام کے اجتماع میں اعلیٰ حضرت کا عربی قصیدہ پڑھا۔

وہاں موجود علماء نے بہ یک زبان کہا۔ ''یہ قصیدہ کسی فصیح اللسان عربی النسل عالم دین کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''

مولانا ضیاء الدین نے جب انہیں یہ بتایا کہ اس قصیدے کے لکھنے والے مولانا شاہ امام احمد رضا ہیں جو عربی نہیں عجمی ہیں تو علمائے مصر حیرت میں ڈوب گئے بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا۔ ''وہ عجمی ہو کر عربی میں اتنے ماہر ہیں۔''

اعلیٰ حضرت کا اظہار عشقِ رسولؐ اس وقت اپنی معراج پر پہنچ گیا جب انہوں نے اپنا مشہور سلام ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' لکھا۔ اس سلام کے بارے میں علمائے کرام نے متفقہ رائے دی کہ اعلیٰ حضرت اگر اور کچھ بھی نہ لکھتے تو یہ سلام ہی آپ کی عظمت کے لیے کافی تھا۔

یہ سلام عقیدت کے اعتبار سے ہی غیر معمولی نہیں بلکہ فنی اعتبار سے بھی منفرد اور بے مثال تھا۔ اردو شاعری میں ''سراپا'' قلمبند کرنے کی روایت موجود تھی لیکن یہ روایت ''غزل'' تک محدود تھی۔ دنیاوی محبوب کا سراپا بیان کیا جاتا تھا لیکن اعلیٰ حضرت ایک نئی روایت کے موجد بن گئے۔ انہوں نے اس سلام میں حضور اکرمؐ کا سراپا پیش کیا۔ حضورؐ کے ہر ہر عضو پر الگ الگ سلام پیش کیا۔ گویا چشم تصور سے حضور اقدسؐ کے سراپائے اقدس کی زیارت کرتے جاتے ہیں اور سلام پیش کرتے جاتے ہیں۔

سر مبارک

جس کے آگے سر سروراں خم رہیں
اس سرتاج رفعت پہ لاکھوں سلام

گیسو مبارک

وہ کرم کی گھٹا گیسوئے مشک سا
لکہ ابر رفعت پہ لاکھوں سلام

جبیں مبارک

جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اس جبین سعادت پہ لاکھوں سلام

مبارک آنکھیں اور ناک مبارک

نیچی آنکھوں کی شرم و حیا پر درود
اونچی بینی کی رفعت پہ لاکھوں سلام

لب ہائے مبارکہ

پتلی پتلی گل قدس کی پتیاں
ان لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

شکم کی قناعت

کل جہاں ملک اور جو کی روٹی غذا
اس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام

مبارک انگلیاں

نور کے چشمے لہرائیں دریا بہیں
انگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام

مبارک ناخن

عید مشکل کشائی کے چمکے ہلال
ناخنوں کی بشارت پہ لاکھوں سلام

اسی جذبۂ عشقِ رسولؐ کا تقاضا تھا کہ صرف حضورؐ سے محبت نہ کی جائے بلکہ آلِ رسولؐ کا احترام بھی روا رکھا جائے کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس سے نسبت رکھنے والوں سے بھی محبت کی جائے۔ آپ حضور اقدسؐ کے ایسے عاشق تھے کہ جو ان کا محب ہوتا وہ ان کا محبوب بن جاتا۔ اسی محبت کا تقاضا تھا کہ حضورؐ کی اولاد امجاد سے بھی محبت کی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ سادات کرام کی تعظیم اعلیٰ حضرت کی پہچان بن گئی۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص سید ہے تو اس کے آگے سر نیاز جھکا دیتے۔ اس کی لیاقت، اہلیت اور مرتبے کو بالائے طاق رکھ کر اس کا احترام خود پر فرض کر لیتے۔

ایک کم عمر صاحبزادے خانہ داری کے کاموں میں امداد کے لیے اعلیٰ حضرت کے گھر میں ملازم تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سید زادے ہیں لہٰذا گھر والوں کو تاکید فرما دی کہ خبردار صاحبزادے سے کوئی کام نہ لیا جائے کہ مخدوم زادہ ہیں۔ کھانا وغیرہ اور جس چیز کی ضرورت ہو حاضر کر دی جائے۔ جس تنخواہ کا وعدہ ہے وہ بطور نذرانہ پیش ہوتا رہے۔

☆......☆

امام اہل سنت کی سواری کے لیے پالکی دروازے پر لگائی گئی تھی۔ وضو سے فارغ ہو کر کپڑے زیب تن فرمائے۔ عمامہ باندھا اور عالمانہ وقار کے ساتھ باہر تشریف لائے۔ چہرۂ انور سے فضل و تقویٰ کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ شب بیدار آنکھوں سے فرشتوں کا تقدس برس رہا تھا۔ پروانوں کے ہجوم میں ایک شمع فروزاں مسکرا رہی تھی اور عندلیبانِ شوق کی انجمن میں ایک گل رعنا کھلا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے سواری تک پہنچنے کا موقع ملا۔ کہاروں نے پالکی اٹھائی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں نیاز مندوں کی بھیڑ چل رہی تھی۔ پالکی لے کر تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ اعلیٰ حضرت نے پالکی

کے اندر سے آواز دی۔ ''پالکی روک دو۔''

حکم کے مطابق پالکی رکھ دی گئی۔ ہمراہ چلنے والا مجمع بھی وہیں رک گیا۔ اضطراب کی حالت میں باہر تشریف لائے۔ کہاروں کو اپنے قریب بلایا اور بھرّائی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''آپ لوگوں میں کوئی آلِ رسولؐ تو نہیں؟'' اس سوال کا کوئی جواب نہیں آیا تو اعلیٰ حضرت نے پھر فرمایا۔ ''اپنی جدِ اعلیٰ کا واسطہ سچ بتایئے۔ میرے ایمان کا ذوق لطیف تن جاناں کی خوشبو محسوس کر رہا ہے۔''

اس سوال پر اچانک ایک شخص کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اس شخص نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد نظر جھکاتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔ ''مزدور سے کام لیا جاتا ہے ذات پات نہیں پوچھی جاتی۔ آہ! آپ نے میرے جد اعلیٰ کا واسطہ دے کر میری زندگی کا ایک سربستہ راز فاش کردیا۔ سمجھ لیجیے کہ میں اسی چمن کا ایک مرجھایا ہوا پھول ہوں جس کی خوشبو سے آپ کی مشامِ جاں معطر ہے۔ چند مہینے آپ کے شہر میں آیا ہوا ہوں۔ کوئی ہنر نہیں جانتا کہ اسے اپنا ذریعہ معاش بناؤں۔ پالکی والوں سے رابطہ کرلیا ہے۔ روز سویرے ان کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہوں اور شام کو اپنے حصے کی مزدوری لے کر اپنے بال بچوں میں لوٹ جاتا ہوں۔''

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ لوگوں نے پہلی بار تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ دیکھا۔ ایک عالم دین ایک مقتدر امام کی دستار اس مزدور کے قدموں میں رکھی ہوئی تھی اور وہ التجا کر رہا تھا۔

''معزز شہزادے! میری گستاخی معاف کردو۔ لاعلمی میں یہ گستاخی سرزد ہوگئی۔ غضب ہوگیا۔ جن کے نقش پا کا تاج میرے سر کا سب سے بڑا اعزاز ہے ان کے کاندھے پر میں نے سواری کی۔''

دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ جس طرح ایک عاشق روٹھے ہوئے محبوب کو مناتا ہے اسی طرح وقت کا عظیم المرتبت امام اس کی منت وسماجت کر رہا ہے۔ ہزار طرح منت وسماجت کرنے کے بعد اور معاف کردینے کا اقرار کرا لینے کے بعد امام اہل سنت، اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں نے آخری التجائے شوق پیش کی۔

''میری تقصیر کا کفارہ اسی وقت ادا ہوگا جب تم پالکی میں بیٹھو اور میں اپنے کاندھے پر بٹھاؤں۔'' اعلیٰ حضرت نے اس مزدور سے کہا۔

وہ مزدور اس تجویز کو کہاں ماننے والا تھا۔ ادھر سے انکار ہو رہا تھا ادھر سے اصرار تھا۔ آخر اس سیدزادے مزدور کو ضد پوری کرنی پڑی۔

آہ! وہ منظر کتنا رقت انگیز اور دلگداز تھا جب اہل سنت کا جلیل القدر امام اپنے علم وفضل کو ایک گمنام مزدور کے قدموں پر نثار کر رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت پٹھان تھے اس لیے طبیعت میں سختی تھی اور غصہ تھا لیکن سادات سے ملاقات ہوتی تو راہ میں آنکھیں بچھانے کے لیے بے قرار ہوجاتے۔

اسی نسبت کا تقاضا تھا کہ دیار محبوب سے آنے والوں کی پابوسی کی جائے۔ جب کوئی حاجی بریلی میں حج ادا کرکے آتا تو اعلیٰ حضرت اپنی عظمت اور اعلیٰ منصبی کے باوجود اس کے پاس جاتے تھے اور اس کے قدموں کو اپنے رومال سے صاف کرتے تھے اس لیے کہ اس کے قدموں نے اس دیار پاک کے ذروں کو بوسہ دیا تھا۔

☆......☆

عشق رسولؐ کی اس کارفرمائی کا معجزہ تھا کہ آپ کی زندگی اتباع سنت کا نمونہ بن گئی تھی۔ اپنے معمولات میں سنت رسول کی ایسی پیروی فرماتے جو دوسروں کے لیے ناممکن تھی۔

آپ کا زیادہ وقت تصنیف وتالیف، کتب بینی اور اوراد واشغال کے خیال سے گھر پر ہی گزرتا۔ صرف پانچوں نمازوں کے وقت مسجد میں تشریف لاتے۔ عصر کی نماز کے بعد مکان کے پھاٹک میں چارپائی پر تشریف رکھتے۔ چاروں طرف کرسیاں رکھ دی جاتیں۔ زائرین تشریف لاتے، حاجتیں پیش کی جاتیں۔ ان کی حاجتیں پوری کرتے توضع وتبلیغ میں وقت گزرتا۔ آپ 24 گھنٹے میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹے آرام فرماتے تھے۔ آپ کے لیٹنے کا انداز بھی بڑا ہی منفرد تھا۔ داہنی کروٹ اس طرح لیٹتے کہ دونوں ہاتھ ملا کر سر کے نیچے رکھ لیتے اور پائے مبارک سمیٹ لیتے۔ کبھی کبھی خدام ہاتھ پاؤں دابنے بیٹھ جاتے اور عرض کرتے حضور دن بھر کام کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے۔ ذرا پائے مبارک دراز فرمالیں تو ہم درد نکال دیں۔ اس کے جواب میں فرماتے کہ پاؤں تو قبر کے اندر ہی پھیلیں گے۔

ایک عرصے تک آپ کے اس ہیئت پر آرام فرمانے کا مقصد معلوم نہ ہوسکا اور نہ ہی کوئی پوچھنے کی ہمت کرسکا آخر

آپ کے فرزند مولانا حامد رضا خاں نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔

نام حبیب کی ادا جاگتے سوتے ہو ادا
نام محمدی بنے جسم کو یہ نظام دو

یعنی ہاتھ کے انگوٹھے کا سر شہادت کی انگلی کی ابتداء پر رکھا جائے تو ہاتھ "اللہ" کے نام کا نقش بن جاتا ہے اور پاؤں سمیٹ کر سونے سے سر "م" کہنیاں "ح" کمر "لام" پاؤں "د" گویا "محمد" کا نقشہ بن جاتا ہے۔

نام خدا ہاتھ میں نام نبی ہے ذات میں
مہر غلامی پڑی لکھے ہوئے ہیں نام دو

☆......☆

ناک صاف کرنے کے سوا آپ کے ہر کام کی ابتداء سیدھی جانب سے ہوتی تھی کہ سنت یہی ہے۔ عمامہ مبارک کا شملہ سیدھے شانے پر رہتا۔ اس کے پیچ سیدھی جانب ہوتے۔

کسی بھی چیز کے لینے دینے میں سیدھا ہاتھ ہی استعمال کرتے۔ اگر کبھی لینے والا اپنا الٹا ہاتھ آگے بڑھاتا تو آپ فوراً ہاتھ کھینچ لیتے اور فرماتے۔ "سیدھے ہاتھ میں لیجیے کہ الٹے ہاتھ میں شیطان لیتا ہے۔"

ناخن کاٹتے ہوئے بھی سنت طریقہ اختیار فرماتے۔ داہنے ہاتھ کے کلمہ کی انگلی سے شروع کرتے اور چھوٹی انگلی پر ختم کرتے پھر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع کر کے انگوٹھے پر ختم کرتے۔ اس کے بعد وہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن ترشواتے۔ اس صورت میں داہنے ہاتھ سے ہی شروع ہوا اور داہنے ہاتھ پر ہی ختم ہوا۔

کبھی قہقہہ لگا کر نہ ہنستے۔ جماہی آنے پر انگلی دانتوں میں دبا لیتے اور کوئی آواز پیدا نہ ہوتی۔ کلی کرتے وقت بایاں ہاتھ داڑھی پر رکھ کر سر جھکا کر پانی منہ سے گراتے۔ قبلہ کی طرف رخ کر کے کبھی نہ تھوکتے، نہ قبلہ کی طرف پاؤں دراز کرتے۔ مسواک کثرت سے فرماتے۔ فرض نماز با عمامہ پڑھتے۔

آپ نہایت قلیل الغذا تھے۔ عام غذا چکی کے پسے ہوئے آٹے کی روٹی اور بکری کے گوشت کا شوربا تھا۔ آخر عمر میں غذا اور بھی کم رہ گئی تھی۔ فقط ایک پیالی شوربا بکری کا بغیر مرچ کا اور ایک ڈیڑھ بسکٹ سوجی کا تناول فرماتے۔

موسم کوئی بھی ہو ہمیشہ سفید رنگ کے کپڑے پہنتے تھے۔ کرتہ، شرعی پاجامہ، انگرکھا، عبا، عمامہ شریف۔ فرض نماز ہمیشہ عبا اور عمامہ کے ساتھ ادا کرتے۔ کیسی ہی گرمی کیوں نہ ہو آپ ہمیشہ دستار اور انگرکھے کے ساتھ نماز پڑھا کرتے۔

مسجد میں داخل ہوتے ہوئے ہمیشہ دایاں قدم پہلے داخل فرماتے جب کہ باہر آتے ہوئے پہلے بایاں قدم جوتے کے بالائی حصے پر رکھتے پھر سیدھے پاؤں میں جوتا پہن کر الٹے پاؤں میں جوتا پہنتے تاکہ سنت کے مطابق عمل ہو جائے۔

مسجد کا بے حد ادب کرتے تھے۔ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب جنہیں نواب صاحب کہا جاتا تھا مسجد میں نماز پڑھنے آئے اور کھڑے کھڑے بے پروائی سے اپنی چھڑی مسجد کے فرش پر گرا دی جس کی آواز حاضرین نے سنی۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ "نواب صاحب مسجد میں زور سے چلنا بھی منع ہے پھر کہاں چھڑی کو اتنی زور سے ڈالنا۔ نواب صاحب نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

اعلیٰ حضرت حضر و سفر، صحت و علالت ہر حال میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا ضروری خیال فرماتے تھے۔ اگر کسی گاڑی سے سفر کرنے میں وقت نماز اسٹیشن پر نہیں ملتا تو آپ اس گاڑی میں سفر ہی نہیں فرماتے اور دوسری گاڑی اختیار فرماتے۔

اعلیٰ حضرت اکثر سلطان الہند خواجہ غریب نواز کے مزار پر حاضری کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اجمیر جانے کے لیے ریل پر سوار ہوئے۔ دوران سفر ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے مریدین سے فرمایا کہ نماز مغرب کے لیے جماعت پلیٹ فارم پر ہی ادا کر لی جائے چنانچہ چادریں بچھا دی گئیں۔ سب نے وضو کیا اور اعلیٰ حضرت کی امامت میں نماز مغرب ادا کرنے لگے۔ اتنے میں گاڑی نے چلنے کے لیے وسل دی لیکن آپ اسی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے۔ ڈرائیور نے گاڑی چلانی چاہی مگر گاڑی کا انجن آگے کو نہ سرکتا تھا۔ ڈرائیور اور گارڈ سب پریشان ہو گئے کہ آخر گاڑی چلتی کیوں نہیں۔ گاڑی کو پیچھے کی طرف دھکیلا تو گاڑی پیچھے کی سمت چلنے لگی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انجن بالکل ٹھیک ہے۔ یہی انجن جب آگے کی طرف چلایا جاتا تھا تو نہ چلتا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اسٹیشن ماسٹر جو کہ انگریز تھا وہ بھی آ گیا۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا کہ انجن

کیوں نہیں چل رہا ہے۔ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''انجن تو بالکل ٹھیک ہے مجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ بزرگ جو نماز پڑھ رہے ہیں کوئی بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔ جب تک ان کی نماز نہیں ہو جائے گی گاڑی نہیں چلے گی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''آپ خود ہی پتا کر لیجیے۔''

انگریز اسٹیشن ماسٹر نمازیوں کی جماعت کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ آپ پوری محویت سے نماز ادا فرما رہے تھے۔

اعلیٰ حضرت نے نماز مکمل کی اور دعا مانگنے لگے۔

''حضرت ذرا جلدی فرمائیے یہ گاڑی آپ کی مصروفیت عبادت کے سبب چل نہیں رہی ہے۔''

''انشاء اللہ اب یہ گاڑی چلے گی۔'' یہ فرما کر آپ اپنے مریدین کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اور چلنا شروع کر دیا۔

اعلیٰ حضرت تو اجمیر روانہ ہو گئے مگر اس اسٹیشن ماسٹر پر اس کرامت کا گہرا اثر ہوا اور وہ مع اپنے افراد خانہ اجمیر پہنچا اور اعلیٰ حضرت کے دست اقدس پر ایمان لے آیا۔

ایک دعوت میں دسترخوان چنا جا رہا تھا کہ ٹائم پیس کا الارم نہایت سریلی پیانو کی آواز میں بجنے لگا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ''اسے بند کرو کہ سریلے راگ کا سننا جائز نہیں۔'' یہ حکم بھی اتباع سنت کے لیے ہی دیا گیا تھا۔

اس تقویٰ اور پرہیزگاری کا اثر تھا کہ آپ بڑے سے بڑے آدمی کو خاطر میں نہ لاتے اور دنیاوی دولت سے دور بھاگتے۔ بڑے بڑے نوابین آپ کی شہرت سن کر آپ سے ملاقات کے متمنی ہوئے لیکن آپ نے ان کی گزارشات کو اسی طرح ٹھکرا دیا جیسے کوئی دامن سے گرد جھاڑ دے۔

حامد علی خاں نواب آف رام پور نہایت رعب داب اور پائے کے نواب تھے۔ اہل علم و ہنر کے قدردان تھے۔ ان کے مراسم شاہ مہدی حسن میاں، سجادہ نشین مارہرہ شریف سے تھے۔ ایک بار انہوں نے چاہا کہ اعلیٰ حضرت سے نواب صاحب کی ملاقات کراؤں چنانچہ ایک مرتبہ جب نواب صاحب شاہ مہدی حسن میاں کے ہمراہ رام پور سے نینی تال جا رہے تھے۔ نواب صاحب کا اسپیشل (ذاتی ڈبہ) بریلی پہنچا تو شاہ مہدی حسن میاں نے اپنے نام سے ڈیڑھ ہزار کے نوٹ وزیر ریاست کی معرفت بطور نذر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں بھیجے اور نواب حامد علی خاں کی جانب سے استدعا کی کہ ملاقات کا موقع دیا جائے۔

مدار المہام (وزیر ریاست) کے آنے کی اطلاع ہوئی تو اعلیٰ حضرت دروازے پر تشریف لائے۔ پورا ماجرا سنا اور فرمایا۔

''میاں صاحب (شاہ مہدی حسن میاں) کو میرا سلام کہنا اور یہ کہہ دیجیے گا یہ الٹی نذر کیسی، مجھے میاں کی خدمت میں نذر پیش کرنی چاہیے نہ کہ میاں مجھے نذر پیش کریں۔ یہ ڈیڑھ ہزار ہوں یا جتنے ہوں لے جائیے۔ فقیر کا مکان نہ اس قابل کہ کسی والیٔ ریاست کو بلا سکوں نہ ہی والیان ریاست کے آداب سے واقف کہ خود جا سکوں۔

اس کے بعد بھی نواب صاحب نے بہت چاہا کہ ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے لیکن آپ تیار نہ ہوئے۔

ان کا منگتا پاؤں سے ٹھکرا دے وہ دنیا کا تاج
جس کی خاطر مر گئے منعم رگڑ کر ایڑیاں

ایک مرتبہ نواب آف نان پارہ نے خواہش کی کہ مولانا میرے سلسلے میں کوئی منقبت یا قصیدہ کہیں لیکن آپ نے سختی سے یہ عرضداشت ٹھکرا دی اور اس کے جواب میں ایک نعت شریف لکھی۔

وہ کمال حسن حضور ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

اور مقطع میں ریاست کا نام ''نان پارہ'' کی بندش بڑے لطیف اشارے میں ادا کی

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارۂ ناں نہیں

حیدرآباد دکن اس وقت علم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ قدردانی کے متلاشی حیدرآباد کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ بانیان دکن ہر اہل علم کو حیدرآباد میں جمع کرنے کے شائق تھے۔ یہ دولت مند ریاست ادیبوں، شاعروں اور علماء کی کہکشاں بنی ہوئی تھی۔ نظام حیدرآباد نے اعلیٰ حضرت کے علم و فضل کی شہرت سنی تو چاہا کہ آپ کی ذات اقدس ان کے دربار سے وابستہ ہو جائے۔ انہوں نے کئی بار لکھا کہ حضور کبھی میرے یہاں تشریف لا کر ممنون فرمائیں۔ اعلیٰ حضرت نے ہمیشہ نفی میں جواب دیا۔

''میرے پاس اللہ تعالیٰ کا عنایت کیا ہوا وقت صرف اسی کی اطاعت کے لیے ہے۔ میں آپ کی آؤ بھگت کے لیے وقت کہاں سے لاؤں۔''

یہ امام اہل سنت کی شان استغنا کی کہ نوابوں کی بھی

پروا نہیں کی۔ یہ تو خیر نوابین تھے، آپ کسی بھی بڑے آدمی سے دنیاوی مقصد کے لیے ملنا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مہاتما گاندھی نے حاضری کا اذن چاہا۔ آپ نے انکار کر دیا۔ گاندھی جی بریلی پہنچ گئے کہ جب بریلی پہنچ ہی جاؤں گا تو ملاقات کر ہی لیں گے۔ بڑے بڑے علماء گاندھی سے مل رہے تھے اسی لیے انہیں یہ خوش فہمی تھی لیکن جب وہ بریلی پہنچے تو انہیں اعلیٰ حضرت کے انکار کا سامنا ہوا۔ مجبور ہو کر انہوں نے کچھ بااثر افراد کو درمیان میں ڈالا۔ ان حضرات نے بھی سفارش کی لیکن اعلیٰ حضرت نے جواب میں یہی فرمایا۔

''وہ مجھ سے دینی امور میں گفتگو کریں گے یا دنیوی امور کی بہبود کے متعلق۔ دینی امور سے متعلق تو گفتگو کر نہیں سکتے کہ وہ ہمارے دین سے واقف نہیں۔ رہا دنیوی بہبود کے متعلق تو جب میں نے اپنی دنیوی بہبود کی طرف توجہ نہ کی تو دوسروں کی دنیا سنوارنے کی فکر میں کس طرح اپنا وقت ضائع کر سکتا ہوں۔''

گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں۔ ''ہم اہلِ محبت کی ٹھوکر میں زمانہ ہے۔''

ایک طرف یہ عالم کہ بڑے بڑے لوگوں سے ملنا گوارا نہ کیا دوسری طرف یہ حال کہ غریبوں پر شفقت کے پھول نچھاور کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ بڑے لوگوں کے گھر پالکی میں جانا گوارا نہ کرتے غریبوں کی دعوت پر پیدل چلے جاتے۔

بریلی کے محلہ بازداراں میں ایک بیوہ خاتون ''اِننا بوا'' رہتی تھیں۔ نہایت متین اور سنجیدہ۔ چکی پیس کر گزارہ کرتی تھیں۔ بڑی آرزو تھی کہ کچھ پس انداز ہو جائے تو اپنے گھر پر میلاد کریں۔ یہ خواہش بھی تھی کہ اس میلاد میں اعلیٰ حضرت احمد رضا بھی تشریف لائیں۔ کچھ لوگوں سے ذکر کیا تو انہوں نے ہنسی اڑائی۔ اعلیٰ حضرت تمہارے اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں کہاں آئیں گے۔ جانتی نہیں ہو وہ تو نواب رام پور کی دعوت پر تشریف نہیں لے گئے۔

اننا بوا نے ایک روز سر پر برقع رکھا اور اعلیٰ حضرت کے حضور پہنچ گئیں۔ ''سرکار، بندی کی بڑی خواہش ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی باتیں میرے گھر میں ہوں۔''

''خدا کی بندی میلاد کیوں نہیں کراتی۔''

''وہی بتانے تو آئی ہوں۔ میں اپنے گھر میلاد کرا رہی ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ شرکت فرمائیں گے اور پڑھنے والے بھی آپ ہی تجویز فرمائیں گے۔''

''آئیں گے بھئی کیوں نہیں آئیں گے۔''

''لوگ کہتے ہیں آپ بڑے بڑے لوگوں کے گھر نہیں جاتے مجھ غریب کے گھر کیا آئیں گے۔''

''ان باتوں کو چھوڑو اننا بوا۔ میں آؤں گا۔''

اعلیٰ حضرت باوجود یکہ مسجد تک عصا کے سہارے آتے تھے اور جہاں کہیں جاتے تھے سواری میں جاتے تھے لیکن اس بیوہ خاتون کے گھر پیدل ہی گئے۔

کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اعلیٰ حضرت کے ساتھ میلاد خواں اور دیگر حضرات پاپیادہ گئے اور پاپیادہ آئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلمانوں کا ایک خاص علمی مرکز تھا۔ چیدہ چیدہ اساتذہ طلباء کی رہنمائی کے لیے موجود تھے۔ دینی تعلیم کے لیے تو بہت سے مراکز کھل گئے تھے لیکن وقت کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم کا بندوبست ہو۔ سرسید احمد خاں کا لگایا ہوا یہ پودا اس ضرورت کو بحسن وخوبی پورا کر رہا تھا۔

ان دنوں ڈاکٹر سر ضیاء الدین عظیم ریاضی داں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان کی رہنمائی میں یونیورسٹی ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔

سر ضیاء الدین کا رویہ اساتذہ کے ساتھ نہایت مشفقانہ تھا لیکن ادھر چند دنوں سے وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ دفتری مصروفیات میں بھی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ جب انہوں نے چھٹی کی درخواست دی اور بیرون ملک جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو بعض لوگوں کو تشویش ہوئی کہ معاملہ کیا ہے۔ مولانا سید سلیمان اشرف پروفیسر دینیات ان کے دوست تھے۔ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انہوں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''ڈاکٹر صاحب مجھے تو بتایئے آپ کو کیا ضرورت بیرون ملک لے جا رہی ہے۔ کیا پریشانی ہے۔ شاید میں کسی کام آسکوں۔''

''مولانا، آپ کا خلوص اپنی جگہ لیکن آپ کے پاس میری پریشانی کا حل نہیں ہوگا۔''

''پھر بھی معلوم تو ہو۔''

''ریاضی کا ایک مسئلہ ہے جو مجھ سے حل نہیں ہو رہا ہے۔''

''آپ باکمال ریاضی داں ہیں۔ جب آپ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا تو اور کس کے پاس جائیں گے۔''
''اسی لیے تو جرمنی جا رہا ہوں۔ یہ مشکل وہیں آسان ہوگی۔ میں نے تو بہت دماغ کھپا کر دیکھ لیا۔''
''کیا ہندوستان میں کوئی ایسا نہیں۔''
''بہت کوشش کر کے دیکھ لی۔''
''ہندوستان میں کم از کم ایک آدمی ایسا ہے اور اس کے پاس آپ یقیناً نہیں گئے ہوں گے۔''
''نام بتائیے۔''
''میرے مرشد امام اہل سنت احمد رضا خان بریلوی۔''
''مولانا یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میں کہاں کہاں تعلیم پا کر آیا ہوں اور حل نہیں کر سکا اور آپ ان صاحب کا نام لیتے ہیں جو غیر ممالک تو کجا ہندوستان کے کسی کالج میں بھی داخل نہیں ہوا۔ بھلا ان سے کیا معلوم ہو سکتا ہے۔''
''ان کی ذات گرامی علوم کا پہاڑ ہے۔ ان کے پاس ضرور کوئی نہ کوئی حل ہوگا۔''
''میں ان کے عالم ہونے سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ وہ دینی عالم ہیں اور میرا سوال جدید دنیاوی علم سے متعلق ہے۔''
''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ایک چکر بریلی کا بھی لگا لیجیے۔''
''مولانا، عقل بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' سر ضیاء الدین نے جھنجلا کر کہا۔ ''آپ مجھ کو کیا رائے دیتے ہیں۔ مسجد کا ایک مولوی میرا سوال حل کر دے گا؟''
سید سلیمان اشرف یہ سن کر خاموش ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے سفر کی تیاری شرع کر دی۔ اب یہ اعلیٰ حضرت کی توجہ تھی یا کیا تھا کہ سر ضیاء الدین بریلی جانے پر رضامند ہو گئے لیکن انہیں کچھ تحفظات بھی تھے۔
''مولانا، میں نے سنا ہے اعلیٰ حضرت نہایت سخت مزاج اور غصے کے تیز ہیں۔''
''آپ اس کی فکر نہ فرمائیں۔ یہ محض لوگوں نے مشہور کر دیا ہے۔ آپ ان کا اخلاق دیکھ کر تعجب کریں گے۔ بس صرف اتنا ہے کہ پہنچنے سے پہلے ان سے وقت لینا ہو گا۔''
''یہ کام تو آپ ہی کریں گے۔ مجھے تو صرف یہ بتا دیجیے گا کہ چلنا کب ہے۔''
''میں آج ہی خط لکھے دیتا ہوں۔''
مولانا سید سلیمان اشرف نے اس مضمون کا ایک خط تحریر کر دیا۔
''ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب جو ریاضی میں تقریباً ہر ولایت کی ڈگریاں اور تمغاجات حاصل کیے ہوئے ہیں عرصہ سے حضور کی ملاقات کے مشتاق ہیں چونکہ ایک جنٹلمین انگریزی وضع قطع کے آدمی ہیں اس لیے آتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اگر وہ پہنچیں تو انہیں باریابی کا موقع دیا جائے۔''
اعلیٰ حضرت نے مولانا صاحب کو جواب دیا کہ وہ بلا تکلف تشریف لے آئیں۔ فقیر منتظر رہے گا۔
اس جواب کے بعد بھی مولانا صاحب نے اتنی احتیاط کی کہ پہلے مارہرہ پہنچے۔ وہاں سے سجادہ نشین سید شاہ مہدی حسن میاں کو ساتھ لیا اور ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر بریلی پہنچ گئے۔
یہ حضرات اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پہنچے تو عصر کی نماز ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں ریاضی کا ایک مسئلہ دریافت کرنے آیا ہوں۔
''ارشاد فرمایئے۔''
''وہ کوئی ایسی بات نہیں جسے میں اتنی جلدی عرض کردوں۔''
''آخر کچھ تو فرمایئے۔''
ڈاکٹر صاحب نے سوال پیش کر دیا۔ اعلیٰ حضرت نے کچھ غور کرنے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ سنتے ہی فرمایا۔ ''اس کا جواب یہ ہے۔''
ڈاکٹر صاحب حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے اور پھر بے اختیار بول اٹھے۔
''میں سنا کرتا تھا کہ علم لدنی بھی کوئی شے ہے۔ آج آنکھ سے دیکھ لیا۔ میں تو اس کے حل کے لیے جرمنی جانا چاہتا تھا۔ مجھے جواب سن کر تو ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا جناب اس مسئلے کو کتاب میں دیکھ رہے تھے۔ آپ نے یہ علوم کہاں سے سیکھے؟''
''کہیں سے بھی نہیں۔ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں مکان کے اندر بیٹھا خود ہی کرتا رہتا ہوں۔'' اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کو بڑی حیرت ہوئی اور فرمایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"میرے یہاں کالج کی لائبریری میں ایک کتاب عربی میں ہے جس کا وجود دنیا میں معدودے چند نسخوں پر ہے یعنی ایک تو میرے یہاں اور ایک ایک جلد انگلینڈ، بھوپال، ریاست رام پور میں اور ایک نسخہ قسطنطنیہ میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے لیکن حضور انگریزی سے ناواقف ہیں۔ حضور فرمائیں تو میں ایک مولوی صاحب کو وہ کتاب دے کر خدمت والا میں بھیج دوں گا کہ وہ حضور سے آ کر سمجھ لیں۔ پھر ان سے میں سمجھ لوں گا اور ترجمہ کر دوں گا۔"

"بہتر ہے۔" اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

چند روز کے بعد ڈاکٹر صاحب کے فرستادہ مولوی صاحب وہ کتاب لے کر آ گئے اور حضور نے پڑھنا شروع کیا، حیرتوں کے پہاڑ ان مولوی صاحب پر بھی ٹوٹ پڑے جب انہوں نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت نے اس کمیاب کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اس طرح سمجھانا شروع کر دیا جیسے حضور نے اس کو بار بار پڑھا ہے۔

آپ کے حسن اخلاق اور علمیت کا یہ اثر ہوا کہ بریلی سے واپس ہونے پر ڈاکٹر صاحب نے داڑھی رکھ لی اور نماز کے بھی پورے پابند ہو گئے۔

شب و روز انہی علمی دینی مصروفیات میں گزر رہے تھے کہ مکہ معظمہ جانے کا اچانک موقع آ گیا۔ آپ کے مجھلے بھائی آپ کے بڑے بیٹے حامد رضا خاں و دور متعلقین نے حج پر جانے کا ارادہ کیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ حج فرض ادا ہو چکا تھا۔ ماں کے وہ جملے بھی یاد تھے جو انہوں نے پہلے حج کے موقع پر ادا کیے تھے۔

"حج فرض اللہ تعالیٰ نے ادا فرما دیا اب میری زندگی بھر دوبارہ ارادہ نہ کرنا۔"

ان جملوں کی روشنی میں وہ والدہ کی اجازت کے بغیر حج کی نیت نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ اعلیٰ حضرت کی اہلیہ بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں لہٰذا آپ احتراماً اس قافلے کو خدا حافظ کہنے کے لیے جھانسی تک ساتھ گئے جہاں سے ان لوگوں کو بمبئی میل میں بیٹھنا تھا جو انہیں سیدھا بمبئی پہنچا دے گا۔

اعلیٰ حضرت کو ان کے ساتھ نہیں جانا تھا صرف ان کو ہمسفری مقصود تھی۔ اس درمیان آپ کو اپنی ایک نعتیہ غزل یاد آ گئی۔

وائے محرومی قسمت کہ پھر اب کے برس
رہ گیا ہمرہِ زوار مدینہ ہو کر

اس شعر کا یاد آنا تھا کہ دل بے چین ہو گیا

پھر اٹھا ولولہ یادِ مغیلانِ عرب
پھر کھنچا دامنِ دل سوئے بیابانِ عرب

کیا کرتے افسوس کرتے آنسو بہاتے بریلی واپس آ گئے لیکن انتشار تھا کہ بڑھتا ہی گیا جب دل بہت بے قابو ہو گیا تو اضطراب سے مجبور ہو کر اپنے ایک شاگرد مولوی نذیر احمد کو اسٹیشن بھیجا کہ جا کر بمبئی تک سیکنڈ کلاس ریزرو کرا لیں کہ نمازوں کا آرام رہے۔

مولوی نذیر احمد اسٹیشن گئے اور اسٹیشن ماسٹر سے گاڑی مانگی۔

"کس ٹرین سے ارادہ ہے؟"

"اسی شب کی دس بجے والی گاڑی سے۔"

"یہ گاڑی نہیں مل سکتی۔ اگر آپ کو اس گاڑی سے جانا تھا تو چوبیس گھنٹے پیشتر اطلاع دیتے۔"

وہ مایوس ہو کر لوٹ ہی رہے تھے کہ ایک ٹکٹ کلکٹر مل گیا جو انہیں جانتا تھا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ بکنگ کرا دے گا۔ ٹکٹ کلکٹر انہیں لے کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچ گیا۔

اس نے کہہ سن کر سیکنڈ کلاس کی بکنگ کرا دی۔

بکنگ ہو گئی تھی اب صرف والدہ ماجدہ سے اجازت لینا باقی رہ گیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اجازت نہیں دیں گی اور ان کی اجازت کے بغیر جانا حرام ہے۔

اعلیٰ حضرت زنانے میں گئے تو دیکھا والدہ چادر اوڑھے آرام فرما رہی ہیں۔ موقع اچھا تھا۔ آپ نے آنکھیں بند کر کے قدموں پر سر رکھ دیا وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔

"کیا ہے۔ امن میاں کیا چاہیے۔"

"مجھے حج کی اجازت دیجیے۔"

والدہ بھی ایک ولی کی والدہ تھیں۔ ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "اللہ حافظ۔" بس اور کیا چاہیے تھا آپ الٹے پاؤں باہر آ گئے۔ سواری تیار تھی، بیٹھے اور اسٹیشن پہنچ گئے۔

اسٹیشن پہنچتے ہی ایک تار اپنی روانگی کا بمبئی روانہ کر دیا۔ اتفاق یہ بھی ہوا کہ پہنچنے میں ایک دن کی تاخیر ہو گئی۔ آگرہ میں میل نکل گئی اور آپ کو پسنجر سے جانا پڑا۔ یہاں تک کہ وہ دن آ گیا جب لوگ جہاز میں سوار ہونا شروع ہوئے آپ اس سوچ میں تھے کہ جہاز روانہ ہو جائے

گا اور میں رہ جاؤں گا۔

اللہ اللہ کر کے بمبئی پہنچے۔ اسٹیشن پر دیکھا کہ بمبئی کے احباب کا ہجوم ہے۔ سلام و مصافحہ کے بعد پہلی بات جو انہوں کی وہ یہ تھی کہ شہر کو نہ چلیے سیدھے جہاز پر چلیے ابھی آپ لوگ داخل نہیں ہوئے۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے مجھے تو تاخیر ہوگئی۔ وہ لوگ تو کل ہی سوار ہوگئے ہوں گے۔''

''نہیں، ابھی سوار نہیں ہوئے۔ واقعہ کیا ہے۔ وہاں جاکر معلوم ہوگا۔''

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ کی بے تابی نے ایک اور معجزہ دکھا دیا۔ آپ کے بغیر جہاز کیسے روانہ ہوسکتا تھا۔ لوگوں سے معلوم کیا تو عجیب بات سامنے آئی۔

''واقعہ عجیب بلکہ سخت عجیب ہے۔ ڈاکٹر آیا تھا چیک اپ کر کے لوگوں کو سوار کرا رہا تھا پھر اچانک اس کا دل گھبرایا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ باقی لوگ کل چیک اپ کرائیں۔ اب ایک اور دقت پیش آئی کہ اس جہاز کا ٹکٹ بالکل ختم ہوگیا جس پر اعلیٰ حضرت اور اہل خانہ کو جانا تھا مجبوراً دوسرے جہاز کا ٹکٹ خریدا اور وہ بھی تیسرے درجے کا۔ بعد میں اوّل درجے کا ٹکٹ تبدیل کرالیا۔

جب جہاز جدہ پہنچا تو عجیب ماجرا تھا۔ حجاج کی بے حد کثرت اور جانے کا صرف ایک راستہ۔ زنانی سواریاں ساتھ تھیں۔ اس بھیڑ میں کیسے راستہ بنتا۔ پانچ گھنٹے اسی انتظار میں گزر گئے کہ بھیڑ کم ہو تو نکلیں لیکن بھیڑ کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک عرب اعلیٰ حضرت کے نزدیک آیا اور پریشانی کا سبب دریافت کیا۔ ان صاحب کو اب سے پہلے جہاز پر نہیں دیکھا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے پریشانی کا سبب بتایا۔ اس عرب نے مشورہ دیا کہ اپنے مردوں کا حلقہ بنا لو اور درمیان میں عورتوں کو لے لو اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ غرض حلقے میں عورتوں کو لے کر ان عربی صاحب کے پیچھے ہولیے۔

جب راستہ طے ہوا تو فوراً وہ عربی صاحب نظروں سے غائب ہوگئے۔

جدہ پہنچتے ہی اعلیٰ حضرت کو بخار نے آلیا۔ اب بڑی فکر ہوئی کہ مناسک حج کیونکر ادا ہوں گے۔ سرکار اقدس سے عرض کی گڑگڑا کر دعا مانگی۔ دعا قبول ہوئی اور بخار جاتا رہا۔

جب بفضلہ تعالیٰ تمام مناسک حج ادا ہوگئے تو ایک مرتبہ پھر بخار عود کر آیا لیکن اب پروا نہیں تھی۔ آرام کا بہت موقع تھا۔

آپ کا لکھا ہوا اٹھائیس سوالوں پر مشتمل فتاویٰ کا مجموعہ آپ سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور توصیف کا سبب ٹھہرا تھا۔ خادمان دین آپ کے نام سے واقف ہو چکے تھے چنانچہ جب آپ کتب خانہ حرم پہنچے اور کتب خانے کے محافظ مولانا سید اسماعیل سے ملاقات کی تو وہ مل کر بہت خوش ہوئے۔ یہاں آپ نے کچھ کتابیں مطالعہ کے لیے نکلوائیں۔

مولانا شیخ صالح کمال سابق قاضی مکہ و مفتی حنیفہ سے ملاقات کی۔ ان دنوں وہاں مسئلہ علم غیب چھڑا ہوا تھا اور کچھ سوالات ان کے پاس آئے ہوئے تھے۔

آپ کے سامنے بھی ذکر آیا۔ آپ نے علم غیب کے مسئلے پر دو گھنٹے تقریر کی اور آیات و احادیث سے ثابت کیا اور مخالفین کے خیالات کو رد کیا۔

مولانا سے مقام قیام کا کوئی تذکرہ نہ آیا تھا اور وہ اعلیٰ حضرت سے ملاقات کے متمنی تھے۔ انہوں نے سوچا آدمی صاحبِ علم ہے ضرور کتب خانے میں آتا ہوگا۔ ان کا اندازہ درست تھا۔ ان کی ملاقات اعلیٰ حضرت سے ہوگئی۔ جب ملاقات ہوئی اور دفتر میں جاکر بیٹھے تو شیخ اسماعیل نے ایک پرچہ جیب سے نکالا جس پر علم غیب سے متعلق پانچ سوال درج تھے۔

''یہ سوال مخالفین نے حضرت سیدنا (شریف مکہ) کے ذریعے پیش کیے ہیں اور آپ سے جواب مطلوب ہے۔''

''اس میں کیا ہے قلم دوات لاؤ۔ ابھی لکھے دیتا ہوں۔'' اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

''بلکہ مفصل و مدلل جواب درکار ہے۔'' شیخ صالح نے فرمایا۔

''اس کے لیے قدرے مہلت درکار ہوگی۔''

''میں دو روز کی مہلت دیتا ہوں۔ تیسرے دن یہ مجھے مل جائے کہ میں شریف کے سامنے پیش کردوں۔''

آپ نے وعدہ فرما لیا اور اپنی قیام گاہ پر آکر رسالہ تصنیف کرنے بیٹھ گئے۔ دوسرے دن حضرت شیخ احمد ابوالخیر کا پیغام آیا کہ میں پاؤں سے معذور ہوں اور تمہارا رسالہ سننا چاہتا ہوں۔ آپ نے جتنے اوراق لکھے تھے لے کر

حاضر ہو گئے۔ حضرت شیخ نے اوّل تا آخر سن کر فرمایا۔ ’’اس میں علم خمس کی بحث نہیں آئی۔‘‘

’’اس واسطے کہ سوال میں نہ تھی۔‘‘ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

’’میری خواہش ہے کہ ضرور زیادہ ہو۔‘‘ شیخ نے فرمایا۔

اعلیٰ حضرت نے ان کی اس خواہش کو قبول کر لیا۔

دوسرے دن صبح کی نماز پڑھ کر حرم شریف میں آئے ہی تھے کہ ایک صاحب مولانا سید عبدالحئی جن کی اس وقت تک چالیس کتابیں علوم حدیثیہ و دینیہ مصر میں چھپ چکی تھیں، ان کا خادم پیام لایا کہ مولانا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ سوالات کے جواب لکھنے میں مصروف تھے۔ بہانہ کر دیا کہ آج کی معافی دیں کل میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ فوراً خادم واپس آیا انہوں نے کہلوایا تھا کہ میں آج ہی مدینہ جا رہا ہوں۔ ظہر پڑھ کر سوار ہو جاؤں گا۔‘‘

مجبور ہو کر مولانا کو تشریف آوری کی اجازت دے دی۔ وہ تشریف لائے۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔

پورا دن گزر گیا لکھنے کا کام کچھ نہ ہو سکا۔

اب آپ کے پاس صرف اس دن کی رات باقی تھی۔ عنایت الٰہی سے کتاب کی تکمیل ہو گئی اور صبح ہوتے ہی شیخ صالح کی خدمت میں پہنچا بھی دی۔ شیخ کمال نے دن بھر میں اس کا مطالعہ کیا اور جب عشاء کے بعد شریف مکہ کا دربار ہوا تو کتاب دربار میں پیش کر کے درباریوں کو مخاطب کیا۔

’’اس شخص نے وہ علم ظاہر کیا جس کے انوار چمک اٹھے اور جو ہمارے خواب میں بھی نہ تھا۔ شریف مکہ نے حکم دیا کہ کتاب بہ آواز بلند پڑھی جائے۔

نصف شب ہوئی اور کتاب آدھی باقی تھی۔ دربار کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ شریف مکہ نے حکم دیا کہ کتاب پر نشانی لگا دی جائے اور کتاب بغل میں دبا کر بالا خانے پر تشریف لے گئے۔

یہ کتاب شریف مکہ کے پاس ہی رہی۔ اصل سے متعدد نقلیں مکہ معظمہ کے علمائے کرام نے لیں اور تمام مکہ میں اس کتاب کا شہرہ ہوا۔

اس شہرت نے علماء میں آپ کو ایسا مقبول کیا کہ جگہ جگہ دعوتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ وہاں کے علماء میں ایسے مقبول ہوئے کہ یہ حضرات آپ کی قیام گاہ پر تشریف لاتے اور نصف شب تک ملاقاتوں ہی میں وقت صرف ہوتا۔

ایک صاحب مولانا عبدالحق الہ آبادی کو چالیس سال مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے ہو گئے تھے۔ کبھی شریف مکہ کے ہاں بھی تشریف نہ لے گئے لیکن اعلیٰ حضرت سے ملنے دو مرتبہ قیام گاہ پر تشریف لائے۔ ان کے تلامذہ اس پر سخت حیران تھے اور کہتے تھے یہ محض خرق عادت ہے ورنہ یہ تو شریف مکہ سے ملنے کی روادار نہیں اور آپ سے ملنے دو مرتبہ آئے۔

مولانا عبدالحق ہندی تھے مگر ان کے انوار مکہ میں چمک رہے تھے۔ التزاماً ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ حج کے علاوہ کبھی گھر سے نہ نکلے۔

ان علماء کے برخلاف ایک صاحب ایسے تھے جو ملنے نہ آئے۔ یہ تھے شیخ عبداللہ بن صدیق بن عباس۔ یہ اس وقت مفتی حنفیہ تھے۔ مفتی حنفیہ کا منصب شریف سے دوسرے درجے میں سمجھا جاتا تھا۔ اپنے منصب کی طلالت قدر نے انہیں اعلیٰ حضرت کے پاس آنے سے روکا البتہ ایک روز ان کا پیغام آیا کہ میں آپ کی زیارت کا مشتاق ہوں۔ اعلیٰ حضرت نے چاہا کہ ان سے ملنے جائیں لیکن قریب بیٹھے ہوئے اکابرین نے انہیں روک دیا کہ تمام علماء ملنے آتے ہیں وہ کیوں نہیں آسکتے۔ آپ کیوں جاتے ہیں۔ یوں یہ ملنا رہ گیا۔

ایک روز اعلیٰ حضرت کتب خانے میں تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک وجیہ و شکیل ہستی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ غور سے دیکھا تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کے ہاتھ میں جو رسالہ ہے وہ اعلیٰ حضرت کا تصنیف کردہ ہے جو انہوں نے حال ہی میں بارہ سوالوں کے جواب میں لکھا تھا۔ اس وقت تک نہ اعلیٰ حضرت ان سے واقف تھے نہ شیخ عبداللہ انہیں جانتے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے محافظ کتب خانہ سے اعلیٰ حضرت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ’’یہ کون صاحب ہیں‘‘ محافظ کتب خانہ نے بتایا کہ جو رسالہ آپ کے زیر مطالعہ ہے یہ اس کے مصنف احمد رضا بریلوی ہیں۔ شیخ عبداللہ کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں ہوئے کہ جس سے میں ملنے نہیں جاتا تھا اس سے ملاقات ہوئی تو کہاں ہوئی۔ وہ ملے ضرور لیکن خجالت کے ساتھ اور عجلت کے ساتھ اٹھ گئے۔

حج کے بعد سے آپ بخار کے مرض میں مبتلا تھے۔

اسی حالت میں تمام کام بھی نمٹائے جا رہے تھے۔ تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری تھا۔ بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ادھر سرکار اقدس کے روضے کی زیارت کی جلدی تھی آپ نے اس حالت میں حاضری کا قصد کیا۔ علماء نے مخالفت کی۔ ”حالت آپ کی یہ ہے اور سفر طویل۔“

”میں کیسے انتظار کرلوں۔“ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

”سچ پوچھیے تو حاضری کا اصل مقصود زیارت طیبہ ہے۔ دونوں بار اسی نیت سے گھر سے چلا۔ معاذ اللہ اگر یہ نہ ہو تو حج کا کچھ لطف نہیں۔“

”آپ ایک بار زیارت کر تو چکے ہیں۔“

”یہ کہاں لکھا ہے کہ عمر میں کتنے ہی حج کرے زیارت ایک بار کافی ہے، ہر حج کے ساتھ زیارت ضروری ہے بس آپ لوگ دعا فرمایئے کہ سرکار تک پہنچ لوں۔ روضہ اقدس پر ایک نگاہ پڑ جائے۔ اگرچہ اسی وقت دم نکل جائے۔“

عزم حاضری سرکار اعظم مصمم ہو گیا۔ اونٹ کرائے پر لے لیے۔ اشرفیاں پیشگی دے دیں۔ اکابر علماء سے رخصتی کی ملاقاتوں میں خوب چائے کے دور چلے۔ یہاں بے دودھ کی چائے پی جاتی تھی جس کے آپ عادی نہیں تھے۔ بے دودھ کی چائے گردوں کے لیے مضر ہوتی ہے اور اعلیٰ حضرت کے گردے پہلے ہی ضعیف تھے۔ رات ہوئی تو گردوں میں ایسا درد اٹھا کہ ساری رات جاگتے گزر گئی۔ صبح مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہونا تھا مگر درد گردہ نے روانگی ملتوی کرا دی۔ اونٹ واپس کردیے جو پیشگی اشرفیاں دی تھیں وہ بھی گئیں۔

ایک ترکی ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ پوری طرح صحت نہیں ہوئی تھی صرف افاقہ ہوا تھا۔ مسلسل درد تو ختم ہو گیا تھا لیکن رہ رہ کر اب بھی اٹھ رہا تھا۔ تاب انتظار اب کہاں تھی۔ دوبارہ اونٹ کرائے پر لیے اور کعبہ جاں کی طرف روانہ ہو گئے۔

بشریت کا تقاضا تھا کہ درد گردہ سے ڈر لگ رہا تھا لیکن راستے بھر درد کی چمک تک نہ ہوئی۔ یہی نہیں بلکہ پھر زندگی بھر گردے میں درد نہیں اٹھا۔

جدہ پہنچ کر کشتی میں سوار ہوئے۔ تین روز کے بعد یہ کشتی ایک مقام ”رابغ“ پہنچی۔ یہاں کے سردار شیخ حسین تھے۔ ان کی محبت سے ایک مکان میں قیام کیا۔

چند روز قیام کے بعد جب روانگی کا وقت آیا تو اونٹ کرایہ کیے گئے۔ تمام سامان جو ساتھ لے جانا تھا جس میں کپڑے وغیرہ تھے سامنے سڑک پر رکھ دیا گیا۔ اعلیٰ حضرت اور ان کے ساتھ جو لوگ تھے سوار ہو گئے اور یہ خیال کیا کہ اس قافلے والوں نے جہاں اوروں کا سامان رکھا ہے ہمارا بھی رکھ دیا ہوگا۔

راہ میں ایک جگہ بیئر شیخ پر پہنچے۔ منزل چند میل باقی تھی اور فجر کا وقت قریب تر تھا۔ قافلے کے اونٹ والوں کا اصرار تھا کہ وہ منزل پر ہی جا کر دم لیں گے یہاں نہیں رکیں گے۔ جسے نماز پڑھنی ہو وہیں جا کر پڑھے۔ اعلیٰ حضرت تو ہندوستان میں رہ کر ایسی ٹرین میں نہیں بیٹھتے تھے جس میں نماز قضا ہونے کا خطرہ ہو۔ وہ فوراً قافلے سے الگ ہو گئے۔ قافلہ چلا گیا۔ اعلیٰ حضرت کے رفقاء بھی آپ کے ساتھ تھے۔ کرِچ کا ڈول پاس تھا لیکن رسی نہیں تھی اور کنواں گہرا تھا۔ عمامے باندھ کر پانی نکالا، وضو کیا خدا کا شکر کہ نماز ہو گئی۔

اب یہ فکر ہوئی کہ منزل تک پہنچنے کے لیے پیدل کیسے چلیں گے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک اونٹ والا اونٹ لیے کھڑا ہے۔ اس آڑے وقت میں اس امداد پر خدا کی حمد ہی ادا کی جاسکتی تھی۔ آپ اس پر سوار ہو گئے اور اس سے پوچھا تم یہ اونٹ کیوں لائے جب کہ تم مجھ سے واقف بھی نہیں۔ اس نے کہا ہمیں شیخ حسین نے تاکید کردی تھی کہ شیخ کی خدمت میں کمی نہ کرنا۔ اعلیٰ حضرت نے بھی سوچا ہوگا آم کھاؤ گٹھلیاں کیوں گنتے ہو۔ کچھ اور آگے چلے تھے کہ ان اونٹوں میں سے ایک اونٹ والا کھڑا ہے جو قافلے میں شامل تھا۔

”قافلہ تو چلا گیا تھا تم یہاں کیسے؟“

”جب قافلے کے ساربان نہ ٹھہرے، میں نے سوچا شیخ کو تکلیف ہوگی قافلے میں سے اونٹ کھول کر واپس لے آیا۔“

یہ سب اس سرکار کی رحمتیں تھیں جس کے دربار میں آپ جا رہے تھے کہ قدم قدم پر امداد پہنچ رہی تھی۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

منزل پر پہنچے تو بدن کے کپڑے میلے ہو گئے تھے اور کپڑے رابغ میں چھوٹ گئے تھے اور ایک یا دو منزل پہلے شب کو جوتا کہیں راستے میں نکل گیا۔

مدینہ شریف پہنچ کر عربی وضع کا لباس اور جوتا خرید کر

پہنا اور یوں مواجہ اقدس کی حاضری نصیب ہوئی۔ شاید یہ بھی حضور کی طرف سے تھا کہ عربی لباس میں بلانا چاہا کیونکہ صرف ایک روز بعد ہی آپ کو آپ کے کپڑے اور دوسرا سامان مل گیا۔

ایک بدوی اونٹ پر سوار پہنچا کہ تمام اسباب جو رابغ میں رہ گیا تھا اس پر بار تھا۔ اس نے شیخ حسین کا رقعہ لا کر دیا کہ یہ آپ کا اسباب رہ گیا تھا روانہ کر دیتا ہوں۔

جب آپ پہلی مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے تو مکہ شریف سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے یہ نعت شریف لکھی تھی۔

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

یہی نعت اب بھی پڑھتے ہوئے شہر مدینہ میں داخل ہوئے تھے۔ جب یہ نعت لکھی تھی آپ صرف 23 سال کے تھے اور اب عمر عزیز تقریباً پچاس سال تھی۔

روضۂ رسولؐ پر پہنچے تو حالت وہی تھی جو پہلے سے معلوم تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دل تھا کہ سینے کا پنجرا توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا۔ قدم اٹھتے نہیں تھے اٹھائے جا رہے تھے۔ یہ سنہری جالیاں عرصہ بعد دیکھنا نصیب ہوئی تھیں۔ احباب سہارا دے کر یہاں تک لائے تھے مگر اب کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ ادب ایسا تھا کہ لڑکھڑانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ زبان مبارک پر اپنا ہی کلام بلاغت نظام دعا کی صورت جاری تھی

یاالٰہی ہر جگہ تیری عطا کا ساتھ ہو
جب پڑے مشکل شہ مشکل کشا کا ساتھ ہو
یاالٰہی بھول جاؤں نزع کی تکلیف کو
شادیٔ دیدار حسنِ مصطفیٰ کا ساتھ ہو
یاالٰہی گورِ تیرہ کی جب آئے سخت رات
ان کے پیارے منہ کی صبح جانفزا کا ساتھ ہو
یاالٰہی جب پڑے محشر میں شور دار و گیر
امن دینے والے پیارے پیشوا کا ساتھ ہو
یاالٰہی جب زبانیں باہر آئیں پیاس سے
صاحب کوثر شہ جود و سخا کا ساتھ ہو
یاالٰہی نامہ اعمال جب کھلنے لگیں
عیب پوشِ خلق ستارِ خطا کا ساتھ ہو
یاالٰہی جب چلوں تاریک راہ پل صراط
آفتاب ہاشمی نورالہدیٰ کا ساتھ ہو
یاالٰہی جب رضا خواب گراں سے سر اٹھائے
دولتِ بیدار عشق مصطفیٰ کا ساتھ ہو

شوقِ دیدار میں روضہ شریف کے مواجہ میں درود شریف پڑھتے رہے۔ یقین کیا کہ ضرور حضور پرنور عزت افزائی فرمائیں گے اور بالمواجہ زیارت سے مشرف فرمائیں گے لیکن پہلی شب ایسا نہ ہوا۔ آپ کبیدہ خاطر ہو کر غزل لکھنے بیٹھ گئے۔ سونے کے تھال میں اشرفیاں اترنے لگیں۔

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
ہر چراغ مزار پر قدسی
کیسے پروانہ وار پھرتے ہیں
اس گلی کا گدا ہوں میں جس میں
مانگتے تاجدار پھرتے ہیں
پھول کیا دیکھوں میری آنکھوں میں
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں
لاکھوں قدسی ہیں کام خدمت پر
لاکھوں گردِ مزار پھرتے ہیں
کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضا
تجھ سے کتنے ہزار پھرتے ہیں

یہ غزل مواجہ میں عرض کر کے مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ غزل کا مقطع بار بار ذہن میں گونج رہا تھا

کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضا
تجھ سے کتنے ہزار پھرتے ہیں

اچانک قسمت جاگ اٹھی۔ عالم بیداری میں زیارت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشرف ہوئے۔

کنواں سامنے تھا اور پیاس زوروں پر تھی۔ جب ہجوم احباب سے فرصت ملتی روضۂ رسولؐ کی زیارت کر آتے۔ طیبہ کی ٹھنڈی چھاؤں میں پورا ایک مہینا گزرا لیکن صرف ایک بار مسجد قبا کو گئے اور ایک مرتبہ زیارت حضرت سید الشہداء امیر حمزہؓ کو حاضر ہوئے باقی سرکار اقدسؐ ہی کی حاضری رکھی۔

یہاں کے علماء نے مکہ معظمہ کے علماء سے بھی زیادہ آپ پر مہربانیوں کے پھول نچھاور کیے۔ مکہ معظمہ کے علماء آپ کی علمیت کا لوہا مان چکے تھے گویا ایک سلطنت فتح کر آئے تھے۔ آپ نے مکہ کے قیام کے دوران جو رسائل تصنیف کیے تھے ان کی شہرت یہاں بھی پہنچی تھی۔ جن

سوالوں کی تحقیق میں لوگ مہینوں لگا دیتے ہیں اعلیٰ حضرت نے دنوں میں تحریر کر دیے تھے اور وہ بھی ایسے مدلل کہ مخالفین لاجواب ہونے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

عربوں کو یہ بھی حیرت ہوتی تھی کہ ایک ہندی نژاد کو عربی پر ایسا عبور کیونکر ہے۔ جب ایسے جید عالم عاشق رسولؐ اور یکتائے روزگار مصنف کو اہل مدینہ نے اپنے درمیان دیکھا تو پروانہ وار نثار ہونے لگے۔ صبح سے عشا تک علمائے کرام کا ہجوم رہتا۔ خصوصاً مولانا سید محمد مغربی جو شیخ الدلائل کہلاتے تھے ان کے الطاف کی تو حد ہی نہیں تھی۔ کمال مہربانی سے اعلیٰ حضرت کو جب خطاب کرتے "یا سیدی" فرماتے۔ اعلیٰ حضرت شرماتے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ "حضرات سید تو آپ ہیں۔" (یہ فقیر تو نسلاً پٹھان ہے)۔

"واللہ تم سید ہو۔" حضرت مولانا نے فرمایا۔

"میں سیدوں کا غلام ہوں۔" اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"یوں بھی تو سید ہوئے۔" مولانا سید محمد سعید مغربی نے فرمایا۔ "نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ قوم کا غلام آزاد شدہ اسی قوم سے ہے۔"

اہم ترین علمائے آپ کے رسائل "حسام الحرمین اور والدولۃ المکیہ" پر تقریظات لکھ کر آپ کو خراج تحسین پیش کیا۔ رسائل کی نقلیں علماء کی آنکھوں کا سرمہ بنا۔

علماء اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہم سال ہا سال سے سرکار میں مقیم ہیں۔ اطراف و اکناف سے علماء آتے ہیں، جوتیاں چٹخاتے چلے جاتے ہیں، کوئی بات نہیں پوچھتا اور تمہارے پاس علماء کا یہ ہجوم ہے۔

اعلیٰ حضرت خندہ پیشانی سے فرماتے، میرے سرکار کا کرم ہے۔

اپنے کرم کا جب وہ صدقہ نکالتے ہیں
ہم سوں کو پالتے ہیں اور ایسا پالتے ہیں

رخصت کا وقت آگیا۔ قافلے کے اونٹ لوٹ آنے۔ پابہ رکاب ہونے تک علماء کو اجازت نامے لکھ کر دیے۔ چلتے وقت حضرات مدینہ نے بیرون شہر دور تک مشایعت کی۔ اونٹ جدہ کے لیے کیے تھے۔ گرمی کا موسم آگیا تھا۔ سر پر آفتاب اور پاؤں کے نیچے گرم ریت یا پتھر۔

جدہ پہنچ کر جہاز تیار ملا۔ بمبئی کے ٹکٹ مل رہے تھے۔ ٹکٹ خریدے گئے اور اطمینان کے ساتھ جہاز میں سوار ہو گئے کہ اب بمبئی تک کا سفر آرام سے کٹ جائے گا۔ اس تصور سے دل خوش تھا کہ بمبئی کے ساحل پر احباب استقبال کے لیے موجود ہوں گے لیکن یہ خواب اس وقت ٹوٹ گیا جب عدن پہنچ کر اعلان ہوا کہ جہاز بمبئی نہیں کراچی جائے گا۔ پہلے یہ قصد کیا کہ جہاز سے اتر جائیں اور بمبئی جانے والے جہاز میں سوار ہو جائیں لیکن پھر ایسے بکھیڑے ہوئے کہ کراچی جانے ہی میں عافیت جانی۔

جب کراچی پہنچے تو جیب میں صرف دو روپے باقی تھے اور یہاں کسی سے تعارف نہیں تھا۔ اسباب کثیر اور یہاں محصول تک دینے کو نہیں۔ دل سے یہی دعا کی کہ جن کے دیدار کو گیا تھا وہی مدد کریں گے۔

ایک گورا آیا اور سامان کی چھان پھٹک کے بعد بارہ آنے کا محصول کہا۔ بارہ آنے کا محصول اس سامان کو دیکھتے ہوئے بہت کم تھا لیکن اس انگریز نے خود طے کیا تھا لہٰذا خوشی خوشی بارہ آنے محصول کے ادا کر دیے۔ چند منٹ بعد وہ پھر واپس آیا۔ صندوق وغیرہ ایک مرتبہ پھر دیکھے اور پھر باز آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اب خود شک ہو رہا تھا کہ سامان زیادہ لیکن جب دیکھتا تھا تو آنکھوں پر پہرے پڑ جاتے تھے۔ تیسری مرتبہ پھر واپس آیا۔ سارا سامان ایک مرتبہ پھر اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر بارہ آنے کیے اور رسید دے کر چلا گیا۔ یہ دعا ہی کا اثر تھا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔

اب صرف سوا روپیا باقی رہ گیا تھا۔ روپے منگوانے کے لیے بریلی تار بھیجا گیا لیکن وہاں یہ تار مشکوک سمجھا گیا کہ تار بمبئی سے آنا چاہیے تھا کراچی سے کیوں آیا۔ بہر حال روپے پہنچ گئے۔

آپ بمبئی میں رونق افروز ہوئے تو ہر شخص چاہتا تھا اس پھول کو وہ اپنے باغ میں سجائے بعض احباب نے ضد کی اور اپنے ساتھ احمد آباد لے گئے۔

آپ کے ساتھ خاندان کے جو دیگر افراد تھے انہیں واپس بھیج دیا۔

مولانا شاہ عبدالسلام تشریف لائے اور دیرینہ نیاز مندوں کی وجہ سے جبل پور میں رونق افروزی کی دعوت دی لیکن آپ اس وقت تشریف نہیں لے جا سکتے تھے معذرت کر لی۔

"ابھی تو سرکار اجمیر مقدس کی حاضری کا شرف حاصل کرنا ہے۔ آیندہ موقع نکال کر ضرور آنے کی کوشش

کروں گا۔“

یہ موقع جلد آ گیا۔ اعلیٰ حضرت سفر سے بہت گھبراتے تھے لیکن دعوت نامہ آیا تو انکار نہ کر سکے۔ مولانا عبدالسلام نے اپنے صاحبزادے کے ہاتھ خط بھیجا اور حضور کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ اعلیٰ حضرت نے خط کو بہ غور پڑھا اور صاحبزادے سے فرمایا۔ ”مولانا کے بے حد کلمات تواضع نے کوئی پہلو عذر کا چھوڑا ہی نہیں۔ اگر بالفرض کسی کے لبوں پر بھی دم ہو وہ بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کلمات کو سن کر یہی کہے گا کہ میں حاضر ہوں۔“ وعدہ فرما لیا اور سفر کی تیاری شروع کر دی۔

آپ کے ساتھ چند افراد کو جانا تھا۔ ان سب کے لیے علی الصباح روانہ ہونے والے پنجاب میل میں سیکنڈ کلاس کا ڈبہ ریزرو کرالیا۔

سب نے طے کیا کہ صبح چار بجے اسٹیشن پہنچا جائے۔ اعلیٰ حضرت کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ نماز کا وقت قریب تھا۔ آتے ہی فرمایا۔ ”مصلیٰ بچھایئے۔ میں نماز پڑھوں گا۔“

”حضور پنجاب میل روانہ ہونے کو ہے۔“ ”نماز سے پہلے کیسے جا سکتی ہے۔“ آپ نے فرمایا اور نیت باندھ لی۔

انجن نے سیٹی دی تو سب لوگ پریشان ہو گئے۔ کچھ لوگ ڈبے میں بیٹھ گئے اور کچھ اعلیٰ حضرت کے قریب کھڑے رہے کہ جیسے ہی آپ نماز ختم کریں انہیں لے کر ڈبے میں جایا جائے۔

اعلیٰ حضرت کو ذرا بھی اضطراب نہیں تھا۔ اسی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کی جو آپ کی عادت تھی بلکہ وہ وظیفہ بھی پڑھا جو نماز فجر کے بعد پڑھتے تھے۔ انجن وسل دے چکا تھا لیکن گاڑی تھی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

”حضور گاڑی چھوٹنے والی ہے تشریف لے چلیں۔“

”اچھا چلیے۔“ آپ نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

عوام جلد جلد دست بوسی کرنے لگے اور اسی وقت سلسلہ بیعت شروع ہو گیا اور گروہ کے گروہ مرید ہونے لگے۔ یہاں تک کہ آفتاب خوب بلند ہو گیا۔ گاڑی اب بھی نہیں چلی تھی۔ بعض لوگوں نے اسٹیشن ماسٹر سے جا کر سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ لائن صاف نہیں ہے۔

”برہان میاں کہاں ہیں جو کہہ رہے تھے گاڑی چھوٹنے والی ہے۔“ غرض گاڑی بدستور کھڑی ہے اور لوگ جوق در جوق آ رہے ہیں اور مرید ہو رہے ہیں۔

اسی وقت اسٹیشن ماسٹر سے معلوم ہوا کہ کسی اسٹیشن پر گاڑی کا پہیا پٹڑی سے اتر گیا ہے جس کے باعث لائن خراب ہو گئی ہے۔ اب عنقریب روانہ ہونے والی ہے۔ اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت کے تمام کام نمٹ چکے تھے۔

گاڑی چلی اور مختلف اسٹیشنوں سے گزری تو ایک اور منظر قابلِ دید تھا۔ لوگوں کو نا معلوم کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ حضور اس گاڑی سے جبل پور جا رہے ہیں۔ گاڑی جس اسٹیشن پر رکتی تھی عوام کی کثرت آپ کی منتظر تھی۔ شاذ و نادر ہی کوئی اسٹیشن ایسا ہو گا جس پر لوگ آپ کے مرید نہ ہوئے ہوں۔ جس اسٹیشن پر گاڑی کم رکتی لوگ چلتی گاڑی کے پیچھے بھاگتے جاتے۔ ”حضور ہمیں مرید کر لیجیے۔“ آپ فرماتے۔ ”میں نے غوث پاک کی غلامی میں آپ حضرات کو قبول کیا۔“

گاڑی رات بھر چلتی رہی۔ سحر کی سپیدی نمودار ہوئی تو گاڑی ایک چھوٹے اسٹیشن پر رکی۔ یہاں ٹرین صرف دو منٹ کے لیے ٹھہرتی تھی۔ لوگ فریضہ فجر ادا کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ صف بندی ہو گئی۔ اعلیٰ حضرت نے امامت فرمائی اور دیر تک وظائف پڑھتے رہے۔

اسٹیشن ماسٹر نے یہ دیکھ کر گاڑی کھڑی رکھی۔ دو منٹ ٹھہرنے والی گاڑی نصف گھنٹا ٹھہری رہی۔

جبل پور کے اسٹیشن کا منظر دیدنی تھا۔ جس طرف نظر پڑتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ گاڑی پہنچتے ہی نعرہ تکبیر کے نعروں سے اسٹیشن گونج اٹھا۔

بڑی مشکل سے سیکنڈ کلاس کے سامنے سے ہجوم کو ہٹایا گیا۔ اس قدر گل ریزی ہوئی کہ پھول کی پتیوں سے زمین چھپ گئی۔

اسٹیشن کے باہر کثرت سے سواریاں لگا دی گئی تھیں۔ ایک بہترین موٹر ہار پھولوں سے سجی ہوئی اعلیٰ حضرت کے لیے تھی۔

”یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔“

سواری چلی تو دوسری سواریوں کی قطار نے جلوس کی شکل اختیار کر لی۔ یہ جلوس ایک میل سے کسی طرح کم نہ ہو گا۔ جگہ جگہ دروازے بنائے گئے تھے جن پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”السلام علیکم یا امام اہل سنت“ کسی پر تحریر ”السلام علیکم یا مجدد ماۃ حاضرہ“ یورپین اور ان کی میمیں اور بچے اپنے بنگلوں سے باہر نکل آئے تھے۔ مستورات چھتوں

سے نظارہ کر رہی تھیں۔ دکاندار اپنی دکانوں سے نیچے اتر کر پرے جمائے اس شاندار جلوس کو دیکھ رہے تھے۔

یہ جلوس کئی گھنٹے کی مسافت کے بعد مولانا عبدالسلام جبل پوری کے کاشانہ اقدس پہنچا۔ مکان کی زیب و زینت بھی قابل دید تھی۔ ترکی قالین بچھائے گئے تھے۔ در و دیوار بیش قیمت کپڑوں سے سجا دیے گئے تھے۔

اعلیٰ حضرت کے تشریف رکھنے پر نعت خوانی کا سلسلہ شروع ہوا۔

نعتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا
ساتھ ہی منشیِ رحمت کا قلم دان گیا
لے خبر جلد کہ غیروں کی طرف دھیان گیا
میرے مولیٰ مرے آقا ترے قربان گیا
دل ہے وہ دل جو تری یاد سے معمور رہا
سر ہے وہ سر جو ترے قدموں پہ قربان گیا
جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینہ پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا

☆

صدقے میں ترے باغ تو کیا لائے ہیں بن پھول
اس غنچۂ دل کو بھی تو ایما ہو کہ بن پھول
واللہ جو مل جائے مرے گل کا پسینا
مانگے نہ کبھی عطر نہ پھر چاہے دلہن پھول
دل بستہ و خوں گشتہ نہ خوشبو نہ لطافت
کیوں غنچہ کہوں ہے مرے آقا کا دہن پھول
دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخنِ پا کا
اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اے چرخِ کہن پھول
کیا بات رضا اس چمنستانِ کرم کی
زہرہ ہے کلی جس میں حسین اور حسن پھول

اعلیٰ حضرت کو ایک ایسے مکان میں ٹھہرایا گیا تھا جو مسجد کے قریب تھا۔ پانچوں وقت کی نماز آپ اسی مسجد میں ادا فرماتے تھے جو اوقات نماز کے نہیں تھے ان میں تحریری کام کیا کرتے تھے جو آپ کی غذائے روحی تھی۔ شمع جلے اور پروانے نہ ہوں۔ اعلیٰ حضرت کہیں موجود ہوں اور مشتاقان ملاقات نہ ہوں۔ اس کثرت سے لوگ آرہے تھے کہ ملاقات کا وقت مقرر کرنا پڑا۔

عصر اور مغرب کے درمیان اعلیٰ حضرت تحریری کام نہیں کیا کرتے تھے کہ بینائی پر اثر پڑتا ہے لہٰذا میزبانوں نے طے کیا کہ بعد نماز عصر آپ کو شہر سے باہر بغرض تفریح لے جایا کریں گے۔

ایک روز طے ہوا کہ اعلیٰ حضرت کو کچھ قدرتی مناظر دکھانے چاہئیں چنانچہ بھیرا گھاٹ جسے دھوا دھار بھی کہتے تھے علی الصباح چلنا تجویز ہوا۔ موٹر وغیرہ آگئے اور اعلیٰ حضرت قافلے کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ ابھی دھواں دھار کا مقام پانچ چھ میل تھا کہ ایسی آواز سنائی دی جیسے بڑے زور سے ریل گاڑی آرہی ہو۔ معلوم ہوا کہ یہ ریل کی آواز نہیں ہے بلکہ دھواں دھار کی آواز ہے جو دم بہ دم اور زیادہ مہیب ہوتی جا رہی تھی۔ قریب دوپہر وہ مقام آگیا جہاں ایک بنگلے میں حضور کو مع ہمراہیان ٹھہرایا جانا تھا۔

قافلے کے پہنچنے سے پہلے ہی باورچی وغیرہ پہنچ گئے تھے لہٰذا کھانا تیار تھا۔ دستر خوان بچھا دیا گیا۔

کھانے کے بعد اعلیٰ حضرت نے قدرے آرام کیا۔

اب دھواں دھار چلنے کی رائے قرار پائی۔ اعلیٰ حضرت کے آرام و سہولت کی خاطر ایک ڈولی بنا کر آپ کو اس میں بٹھا دیا گیا اور دھواں دھار کی طرف چلے۔ کچھ دور پہنچنے کے بعد دریائے نربدا بہتا نظر آیا جس کا نصف پاٹ تو ایسا تھا کہ پہاڑ کے پتھر جس پر بہاؤ تھا قریب قریب ابھرے ہوئے تھے جس پر لوگ پاؤں رکھتے ہوئے ڈولی کے ساتھ ساتھ بے تکلف چلے گئے۔ اب آگے پتھر غائب ہو گئے تھے بلکہ پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ یہ پانی کئی سو فٹ نیچے ایک پہاڑی کے درے میں گر رہا تھا اور گرنے کے بعد دھوئیں کی شکل میں اٹھ رہا تھا۔ اسی لیے یہ دھواں دھار کہلاتا تھا۔

یہاں سے واپس آکر سب لوگوں نے ڈاک بنگلے میں آرام کیا اور پھر نماز ظہر ہوئی۔

اس کے بعد وہیں ایک پہاڑی پر جانے کا اتفاق ہوا جس پر چڑھنے کے لیے پتھر کی پانچ سو سیڑھیاں تھیں۔ اس مقام کا نام چونسٹھ چکنی تھا۔ یہاں وہ بت محفوظ تھے جنہیں اورنگ زیب عالمگیر نے توڑا تھا۔ یہاں ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر یہ ہدایت لکھی ہوئی تھی کہ کوئی ان بتوں کی مرمت نہ کرے۔ اعلیٰ حضرت نے اس بورڈ کو پڑھا اور فرمایا۔

''جن کی عالمگیر نے مرمت کی ہو ان کی مرمت کون کر سکتا ہے۔''

اوپر گھاٹی میں جا کر دیکھا تو بیچ میں ایک مندر تھا اور باہر احاطے میں بڑے بڑے بت رکھے تھے مگر کوئی سالم نہیں تھا۔

نماز عصر یہیں ادا ہوئی۔ نماز کے بعد سب لوگ کشتی میں سوار ہوئے اور اس بحری درے میں جس کے دونوں

جانب سنگ مرمر کی سربہ فلک چٹانیں کھڑی تھیں۔ یہ چٹانیں اس لیے قابل دید تھیں کہ کسی جگہ کوئی چٹان اس طرح ترشی ہوئی تھی کہ چاند کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ایک جگہ پہاڑ پر بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سیاہ فام شخص برہنہ سر سفید کرتہ پہنے کنارے پر بیٹھا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے کچھ دیر کے سفر کے بعد فرمایا۔ ''اب سے پہلے تقریباً بارہ سال ہوئے میں نے اس دریے میں ایک فقیر کو دیکھا تھا۔ اس کی جھونپڑی بھی یہیں کہیں تھی۔''

کشتی آگے بڑھی۔ دور سے دیکھا کہ جھونپڑی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ فقیر کا نام ونشان نہیں تھا اور وہیں دیکھا پانی پر دور تک سیاہ کائی سی جمی تھی۔ ملاحوں نے فوراً کشتی روکی اور گھبرا کر کہا۔ کوئی بیڑی پینے کے لیے دیا سلائی نہ جلائے۔ یہ کائی نہیں ہے شہد کی مکھیاں پانی پی رہی ہیں۔ خیریت گزری کہ ابھی کشتی کی رفتار سے پانی کی لہر وہاں تک پہنچنے نہ پائی تھی۔ ملاحوں نے کشتی کا رخ موڑا اور گھاٹ پر آ کر دم لیا۔

''یہ حضور کے قدموں کی برکت تھی کہ سلامتی کے ساتھ واپس آ گئے ورنہ ایک بھی نہ بچتا اگر وہ خبردار ہو کر پلٹ جاتیں۔'' ملاحوں نے کہا۔

سب نے مغرب کی نماز پڑھی اور شہر کو واپس ہوئے۔

جبل پور میں اعلیٰ حضرت کا قیام اٹھائیس دن رہا اور مسلسل دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

یہ اٹھائیس دن جبل پور والوں کے لیے ہر روز عید اور ہر شب شب برأت کی مثال تھی لیکن کب تک۔ جبل پور والے چاہتے تو یہی تھے کہ آپ مزید قیام فرمائیں لیکن اعلیٰ حضرت کے مشاغل دینیہ میں بہت فرق آ گیا تھا۔ تصنیفات کا شغل یہاں بھی جاری تھا لیکن بریلی جیسی یکسوئی کہاں تھی۔ یہ فرصت زائرین کے ہجوم اور بیعت ہونے والوں کی کثرت کی وجہ سے ناپید تھی۔ آپ نے بریلی واپسی کا ارادہ کر لیا۔ بالآخر وہ رات آ گئی جس کی صبح آپ کو روانہ ہونا تھا۔ اہالیان جبل پور پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ رات ہی کو اسٹیشن آ گئے تھے۔ یہاں بھی لوگ برابر آتے رہے اور بیعت کا سلسلہ جاری رہا۔ صبح کو تقریباً آٹھ بجے گاڑی روانہ ہوئی۔

منتہائے نظر تک پلیٹ فارم پر حسرت بھری نگاہیں ٹرین کا تعاقب کر رہی تھیں۔

☆......☆

اعلیٰ حضرت صرف زبردست عالم نہیں تھے بلکہ ولی کامل بھی تھے جس کے آثار بچپن اور جوانی ہی میں ظاہر ہونے لگے تھے۔

اعلیٰ حضرت کی زندگی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ آپ مادر زاد ولی ہیں۔ آپ عالم بے بدل بھی تھے اور شریعت کے پابند بھی۔ ایک ایک لمحہ سنت رسول مقبول کی پیروی میں گزرتا تھا۔ سینہ مبارک عشق رسولؐ سے مبارک تھا۔ بیعت ہوئے تو مادرزاد ولی کامل کے ہاتھ پر۔

آپ کو سرکار بغداد غوث پاکؒ کی ذات بابرکات سے بے پناہ عشق تھا۔ اسی نسبت غلامی کا نتیجہ تھا کہ آپ ہر مشکل میں غوث پاک ہی کو پکارا کرتے۔ ایک جگہ خود لکھا۔

''میری عمر کا تیسواں سال تھا کہ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ احاطے میں مزامیر کا شور مچا ہوا تھا۔ طبیعت منتشر ہوتی تھی۔ میں نے عرض کیا۔ حضور! میں آپ کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ اس شور وشغب سے مجھے نجات ملے۔ پہلا قدم روضہ مبارک رکھا تو معلوم ہوا سب ایک دم چپ ہو گئے۔ میں سمجھا کہ واقعی سب لوگ خاموش ہو گئے۔ مزار شریف سے باہر نکلا تو پھر وہی شور وغل تھا۔ پھر اندر قدم رکھا پھر وہی خاموشی۔ معلوم ہوا یہ سب حضرت کی کرامت ہے۔ یہ کھلی کرامت دیکھ کر مدد مانگنی چاہی۔ بجائے حضرت محبوب الٰہی کے نام مبارک کے ''یاغوثاہ'' زبان سے نکلا۔

قلبی وابستگی اور تعلق خاطر ہی کا فیض تھا کہ بارگاہ غوث اعظم کی روحانی برکتیں آپ کے سر پر ہمیشہ سایہ فگن رہیں۔ انعام واکرام قادریت کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ آپ کو بارگاہ غوث اعظم سے ''نائب غوث الاعظم فی الہند'' کا عظیم اعزاز بخشا گیا۔

آپ کے ولی ہونے کی شہادتیں اولیائے کرام و مجازیب کی قدر افزائی سے بھی ملتی ہیں۔

مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی نے آپ کو دیکھتے ہی فرمایا تھا۔ ''مجھے آپ میں نور ہی نور نظر آتا'' اس وقت آپ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

حاجی سید وارث علی شاہ نہایت پائے کے بزرگ تھے۔ انہوں نے آپ کو دیکھتے ہی مریدین سے فرمایا تھا۔ ''مولانا اعلیٰ حضرت آ گئے۔''

میاں شیر محمد شرقپور صاحب کرامت بزرگ تھے۔

جب اعلیٰ حضرت سے ملاقات کے بعد شر قپور واپس پہنچے تو مریدین نے پوچھا۔ ”حضور! آپ نے وہاں کیا دیکھا؟“ تو حضرت کے آنسو جاری ہو گئے اور فرمانے لگے۔ ”کیا بتاؤں کیا دیکھا۔ ارے یہ دیکھا کہ ایک پردہ ہے اس کے پیچھے سے تاجدار مدینہ شہنشاہ دو عالمؐ بتاتے ہیں اور مولانا احمد رضا بولتے ہیں۔“

چپ شاہ میاں پیلی بھیت کے مشہور و معروف بزرگ تھے۔ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے اس لیے چپ شاہ میاں کہلاتے تھے۔ جامن کے درخت کے نیچے برہنہ جذب کی حالت میں پڑے رہتے تھے۔ ایک روز خلافِ معمول بلند آواز میں فرمانے لگے۔ ”کوئی ہے۔ کوئی ہے۔“ آواز سن کر ایک شخص ان کے پاس پہنچا اس نے کہا۔ ”میاں کیا ہے۔“ فرمایا۔ ”میں برہنہ ہوں۔ ستر کھلا ہوا ہے۔ ایک مردِ حق آرہا ہے۔ کوئی کپڑا لاؤ کہ میں اپنا ستر چھپاؤں۔“ اس شخص نے کمبل لا کر دے دیا۔ آپ نے اس کمبل کو اوڑھ لیا اور کھڑے ہو گئے جیسے کسی کا انتظار ہو۔ اتنے میں ایک پالکی آئی جس میں سے اعلیٰ حضرت تشریف لا رہے تھے۔ پالکی جب قریب آئی تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ”پالکی روک دو۔ ولی اللہ کی خوشبو آرہی ہے۔“ پالکی رکی۔ اعلیٰ حضرت پالکی سے اتر کر چپ شاہ میاں کی طرف چلے اور چپ شاہ میاں اعلیٰ حضرت کی طرف دوڑے اور لپٹ گئے۔ دونوں کے درمیان راز و نیاز کی باتیں ہونے لگیں۔ ولی نے ولی کو پہچان لیا تھا۔ کیا باتیں ہوئیں کوئی نہ سمجھا۔

ولی را ولی شناسم کے ہزاروں واقعات آپ کو پیش آئے۔ کسی نے تاج القہار کے لقب سے یاد کیا کسی نے سراج العلما لکھا۔ کسی نے مجدد کہا۔

اولیائے حق سے کرامات کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایسی نادر الوجود و تعجب خیز چیز صادر ہو جائے جو عام طور پر عادتاً نہیں ہوا کرتی اس کو ”کرامت“ کہتے ہیں۔ کرامت بھی ولایت کی طرح ذہبی یعنی محض اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور وہ جو کسب سے حاصل ہو محض مداری کا تماشا ہے۔

اولیائے کرام کو اللہ عزوجل نے بہت بڑی طاقت دی ہے۔ ان میں جو اصحاب خدمت ہیں ان کو تصرف کا اختیار دیا جاتا ہے۔ سیاہ سفید کے مختار بنا دیے جاتے ہیں۔ یہ حضرات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے نائب ہیں۔ ان کو اختیار و تصرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں ملتے ہیں۔

علوم غیبیہ ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سوں کو قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے سب کا علم ہے مگر یہ منصب حضور اقدسؐ کے واسطے و عطا سے ہوتا ہے۔ بے وساطت رسول کوئی غیر نبی کسی غیب پر مطلع نہیں ہو سکتا۔

مردہ زندہ کرنا، بیمار کو شفا دینا، مشرق سے مغرب تک ساری زمین ایک قدم میں طے کر جانا غرض تمام خوارق عادات اولیاء سے ممکن ہیں سوا اس معجزے کے جس کی بابت دوسروں کے لیے ممانعت ثابت ہو چکی ہے جیسے قرآن مجید کے مثل کوئی صورت لے آنا۔ (بہار شریعت جلد اوّل)

بنیادی طور پر کرامات کی دو قسمیں ہیں۔

کرامات محسوسہ۔

کرامات معنویہ۔

فتاویٰ رضویہ کی عبادت یہ ہے۔

”یقین جان اللہ تیری مدد کرے کہ کرامت حق سبحانہ کے نام ”بر“ (احسان کرنے والا) کی بارگاہ سے آئی ہے لہٰذا اسے صرف نیکو کار ہی پاتے ہیں اور وہ (کرامات) دو قسم کی ہیں ”محسوس ظاہری“ اور ”معقول معنوی“۔

عوام صرف کرامت محسوسہ کو جانتے ہیں جیسے کوئی دل کی بات بتا دینا، گزشتہ و آیندہ کی خبر دینا، پانی پر چلنا، ہوا پر اڑنا، آنکھوں سے چھپ جانا وغیرہ۔

کرامات معنویہ کو صرف خواص پہچانتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اپنے نفس پر آداب شرعیہ کی حفاظت رکھے۔

اعلیٰ حضرت کی حیات طیبہ بتاتی ہے کہ آپ کرامات کی ان دونوں قسموں کے عامل تھے۔ شریعت پر عمل و استقامت آپ کی زندگی کا جزو لاینفک تھا۔ آپ کا اٹھنے والا ہر قدم شریعت کے عین مطابق تھا لیکن کرامات محسوسہ یا کرامات ظاہری بھی آپ کی ذات سے بارہا ظہور میں آئیں۔

مولانا محمد امجد علی اعظمی اعلیٰ حضرت کی ایک کرامت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم اعلیٰ حضرت سے درس حدیث لے رہے تھے کہ خلاف عادت آپ وہاں سے اٹھے اور پندرہ منٹ کے بعد قدرے متفکر پریشان واپس آئے۔ اس حال میں کہ آپ کے دونوں ہاتھ مع آستین تر (گیلے) تھے۔ مجھے حکم ہوا کہ خشک کرتہ لے آیئے۔ میں نے حاضر کیا، حضور نے پہنا اور پھر درس حدیث دینے لگے۔

اس واقعے کے گیارہ دن بعد کچھ لوگ کچھ تحائف لے کر آئے۔ جب وہ لوگ واپس جانے لگے تو میں نے ان سے ان کا حال پوچھا کہ کہاں مکان ہے۔ اس وقت کہاں سے تشریف لائے اور کیسے آنا ہوا۔

ان لوگوں نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ ہم فلاں تاریخ کو کشتی میں سوار ہوئے۔ ہوا تیز چلنے لگی اور موجیں زیادہ ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ کشتی الٹ جانے کا خطرہ پیدا ہوا۔ ہم نے اعلیٰ حضرت سے توسل کیا اور نذر مانی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کشتی کے نزدیک آیا اور اس کا کنارہ پکڑ کر کنارے پر پہنچا دیا تو اعلیٰ حضرت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو بچا لیا۔ اب وہی نذر پوری کرنے اور اعلیٰ حضرت کی زیارت کو آئے تھے۔

یہ کھلی کرامت ہے۔ اعلیٰ حضرت کو القا ہوا کہ کہیں کشتی ڈوب رہی ہے۔ یہ بھی کرامت ہے کہ زمین لپٹ گئی اور آپ اتنی جلدی وہاں پہنچ بھی گئے اور واپس بھی آگئے۔

ایک مرتبہ دو انگریز آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے گفت و شنید میں مشغول ہو گئے اور آپ سے استفسار کرنے لگے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا۔ ''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہیں۔ آپ بھی اس کے قائل ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''کیا آپ اس کا ثبوت دے سکتے ہیں؟ بنی اسرائیل کے پیغمبر تو جانوروں کی بولیاں تک سمجھتے تھے۔ آپ پیغمبر اسلام کی امت کے عالم ہیں۔ کیا آپ میں ایسی کوئی صلاحیت ہے؟''

آپ بہت ٹالتے رہے انکسار کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن وہ اصرار کرتے رہے، اسی وقت دو کونجیں دور سے ہوا میں اڑتی چلی آرہی تھیں۔ ایک آگے تھی ایک پیچھے۔

جب وہ کونجیں قریب آئیں حضرت نے فرمایا۔

''اگلی پچھلی سے کہہ رہی ہے جلدی کرو، اندھیرا ہو رہا ہے۔ پچھلی کہہ رہی ہے میرے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے اس کی تکلیف سے ہی زیادہ تیز نہیں اڑ سکتی۔

ان فرنگیوں کے پاس بندوق تھی۔ ان میں سے ایک نے نشانہ باندھا اور پچھلی کونج زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ انہوں نے دیکھا کہ واقعی کونج کے بائیں پاؤں میں کانٹا چبھا ہوا ہے۔

آپ کی یہ کرامت دیکھ کر دونوں مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''حضور! واقعی دین اسلام سچا ہے۔''

ایک مرتبہ ایک فقیر اعلیٰ حضرت کی مسجد میں مقیم ہوا اور کسی بات پر ناراض ہو کر اس قدر غصے میں آیا، کہنے لگا۔

''میں سوداگری محلے کو الٹ دوں گا۔''

اعلیٰ حضرت نے یہ سن کر اپنا جوتا اس کی طرف پھینکا۔ جوتا اس کی طرف الٹا گرا۔ فرمایا۔ ''پہلے اس کو سیدھا کریں تب سوداگری محلے کو الٹیے گا۔''

فقیر نے لاکھ زور لگایا مگر سیدھا نہ کر سکا۔

حضرت نے جوتا پہن لیا اور مکان تشریف لے گئے۔ وہ فقیر سخت نادم ہوا اور در دولت پر آیا۔ اعلیٰ حضرت کو معلوم ہوا تو خود اس فقیر کے لیے کھانا لائے۔

اعلیٰ حضرت بریلی شریف جانے کے لیے پیلی بھیت کے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ ٹرین تیار تھی ٹکٹ وغیرہ لے لیے گئے۔ اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا، نماز مغرب پڑھ لی جائے۔ کسی صاحب نے کہا ٹرین چھوٹ جائے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا اگر ٹرین جاتی ہے تو جائے اب تو پہلے نماز ہی پڑھیں گے اور انشاء اللہ فقیر کے بغیر ٹرین نہیں جائے گی۔

ادھر اعلیٰ حضرت نے نماز شروع کی ادھر ٹرین چھوٹ گئی۔ سلام پھیرا تو ٹرین کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ سنتیں وغیرہ پڑھیں پھر وظائف پڑھنا شروع کر دیے۔ چند منٹ کے بعد دیکھا کہ ایک جم غفیر کے ساتھ ریلوے کے ملازمین اعلیٰ حضرت کی طرف چلے آرہے ہیں۔

جب قریب آئے تو خدام نے دریافت کیا کہ کیا معاملہ پیش آیا تو بتایا کہ ٹرین پل پر جا کر رک گئی ہے۔ اب نہ آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے ہٹتی ہے۔ راستہ بھی بند ہو چکا ہے اور دونوں طرف ٹریفک بھی رک گیا۔ انجن میں کوئی خرابی بھی نہیں۔

''پھر ہم کیا کریں۔ یہاں کیوں آئے ہو؟'' خدام نے پوچھا۔

''لوگوں نے ہمیں بتایا کہ بریلی کے ایک بہت بڑے بزرگ نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے یہ ٹرین روک دی ہے۔''

اعلیٰ حضرت کو جلال آگیا۔ فرمایا۔ ''اگر کسی میں طاقت ہے تو ٹرین لے جا کر دکھائے۔ ٹرین فقیر نے نہیں روکی بلکہ فقیر جس اللہ کی نماز پڑھ رہا تھا اس واحدہ لاشریک نے روکی ہے۔''

افسران اعلیٰ نے اعلیٰ حضرت کے پاؤں پکڑ لیے اور

عرض کیا۔ ”ہماری غلطی معاف کی جائے۔ ہمیں آپ کے بغیر گاڑی چلانی ہی نہیں چاہیے تھی۔“

”اسی اللہ عزوجل نے چاہا تو ٹرین چلے گی۔ اس کو واپس اسٹیشن لایا جائے۔“

ڈرائیور وغیرہ گئے۔ دوبارہ ٹرین کو آگے چلانا چاہا نہیں چلی۔ جب پیچھے واپس کیا تو چل پڑی۔ آخرکار گاڑی اسٹیشن پر واپس آئی۔ آپ اس میں سوار ہوئے۔ تب جاکر ٹرین بریلی جانے کے لیے روانہ ہوئی۔

اعلیٰ حضرت ایسے ولی کامل تھے کہ آپ نے ایک نہیں کئی مرتبہ صاحبانِ مزارات سے گفتگو بھی کی۔ مُردوں سے کلام کرنا کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔

اعلیٰ حضرت ہندوستان کے ایک مقام بیسلپور میں مولانا عرفان علی کے گھر مقیم تھے۔ ایک روز فرمایا۔ ”کیا اس بستی میں کسی ولی اللہ کا مزار شریف ہے؟“ صاحب خانہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ”مجھے تو ولی اللہ کی خوشبو آرہی ہے۔ میں ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گا۔“ صاحب خانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”بستی سے باہر جنگل میں ایک قبر ہے تو سہی۔ ایک کوٹھری ہے۔ اس کے اندر وہ قبر ہے۔ فرمایا چلیے۔ اعلیٰ حضرت اس گمنام مزار پر تشریف لے گئے اور اس چاردیواری کے اندر جاکر دروازہ بند کرلیا اور تقریباً پون گھنٹے تک اندر ہی رہے۔

سیکڑوں کا مجمع تھا۔ عینی شاہدوں کا خصوصاً مولانا عرفان علی کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو لوگ آپس میں گفتگو کررہے ہیں۔ ان اوقات میں ایک ولی نے دوسرے ولی سے ملاقات کی۔ کیا کیا راز و نیاز کی گفتگو ہوئی کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں جب آپ باہر آئے تو چہرے پر جلال روشن تھا۔ بارعب آواز میں فرمایا۔

”بیسلپور والو! تم اب تک تاریکی میں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے زبردست ولی اللہ ہیں۔ غازیانِ اسلام سے ہیں۔ سہروردی سلسلے کے ہیں۔ قبیلۂ انصار سے ہیں۔ غازی کمال شاہ ان کا نام ہے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ تم لوگوں کا فرض ہے کہ ان سے کسب فیض کرتے رہو اور ان کے مزار کو عمدہ طریقے پر تعمیر کرو۔“

اعلیٰ حضرت کا یہ فرمانا تھا کہ اسی وقت لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ آپ کی بارگاہ سے لوگ فیض یاب ہونے لگے۔ وہ اجاڑ جنگل تھوڑے ہی دنوں میں صحن گلزار بن گیا۔

اعلیٰ حضرت ایک مرتبہ پیلی بھیت تشریف لے گئے اور حضرت مولانا شاہ وصی احمد محدث سورتی کے دولت خانہ پر قیام فرمایا۔

اعلیٰ حضرت نے حضرت محدث سورتی سے فرمایا۔ ”ہمیں بشارت ہوئی ہے کہ شاہ کلیم اللہ کے مزار پر جانا ہے۔ وہ ہم سے فرماتے ہیں کہ ہمارے مقبرے پر تشریف لایئے۔“

”ان کے مزار پر ایک اژدھا رہتا ہے۔ کسی کو قریب جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ دور سے فاتحہ پڑھ کر چلے آتے ہیں۔“

”آپ مجھے وہاں تو لے چلیے۔“

اعلیٰ حضرت کے ہمراہ محدث سورتی و دیگر طلبہ مزار شریف پر تشریف لے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھنے میں آیا کہ مزار اقدس کے کواڑ کھلے ہیں اور چوکھٹ کے بیچ میں ایک اژدھا لیٹا ہوا ہے۔ اعلیٰ حضرت اکیلے آگے بڑھے۔ مزار کے قریب پہنچے تو وہ اژدھا اندر چلا گیا۔ اعلیٰ حضرت بھی اندر تشریف لے گئے۔

حضرت محدث سورتی اندر جانا چاہتے تھے کہ مزار شریف کے کواڑ خود بخود بند ہو گئے۔ اب اعلیٰ حضرت، اژدھا اور صاحب مزار اندر ہیں۔ جو لوگ باہر ہیں وہ سخت متفکر کہ نہ جانے اعلیٰ حضرت پر کیا گزرے۔

دو گھنٹے بعد یکایک مزار اقدس کا دروازہ کھلا اور اعلیٰ حضرت ہشاش بشاش باہر تشریف لائے اور فرمایا۔ ”وہ اژدھا نظر نہیں آئے گا۔ یہ صاحب مزار نقشبندی سلسلے سے منسلک ہیں اور اس شہر پیلی بھیت کے سلطان الاولیاء ہیں۔“ اس وقت عجیب منظر تھا۔ نیز اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ صاحب مزار نے اس فقیر سے بالمشافہ ملاقات کی اور گفتگو فرمائی۔

جب سے یہ واقعہ ہوا وہاں اژدھا نظر نہیں آیا اور عام طور پر لوگ مزار شریف پر حاضری دینے لگے۔

ایک صاحب مولانا اعجاز علی خاں کا بیان ہے کہ میرے والدین حج کے عازم ہوئے۔ والدہ صاحبہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اجازت چاہی۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ”میں آتے جاتے تمہارے ساتھ ہوں۔“ پھر دوبارہ فرمایا۔ ”میں سچ کہتا ہوں کہ میں آتے جاتے تمہارے ساتھ ہوں۔“ والدہ صاحبہ اس کے بعد حج پر روانہ ہوگئیں۔

حطیم شریف میں ایک شب والدہ صاحبہ نفل پڑھ رہی تھیں کہ لوگوں کا ہجوم ہوگیا اور ساتھ والے سب جدا ہو

گئے۔ والدہ صاحبہ بہت گھبرائیں اور خیال کیا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا تھا کہ میں آتے جاتے تمہارے ساتھ ہوں۔ اب اور کون سا وقت آئے گا جس میں مدد فرمائیں گے۔

لوگوں کا ہجوم اس قدر تھا کہ راستہ ملنا دشوار تھا۔ اتنے میں جو نظر پڑی تو دیکھا اعلیٰ حضرت تشریف لے آئے ہیں اور عربی میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کے آنے کی برکت تھی کہ بھیڑ کے باوجود راستہ مل گیا اور والدہ صاحبہ بہ آسانی وہاں سے چلی آئیں اور جب حرم شریف سے باہر آئیں تو والد صاحب بھی مل گئے اور اعلیٰ حضرت غائب ہو گئے۔

بریلی آکر عرض کیا تو اعلیٰ حضرت نے سکوت فرمایا۔

بہت سے بزرگوں کی ایسی روایات بھی منقول ہیں کہ وقت ان کے لیے مختصر ہو گیا یا رک گیا۔ اعلیٰ حضرت سے بھی اس طرح کی کرامات مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

بریلی کے ایک بگھی والے کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عصر کے بعد اعلیٰ حضرت نے مجھے بلایا۔ میری گھوڑی بالکل تھک گئی تھی مگر اعلیٰ حضرت کے یاد فرمانے کے بعد مجھے کچھ عرض کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور حاضر بارگاہ ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت نے سوار ہونے کے بعد فرمایا۔ ''چلو۔''

''حضور کہاں۔''

''پیلی بھیت والی سڑک پر؟''

پہلی کرامت تو یہ ہوئی کہ گھوڑی یکدم تروتازہ ہو گئی اور خوب دوڑنے لگی۔ دوسری کرامت یہ دیکھی کہ صرف ایک میل کی مسافت طے کی ہو گی کہ پیلی بھیت کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔

اعلیٰ حضرت سیدھے آستانہ حضرت محمد شیر میاں پر تشریف لائے اور ان سے دریافت فرمایا، کیسے یاد کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''ابھی ابھی خیال ہوا کہ مولانا احمد رضا خان کی زبان سے نعت شریف سننا چاہیے۔''

اعلیٰ حضرت نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضائل بیان کیے۔ اس کے بعد بریلی واپس تشریف لے آئے اور ابھی مغرب کا وقت نہیں ہوا تھا۔ بریلی شریف آکر نماز مغرب ادا کی۔

عصر سے مغرب بہت کم وقت ہوتا ہے۔ یہ آپ کی کرامت ہے کہ مختصر وقت میں ایک گھوڑا گاڑی پر دوسرے شہر تشریف لے گئے اور واپس تشریف لائے۔ دوسری کرامت یہ ہے کہ ادھر حاجی شیر میاں کے دل میں خیال گزرا۔ ادھر اعلیٰ حضرت کو خبر ہو گئی کہ جناب حاجی صاحب یاد کرتے ہیں۔

☆......☆

صحیح حدیث میں یہ روایت حضرت ابی ہریرہؓ سے ہے۔

''بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی پر ایسے شخص کو قائم کرے گا جو اس دین کو از سر نو زندہ کرے گا۔''

زندہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان میں ایک صنف یا صنفتیں ایسی پائی جائیں جن سے امت محمدیہ کو دینی فائدہ ہو جیسے تعلیم و تدریس، وعظ، امر المعروف، نہی عن المنکر، لوگوں سے مکروہات کا دفع، اہل حق کی امداد۔

مجتہد کے لیے خاص اہل بیت سے ہونے کی شرط نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ صحیح العقیدہ علوم و فنون کا جامع، بے لوث حامی دین، متقی پرہیزگار، شریعت و طریقت کے زیور سے آراستہ خلاف شرع سے دل برداشتہ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جس صدی میں پیدا ہو اس کے خاتمے اور اس صدی میں انتقال کرے کیونکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ صدی کے ختم ہوتے ہوتے علمائے امت بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ دینی باتیں مٹنے لگتی ہیں۔ بدمذہبی اور بدعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس واسطے دین کی تجدید کی ضرورت پڑتی ہے۔ (حیات اعلیٰ حضرت)

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کو تیرھویں صدی کا مجدد کہا جاتا ہے اور چودھویں صدی کے مجدد احمد رضا خان بریلوی ہیں۔ اس لیے کہ آپ کی ولادت 1240ھ اور انتقال 1340ھ میں ہوا۔ تیرھویں صدی کے 39 سال ایک مہینا 25 دن پائے جس میں حمایت دین، اعانت سنت میں جان و مال اور علم و فضل صرف فرمایا۔ شہرت و مدح کی پروا نہیں کی، حق کہنے میں دیر نہیں لگائی۔ (حیات اعلیٰ حضرت)۔

تصنیف و تالیف میں ایسا وقت صرف کیا کہ رسائل و مستقل تصنیفات 600 سے بالا ہوئیں اور پچاس علوم و فنون کو احاطہ کرتی ہیں۔

درس و تدریس میں ایسی دھاک بٹھائی کہ دور دور سے طلبہ آکر مستفید ہوتے رہے۔

شہر کا کوئی محلہ (اور بیرونی شہر بھی) ایسا نہیں جو آپ کے پند و نصائح سے محروم رہا ہو۔

باطل کی سرزنش اور حق کی حمایت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ عرب و عجم کے علماء نے آپ کا لوہا مانا۔ لاکھوں اشخاص نے آپ کی تحریرات و تقاریر سے فائدہ

اٹھایا۔ گناہ گاروں نے توبہ کی گمراہ دیندار ہوئے۔
وعظ و تبلیغ کر کے نائب رسولؐ ہونے کا حق ادا کیا۔
شہرت و مقبولیت میں بے مثال ہوئے۔
آپ کے دور کے مقتدر علمائے کرام نے آپ کو مجدد مائۃ حاضرہ سے یاد کیا۔ گویا ایک طرح سے اجماع اہلِ سنت تھا۔ باہر سے جتنے خطوط آتے تھے ان سب میں امام اہل سنت، مجدد مائۃ حاضرہ، موید ملت طاہریہ، اعلیٰ حضرت یہ چار صفات ضرور تحریر ہوتیں۔
یہ کچھ علمائے ہندوستان پر موقوف نہیں، دیگر اسلامی ممالک کے علماء بھی آپ کو اسی نام سے یاد کیا کرتے تھے۔
مکہ شریف کے محافظ کتب خانہ حرم مولانا سید اسماعیل خلیل مکی نے آپ کے بارے میں لکھا۔
''اور میں اللہ عزوجل کی حمد بجالاتا ہوں کہ اس نے اس عالم باعمل کو مقرر فرمایا جو فاضل کامل ہے۔ منقبتوں اور فضلوں والا۔ اس مثل کا مظہر کہ اگلے پچھلوں کے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ یکتائے زمانہ اپنے وقت کا یگانہ مولانا حضرت احمد رضا خاں، اللہ بڑے احسان والا پروردگار اسے سلامت رکھے اور وہ کیوں نہ ایسا ہو کہ علمائے مکہ اس کے لیے فضائل کی گواہیاں دے رہے ہیں اور اگر وہ سب سے بلند مقام پر نہ ہوتا تو علمائے مکہ اس کی نسبت یہ گواہی نہ دیتے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کے حق میں یہ کہا جائے کہ وہ اس صدی کا مجدد ہے تو البتہ حق و صحیح ہے۔''
امام جلیل جلال الدین سیوطی سنن ابوداؤد میں فرماتے ہیں۔ ''اچھا یہ ہے کہ صدی کا مجدد وہ شخص ہے جو مشہور و معروف ہو اور امور دین میں جس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہو۔ حدیث شریف ہم کو ہر صدی میں ایک مجدد کی تشریف آوری کی بشارت سناتی ہے۔ آئمہ کرائم بتا دیتے ہیں کہ گزشتہ صدی کے آخری حصے میں جس کی شہرت ہو چکی ہو اور موجودہ صدی میں بھی وہ مرکز علوم سمجھا جاتا ہو اس کے قدم مجدد کے قدم ہوتے ہیں۔
مجدد کی اس تعریف پر اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا احمد رضا خاں قادری برکاتی پر پورے اترتے ہیں۔
مولوی محمد شاہ خاں عرف ننھن خاں اعلیٰ حضرت کے محلے ہی میں رہتے تھے۔ اعلیٰ حضرت سے عمر میں ایک سال بڑے تھے۔ بچپن ساتھ گزارا۔ ہوش سنبھالا تو ایک ہی جگہ نشست و برخاست رہی۔ آپس میں خوب بے تکلفی تھی۔
ان کو اعلیٰ حضرت بھائی جان کہتے تھے۔ یہ بھی اکثر سفر حضر میں ساتھ رہتے تھے۔ اس بے تکلفی کے باوجود ننھن خان، اعلیٰ حضرت کا بڑا احترام کرتے تھے اور اکثر ان کے حضور خاموش ہی رہا کرتے۔ کوئی مسئلہ بھی دریافت کرنا ہوتا تو دوسروں کے ذریعے سے دریافت کراتے۔
جس دن محرم الحرام 1301ھ کا چاند ہوا اس دن حسب معمول بعد مغرب سب لوگ جمع ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ''ننھن بھائی جان! آج 1301ء کا چاند ہو گیا۔'' ننھن خاں نے عرض کیا، جی ہاں۔
اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ''بھائی جان، یہ تو صدی بدل گئی۔''
''صدی تو واقعی بدل گئی۔'' ننھن خان نے فرمایا۔
اس پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ اب ہمیں اور آپ کو بھی بدل جانا چاہیے۔ اس کا مطلب کیا ہے کسی کو پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔
اس وقت تو بات سمجھ میں نہ آئی لیکن دوسرے روز نماز فجر جب سامنا ہوا اور ان کے مجددانہ جلال سے واسطہ پڑا تو یاد آیا کہ انہوں نے جو بدلنے کو فرمایا تھا وہ ایسے بدلے کہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔
اس دن آپ کا چہرہ بتا رہا تھا کہ آپ نے مجدد ہونے کی شرط پوری کر دی۔ تیرھویں صدی کے 28 سال درس و تدریس تالیف و تصنیف، وعظ و تقریر کی شہرت میں گزارنے کے بعد دوسری صدی میں قدم رکھ دیا۔
تدریس و تقریر کا اثر محدود اور وقتی ہوتا ہے جب کہ تصنیف و تحریر کا اثر غیر محدود اور ہمیشہ کے لیے باقی رہنے والا ہوتا ہے۔ جن علماء نے تحریر و تصنیف کو اختیار نہیں کیا وہ اپنے دور حیات میں کتنے ہی نامور رہے ہوں آج ان کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ اگر ان کے کسی کارنامے کا ذکر آتا بھی ہے تو براہِ راست نہیں بالواسطہ یعنی علمائے معاصرین بالید کے لوگوں کی تحریر کی بدولت اور وہ بھی سرسری، اس کے برخلاف جن لوگوں نے تصنیفات لکھیں ان کے علوم و فنون سے ہم براہ راست مستفید ہوتے ہیں۔ امام غزالی، امام رازی، آئمہ اربعہ کے ناموں اور کارناموں سے کون واقف نہیں۔ ان کی یہ حیات ابدی ان کی تصنیفات کی بدولت ہوئی۔
اعلیٰ حضرت کو بھی چونکہ مجدد ہونا تھا اور ان کے علوم و فنون سے زمانہ دراز تک عرب و عجم روم و شام اور تمام ممالک اسلامیہ کو فیض یاب کرنا تھا اس لیے ضروری تھا کہ آپ

تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دیں تا کہ آپ کے خیالات آپ کے بعد بھی سفر میں رہیں اور اصلاح کا کام جاری رہے۔

قدرت نے آپ کو بچپن ہی سے قلم کی طاقت عطا کی چنانچہ صرف آٹھ سال کی عمر میں آپ نے ''ہدایت النحو'' کی شرح عربی زبان میں تالیف فرما دی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں عربی زبان میں ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ رکا نہیں۔ جہاں آپ کی بہت سی باتیں حیران کن ہیں، وہاں کثرت تصنیف بھی حیران کن ہے۔ آپ کے رسائل و تصنیفات کی تعداد ایک ہزار بتائی جاتی ہے جو بذات خود ایک کرامت ہے۔

یہ تصنیفات بھی کسی ایک موضوع تک محدود نہیں بلکہ کم از کم پچاس علوم کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان فنون میں علم عقائد، علم کلام، علم تجوید، علم اصول حدیث، علم حدیث، علم اصول فقہ، علم فقہ، علم الفرائض، علم رسم خط قرآن، علم الادب العربی، علم لغت، علم سیر، علم الفضائل، علم المناقب، علم سلوک، علم الاخلاق، علم تصوف، علم اذکار، علم ترغیب و ترہیب، علم تاریخ، علم مناظرہ، علم تکسیر، علم الوقت، علم التوقیت، علم ہیئت، علم الحساب، علم ریاضی، علم الہندسہ، علم جبر و مقابلہ، علم الزریجات، علم الجفر، علم النجوم وغیرہ پچاس علوم پر مبنی ہیں۔

کثرت عبادات اور عادتاً کم غذا کے استعمال کی وجہ سے آپ کی صحت گرتی رہی تھی۔ جوانی اور قوت ایمانی نے کمزوری کے باوجود عوارض سے دور رکھا ہوا تھا لیکن حیات طیبہ کے آخری سالوں میں جسمانی بیماریاں آپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ ان تکالیف کے باوجود آپ کی دینی خدمات میں تعطل نہیں آیا لیکن بیماری تو بیماری ہے۔ شدت اختیار کر لیتی۔ مسجد تک جانا دوبھر ہو جاتا لیکن یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ مسجد نہ جائیں۔ لوگ کرسی پر بٹھا کر لے جاتے اور لے آتے۔ نقاہت بہت ہوتی تو لوگ سہارا دے کر لے جاتے۔

ایک مرتبہ تو ایسے بیمار ہوئے کہ پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ وصیت نامہ بھی لکھوا دیا تھا لیکن اللہ نے شفا دے دی تھی۔ آپ کو یقین بھی تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا لیکن آپ کی روشن ضمیری نے تاریخ وفات کی خبر پہلے ہی دے دی تھی۔

استاذی محدث سورتی کا وصال ہوا تو آپ نے تاریخ وفات نکالی، مولانا ظفر الدین بہاری ملنے آئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

''میں نے حضرت محدث صاحب کی تاریخ وفات اس آیت شریفہ سے پائی ہے جس سے ان کا مرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے۔'' اعلیٰ حضرت نے آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔ یہ آیت ویطاف سے شروع ہوتی تھی لیکن اعلیٰ حضرت نے جو تاریخ نکالی تھی اس میں ''و'' شامل نہیں کیا تھا۔ صرف یطاف سے شروع کی تھی۔ ذہنتا کر اس آیت کے اعداد 1334 نکلتے تھے جو محدث سورتی کی تاریخ وفات تھی۔ مولانا ظفر الدین بہاری نے آپ کی توجہ اس طرف دلائی۔ عرض کیا آیت کریمہ ویطاف ہے۔ آپ نے اس پر تبسم فرمایا۔ ارشاد ہوا۔ ''پوری آیت اس بندۂ خدا کی تاریخ ہو گی جس کا انتقال چھ سال بعد 1340ھ میں ہو گا۔

اعلیٰ حضرت کا اشارہ دراصل اپنی جانب تھا لیکن اس وقت کوئی سمجھ نہ سکا۔ بیماریاں آپ کو گھیرے رہیں۔ گو نا گوں امراض اور ضعف سے یہ طاقت نہ رہی کہ سخت گرمی میں روزہ رکھ سکیں اس لیے آپ نے اپنے حق میں یہ فتویٰ دیا کہ پہاڑ پر سردی ہوتی ہے وہاں روزہ رکھ لینا ممکن ہے تو روزہ رکھنے کے لیے وہاں جانا استطاعت کی وجہ سے فرض ہو گیا۔ اسی فتوے کی بناء پر اعلیٰ حضرت اخیر شعبان کوہ بھوالی تشریف لے جاتے اور عید الفطر کی نماز اپنی مسجد میں ادا فرمایا کرتے۔

1339ھ کا سال آ گیا کہ اس سال کے رمضان گزارنے کے لیے آپ بھوالی (ضلع نینی تال) تشریف لے گئے۔

آپ بھوالی ہی میں تھے کہ 19 ذی الحجہ سے چار روز قبل شدید بخار آیا۔ پانچویں دن درد پہلو پیدا ہوا پھر وہ درد جگر میں متبدل ہوا۔

7 محرم کا دن تھا اور آٹھویں شب برے حالوں گزری۔ وہاں نہ کوئی طبیب تھا نہ کچھ دوسرا۔ درد اتنا شدید تھا کہ معلوم ہوتا تھا جگر کی رگیں اوپر کھنچی چلی آتی ہیں۔ بائیس دن میں بازو کا گوشت صحیح پیمائش سے سوا انچ گھل گیا۔

اب یہی طے ہوا کہ بریلی واپس جایا جائے۔ ساتھ کے لوگوں نے انتظام کیا۔ نہ چلنے کی طاقت تھی نہ بیٹھنے کی۔ لاری میں آپ کے لیے پلنگ بچھا دیا گیا۔

بریلی واپس آئے۔ عشاء سے ظہر تک کی نمازوں کے لیے چار آدمی کرسی پر بٹھا کر مسجد میں لے گئے۔ عصر بھی مسجد میں ادا کی۔

بھوالی میں بیماری کی وجہ سے اور واپس آ کر نقاہت

کے سبب پیر و مرشد سیدنا شاہ آل رسول صاحب قادری برکاتی مارہروی کے عرس کا زمانہ گزر چکا تھا لہٰذا واپس آنے پر تاخیر سے یہ تقریب منائی گئی اور چونکہ نقاہت اس درجہ تھی کہ خدام کرسی پر بٹھا کر پانچوں وقت مسجد میں لے جاتے تھے لہٰذا قل شریف کے لیے کاشانہ اقدس میں انتظام ہوا۔

وعظ کی اس آخری مجلس میں آپ نے نہایت ایمان افروز تقریر فرمائی۔

''پیارے بھائیو! مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنے دن تمہارے اندر ٹھہروں گا۔ تین ہی وقت ہوتے ہیں، بچپن، جوانی، بڑھاپا۔ بچپن گیا، جوانی آئی جوانی گئی بڑھاپا آیا۔ اب کون سا چوتھا وقت آنے والا ہے جس کا انتظار کیا جائے ایک موت ہی باقی ہے۔

اللہ عزوجل قادر ہے کہ ایسی ہزار مجلس عطا فرمائے اور آپ سب لوگ ہوں اور میں آپ لوگوں کو سناتا رہوں مگر بظاہر اب اس کی اُمید نہیں۔

''اے لوگو! تم پیارے مصطفیٰ کی بھولی بھیڑیں ہو اور بھیڑیے تمہارے چاروں طرف ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بہکائیں، تم میں فتنہ ڈال دیں۔ تمہیں اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں۔ ان سب سے بچو اور دور بھاگو...... میں چودہ برس کی عمر سے یہی بتاتا رہا ہوں...... اللہ تعالیٰ ضرور اپنے دین کی حمایت کے لیے کسی بندے کو کھڑا کردے گا مگر نہیں معلوم میرے بعد جو آئے وہ کیسا ہو اور تمہیں کیا بتائے۔ اس لیے میری بتائی باتوں کو خوب سنو۔ حجۃ اللہ قائم ہو چکی ہے اب میں قبر سے تمہارے پاس بتانے نہ آؤں گا۔''

میری دوسری وصیت یہ ہے کہ آپ حضرات نے مجھے کبھی کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچنے دی۔ میرے کام آپ لوگوں نے خود کیے مجھے نہ کرنے دیے۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

میں نے تمام اہلسنت کو اپنے حقوق معاف کر دیے ہیں۔ آپ لوگوں سے دست بستہ عرض ہے کہ مجھ سے جو کچھ آپ کے حقوق میں فروگزاشت ہو وہ سب معاف کر دیں۔

آخر میں یہ بھی فرمایا۔ ''آئندہ ہمیں تمہیں شاید ایسا موقع نہ ملے، اس لیے جو یہاں موجود ہیں وہ بہ غور سے سنیں اور جو موجود نہیں ہیں انہیں میرے یہ الفاظ پہنچادیں۔

اس پر سارا جلسہ بے حواس ہو کر رونے لگا۔ تسکین دی اور فرمایا کہ خدا تعالیٰ میں سب قدرت ہے وہ چاہے تو ہم تم اسی طرح بار ہا جمع ہوں۔''

غرض یہ کہ لوگ متنبہ ہو گئے کہ آپ اب ہم میں رہنے والے نہیں۔

حضرت جعفر شاہ پھلواری اجمیر شریف سے واپسی پر بریلی رکے۔ یہاں سے لکھنو جانے کا ارادہ تھا لیکن ٹرین چھوٹ گئی۔ جمعہ کا دن تھا۔ معلوم ہوا اب بریلی میں کسی جگہ جمعہ نہیں مل سکتا۔ صرف ایک جگہ مل سکتا ہے جہاں خاصی تاخیر سے جمعہ ہوتا ہے۔

جعفر شاہ پھلواری اس مسجد میں پہنچے اور دوسری صف میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ساری مسجد کے لوگ کھڑے ہو گئے اور فضا درود کی آواز سے گونج اٹھی۔ دیکھا کہ ایک کرسی پر ایک بزرگ جلوہ افروز ہیں اور چند آدمی کرسی کو اٹھائے چلے آرہے ہیں۔

اگلی صف میں وہ ضعیف اور بیمار آدمی بیٹھ گیا۔ اذان ہوئی خطبہ ہوا اور نماز کے لیے وہ بیمار آدمی کھڑا ہوا تو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ اپنا عصا پکڑے ہوئے تھا۔ سجدہ ہوتا تو عصا زمین پر رکھ دیتا اور قیام کے وقت پھر عصا سنبھال لیتا۔

نماز ختم ہوئی تو ایک بڑا گاؤ تکیہ لایا گیا جس سے ٹیک لگا کر وہ بیمار نیم دراز ہو گیا۔ میانہ قد، سر پر ہلکا بادامی عمامہ، داڑھی لمبی گھنی اور سفید، رنگ گندمی۔

اس کے بعد بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ نحیف اور درد بھری آواز میں وہ بیمار آدمی مخاطب ہوا۔ ''میری طرف سے تمام اہل سنت مسلمانوں کو سلام پہنچا دو اور میں نے کسی کا کوئی قصور کیا ہو تو میں بڑی عاجزی سے اس کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے خدا کے لیے معاف کر دو یا مجھ سے کوئی بدلہ لے لو۔

یہ بھی صاف طور پر ارشاد فرما دیا۔ ''آج کرسی پر حاضری ہوئی ہے آئندہ جمعہ چارپائی پر ہوگی۔''

یہ پیر ضعیف، بیمار حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی تھے۔

☆......☆

یوم وفات سے دو روز قبل تپ لرزہ (سردی سے بخار) کا حملہ محسوس ہوا۔ اس سے دفعتاً کمزوری بڑھ گئی اور اتنی بڑھی کہ نبض غائب ہو گئی۔

حکیم حسین رضا خان حاضر تھے۔ انہوں نے نبض دیکھی تو وہ ڈوب چکی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر عرض کیا۔

''کمزوری کی وجہ سے نبض نہیں ملتی۔''

اعلیٰ حضرت نے بے حد نقاہت کے باوجود فرمایا۔
"آج کیا دن ہے۔" بتایا گیا کہ "بدھ" ہے۔ اس پر فرمایا۔
"جمعہ پرسوں ہے۔" اور آنکھیں بند کر لیں البتہ ہونٹ حرکت کر رہے تھے جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ جاننے والوں نے جان لیا کہ امام اہل سنت جمعہ کو ہم میں رہنے والے نہیں۔

ابھی آپ کو جمعہ تک اس دنیا میں اور رہنا تھا۔ لہٰذا طبیعت بدستور سہولت پر آ گئی۔ دن بھر طبیعت ایسی خوشگوار رہی کہ ایک فتویٰ بھی مع دلیل لکھوایا۔ مولانا امجد علی کے پاس ایک استفتاء آیا جس میں انہیں کوئی دشواری پیش آئی۔ آپ استفسار کے لیے اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی وغیرہ کے بعد استفتاء کا مضمون عرض کیا اور یہ بھی کہ اس کا جواب کیا ہونا چاہیے۔ آپ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا۔ پھر مولانا امجد علی نے عرض کیا۔ یہ حکم کس کتاب میں ہے اور کس مقام پر ہے۔ فرمایا۔ "بحر الرائق" میں فلاں مقام پر ہے۔

آپ کی یادداشت کو دیکھ کر سب کو خوشی ہوئی کہ ماشاء اللہ ذہنی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ آپ نے اس خوشی کو محسوس کر لیا اور فرمایا۔ "آج میری لڑکی میرے سامنے آئی۔ بہت دیر تک میں سوچتا رہا۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں آتا تھا مگر الحمدللہ دینی عقائد و مسائل کے جملہ مضامین پیش نظر ہیں۔"

ایک مجدد کی شان یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی جو خدمت سپرد کی ہے اسے آخر وقت تک انجام دیتا ہے۔

جمعرات کی شب کو اہل خانہ نے چاہا کہ جاگیں شاید کوئی ضرورت ہو۔ آپ نے منع فرما دیا۔ "انشاء اللہ یہ رات وہ نہیں ہے جو تمہارا خیال ہے۔ تم سب سو رہو۔"

یہ رات بھی گزر گئی۔ اگلی صبح (25 صفر 1360ھ) کو لوگ بعد نماز فجر حسب معمول مزاج پرسی کے لیے ملنے آئے تو اعلیٰ حضرت کی طبیعت اس قدر شگفتہ اور بحال تھی کہ دیکھنے والوں کو مسرت ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ جس کا خطرہ تھا وہ وقت ٹل گیا۔

آپ کے بھتیجے مولوی حسنین رضا خاں آپ کی صحت کی خوش خبری سناتے مدرسہ منظر اسلام میں مولوی اکرام الحق گنگوہی کے پاس گئے اور ان کو اعلیٰ حضرت کی صحت کی خوش خبری سنائی۔

مولوی حسنین رضا اس وقت بستر پر رضائی میں منہ لپیٹے رو رہے تھے۔ حسنین رضا خان نے ان سے فرمایا۔

"اعلیٰ حضرت کو آج آثار صحت شروع ہو گئے اور آپ دیکھنے بھی نہ گئے۔" اس پر ان کی سسکی بندھ گئی اور وہ زیادہ رونے لگے۔

مولوی حسنین رضا خاں نے انہیں تسلی دی اور رونے کی وجہ پوچھی۔ آپ نے اپنا خواب سنایا۔ "میں نے آج ہی صبح صادق کے وقت دیکھا ہے کہ بہت سے علماء و اولیاء ایک جگہ جمع ہیں اور وہ سب رنجیدہ و مغموم معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے اس رنج و غم کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ آج مولانا احمد رضا خان دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ اس درد ناہنجار میں اعلیٰ حضرت کا دنیا سے جانا ان حضرات پر بھی گراں تھا۔"

"حضرت یہ آپ کا خیال ہوگا جو خواب بن کر سامنے آ گیا۔ ہم سب اعلیٰ حضرت کی صحت کی طرف سے فکر مند ہیں اس لیے آپ کو یہ خواب نظر آیا ورنہ اعلیٰ حضرت تو تیزی سے زندگی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" مولانا حسنین رضا خاں نے فرمایا۔

"میں علماء و صلحا کے اس جم غفیر کے مقابلے میں آپ کے تخمینی خیال کی تائید نہیں کر سکتا۔ آج کوئی نہ کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔" یہ کہہ کر آپ پھر رونے لگے۔

اعلیٰ حضرت کی طبیعت اتنی سنبھل گئی تھی کہ پورے ہوش و حواس میں کل جائیداد کا وقف نامہ لکھوایا اور اپنے دستخط کیے۔ اس دن یعنی بروز جمعہ 25 صفر المظفر 1340ھ کو وصایا تحریر ہو چکے اور دستخط ہو گئے تو فرمایا۔ گھڑی سامنے رکھ دو۔ گھڑی رکھ دی گئی اور جب 2 بجنے میں چند منٹ باقی رہ گئے تو اچانک ارشاد فرمایا۔

"میری وجہ سے نماز جمعہ میں تاخیر نہ کی جائے۔ جمعہ کی نماز اپنے وقت پر قائم ہو۔ کوئی بھی کہے نہ مانا جائے۔"
"تصاویر ہٹا دو۔" پھر خود ہی وضاحت کی۔ "یہی کارڈ، لفافہ، روپے، پیسے وغیرہ کہ ان پر تصاویر ہوتی ہیں۔"
"حامد رضا کہاں ہیں۔"
"یہ رہے حضور۔"
"ان سے کہو وضو کر کے آئیں اور سورۂ یٰسین اور سورہ رعد کی تلاوت کریں۔" یہ بھی فرمایا۔ "حامد رضا خاں وہ دعائیں جو فتاویٰ میں لکھی ہیں خوب ازبر کر لیں تو وہ نماز پڑھائیں، ورنہ مولوی امجد علی۔"
"جنازہ میں بلاوجہ شرعی تاخیر نہ ہو۔ جنازے کے آگے آگے میری یہ دو نظمیں پڑھیں۔"

کعبہ کے بدرالدجیٰ تم پہ کروڑوں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

☆

واہ کیا جودو کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

"خبردار! کوئی شعر میری روح کا نہ پڑھا جائے۔"

"قبر میں بہت آہستگی سے اتارا جائے۔"

"وقت نزع کوئی رونے والا بچہ مکان میں نہ آئے۔"

"روح قبض ہو جائے تو نہایت نرمی سے آنکھیں بند کردی جائیں۔"

اتنی دیر میں حامد رضا خاں وضو کر کے آگئے اور آپ کی بتائی ہوئی دونوں سورتیں لیسین اور سورہ رعد تلاوت فرمائیں۔

آخری گھڑی آنے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے کہ کچھ لوگ ایک مسلمان ڈاکٹر عاشق حسین کو اپنے ہمراہ لائے۔ اعلیٰ حضرت نے مصافحہ کیا۔ ڈاکٹر نے حال دریافت کیا مگر آپ نے مطلق توجہ نہ دی اور وہ دعائیں پڑھنے لگے جو آپ عموماً سفر کے وقت پڑھا کرتے تھے۔ گویا سفر آخر کے لیے تیاری فرما رہے تھے پھر نہایت آہستگی سے فرمایا۔ "اے اللہ سفر کی درازی کو میرے لیے مختصر فرما دے۔"

کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ دم سینے میں آگیا ہے۔ آپ نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ جب آپ کو بولنے کی طاقت نہ رہی اس وقت بھی لب ہائے مبارک جنبش میں تھے۔ کان لگا کر سنا تو اللہ اللہ فرما رہے تھے۔

ہونٹوں کی حرکت ختم ہوتے ہی چہرہ مبارک پر نور چمکا جس میں جنبش تھی۔ اس کے ختم ہوتے ہی وہ جان نور جسم اطہر سے پرواز کر گئی۔

گھڑی قریب رکھی تھی۔ لوگوں نے گھڑی دیکھی 2 بج کر 38 منٹ ہوئے تھے۔ صفر کی 25 تاریخ اور 1340ھ تھا۔

جان کنی کا وقت سخت ترین ہوتا ہے۔ لوگوں کے چہروں پر وحشت چھا جاتی ہے مگر سب نے دیکھا کہ آپ کے چہرے پر بجائے کلفت، مسرت ہے۔

عزیز و اقارب گرد و پیش حاضر تھے لیکن آپ نے کسی کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ ان کی نظر تو اس عظیم ہستی پر تھی جو سب پیاروں سے پیاری ہے۔ یہ وقت فراق کا نہیں محبوب حقیقی سے وصال کا تھا۔

اس کا یقین ہوتے ہی کہ آپ کی روح پرواز کر گئی ہے۔ اعلیٰ حضرت کی وصیت کے مطابق جمعہ کی نماز کا اعلان کر دیا گیا تا کہ لوگ نماز کی تیاری میں مشغول ہو جائیں اور گریہ وزاری سے گریز کریں۔

تجہیز و تکفین و تدفین کا مشورہ ہوا۔ جگہ جگہ تار دیئے گئے۔

دوسرے روز بروز ہفتہ غسل دیا گیا۔ عین وقت غسل ایک حاجی صاحب اعلیٰ حضرت سے ملنے آئے۔ یہاں آکر وصال کی خبر ملی۔ تحفے میں زم زم لائے تھے۔ زم زم میں کافور تر کیا گیا اور خلعت رخصت میں لگا دیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مدینہ طیبہ سے سرکاری عطائیں عین وقت پر پہنچیں۔

گلی کوچے اللہ اکبر یارسول اللہ یا غوث الوریٰ کے نعروں سے گونج رہے تھے۔

جنازہ نماز کے لیے عیدگاہ کی طرف بڑھا۔

وصیت کے مطابق جنازہ کے آگے یہ سلام پڑھا جارہا تھا۔

کعبہ کے بدرالدجیٰ تم پہ کروڑوں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

سوداگری محلہ سے عیدگاہ تک عجیب کشمکش تھی۔ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ جنازے کو کندھا دینے کا موقع مل جائے۔ جس کو موقع نہ ملتا اپنی ٹوپی جنازے سے مس کر کے چومتا اور سر پر رکھتا۔

نماز کے بعد عیدگاہ میں زیارت کرائی گئی۔ اتنا وقت لگ گیا کہ ظہر بھی عیدگاہ ہی میں ادا کی گئی۔ پھر اسی شان و شوکت کے ساتھ جنازہ واپس ہوا۔ سوداگراں محلہ میں مولانا حامد رضا خاں کے مکان کے قریب لحد کھودی گئی۔ یہاں تمام حاضرین نے نماز عصر ادا کی اور اسی وقت مزار شریف پر تلاوت قرآن شروع کر دی گئی اور حسب وصیت ایک آن کو بھی تلاوت نہ رکی اور تین دن جاری رہی۔

☆......☆

آپ کے یوم وصال 25 صفر 1340ھ کو بیت المقدس میں ایک شامی بزرگ نے خواب میں اپنے آپ کو دربار رسالت میں پایا۔ تمام صحابہ کرام اور اولیائے عظام دربار میں حاضر تھے لیکن مجلس میں سکوت طاری تھا اور

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی آنے والے کا انتظار ہے۔ ان شامی بزرگ نے بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی حضور! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کس کا انتظار ہے۔"

"ہمیں احمد رضا خاں کا انتظار ہے۔" سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"حضور احمد رضا کون ہیں؟" شامی بزرگ نے عرض کیا۔

"ہندوستان میں بریلی کے باشندے ہیں۔"

بیداری کے بعد وہ شامی بزرگ مولانا احمد رضا کی تلاش میں ہندوستان کی طرف چل پڑے اور جب وہ بریلی آئے تو انہیں معلوم ہوا کہ اس عاشق رسول کا اسی روز یعنی 25 صفر المظفر 1340ھ کو وصال ہوا ہے جس روز انہوں نے خواب میں سرور کائنات کو یہ کہتے سنا تھا۔ "ہمیں احمد رضا کا انتظار ہے۔"

انہیں مانا، انہیں جانا، نہ رکھا غیر سے کام
للہ الحمد میں دنیا سے مسلمان گیا

☆

اب آئی شفاعت کی ساعت اب آئی
ذرا چین لے میرے گھبرانے والے

مخدوم الملت، محدث اعظم ہند حضرت سید محدث کچھوچھوی علیہ الرحمہ بیان کرتے ہیں۔ "میں اپنے مکان پر تھا اور بریلی کے حالات سے بے خبر تھا۔ میرے حضور شیخ المشائخ سید علی حسین اشرفی وضو فرما رہے تھے کہ یکبارگی رونے لگے۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ میں آگے بڑھا اور پوچھا تو فرمایا۔

"بیٹا! میں فرشتوں کے کاندھوں پر "قطب الارشاد" کا جنازہ دیکھ کر رو پڑا ہوں۔ چند گھنٹے بعد بریلی سے تار آگیا کہ اعلیٰ حضرت کا وصال ہوگیا۔"

☆......☆

مولانا ظفر الدین بہاری بوقت وصال اعلیٰ حضرت پٹنہ میں تھے۔ ان کو بھی اعلیٰ حضرت قبلہ کی زیارت سے مشرف ہوا کہ مسجد میں نہایت ہی سفید صاف شفاف لباس زیب بدن فرمائے تشریف رکھتے ہیں۔ چاروں طرف لوگ بدستور مسائل پوچھ رہے ہیں لیکن میں بالکل خاموش اعلیٰ حضرت کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ خود اعلیٰ حضرت میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔"

مولانا آپ اس قدر حیرت میں کیوں ہیں۔" میں نے عرض کیا۔ "حضور! حامد رضا خاں کا تار میرے پاس پہنچا کہ اعلیٰ حضرت کا وصال ہوگیا اور میں آپ کو زندہ دیکھ رہا ہوں۔ اس پر مسکرا کر فرمایا۔ تو آپ نے اس تار پر یقین کرلیا۔ میں نے کہا مجھے یقین ہی تو نہیں ہوا۔ اس لیے میں نے تار دے دیا کہ کیا آپ نے کوئی تار میرے نام بھیجا ہے لیکن اس کا جواب نہ پہنچا اور اسی پریشانی میں حضور کو دیکھنے خود چلا آیا ہوں۔

اسی حالت میں آنکھ کھل گئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ تار سچا ہے۔ اس لیے کہ حضور والا اگرچہ برابر سفید کپڑے ہی پہنا کرتے تھے مگر اس جوڑے کی سفیدی اور چمک دوسرے قسم کی تھی۔

اسی دن دوسرا تار بھی بریلی سے آگیا کہ اعلیٰ حضرت کے وصال کی خبر صحیح ہے۔"

☆......☆

نہ صرف بریلی میں قل خوانی کا ختم شریف ہوا بلکہ ہندوستان میں جگہ جگہ سوئم ہوا۔ اجمیر شریف میں خواجہ غریب نواز کے آستانے پر خادم آستانہ نے جو سوئم کیا وہ بہت بڑے پیمانے پر ہوا۔ کلکتہ، رنگون سے بھی سوئم کی اطلاعات آئیں۔

جامعہ ازہر مصر کی تعزیتی رپورٹ جو انگریزی اخباروں میں چھپی۔ اس سے بڑی حیرت ہوئی۔ اس واسطے کہ یہاں سے کوئی اطلاع نہ دی گئی تھی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سے بھی ایصال ثواب کی اطلاعات ملیں۔ مدینہ منورہ میں مولانا ضیاء الدین برنی اور وہاں کے دیگر علمائے کرام نے مواجہہ قدس میں بیٹھ کر ایصال ثواب کیا۔ یہ اسی ذاتی عشق کا اثر تھا جو اعلیٰ حضرت کو سرکار دو عالم کی ذات گرامی سے تھا۔

اعلیٰ حضرت کے وصال پر نہ صرف ہندوستان بلکہ حرمین طیبین مصر، شام اور بیروت کے اخباروں میں بھی اس حادثہ ارتحال کی خبریں شائع ہوئیں۔

تلخیص و ماخذات

(1) فیضان اعلیٰ حضرت، حافظ محمد ریحان احمد قادری
(2) حیات اعلیٰ حضرت، محمد ظفر الدین بہاری
(3) حدائق بخشش، دیوان اعلیٰ حضرت
معارف رضا، شمارہ ہشتم 1988ء

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایمانے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

تم ہو چپ

زویا اعجاز

کشمیر ہماری شہ رگِ حیات ہے، ہمارا وہ حصّہ ہے جس کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔ جہاں کے عوام پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔ ایسا کون سا ظلم ہے جو ان پر نہیں توڑا جارہا ہے۔ کیونکہ غاصب حکومت اس پر قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔

جنت نظیر وادی کی ایک ان کہی کہانی

میں ایک اسرار ہوں، نظام کائنات کا ایک اٹوٹ انگ۔ میں قرنوں سے حیات ہوں اور ابد تک دائم رہوں گا۔ مجھے نیرنگیٔ کائنات دیکھتے رہنے کے لیے مقسوم کیا گیا ہے۔ تہذیب و تمدن میری آغوش میں پل بڑھ کر پروان چڑھیں۔ میں نے نوزائیدہ تہذیب کی لڑکھڑاہٹ میں اپنی بقا کے لیے عظیم تڑپ دیکھی۔ ابلیس کی کارفرمائیاں، ہمہ وقت خیر و شر کی کشمکش اور موت و حیات کے دائرے میں سفر کرتے بنی نوع انسان کی اپنی معراج تک پہنچنے کی ہر کاوش

نے بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ پہ گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ جب موسیٰ کے عصا کے اشارے پر سمندر دولخت ہو کر فرعون غرقاب آب ہوا تو میری سانسیں تھم سی گئی تھیں۔ روح اللہ کے مصلوب ہونے اور آسمان پر اٹھائے جانے کے منظر نے مجھے لرزاں دیا تھا۔ چاہ سے صدائیں دیتے یوسفؑ کی پکار مجھے تڑپاتی تھی تو ایوبؑ کی گریہ زاری پر میں قطرہ قطرہ پگھلتا تھا۔ نبی آخر الزماں ﷺ کے سفر معراج پر میری ازل سے رواں سانسوں نے پہلی بار موت کا مزہ چکھا تھا۔ ایک عارضی موت۔ نواسۂ رسولؐ نے جب اپنی قوم کی بقا کے لیے خاک بجھو دھو کر شہادت پائی اس وقت کائنات کی ہر شے کے ساتھ میں بھی نوحہ کناں تھا۔

اپنے اس سفر کی داستانیں صفحہ قرطاس پر بکھیر نے لگوں تو ایک مکمل خاکی زندگی تمام ہو جائے لیکن میری داستان ہزار رنگ بھی مکمل نہ ہو پائے گی۔ میں نے آدمیت کی معراج بھی دیکھی اور بشر میں سمائے ہوئے شر کی تباہ کاریاں بھی۔ چنگیز خان نے سمرقند اور بخارا میں انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنائے تو میں بھی سکوت کی چادر اوڑھے وہیں خون کے آنسو بہا رہا تھا، ہلاکو خان نے دجلہ کے پانی کو کتابوں کی بے حرمتی سے داغدار کیا تو اس دن مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرا آئندہ سفر انسانیت کی بد سے بدتر تذلیل دیکھتے گذرے گا۔ درندگی و وحشت کی بے لگام حشر سامانیاں سہتے ہوئے میں نے ایک ایسی وادی بھی دیکھی جس کی محض ایک جھلک بے خود کر دیا کرتی ہے، جہاں دودھ سے شفاف پانی کی نہریں مدھر نغموں کی طرح بہتی ہیں۔ پہاڑ دھرتی پر کسی محافظ کی طرح اپنا چوڑا سینہ تانے ایستادہ ہیں۔ سرو قامت درختوں سے سورج کی کرنیں اٹکھیلیاں کرتیں، زمین کو اپنی حرارت کی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں بدن کو سرسراتی ہیں تو پھولوں کی خوش رنگ نرماہٹ انگلیوں کی پوروں میں گدگداتی محبت جگا دیتی ہیں۔ جہاں چاند اپنے ہم نشینوں کے ساتھ قصہ گوئی میں مصروف رہتا ہے، رات کسی مہربان محبوبہ کی مانند اپنی زلفیں بکھیرے وادی میں کج کج اترتی ہے اور سورج کی پہلی کرن اس کے ہر ایک کونے کو بوسے دیتی منور و تاباں کر دیتی ہے۔

یہاں موسم اپنے اندر فطرت کی دلکشی سموئے ہر سو جلوے بکھیرتے ہیں۔ اس وادی نے اپنی پیدائش کے آغاز ہی سے المناک حوادث کا سامنا کیا۔ مختلف مذاہب کے پیرو کار اس کی ملکیت و حقوق کے لیے ہمیشہ برسر پیکار رہتے اپنے انجام سے بغلگیر ہوتے رہے لیکن میں آج بھی اس داستان کے اوراق پلٹنے کے لیے حیات ہوں۔

میں ایک مسافر ہوں جو ازل سے اس کائنات میں وقت کی اکائی کا روپ لیے ایک لامتناہی سفر طے کر رہا ہے۔

اور یہ داستان ہے اسی سفر میں میری ہمسفر بنی ایک وادی ”کشمیر“ کی۔

☆......☆

اس وادی میں زندگی پتھر کے زمانے سے سانس لے رہی ہے۔ میری آنکھیں ان کی سادگی، باہمی محبت اور خوبصورت طرز زندگی سے بہت ٹھنڈک اور سکون پاتی تھیں، مٹی سے تعمیر شدہ گھر، استرکاری، کھردرے برتن اور پتھروں سے بنے اوزار ہی ان کی متاع حیات ہوتے تھے۔ شعور کی سطح کچھ مزید اجاگر ہوئی تو مکانات سطح زمین پر تعمیر کیے جانے لگے اور مُردوں کو دفنایا جانے لگا۔ طعام کے لیے شکار اور ماہی گیری کے علاوہ گندم، جو اور مسور کی دالیں یہاں کے باسیوں کو خوب بھاتی تھیں۔

326 قبل از مسیح میں پورس نے بادشاہ وقت امبھیر سے سکندر اعظم سے جنگ کے خلاف مدد طلب کی۔ اس جنگ میں پورس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور امبھیر نے سکندر اعظم کو بطور تاوان کئی ہاتھی اور شاہی خزانے بھیج کر اس کی اطاعت قبول کر لی۔

راجا اشوک کے عہد حکومت میں کشمیر موریہ سلطنت کا حصہ بن گیا اور یہاں پہلی مرتبہ بدھ مت کی تعلیمات متعارف ہوئیں۔ اس دور میں بہت سے سٹاپو، شیوا کے نام لیوا شوالہ سری نگری (موجودہ سری نگر) میں تعمیر کیے گئے۔ زندگی بہت سہل اور رواں انداز میں بیت رہی تھی۔

موریہ حکومت کا خاتمہ شہنشاہ کنشکا نے کیا اور یہاں ایک نئے شہر کنشکا پور کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں 'اشوا گوش'، 'نگار جونا' اور 'واسومترا' جیسے کئی نامور علما نے بدھ مت کی تعلیمات کو فروغ دیا۔

چوتھی صدی عیسوی میں کشمیر بدھ مت اور ہندو مت کا ایک اہم تعلیمی و مذہبی مرکز بن گیا تھا۔ کشمیری بدھ مبلغین نے مذہبی تعلیمات تبت اور چین کی سرحدوں کے پار پہنچا دیں اور پانچویں صدی سے ان ممالک کے مذہبی زائرین نے بھی یہاں کئی دورے کیے۔ کمار جیوا (413-434 بعد از مسیح) ان نامور کشمیری مبلغین میں سرفہرست تھا جنہوں نے چین کا دشوار تر سفر اختیار کیا۔ اس کی نرم خوئی اور تعلیمی و مذہبی

قابلیت نے چینی شہنشاہ یاوزنگ کو بہت متاثر کیا۔ اس نے شینگلین نامی خانقاہ میں قیام کے دوران بہت سے سنسکرت افکار کو چینی زبان کے قالب میں ڈھالا۔

محبت، خلوص اور خود شناسی کا یہ دور اپنے اصل ماخذ و فطرت سے دور ہی سہی لیکن یہاں انسان دوستی اور امن و آشتی کی ایک پُرسکون فضا قائم تھی جسے اب بشر میں سمایا ہوا شر دھیرے دھیرے گہنانے لگا تھا۔ ایشیائی جنگجو خانہ بدوشوں نے تورمان کی قیادت میں کوہ ہندوکش عبور کرنے کے بعد کشمیر سمیت مغربی ہندوستان پر اپنا تسلط جمالیا۔ اس کے بیٹے مہیر کلا نے شمالی ہندوستان پر تسلط جمانے کے لیے ایک فوجی دستے کی قیادت کی لیکن مگدھ میں بالادتیہ کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مالوہ کے مقام پر یشودھرمان سے مغلوب ہونے کے بعد مہیر کلا کشمیر واپس لوٹ آیا اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ مہیر نے پہلی مرتبہ اس وادی میں خون کی ندیاں بہادیں۔ گندھارا فتح کرنے کے بعد بدھ مت کے پیروکاروں پر بے پناہ ظلم و تشدد کیا اور ان کے عبادت کدے تباہ کر دیئے۔ مہیر کی وفات کے بعد ان جنگجو خانہ بدوشوں کا تسلط کمزور پڑ گیا۔

میرا استغراب سات صدیاں مکمل کر چکا تھا اور اس سفر کے دوران میں نے اس وادی میں ہندومت کا اثر و رسوخ قائم ہوتے دیکھا۔ شعرا، فلسفیوں اور فنکاروں نے سنسکرت ادب اور ہندو مذہبی افکار پروان چڑھائے۔

آٹھویں صدی میں یہاں کرکوٹا سلطنت کے جانبازوں نے حکمرانی قائم کر کے کشمیر کو ایک سامراجی طاقت کا درجہ دے دیا۔ للیت آدتیہ نے ریاستی حدود میں اضافہ کرتے ہوئے اپنا اثر و رسوخ مالوہ اور گجرات تک بڑھا کر سندھ میں عربوں کو شکست دی لیکن خود اپنی زندگی کے محاذ پر موت کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ اس کی وفات نے دوسری ریاستوں پر کشمیری تسلط کمزور کر دیا اور اس عہد حکومت کا باب ختم ہوتے ہی 'اونتی ورمن' نے 'اتپالا' دورِ سلطنت کی داغ بیل ڈال دی جسے اس کے جانشین 'شنکر ورمن' نے پنجاب کی سرحدوں تک وسعت دے دی۔

بہادری، جوانمردی اور جنگی نقاروں کے ساتھ ساتھ اب درباری سازشیں، حسد اور کینہ پروری نے اس وادی کی بنیادیں کھوکھلی کرنی شروع کر دی تھیں۔ دسویں صدی میں سیاسی عدم استحکام نے سازشی عناصر کا اثر و رسوخ بڑھا دیا اور عوام کے لیے ظلم و وحشت کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ شاہی محافظ دستے لوٹ مار اور قانون شکنی میں ملوث ہو گئے جس کے باعث شہری انتظامی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

دسویں صدی کا نصف پڑاؤ مکمل ہونے کے بعد کشمیر پر پہلی مرتبہ ایک باثر خاتون کی حکومت کا آغاز ہوا۔ 'ملکہ دیڈا' کابل کے شاہی خاندان کی دختر تھی جس نے کشمیری بادشاہ 'کسیم گپتا' سے شادی کے بعد کشمیر سے اپنی خاندانی ریاست کا الحاق کر لیا۔ 958 عیسوی میں شکار سے واپسی کے دوران بخار میں مبتلا ہونے کے بعد بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ جانشین شہزادہ 'ابھیمنیو' نابالغ تھا لہٰذا ملکہ نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالنے کے بعد ریاستی معاملات میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ ذاتی کردار میں کئی خامیوں کے باوجود وہ گرانقدر سیاسی بصیرت کی حامل تھی۔ اس کے دورِ حکومت میں کشت و خون اور ریاستی بربریت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور کشمیر کی خوبصورتی و امن زندگیوں کو معطر کرنے لگا۔ 1003 میں ملکہ کی وفات کے بعد تخت و تاج اس کے ورثا کو منتقل ہو گیا جنھوں نے 'لوہارا عہد حکومت' کی بنیاد رکھنے کے بعد ایک طویل عرصے تک حکومت کی۔

گیارہویں صدی میں محمود غزنوی نے اس جنت نظیر وادی پر قابض ہونے کی تمنا لیے دو بھرپور حملے کیے لیکن ناکام رہا اور لوہارا خاندان کی حاکمیت آئندہ دو صدیوں تک برقرار رہی۔ جابرانہ محاصل، بدعملی، خونریز جنگوں اور جاگیردارانہ نظام نے عوام کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ مرکزی نظام کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا اور بیرونی حملہ آوروں کی راہیں آسان ہونے لگیں۔ لوہارا سلطنت کا آخری حکمران ''سوہا دیو'' تھا جس کی نااہلی اور سیاسی کمزوریوں کے باعث ایک ترک منگول سردار ''زلجو'' نے ستر ہزار افراد کے لشکر کے ساتھ کشمیر پر ایک بھرپور وحشیانہ حملہ کیا۔ سوہا دیو تخت و تاج چھوڑ کر تبت فرار ہو گیا۔ منگولوں نے بھی مالِ مفت دلِ بے رحم کے مصداق اس وادی کا خوب استحصال کیا۔ بدنظمی اور شورشیں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ وزیر اعظم رام چندر نے اس صورتِ حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور تخت پر قبضہ جما کر 'رنچن' کو وزیر مقرر کر دیا۔

اب رنچن کا احوال بھی ملاحظہ ہو۔ وہ ایک بدھ شہزادہ تھا۔ لداخ کے سردار کا بیٹا تھا۔ اس کے ایک چچا نے لداخ پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی لیکن اس نے چچا کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور اپنا آبائی علاقہ چھوڑ دیا۔ ان حالات میں

وادی کشمیر نے اپنی بانہیں وا کیے اسے پناہ دی۔ راجا سوہادیو اپنی زندگی میں ہی اسے اہم درباری عہدے پر فائز کر چکا تھا۔ دربار میں رنچن کے روابط ایک مسلم وزیر ''شاہ میر'' سے قائم ہو گئے۔ مسلم عقائد و نظریات نے اسے بے حد متاثر کیا لیکن تبدیلی مذہب سے وہ تا حال بہت دور تھا۔ رنچن نے رام چندر کی حکومت کا تختہ الٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کے اہل و عیال کو دائمی قید میں مبتلا کر دیا۔

لدا خی نظریات و افکار کے باعث وہ اپنے عوام کے دلوں کو تسخیر کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ حکومتی معاملات میں بہتری کے لیے اس نے جاں توڑ کوششیں کیں اور رام چندر کے بیٹے ''راون چندر'' کا دل جیت کر اسے اپنا مشیر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ رام چندر کی بیٹی ''کوٹا رانی'' سے شادی کر لی اور ایک بار پھر ہندو مت کی طرف مائل ہونے لگا۔ سیاسی مفادات کے پیش نظر وہ برہمن پنڈتوں کے پیشوا اعظم ''دیوا سوامی'' کے پاس جا پہنچا اور اس سے ہندو مت اختیار کرنے کی درخواست کی۔ سوامی نے اس کی نسل اور قومیت کو کمتر قرار دیتے ہوئے اسے ہندو بنانے سے انکار کر دیا۔

قدرت نے رنچن کی زندگی اور پھر اس کے توسط، وادی کشمیر میں ابھی بہت سے انقلاب برپا کرنے تھے۔ مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا سے صوفی مبلغین وادی کا رخ کرنے لگے اور عوامی سطح پر اسلام کی روشنی پھیلنے لگی۔ شاہی دربار میں بدھ مت اور ہندو مت کے پیروکاروں میں ایک سرد جنگ جاری ہو چکی تھی۔ شاہ میر اب دلی طور پر اس بات کا خواہاں تھا کہ رنچن تینوں مذاہب میں کسی ایک کا مستقل انتخاب کر کے اپنا تذبذب ختم کر دے۔ اس نے بادشاہ کو رائے دی کہ اگلی صبح دربار میں حاضر ہونے والے پہلے شخص کو مشیت الٰہی کی تائید سمجھتے ہوئے اس کا مذہب اختیار کر لے۔

شاہ میر اپنے ایک قریبی ساتھی بلبل شاہ کے ساتھ ایک منصوبہ پہلے ہی ترتیب دے چکا تھا لہٰذا جب اگلی صبح وہ بادشاہ کی معیت میں دربار پہنچا تو ''سید شرف الدین بلبل شاہ'' کو نماز کی ادائیگی میں مصروف پایا۔ رنچن نے اسلام قبول کر کے ''سلطان صدرالدین شاہ'' کا لقب اختیار کر لیا۔ بادشاہ کی تبدیلی مذہب کے ساتھ اس کے برادر نسبتی راون چندر اور دس ہزار عام افراد بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اسلام کی روشنی اب صدرالدین کے قلب و روح کو منور کرنے لگی تھی۔ اس نے بدھ مندر کی جگہ پر ''بڑ مشید'' نامی مسجد تعمیر کروائی۔ یہ کشمیری تاریخ کی پہلی مسجد تھی۔ بعد ازاں ان تعمیرات کا سلسلہ رک نہ سکا۔ علی کدال میں ایک اور مسجد کے علاوہ اس نے اپنے روحانی سرپرست بلبل شاہ کے اعزاز میں ایک خانقاہ تعمیر کروائی جس کے ساتھ ایک لنگر خانہ بھی متصل تھا جہاں غریبوں کو دو وقت کا کھانا بلا معاوضہ فراہم کیا جاتا تھا۔

سلطان صدرالدین کی وفات کے بعد شاہ میر نے اس کے جانشین ''حیدر خان'' کے خلاف بغاوت کا نیا سلسلہ شروع کر کے تخت و تاج پر قبضہ کر کے مسلم حکومت کا تسلسل قائم رکھا۔

☆......☆

صدرالدین اور شاہ میر کے اقتدار کی داستان ختم ہوئی۔ میرا سغراب چودھویں صدی کی مسافت میں آن پہنچا تھا۔ دین فطرت اسلام کا آفاقی رنگ کشمیری عوام کو اپنے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ میں نے اپنے اس سفر میں واحد اسی مذہب کو ناقابل تغیر پایا تھا۔ ہندو مت اور بدھ مت کے افکار نے اسے مغلوب کرنے کی ان تھک کوششیں کر ڈالیں لیکن اسے اپنے مذہب میں ضم نہ کر سکے۔ مسلم مبلغ شیخ نور الدین نورانی نے یہاں صوفی تعلیمات کا پرچار کیا اور اسلام دھیرے دھیرے تمام تر ظلمتیں مٹانے لگا۔

1470-1354 کے درمیانی عرصہ میں تمام تر سلاطین متحمل مزاج اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے لیے انتہائی روادار تھے۔ شاہی رواداری اور آسودگی کا اثر عوامی حلقوں میں بھی مثبت اثرات مرتب کر رہا تھا۔ اس پر سکون سفر میں سلطان سکندر (1413-1389) کی اقتدار میں آمد نے ایک ذرا سی ہلچل مچا دی۔ اس نے غیر مسلموں پر بے جا ٹیکس لاگو کیے اور انھیں تبدیلی مذہب کے لیے مجبور کرتا رہا۔ سلطنت میں موجود بتوں کی تباہی کے باعث اسے ''بت شکن'' کا خطاب بھی ملا۔

اگلی نصف صدی کے لیے کشمیری سلطنت کی عنان سلطان زین العابدین کے تسلط میں آ ئی۔ اس نے کئی فنکار، دستکار اور ہنر مند وسط ایشیا اور فارس (ایران) سے مقامی افراد کی تکنیکی تربیت کے لیے طلب کیے۔ اس کے عہد حکومت میں لکڑی پر کندہ کاری، کاغذ کی لیدی کے مواد سے مختلف چیزوں کی صناعی، شال اور قالین بافی کے شعبے بہت تیزی سے پروان چڑھے۔

سولھویں صدی کے وسط تک درباری معاملات میں ہندو پجاریوں کا اثرورسوخ مزید کم ہوگیا اور وسطی ایشیا و فارس سے ہجرت کرکے آنے والے مسلم مبلغین کی کاوشوں سے فارسی زبان نے سنسکرت کی جگہ شاہی زبان کا مقام حاصل کرلیا۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان پر مغلیہ حکومت اپنے مکمل جاہ وجلال سے قوت حاصل کرچکی تھی لیکن اس وادی میں ابھی تک مغلوں کے مضبوط قدموں کی دھمک نہیں گونجی تھی۔ 1540 میں کاشغر کے حکمران خاندان کے ایک فرد مرزا محمد حیدر دولت نے شہنشاہ ہمایوں کی ایما پر یہاں حملہ کیا اور لگ بھگ ایک عشرہ تک اپنی حکومت قائم رکھی۔

کشمیر تا وقت براہ راست مغل حکومت کے زیر اثر نہیں آپایا تھا۔ 1589 میں مغل بادشاہ اکبر نے اس وادی کا بنفس نفیس دورہ کیا۔ اس کے جانشین حکمرانوں نے بھی یہاں کئی باغات، مساجد اور محلات تعمیر کروائے۔ مغل تمدن نے وادی کے حسن کو مزید دلکشی عطا کردی لیکن اورنگزیب کی وفات کے بعد مذہبی عدم برداشت اور جابرانہ محاصل نے ایک بار پھر عوامی سطح پر اپنا پھن پھیلا لیا اور مغلیہ تسلط کمزور سے کمزورتر ہونے لگی۔

1700 عیسوی میں ایک مالدار تاجر کا ملازم "موئے مبارک" کشمیر میں لایا جسے ڈل جھیل کے کنارے حضرت بل کی درگاہ پر زیارت کے لیے رکھ دیا گیا اور اس وادی کی اہمیت میں گوناگوں اضافہ ہوگیا۔

1738 میں نادر شاہ مکمل قوت کے ساتھ ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ برسرپیکار ہوا اور میں نے انسانی وحشت کی ایک نئی داستان رقم ہوتے دیکھی۔ ان حملوں کے نتیجہ میں مغلوں کی عسکری وسیاسی قوت مزید لڑکھڑا گئی اور وفاق سے کئی سومیل دور اس وادی میں ان کا تسلط تاش کے پتوں سے بنے کسی گھر کی مانند بکھرنے لگا۔ 1753 میں احمد شاہ ابدالی کے فوجی جرنیل عبدالخان نے کشمیر کا رخ کیا اور ایک مرتبہ پھر یہ جنت نظیر وادی بارود وخون کی لپیٹ میں آگئی۔ افغان حکومت مقامی باشندوں کے حق میں بے حد ظالم وجابر ثابت ہوئی۔ ہندو شہریوں کی جائیدادیں ضبط کرکے انہیں جبری غلام بنادیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی وفات کے بعد افغان تسلط میں کمزوری کے باوجود وادی کے رہائشیوں پر آئندہ 47 سال بہت کٹھن اور گھٹن زدہ ثابت ہوئے۔

☆......☆

اس حرماں نصیب وادی پر بیتنے والی ہر اک گھڑی میرے سامنے عیاں تھی۔ ہر گذرتا دن اس کے باسیوں کے لیے نئی سے نئی تبدیلی اور آزمائش لے آتا تھا۔ سینکڑوں حملہ آوروں اور دراندازوں کے قدموں تلے روندی جانے والی یہ سرزمین ایک بار پھر ایک نئی قوم کی وحشت کی بھینٹ چڑھنے والی تھی۔ اونچے لمبے بھاری بھرکم جثے، لمبے کیس اور گھنی داڑھیاں لیے یہ سکھ قوم ایک آندھی کی طرح نمودار ہوئی اور کسی طوفان کی مانند سب کچھ ملیامیٹ کرکے رکھ دیا۔ درانی حکومت کے چار سو سالہ اقتدار کا خاتمہ ایک پنجابی سردار رنجیت سنگھ نے کیا۔ 1819 میں درانی سلطنت کے اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ افغان جبرواستبداد سے بے حال کشمیری عوام نے اپنے ان نئے حکمرانوں کا بہت خوشدلی سے استقبال کیا۔ ان کی یہ نادانیاں افسوسناک ہی نہیں، تشویشناک بھی تھیں۔ سکھوں نے بھی سابقہ روش برقرار رکھی اور عوام کے لیے ماضی سے زیادہ سخت گیری روا رکھی۔ مقامی حکمرانوں نے لاہور میں اپنی وفاقی حکومت کے احکامات کے زیراثر مسلم کش قوانین لاگو دیئے۔ ذبیحہ گائے میں ملوث مسلمانوں کو سزائے موت دی جانے لگی۔ سکھ مذہب کے پیروکار اذان کے مقدس کلمات سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتے تھے۔ عوامی مقامات پر اذان کی ادائیگی روکنے کے علاوہ سری نگر کی جامع مسجد میں نماز کی ادائیگی پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ ہر سو ایک ہراس وبے بس آہوں نے فضائیں بوجھل کررکھی تھیں۔

وادی کشمیر کا حسن یورپی سیاحوں کے دلوں کو بھی گدگدانے لگا تھا۔ فطری مناظر کے رسیا ان سیاحوں نے انسانی استحصال کی اس بدترین صورت حال دیکھی تو مقامی مسلم کسانوں پر ان کی قوت برداشت سے کہیں زیادہ محصولات، غربت، کسمپرسی اور مذہبی جبر کے متعلق کئی تصانیف لکھیں۔ زرعی اراضی کا محض سولھواں حصہ ہی قابل کاشت تھا کیونکہ مزید کھیتی باڑی کی صورت میں کسان محصولات کی ادائیگی کی تاب خود میں نہ پاتے تھے تاہم 1832 میں ایک سخت قحط کے بعد سکھ حکمرانوں نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارضی محصول میں نصف کے تناسب سے کمی کرنے کے علاوہ کسانوں کو سود سے پاک قرضوں کی فراہمی بھی شروع کردی۔ اس کے باوجود بھی کشمیر سکھ سلطنت کی دوسری بڑی مالگوار ریاست بن چکی تھی۔ کشمیری شالوں کی

مانگ میں عالمی سطح پر اضافہ ہونے لگا اور یورپی منڈی میں اس کے کئی مستقل گاہک بن گئے۔

سکھ کشمیر میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے میں معروف تھے ان کا جوش اور جنگی جنون مستقبل قریب کے مخدوش حالات کا واضح عکاس تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد وادی کا جنوبی حصہ ’جموں‘ بھی فتح کرلیا گیا۔

اس وادی کی خونی داستان میں گلاب سنگھ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ رنجیت سنگھ کا یہ بھتیجا دربار ی خدمات کے علاوہ کئی فوجی مہمات میں اپنی اہلیت کا لوہا منوا کر جموں کے علاقہ کا گورنر مقرر ہو گیا۔ انسانی لہو کی چاٹ اور اقتدار کا نشہ اس کے حواس کو مکمل طور پر مغلوب کر چکا تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی افسر ”زور آور سنگھ“ کی معاونت سے اپنی حکومت کی سرحدیں جموں کے مشرق اور شمال مشرق تک وسیع کرتے ہوئے لداخ اور بلتستان پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

گلاب سنگھ ایک دور اندیش اور ابن الوقت انسان تھا۔ ہواؤں کا رخ مکمل طور پر بھانپتے ہوئے اس نے اپنی درپردہ خدمات اور وفاداریاں انگریزوں کو سونپ دی تھیں۔ تجارت کی غرض سے برصغیر میں وارد ہونے والی یہ قوم ’ایسٹ انڈیا کمپنی‘ کے توسط یہاں کے کمزور، بے بس اور عیش و نشاط کے دلدادہ حکمرانوں کی کمزوریوں پر کسی شاطر کھلاڑی کی مانند غالب تھی۔

1845 میں ہونے والی اینگلو۔ سکھ جنگ میں گلاب سنگھ انتہائی حکمت عملی اور تدبیر کے تحت بالکل ملوث نہ ہوا اور انگریز حکومتی اہلکار و فوجی ”سرہنری لارنس“ کے لیے بھی بھرپور ثالثی مشیر کا کردار ادا کر کے ان کی ہمدردیاں مکمل طور پر حاصل کرلیں۔

☆......☆

گلاب سنگھ اور انگریزوں کا گٹھ جوڑ کشمیر کے لیے ایک ایسی بلائے ناگہانی ثابت ہوا جس کا کرب آیندہ آنے والی ہر نسل نے برداشت کیا۔ جبر، استحصال، خونریزی، عدم برداشت اور بے حسی جھیلنے والے اس جنت نظیر وادی کے عوام اپنے سر پر پڑنے والی ایک نئی افتاد سے بالکل بے خبر تھے۔

روئے کائنات میں پہلی مرتبہ خالق کی تخلیق انسانی فرعونیت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر ڈوگرہ راجا گلاب سنگھ کو 75 لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض فروخت کردی۔ اس وقت ریاست کا رقبہ تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار میل تھا۔ وادی اور اس کے رہائشیوں نے محض چند روپوں فی مربع و فی کس کے مول میں اپنا وجود، شناخت اور آدمیت کی معراج کھو دی۔

1857 کی جنگ آزادی میں ڈوگرہ خاندان نے برطانوی حکمرانوں کی معاونت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ انھوں نے انگریز خواتین اور بچوں کو دربار میں سیاسی پناہ دی اور کئی کشمیری فوجی دستے برطانوی فوج کی مدد کے لیے بھیجے۔ اس وفاداری کے انعام میں انگریزوں نے گلاب سنگھ کی آیندہ نسلوں پر بھی نوازشات کا ایک نیا سلسلہ جاری کر دیا۔ گلاب سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا رنبیر سنگھ بھی اسی میراث پر عمل پیرا رہا۔

کشمیر کی ریاست کبھی بھی مربوط شناخت حاصل نہ کر پائی تھی۔ ریاستی حکمران مختلف علاقے تسخیر کرنے کے بعد اس کی سرحدیں وسیع کرتے رہے تھے لیکن نسلیت و قومیت کے لحاظ سے یہاں کسی قسم کی ہم آہنگی نہ تھی۔ ریاست کے مشرق میں واقع لداخ ثقافتی اعتبار سے ایک تبتی علاقہ تھا اور یہاں کے باشندے بدھ مت کے پیروکار تھے۔ جنوبی سمت میں جموں کی آبادی مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ وسطی علاقے گنجان آباد تھے اور یہاں سنی مسلمانوں کے علاوہ برہمن پنڈتوں کا ایک چھوٹا سا قدرے بااثر طبقہ بھی موجود تھا۔ شمال مشرقی سمت میں بلتستان کی منتشر آبادی نسلی اعتبار سے لداخ کے مکینوں جیسی تھی لیکن مذہبی لحاظ سے وہ شیعہ افکار کے حامل تھے۔ شمال کی جانب گلگت ایجنسی میں بھی آبادی قدرے منتشر اور شیعہ ہی تھی۔ مغربی اطراف میں نسلی اعتبار سے وادی کے دیگر علاقوں سے قطعی مختلف سنی اکثریت آباد تھی۔

اس ریاست میں صدیوں سے جاری ظلم و ستم ہر گذرتے دن کے ساتھ شدید ہونے لگا تھا اور اس عمل کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک ریاستی مکینوں اور اقوام پر بھی عائد ہوتی تھی۔ اس وسیع و عریض کائنات میں ازل سے ہر قوم کے لیے ایک مخصوص راستہ اور طرز حیات متعین ہے اور جب بھی کوئی قوم اپنے مخصوص سفر اور رستوں سے پہلو تہی کرتی ہے ذلت، عذاب اور غلامی کی ناقابل برداشت بیڑیوں میں جکڑ دی جاتی ہے۔ بالخصوص مسلم قوم بھی اپنی اسی کوتاہی کے باعث انسانی درجے کی کم ترین سطح پر زندگی گذارنے پر مجبور تھی۔

مسلم قوم کو ودیعت کردہ الہامی تعلیمات اور کتاب ان کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہیں۔ ان کے وجود میں

موجزن اضطراب کا ایک بحر ہی ان کی بقا کا ضامن ہے۔ یہ قوم غلامی کے لیے تخلیق نہیں کی گئی۔ الہامی کتاب قرآن پاک کے تیس پاروں، ایک سو چودہ سورتوں اور 6666 آیات کی کسی ایک سطر یا حرف میں غلامی کے آداب شامل ہی نہیں ہیں تو اس حالت میں یہ کیونکر پُرسکون، اطمینان بخش اور باعزت زندگی گزار سکتی تھی۔ ان کی تمام تر سابقہ کوتاہیوں کی بدولت اغیار ان پر بری طرح مسلط کر دیے گئے تھے اور اب تو صورتِ حال مزید بے قابو ہونے لگی تھی۔

میرا قرنوں سے جاری یہ سفر بیسویں صدی کی مسافت طے کر رہا تھا۔ تبدیلی کا پھیرو ہر سُو اپنی بلند پروازی میں مگن تھا لیکن بس ایک یہی ریاست تھی جو اب بھی اپنی اسی روش پر قائم تھی۔ شاہی اقتدار گلاب سنگھ کی تیسری نسل میں ہری سنگھ کو منتقل ہو گیا تھا جو ہمہ وقت لہو و لعب اور عیش و نشاط کی سرگرمیوں میں غرق رہتا تھا۔ سیاسی معاملات میں اس کی دلچسپی مفقود تھی اور نتیجتاً ریاست کے ڈوگرہ ہندو ملازمین اپنی من مانیوں میں مشغول رہتے۔ عوامی سطح پر لوٹ مار اور استحصال کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری زور پکڑتی جا رہی تھی جس کے دوررس اثرات کشمیری مسلمانوں کی نسل نو میں بھی سرایت کرنے لگے۔ اپنی اصل شناخت اور مقصدِ حیات کے عرفان نے بالآخر ان کے دلوں میں بھی آزادی کی ایک شمع روشن کر دی اور وہ اپنی پوری قوت و استطاعت کے ساتھ شاہی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ نتیجہ کی پروا کیے بغیر سرفروشوں کا ایک قافلہ اپنی منزل متعین کیے دیوانہ وار آتشیں سفر کے لیے تیار تھا۔

شعور کی سطح جوں جوں بلند ہوئی ریاستی افراد نے مقدور بھر اقدامات اٹھانے شروع کر دیے۔ 1929 میں سرینگر میں شیخ عبداللہ نے ''ریڈنگ روم پارٹی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جموں میں چودھری غلام عباس نے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر "Young Men's Muslim Association" کی بنیاد ڈالی۔ ریاست کے مسلم نوجوان ایک نیا جوش و ولولہ لیے صدیوں سے لپٹی غلامی کی ان زنجیروں سے چھٹکارے کے لیے باہم مٹھی کی مانند متحد ہو گئے اور اس پلیٹ فارم کے توسط معاشرتی ناہمواریوں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر سراپا احتجاج ہو گئے۔

مہاراجا ہری سنگھ شراب و شباب کی مستیوں میں اپنی سدھ بدھ گنوا بیٹھے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت کلکتہ، بمبئی، لندن اور پیرس کے عشرت کدوں میں دادِ عیش دیتے گزرتا تھا۔ ہندو اہلکاروں کے بدعزائم اپنی حدود تجاوز کر رہے تھے۔ مسلم رعایا کی جان اور مال کے بعد ان کی عزت و ناموس اور دین و ایمان بھی غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ مساجد میں نماز کی ادائیگی پر پابندی کے بعد خانہ خدا کی شہادت نے مسلمانوں کی قوت برداشت کا خاتمہ کر دیا۔ ہندوؤں کی چیرہ دستیاں اور حوصلے اس قدر بڑھ گئے کہ جموں میں پولیس کی سرپرستی میں قرآن پاک کی سرعام بے حرمتی کے واقعات رونما ہونے لگے جس کے باعث ریاست میں ہنگاموں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کا طیش کسی آتش فشاں کی مانند ان سب غیر انسانی سرگرمیوں پر پھٹ پڑنے کے لیے بے تاب تھا۔ انھی دنوں عبدالقدیر نامی ایک حریت پسند نے کئی بڑے جلوسوں میں تقاریر کیں اور مہاراجا ہری سنگھ کی کٹھ پتلی حکومت کو خوب آڑے ہاتھوں لیا جس کی پاداش میں اسے پسِ زنداں بھیج دیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف مسلمانوں نے کئی احتجاجی مظاہرے کیے۔ جیل کا محاصرہ کر لیا گیا لیکن حکومتی اہلکاروں نے مجمع کو بہیمانہ فائرنگ سے بھون ڈالا۔

مہاراجا ہری سنگھ اور اس کے پٹھوؤں کے ظلم و ستم کی داستانوں کی گونج اب ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں بھی سنائی دینے لگی تھی۔ سیالکوٹ، گورداسپور اور گجرات سے مسلم عوام کشمیری بھائیوں کی حمایت کے لیے جوق در جوق ریاست میں وارد ہونے لگے۔ اسلامی مواخات کا تاریخی رشتہ ایک بار پھر اپنی بھرپور جھلک دکھانے لگا اور اسی تاریخ میں ہمیشہ سے اپنوں کی دغابازی اور موقع پرستی بھی ایک ابتلا کی مانند نقصانات پہنچاتی آئی ہے۔ کشمیر میں جہاں ایک طرف ہندوستانی مسلمان مقامی آبادی کو باہمی تقویت بہم پہنچا رہے تھے وہیں دوسری جانب شیخ عبداللہ نے ہندو کانگریس کا دم بھرنا شروع کر دیا۔ اس گھر کو گھر ہی کے چراغ نے خاکستر کر دیا۔

آزادی کی یہ جدوجہد اپنے اختتامی مراحل میں آن پہنچی۔ 1947 میں برطانوی سامراج نے ایک بظاہر نحیف ونزار لیکن مردِ آہن محمد علی جناح کی قوت ارادی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور دنیا کے نقشے پر ایک نئی اسلامی ریاست ''پاکستان'' کا وجود ابھرا۔ اس نوزائیدہ ریاست کے لیے کشمیر کی محبت وضرورت ناگزیر امر تھی۔ وہ ریاست کے عوام

سے دینی و ملی اخوت کے اٹوٹ رشتے سے بندھے تھے۔ ایک ایسا انمول رشتہ جس میں ہزاروں میل دور بیٹھے دینی بھائی کو چبھنے والے ایک معمولی سے کانٹے کی تکلیف بھی دوسرے بھائی کو بے تاب کر دیتی ہے۔ صرف یہی نہیں پاکستان کی جغرافیائی سرحدیں بھی کشمیر سے منسلک تھیں۔

انگریز سامراج کی ہمیشہ سے ایک خاصیت یہ رہی ہے کہ اپنی نوآبادیوں سے دستبردار ہونے سے پہلے وہاں کی حکومت و عوام کو کسی نہ کسی متنازعہ معاملہ میں جتلا کر دیتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے وقت 562 ریاستوں کی قسمت کا فیصلہ ان کے حکمرانوں اور عوامی خواہشات کے سپرد کر دیا گیا۔ کشمیر کی 80 فیصد آبادی مسلمان تھی لہٰذا اصولی طور پر ان کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا لازم تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے گورداسپور کا مسلم اکثریتی علاقہ جنبش قلم سے بھارت کی جھولی میں ڈال کر اس تقسیم کو رہتی دنیا تک ایک ناقابل فراموش خونی رنگ میں ڈھال دیا بھارت کو کشمیر میں رسائی مل گئی لیکن مسلمانوں کی دلی رضامندی پاکستان کے حق میں تھی۔ برسوں سے خوابیدہ ہری سنگھ کے اقتدار اور... عیش و نشاط کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ اس الحاق کے لیے دلی طور پر قطعی رضامند نہیں تھا مگر اس میں اب مسلم عوام کے جوش اور جذبہ آزادی سے براہ راست ٹکر لینے کا یارا بھی نہ رہا تھا۔ اس نے بظاہر پاکستان میں شمولیت کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔ ڈاک، تار اور مواصلات کے نظام سمیت تمام ریاستی معاملات میں باہمی تعاون کی مکمل یقین دہانی کروائی۔

مسلم قوم کا سدا سے ایک المیہ یہ بھی رہا ہے کہ یہ سادگی اور مروت میں اپنی مثال آپ رہے ہیں۔ آزادی کی تحریک میں اپنی حفاظت سے غفلت کا خمیازہ لاکھوں افراد کی شہادت اور خواتین کی بے حرمتی کی صورت میں ادا کرنا پڑا اور اب بھی مہاراجا کی چال میں الجھ گئے۔ ہری سنگھ نے اپنی ریاست سے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے فیصلے پر مہر ثبت کر دی۔ فوج، پولیس اور راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) نامی تنظیم کے ارکان مسلم عوام پر قہر بن کر ٹوٹے۔ قتل و غارت اور خواتین کی آبروریزی ایک معمول بن گئی۔ ریاستی اہلکار بظاہر دوستانہ اور ہمدردانہ انداز میں مسلمانوں کو پاکستان منتقل کرنے کا جھانسا دے کر بسوں اور ٹرکوں میں سوار کر دیتے مگر راستے میں ڈوگرہ فوج کے سپاہی اور تنظیم کے افراد گھات لگائے ان کے منتظر ہوتے۔۔ موت کا برہنہ رقص ابلیس کو بھی شرما دیتا تھا۔

جموں میں کشت و خون کے بعد ہری سنگھ پونچھ کے علاقہ میں بھی یہی کھیل کھیلنا چاہتا تھا لیکن ریاست کی مسلم عوام اب سر پر کفن باندھے، اپنی سب کشتیاں جلائے میدان میں کود پڑے۔ وسائل محدود تھے اور مدمقابل انتہائی طاقتور۔ ایمانی قوت کو ہتھیار بنائے آزادی کے ان متوالوں نے اپنے رستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کا سامنا کیا اور ایک طویل مشقت کے بعد پونچھ کا علاقہ ڈوگرہ فوج سے چھین لیا۔ اس کے بعد انھیں مزید قبائلی علاقوں اور رضا کار اہلکاوں کی اعانت حاصل ہو گئی۔ کوہالہ، دومیل اور مظفر آباد کی فتح کے بعد مسلمانوں کے قدم اب سرینگر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مہاراجا ہری سنگھ نے 24 اکتوبر 1947 کو وادی کشمیر سے بھاگ کر جموں میں پناہ لے لی۔

جموں سے مہاراجا نے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھا جس میں اس نے شدید خوف اور بوکھلاہٹ میں بھارتی حکومت سے مدد طلب کر لی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی اسی موقع کی تاک میں تھے۔ انھوں نے ہری سنگھ سے الحاق کے معاہدے پر دستخط کروائے اور کشمیر میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ بھارت کشمیر کے تین چوتھائی حصے پر قابض ہوتے میں کامیاب ہو گیا اور یوں اس داستان نے ایک نیا موڑ لے لیا۔

☆......☆

صدیوں سے جبر کی بھٹی میں سلگتی یہ وادی شاطرانہ سیاسی پینتروں کی زد میں تھی۔ 1948 میں بھارت کی جانب سے یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کیا گیا۔ کونسل نے ''عوامی رائے شماری'' کی ایک قرارداد منظور کی۔ عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے مجاز قرار دیے گئے لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی بھارت نے ریاست پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان بھی اپنی افواج کشمیر بھیجنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے بعد یہاں باہمی کشمکش اور رسہ کشی کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمیر ایک ایسی جنگ کی لپیٹ میں آ گیا جس کا کوئی اختتام نہ تھا اس کی تباہی ماضی کی کسی بھی جنگ سے زیادہ ہولناک تھی کیونکہ اس میں انا، ضد اور ذاتی عناد پنہاں تھا۔

کشمیر کے حالات کو اس نہج تک پہنچانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا کردار یادگار اور تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ نہرو کے آباؤ اجداد کشمیری برہمن تھے لہٰذا اس ریاست کا پاکستان سے الحاق اس کے لیے موت و حیات کا مسئلہ

تھا۔ اپنی انا اور ضد کی تسکین کے لیے اس نے سیاسی داؤ پیچ اور ہٹ دھرمی سے کشمیر کو ایک مستقل میدانِ جنگ بنا ڈالا۔

اکتوبر ۱۹۵۰ میں بھارت نے اپنے آئین میں ایسی ترامیم کیں جس کی رو سے ہندوستان کو مقبوضہ کشمیر میں اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ شیخ عبداللہ نے بھی ایک باہمی میثاق کے تحت بھارتی حکومت کو دخل در معقولات کی مکمل آزادی فراہم کردی۔ گلاب سنگھ کے 'معاہدہ امرتسر' کے بعد شیخ عبداللہ کا یہ 'معاہدہ دہلی' اس ریاست کی پُر امن زندگی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

آیندہ نامزد ہونے والے وزرائے اعظم بھی بھارت نواز ثابت ہوئے۔ ہمہ وقت تناؤ کی کیفیت طاری رہتی۔ مسلم عوام دھونس اور جبر کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ عالمی امن کی علمبردار تنظیم اقوام متحدہ کا دباؤ، تجاویز اور قراردادیں بھارتی ہٹ دھرمی کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوتی رہیں۔ اس خطے کی آزادی کے لیے پاکستان اور بھارت کے مابین نصف صدی میں چار جنگیں لڑی گئیں مگر بے سود۔ سیاسی داؤ پیچ اور عالمی ردِعمل کی قصہ گوئی تو مانو ایک الگ ہی داستان کی متقاضی ہے۔ کشمیر پر مسلط ہونے والے اکثر حکمرانوں نے یہاں ظلم و ستم کی کئی نئی داستانیں رقم کیں۔ اس وادی نے امن و آشتی اور شکوہ بھرے دنوں کی آس میں صدیوں کا کرب جھیلا ہے۔ میں نے بھی اس کرب و اذیت کو خوب محسوس کیا ہے لیکن ان کی آزمائشوں کا یہ دائمی سلسلہ اب جس نہج پر پہنچ چکا تھا کہ وادیٔ کشمیر میں ایک سٹیج تیار ہو چکا تھا جہاں تاریخِ عالم کا ایک سفاک ترین خونی کھیل رچنے والا تھا۔ عوام بے خبر تھی اور خواص بے حس۔ عوام نے ہندو آرزوؤں کے برخلاف تشکیل پانے والی اسلامی مملکت پاکستان کے ساتھ الحاق کی تمنا کی گستاخی کی تھی۔ جرم پہلے سے بھی شدید تھا، سزا تو شدید تر ملنی واجب تھی۔

☆......☆

مدتوں تک مختلف النسل حکمرانوں کی لونڈی بنی رہنے والی یہ ریاست اب ایک ایسی قوم کے تسلط میں تھی جن کے دلوں میں صدیوں سے پروردہ بغض، کینہ اور وحشت اب طاقت کا سہارا ملتے ہی ایک کھولتا ہوا آتش فشاں بن چکی تھی۔ 'اہنسا' اور 'عدم تشدد' کے راگ الاپنے والے قائدین کے پیروکاروں نے تہذیب اور انسانی حقوق کی دھجیاں بکھیر دیں۔ انسانیت ہر سو سسکتی اور بلکتی دکھائی دینے لگی۔ اشرف المخلوقات اپنی ہی جنس کے ہاتھوں تذلیل کے کمترین درجے

> ### حاضر جوابی
>
> حضرت خواجہ حسن بصری (21 تا 110ء) فرماتے ہیں کہ ایک شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ شمع روشن کیے جا رہا ہے۔ میں نے اس کو روک کر پوچھا "بیٹے! تم بتا سکتے ہو کہ یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے؟"
>
> میرا سوال سنتے ہی بچے نے ایک لمحے توقف کیا پھر فوراً ہی پھونک مار کر شمع گل کر دی اور مجھ سے کہنے لگا۔
>
> "آپ مجھے بتائیے کہ روشنی کہاں چلی گئی؟ تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ روشنی کہاں سے آرہی تھی۔" آپ فرماتے ہیں کہ یہ جواب سن کر میں لاجواب ہو گیا۔
>
> انتخاب: اختر شجاع، ملتان

سہنے پر مجبور ہو گیا۔

ہوم منسٹر سردار پٹیل، وزیر دفاع بلدیو سنگھ اور پٹیالہ کے مہاراجا نے باقاعدہ حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے تحت مسلم نسل کشی کا آغاز کر دیا۔ مسلمان تاجروں اور دکانداروں کی ذاتی املاک سے ان کے نام ہٹا دیے گئے۔ "اردو بازار" کو راجندر بازار" کا نام دے دیا گیا اور "اسلامیہ اسکول" کی شناخت "ہری سنگھ ہائی اسکول" میں تبدیل ہو گئی۔

بھارتی حکومت نے اپنی مسلح ایجنسیز کو خصوصی اختیارات تفویض کیے۔ جس کی رو سے اس ایجنسی کا ہر افسر کسی بھی متنازعہ کشمیری علاقے میں عوامی امن و امان کے لیے خطرہ بننے والے مقامی کشمیری پر بلا مضائقہ ہتھیار چلانے میں آزاد تھا۔ مقامی افراد کو حریت پسندوں کی امداد کے شک و شبہ میں بھیڑ بکریوں کی طرح عقوبت خانوں میں گھسیٹ لیا جاتا۔ کسی بھی وارنٹ کے بغیر یہ افسران ذاتی املاک میں دراندازی کے علاوہ ہر قسم کے ذرائع مواصلات کو روک کر تلاشی اور مشکوک افراد کی گرفتاری کے بھی مجاز تھے۔ اس ایجنسی کے افسران پر محض اپنے 'شکار' کی بابت نزدیکی پولیس اسٹیشن میں انچارج افسر کو مطلع کرنے کی بندش تھی۔

فوجی افسران اپنے اعمال و افعال میں کسی بھی قانونی جوابدہی سے مستثنیٰ تھے۔ ان کے مزاج کی فرعونیت حد سے سوا ہونے لگی اور پھر ایک عالم نے ریاست کے مقامی باشندوں پر قہر نازل ہوتے دیکھا۔

حراست میں لیے جانے والے افراد پر حیا سوز تشدد

کیا جانے لگا۔ ہر مقامی فرد پر پاکستانی اہلکار ہونے کا شبہ کیا جاتا اور حریت پسندی کی پاداش میں اس کے جنسی اعضا سے برقی رو گزاری جاتی۔ اس کارروائی میں خواتین، بچوں یا بوڑھوں کی کوئی تخصیص نہ تھی۔

نوے کی دہائی میں بھارتی فوج کے چوتھے راجپوتانہ رائفلز نے ایک سرچ آپریشن میں ضلع کپواڑہ کی 80 سے زائد مختلف عمر کی خواتین کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی۔ مقامی شفا خانوں اور نامور اسپتالوں میں زیرِ علاج افراد کے علاوہ کئی آپریشن تھیٹرز میں دوران جراحی مریضوں کو دہشت گردی کے شبہ میں موت کی سرحدوں کے پار پہنچا دیا جاتا۔

خواتین، بچے، مرد اور بوڑھے جعلی پولیس مقابلوں میں کسی بھی اندھی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ تفتیش کے لیے لے جائے جانے والے افراد یوں غائب ہوتے گویا لاوجود تھے۔ گولیوں سے چھلنی لاشیں بے نام و نشان قبروں میں اجتماعی طور پر دفنا دی جاتیں۔ تا حال 6000 ایسی قبریں دریافت ہو چکی ہیں جہاں خون آلود لباس میں ان گنت لاشیں اپنی بے حرمتی پر بزبان خاموشی نوحہ کناں نظر آتی ہیں۔

عورت اس ریاست میں سب سے ارزاں جنس ہے جسے ہولناک درندگی اور وحشت سے اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنا کر بے دردی سے مسل دیا جاتا ہے۔ ۱۵۰ سرکاری اعلیٰ عہدیداران اس قبیح فعل میں ملوث رہے ہیں لیکن قانون کی دست بردگی سے محفوظ و مامون ہیں۔ کشمیری خواتین جس بدترین جنسی تشدد کا نشانہ بنتی ہیں اس کی نظیر روئے کائنات کے کسی اور خطے میں نہیں ملتی۔ اس بربریت کا شکار ہونے کے بعد 17000 حوا کی بیٹیاں خودکشی کر چکی ہیں۔

بدترین جسمانی، ذہنی اور جنسی تشدد کے بعد بھی جن افراد کی سانسوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے؛ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ 100000 افراد وادی کے اسپتالوں میں دماغی امراض کے علاج کے لیے اب بھی موجود ہیں۔

محض دو دہائیوں میں 94548 کشمیری پروانوں کی مانند اپنی زندگیاں شمعِ آزادی کی روشنی پر قربان کر چکے ہیں۔ 7073 افراد کو غیر قانونی حراست کے دوران ماورائے عدالت قتل کیا گیا ہے۔ 22826 خواتین بیوہ اور 107591 بچے یتیم ہو چکے ہیں۔

گذشتہ 79 سال کے جبرِ مسلسل کے باوجود اس وادی کے مکینوں میں آزادی کی تڑپ اور ولولہ جوں کا توں برقرار ہے۔ نسلِ نو نئی امنگوں کے ساتھ جبلی حق کے حصول کے لیے بھارتی فرعونیت کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہے۔

جھنجلاہٹ، طیش اور فرعونیت کے زعم میں مبتلا غاصب نے تین ماہ سے یہاں کے رہائشیوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ مکانات نذرِ آتش کیے جا رہے ہیں۔ آزادی کی تمنا کی پاداش میں انھیں بدنام زمانہ ہتھیار "پیلٹ گنز" سے نشانہ بنایا جانے لگا ہے۔ عالمی سطح پر پابندی کا شکار یہ بندوق کشمیری عوام کو لہولہان کر رہی ہے۔ انگلی کی ایک معمولی سی جنبش سے سینکڑوں چھرے انسانی جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں اور آنکھیں حقیقی معنوں میں لہو اگل کر خون کے آنسو رونے لگتی ہیں۔ آزادی کے خوابوں سے سجی لہولہو کشمیری آنکھیں اپنے خوابوں کے تاوان کی ادائیگی کر رہی ہیں لیکن وہ ان خوشنما سپنوں سے دستبرداری کے لیے آمادہ نہیں۔

ہر ظلم کے جوابی ردِ عمل میں اس وادی میں ہزاروں یسین ملک، میر واعظ عمر فاروق محمد عباس انصاری اور برہان وانی جیسے جیالے پیدا ہوتے رہے، نظر بند ہوتے رہے، شہادت پاتے رہے لیکن آزادی کی تڑپ تا حال ختم نہیں ہو پائی ہے۔ بھارتی فوج لاکھوں افراد کو شہید کرنے کے باوجود تہی داماں ہے۔ وہ جھنجلاتے ہیں، مزید شدت سے اپنے مزید داؤ آزماتے ہیں لیکن ہر حریت پسند کے بعد اس سے بھی کئی گنا جوشیلے سرفروش ان کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی انسانیت سوز پیلٹ گنز سے صرف ان کے جسم لہولہان کر پاتے ہیں۔ ان کا جذبہ، ہمت اور سرفروشانہ سوچ غاصبین کی دستبرد سے ماورا ہیں۔

کشمیر کے بیٹے آج بھی اپنی ناتوانی کے باوجود ایمانی قوت کے ہتھیار تھامے اپنی سرزمین کی آزادی کے لیے موت کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے للکار رہے ہیں۔ میں اپنے سفر کی منازل طے کرتا صرف ایک ہی الجھن میں مبتلا ہوں۔

یہ مٹھی بھر سرفروش حسبِ مقدور اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ لیکن جو صاحبِ استطاعت بھی ہیں اور ان کی مظلومیت کے قرضدار بھی۔ جانے کب تک ان سے لاتعلق رہیں گے؟ میں اپنی مسافت کی تکمیل سے پہلے انھیں اپنی منزل کے حصول میں کامران ہوتے دیکھنے کا شدید متمنی ہوں لیکن دلِ مسلم میں روح کو گرمانے والی اور قلب کو تڑپا دینے والی تمنا خوابیدہ رہی تو یہ وادی یونہی آتشیں آنسوؤں میں جھلستی رہے گی کیونکہ..... تم ہو کہ چپ۔

عجیب عادتیں

رئیسہ خالد

عادات و اطوار انسان کی پہچان ہے اور یہی عادتیں خبطی بھی مشہور کرا دیتی ہیں۔ خبط میں مبتلا ہی چند مشہور ادیب کا تذکرہ جن کی تحریر کے لوگ دیوانے تھے، وہ قلم کے شہنشاہ کہلاتے تھے لیکن کچھ ایسی عادتوں کے بھی حامل تھے جو پاگل پن کہلاتی ہے۔

مشہور ادیبوں کی عجیب عادتوں کا تذکرہ

تخیل کی دنیا میں رہنے والے مصنفین اور فن کار کے کام اور زندگی کی طرح ان کے کچھ معمولات بھی غیر معمولی ہوتے ہیں۔ چونکہ تحریر و تصنیف کو باقاعدہ کام کے طور پر اختیار کرنے والوں کے لیے یہ ایک پوری سرگرمی ہوتی ہے اس لیے ہر کوئی اپنے طور پر اس کا اہتمام کرتا ہے جو دوسروں کے لیے بھلے عجائب کا درجہ رکھتا ہو لیکن تخلیق کار ہی جانتا ہے اس اہتمام کے پیچھے کیا راز پوشیدہ ہوتے ہیں۔

چارلس ڈکنز: اے ٹیل آف ٹو سٹیز اور کرسمس کیرول

جیسے شاہ کاروں کے تخلیق کار اور انگریزی ادب میں کلاسک کی حیثیت رکھنے والے چارلس ڈکنز کام کے لیے مخصوص ماحول بنانے کا مزاج رکھتے تھے۔ ان کا روزانہ کا معمول فوجیوں کی طرح سخت تھا۔ وہ صبح نو بجے سے لے کر دو بجے دوپہر تک لکھنے لکھانے کا کام کرتے تھے۔ کام شروع کرنے سے پہلے تین گھنٹے واک کیا کرتے۔ لکھتے ہوئے ڈاکٹر کو گھر میں مکمل خاموشی درکار ہوتی تھی۔ ان کے ڈیلسک پر لکھنے کے لیے قلم اور دوات کے ساتھ ساتھ مجسمے بھی رکھے جاتے تھے۔ ان کے بارے میں ڈکنز کا خیال تھا کہ یہ چھوٹے مجسمے انہیں سوچنے میں مدد دیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر جہاں بھی جاتے یہ سامان ان کے ساتھ جایا کرتا تھا بلکہ جب وہ گھر سے کہیں دور جایا کرتے تو ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس کا فرنیچر بھی اسی ترتیب سے رکھوایا کرتے۔ کمرے کا ماحول ان کے گھر کے ماحول سے قریب تر محسوس ہوتا۔ ڈکنز کی ایک اور انوکھی عادت تھی وہ ہمیشہ بستر پر اس طرح سوتے تھے کہ ان کا رخ ہمیشہ شمال کی جانب ہوتا۔ ڈاکٹر ڈکنز اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ شمال کی جانب منہ کر کے سونے سے زمین کے مرکز سے نکلنے والی برقیاتی لہروں کا دماغ سے رابطہ قائم رہتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد: یہ اپنے زمانے کے ایک بے مثل خطیب اور عالم تھے۔ تحریک آزادی کے دوران کئی سال قلعہ احمد نگر میں نظر بند رہے دورانِ نظر بندی ان کا قاعدہ تھا کہ وہ علی الصباح چار بجے نیند سے بیدار ہو کر اپنے ادبی کام کی جانب رجوع ہونے سے پہلے اپنے لیے چائے بنانا شروع کرتے۔ مولانا آزاد وہائٹ جیسمین کی چینی چائے استعمال کرتے اور اس کا ان کے یہاں بڑا اہتمام تھا۔ وہ چائے دم دے کر اپنے سامنے رکھتے۔ اس کے بعد لطیف اور نازک روسی فنجانوں میں یہ چائے ڈالی جاتی۔ چینی کی بجائے وہ شوگر کیوب استعمال کرتے تھے اور پھر بنا دودھ کی اس چائے کو وہ چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے کر دیر تک پیتے رہتے۔ چائے پینے کا انداز یہ تھا کہ ہر چسکی کے بعد سگریٹ کا ایک کش لیتے اور پھر چسکی لیتے اس طرح ان کا یہ شغل جاری رہتا۔ اپنے اس معمول کو انہوں نے غبار خاطر میں کچھ اس طرح بیان کیا۔ ”شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے بارے میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیف مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں پھر اس ترکیب خاص کا شغل نقش عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔ علمی اصطلاح میں اس صورت حال کو ”علی سبیل التوالی والتعاقب“ کہیے۔ اس طرح اس عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ ادھر فنجان خالی ہوا ادھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خط کشید تک پہنچ کر دم لیا۔“

لکھنے سے قبل ان کی میز پر ان اشیاء کا ظہور ترتیب بھی انہی کی زبانی سنیے۔ ”جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا اس کی اولیت اس کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامان کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔

سعادت حسن منٹو: یہ مشہور افسانہ نگار خیالات اور افکار کے بے کراں ہجوم سے رات بھر برسر پیکار رہتے۔ صبح اٹھتے تو ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے چھائے ہوتے۔ انہیں اس تخلیقی عمل میں اکثر ایک کرب سے گزرنا پڑتا تھا لیکن ایک بار جب ان کے ذہن میں پورے افسانے کا خاکہ بن جاتا تو وہ انتہائی تیزی سے اسے کاغذی پیکر میں ڈھال دیا کرتے تھے۔ منٹو کو لکھنے لکھانے کے لیے کوئی خاص ماحول یا خاموشی درکار نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھر میں ہوتے ان کے اردگرد بچے لڑتے جھگڑتے شور مچاتے تو وہ اطمینان سے ان کے جھگڑے نمٹاتے۔ کوئی مہمان آجاتا تو اس کی خاطر مدارت کرتے ساتھ ساتھ بیوی سے بھی بات چیت جاری رہتی لیکن منٹو کا قلم نہ رکتا۔ کسی ناشر کے دفتر ہی میں لکھنے بیٹھ جاتے تو گرد و پیش کا شور شرابہ یا لوگوں کی آمد و رفت ان کے کام میں بالکل حائل نہ ہوتی۔ منٹو کہیں بھی ہوتے جب افسانہ لکھنے بیٹھتے تو ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیتے۔ ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ لکھ کر کبھی نظر ثانی نہ کرتے تھے۔ کرسی پر ہمیشہ دونوں پاؤں اوپر رکھ کر اکڑوں بیٹھتے۔ کاغذ کو اپنے گھٹنوں پر رکھتے اور لکھتے چلے جاتے۔ اردو کے اس منفرد افسانہ نگار کا یہی انوکھا انداز نشست تھا۔

راجندر سنگھ بیدی: راجندر سنگھ بیدی اپنے معمول کے

مطابق صبح تین چار بجے بیدار ہو جاتے۔ اپنے ہاتھ سے خود اپنے لیے چائے بناتے۔ لکھنے کی میز پر بیٹھ جاتے کبھی کبھی لیٹ کر بھی لکھتے جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو افسانہ لکھنے کے لیے کیسا ماحول درکار ہوتا ہے تو انہوں نے جواب دیا۔ میز پر کتابیں بکھری ہوئی ہوں اور افسانے کے لیے ایک رم کاغذ اور ردی کی ٹوکری۔ ردی کی ٹوکری سامان تحریر کا حصہ اس لیے بھی تھی کہ بیدی کو اگر اپنی تحریر میں کوئی جملہ پسند نہ آتا تو اس کی تصحیح کرنے کی بجائے وہ پورا صفحہ پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے اور نئے سرے سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ جب تک افسانے کی نوک پلک ہر لحاظ سے درست نہ ہو جاتی مطمئن نہ ہوتے اور بے قرار رہتے۔ پوری زندگی ان کا یہی معمول رہا۔

کرشن چندر: کرشن چندر کا معمول تھا کہ جب بھی اپنی کہانی کے لیے کوئی پلاٹ سوجھتا وہ فوراً اس کے بنیادی خیال کو قلم بند کر کے محفوظ کر لیتے تھے تا کہ وہ خیال کہیں ان کے ذہن سے اتر نہ جائے۔ اس طرح انہیں پلاٹ سوجھتے رہتے اور وہ انہیں نوٹ کرتے رہتے جس خیال کو وہ کہانی کی شکل میں ڈھال دیتے اسے اپنی فہرست سے قلم زد کر دیتے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک رجسٹر سا بنا رکھا تھا۔ مدیر نقوش لاہور نے جب ان کا یہ رجسٹر دیکھا تو ابھی ایک سو کے قریب کہانیوں کے بنیادی خیالات کو افسانوں کی شکل دینا باقی تھا۔ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں اس قدر زرخیز ادیب شاید ہی کوئی دوسرا ہوا ہو۔ اس بارے میں محمد طفیل لکھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا آپ روز ایک سے ایک موضوع کس طرح لکھ لیتے ہیں۔ تو انہوں نے بتایا۔ میرے پاس ایک رجسٹر ہے جب کوئی پلاٹ ذہن میں آتا ہے تو اسے اس میں نقل کر لیتا ہوں۔ اس رجسٹر میں تین تین چار چار سطروں میں افسانوں کے بنیادی خیالات لکھے ہوئے تھے۔ کچھ یادداشتوں کے آگے اس قسم کے (X) نشان پڑے ہوئے تھے اور کچھ یادداشتوں پر کوئی نشان نہ تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ یہ نشانات کیسے ہیں۔ کہنے لگے جن پر اس قسم (X) کے نشانات ہیں وہ افسانے تو لکھے جا چکے ہیں باقی لکھے جانے والے ہیں۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ اس طرح تو وہاں بھی ایک سو کے قریب لکھے جانے والے افسانوں کی یادداشتیں موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر روز ایک افسانہ لکھ لیتے تھے۔

لڈونگ وان بیتھون (معروف جرمن موسیقار) یہ زیادہ تر کام چلتے پھرتے کیا کرتے تھے۔ کافی سے ناشتا کرتے تھے اور کافی بنانے کے لیے ہاتھ سے گن کر ساٹھ دانے کافی کے ڈالتے تھے۔ کچھ گھنٹوں کے لیے اپنے ڈیسک پر بیٹھنے کے بعد وہ واک کے لیے نکل جاتے۔ اسی آوارہ گردی کے دوران جب کوئی دھن یا کوئی خیال ان کے ذہن میں آتا تو وہ بغل میں دبائی ہوئی نوٹ بک کھولتے اور اس میں وہ بات درج کر لیتے۔ لڈونگ بیتھون کے بارے میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ نہاتے ہوئے بھی دھنیں ترتیب

ڈیرہ اسماعیل خان سے ماہر امراض اطفال ڈاکٹر فاروق اعظم کہتے ہیں کہ واکر نارمل انداز سے چلنے میں مدد نہیں دیتا۔ ان کے بقول ”بچے کے مسلز وقت کے ساتھ ساتھ طاقتور ہوتے ہیں۔ انہیں قبل از وقت چلانے کی کوشش میں جب واکر میں ڈالا جاتا ہے تو وہ اپنا وزن نہیں سہار سکتے، اپنی کمر کو سہارا نہیں دے پاتے، اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتے اور پنجوں کے بل چلتے ہیں۔ ایسے میں ان کا واکر دائیں بائیں تیزی سے حرکت کرتا ہے جس سے ہر چیز ان کی پہنچ میں آجاتی ہے۔ یوں وہ گھریلو حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔“ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس طرح وہ گرم دودھ یا اشیاء اپنے اوپر گرا کر اپنے آپ کو جلا بیٹھتے ہیں، کوئی بھاری چیز اپنے اوپر گرا لیتے ہیں، زہریلا مواد یا دوا پی جاتے ہیں اور ہیٹرز یا اوون سے اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیتے ہیں۔ اپنی تیز رفتاری کے باعث بعض اوقات ان کا واکر راستے میں پڑی اشیاء سے ٹکرا کر الٹ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ حادثات سیڑھیوں سے لڑھک کر گرنے کے ہیں جو کبھی معمولی تو کبھی سنگین نتائج کو جنم دیتے ہیں۔

بے بی واکر کے نقصانات کو دیکھتے ہوئے امریکن اکیڈمک آف پیڈیاٹرکس نے اس کے استعمال کی حوصلہ شکنی کی ہے اور امریکا میں اس پر پابندی عائد کرنے کی تجویز بھی دی ہے جب کہ کینیڈا میں تو اس کی خرید و فروخت پر پابندی لگ چکی ہے۔

اقتباس: شفا نیوز۔

مرسلہ: انوار مجتبیٰ۔ کوئٹہ

دیا کرتے تھے۔ اس عظیم موسیقار کے سیکریٹری کے مطابق لڈونگ اپنے کمرے میں بھی چلتے پھرتے دھنیں ترتیب دیتے تھے اور چلتے پھرتے بار بار اپنے ہاتھوں پر جگ سے پانی ڈال کر انہیں ہوا میں لہراتے رہتے تھے۔

مارسل پروست (فرانسیسی ادیب، نقاد، ناول نگار): انہوں نے ناول کی تشکیل کا ایک نیا انداز اختیار کیا۔ اس کے ناول ''یاد ماضی'' کے مشترک عنوان سے شائع ہوئے جن میں اس نے کئی موضوعات اور واقعات کے امتزاج سے نرالا لطف پیدا کیا ہے۔ مثلاً حدیث دیگراں کے روپ میں خود مصنف کی آپ بیتی ہے لیکن آسانی سے پتا چل جاتا ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔ ایک لاڈلے بیٹے کا احوال جو ایک دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور پہلی جنگِ عظیم کے درمیان کے زمانے میں فرانس کے امرا اور ان کے مصاحبین اور حاشیہ برداروں کے طرزِ زندگی کا ذکر ہے۔ محبت اور جدائی کی صورتِ حال کا نفسیاتی جائزہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی دوری یا اظہارِ محبت کے جواب میں انکاری ردِعمل یا ایک گونہ بے وفائی طالب و مطلوب کے رشتہ الفت کی بے قراری اور استحکام کے لیے لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ان ناولوں میں غیر ارادی طور پر ماضی کے بھولے بسرے واقعات اور گریز پا لمحات کی مکمل تصویریں بھی آگئی ہیں۔ مارسل پروست کی یہ لطافت آمیز اور طویل داستان جس کا ماحول خواب سا ہے حسن نگاری کا ایک غیر فانی کرشمہ ہے۔ In search of lost time لکھتے ہوئے پروست نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کرلیا تھا۔ اس ناول کی ضخامت تین ہزار صفحات سے زیادہ ہے۔ عام طور پر پروست دن ڈھلے یا چار بجے سو کر اٹھتا تھا۔ جاگنے کے بعد وہ کافی اور فرانسیسی بن سے ناشتا کرتا تھا۔ اس کے بعد افیون ملے تمباکو کے لمبے لمبے کش لیا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ نشہ دمے کی وجہ سے ہونے والی تکلیف میں آرام دہ ثابت ہوتا تھا۔ پروست اس قدر کاہل تھا کہ لکھنے کے لیے وہ ٹیبل استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ بستر پر پڑے ہوئے ہی لکھتا تھا۔ اس کے بستر پر کئی تکیے لگے ہوتے تھے جن کا سہارا لیے وہ نیم دراز ہو کر لکھتا تھا۔ اس قدر آرام اور سہولت کے باوجود اس کا کہنا تھا کہ یہ ناول لکھتے ہوئے اسے شدید تھکان کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لکھتا ہے کہ دس صفحات لکھنے کے بعد میں نڈھال ہو جاتا تھا۔

سلواڈور ڈالی: یہ اسپین سے تعلق رکھنے والا مصور اپنی مصوری کے ساتھ ساتھ اپنی مونچھوں کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا تھا۔ سرریلیزم مصوری کی ایسی صنف ہے جس میں غیر شعوری انداز میں تخیل میں چھپے خزانوں کو تصویروں اور فن پاروں کی شکل دی جاتی ہے۔ ڈالی کی معروف پینٹنگز The Persistence of swans Reflecing Memory Elephants.

ان شاہکاروں میں ڈولی نے بڑی مہارت سے خواب اور غفلت کے درمیان پائے جاتے والے خطِ تفریق کو مدغم کر دکھایا ہے۔ ڈالی پینٹنگ کرتے ہوئے ایک انتہائی عجیب تکنیک کا استعمال کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک چابی رکھتا تھا اور اس کے بالکل نیچے ایک دھاتی برتن رکھ دیا کرتا تھا۔ سوچتے سوچتے جب ڈالی اونگھنے لگتا تو چابی اس کے ہاتھ میں ہوتی جیسے ہی وہ ذرا گہری نیند میں جاتا تو چابی اس کے ہاتھ سے برتن میں گر جاتی اور اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اس طرح وہ جاگ اٹھتا اور اس مختصر عرصے میں خواب کے دوران دماغ کے پردے پر بننے والی شبیہ کو موئے قلم سے محفوظ کر لیتا تھا۔ اپنے فن پاروں کو عجیب و غریب اور اچھوتا بنانے کے لیے وہ خود پر ہمیشہ ایسی کیفیت طاری کیے رکھتا جسے وہ مکمل غیر منطقی حالت کہا کرتا تھا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ وہ ہمیشہ عجیب و غریب خیال کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس لیے خود پر بھی نیم دیوانگی طاری کیے رکھتا تھا۔

مایا انجلو: مایا انجلو امریکا سے تعلق رکھنے والی معروف شاعر اداکارہ رقاصہ اور گائیک اس کی نظم ''قفس میں پرندے کیوں گیت گاتے ہیں میں جانتی ہوں'' بہت مشہور ہوئی۔ مایا نے مختلف شعبوں میں اپنی پہچان بنائی مگر لکھنے لکھانے کا زیادہ تر کام اس نے گھر سے باہر رہتے ہوئے کیا۔ وہ خاص طور پر مہینوں کے لیے کمرا کرائے پر لیا کرتی تھی اور پھر صبح سویرے اپنے کمرے میں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ لکھنے کے لیے درکار سامان اور وائن کی ایک بوتل و کارڈز کا ایک گڈی ہوا کرتی تھی۔ انجلو کا کہنا تھا کہ یہ چیزیں اس کے چھوٹے دماغ کو یکسو کرنے کے کام آتی تھیں۔ ہوٹل کے کمرے میں مکمل خاموشی کے بعد انجلو ایک جانب کروٹ پر لیٹ کر لکھا کرتی تھی۔ اپنے انٹرویو میں اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ اس عادت کی وجہ سے اس کی ایک کہنی پر گہرے نشان پڑ چکے ہیں۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا دسواں حصہ

شیڈ کے نیچے دو پولیس والے کھڑے تھے، شہباز کھڑکی کے بند شیشے سے انہیں دیکھ رہا تھا اور خان بار بار ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ مایا کون؟ شہباز کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا مگر مجھے یقین تھا اس کے دماغ میں بس ایک ہی جملہ گونج رہا ہوگا کہ یہ کیا سیاپا ہے۔ اس کے چہرے پر چھائی گمبھیرتا گہری ہوتی جا رہی تھی اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ جذباتی نہ ہو جائے۔ یوں بھی وہ پل میں تولہ پل میں ماشا ہو جانے والا شخص ہے۔ ایسے جذباتی لوگ کئی معنوں میں

خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ ان کا فیصلہ عقل سے نہیں جذبات سے ہوتا ہے اور جذبات میں کیے گئے فیصلے ہمیشہ نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ میں خان کو چپ کرانے کی راہ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ گویا ابل پڑا۔ خان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر بولا۔ ''یہ کیا سیاپا ہے، کچھ تو شرم کرو اگر تم نے زبان نہ روکی تو میں پولیس بلالوں گا۔''

خان اور مرعوب ہو جائے یہ ایک ناممکن سی بات تھی۔ اس نے بریک دبایا۔ گاڑی کو سائیڈ میں لے جا کر روکی اور پھر نیچے اتر کر بولا۔ ''میں اس کو نہیں لے جاؤں گا۔ اس سے کہو کہ وہ گاڑی سے اتر جائے۔''

''میں بھی اس کھٹارے میں جانے والا نہیں۔'' شہباز بھی کھڑا ہو گیا۔ معاملہ بگڑ رہا تھا۔ سرجی کی زبان گنگ ہو گئی۔ انہوں نے سر جھکا لیا تھا۔ ایسے جیسے وہ اس منظرنامے میں ہی نہیں۔ میں نے خان کو سنبھالنا چاہا تھا کہ شہباز بدک گیا۔ اس نے نسبتاً تیز لہجے میں کہا۔ ''میں خود لعنت بھیجتا ہوں۔''

وہ گاڑی سے اترنا چاہتا تھا۔ دونوں پولیس والے نزدیک آ گئے۔

''کیا میں آپ لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔'' پولیس والے نے مہذب لہجے میں کہا۔ مگر میں سمجھ رہا تھا کہ اس کا انداز مہذب ضرور ہے مگر جیسے ہی اسے ایسا کچھ نظر آیا کہ قانون کو مداخلت کرنا ہے تو وہ ہم پر پل پڑے گا۔

بات کسی اور رخ پر نہ چلی جائے اسی ڈر سے میں نے مداخلت کی۔ ''نہیں جناب، شکریہ۔''

''پھر یہ چیخ کیوں رہا ہے؟'' اس نے شہباز کی جانب اشارہ کیا۔

شہباز بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ چکا تھا۔ اس نے فوراً پینترا بدل لیا۔ خان بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ دونوں ہی سمجھ رہے تھے کہ معاملہ اگر پولیس کی مداخلت کا بن گیا تو ہمیشہ کے لیے ان کا ریکارڈ غلط ہو جائے گا۔

''آفیسر۔'' شہباز نے کہا۔ ''میں اپنے چچا کے پاس آج جانا نہیں چاہتا اور یہ میرے کزن مجھے زبردستی لے جانا چاہتے ہیں جب کہ میں آج کی چھٹی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔''

''ینگ مین!'' آفیسر نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ ''اسے چھٹی انجوائے کرنے دو۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں یہ وقت گزارنا چاہ رہا ہے۔ وہاں کوئی اس کا منتظر ہو۔''

''شکریہ سر!'' کہہ کر اس نے خان سے کہا۔ ''اب تو میری بات مان لو مجھے اسٹور پر اتار کر جہاں خوشی چلے جانا۔''

''آؤ!'' کہہ کر خان نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

برف باری ہلکی ہو چکی تھی مگر سڑک پر بچھی برف کی سفید چادر ہماری گاڑی اور ہمارے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔

ہم گارڈنر ہائی وے پر آئے تو رش اپنے شباب پر تھا۔ بھاگتی گاڑیوں کے بیچ ہماری کار بھی ٹھہر ٹھہر کر چلنے لگی۔ فضا میں ایک اجالا سا پھیلا ہوا تھا۔ ایسے ہی جیسے فجر سے پہلے نور سا مشرقی سمت میں پھیل جاتا ہے۔ ہلکی برف باری میں یہ اجالا چہار جانب سے نکل کر اب جیسے ہمارے سامنے کوئی نیا منظر تخلیق کر رہا تھا۔ ہم سب خاموش تھے اور خان پوری توجہ سے گاڑی چلا رہا تھا۔

خان نے گاڑی دائیں جانب لیک شور روڈ کی جانب موڑ لی۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگا۔ ''اس برف باری میں اونٹاریو لیک کا منظر بھی دیکھ لیا جائے۔''

اونٹاریو لیک کا نام سنا تو ایک لہر سی میرے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ میں سکتے کی حالت میں تھا۔ یہ نام میں نے اپنے دماغ میں سنبھال رکھا تھا۔ میں اپنی تنہائی میں اسے پہلی بار دیکھنا چاہتا تھا۔ میں ہجوم میں انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ ہر ایک نے اس کی خوب صورتی کی تعریف کی تھی بلکہ میں ٹورنٹو کے خواب دیکھتا تھا تو اونٹاریو لیک ساتھ چپکی ہوتی تھی۔ جہاں ٹورنٹو کا نام آتا ہے تو وہاں لازمی ہے کہ اونٹاریو لیک کا نام بھی آتا ہے۔ میں پاکستان میں اپنے ذہن کے پردے پر اس جھیل کے مناظر تخلیق کرتا تھا۔ جھیل کا نام آئے تو میرے ذہن پر سیف الملوک یا پھر راول جھیل کا نقشہ ابھرتا تھا مگر یہ جھیل اٹھارہ ہزار مربع کلومیٹر کے رقبے پر محیط ہے۔ گیارہ سو کلومیٹر کا ساحل ہے جو نیاگرہ سے ٹورنٹو تک پھیلا ہوا ہے اور پھر مغربی سمت میں کنگسٹن اور آگے ایک دریا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ دریا آگے کیوبک سے گزرتا اٹلانٹک میں گر جاتا ہے۔ یورپ کے تجارتی جہاز اس جھیل تک مال برداری کرتے ہیں۔ پھیلاؤ میں یہ اتنی بڑی ہے کہ دوسری جانب نیویارک اسٹیٹ کو جا لگتی ہے۔ پانی ہی میں ایک ان دیکھی سرحد بنا دی گئی ہے جو بھی کینیڈا آ گیا اس نے نیاگرا فال کا ذکر کیا یا پھر سینٹرل آئی لینڈ کے جزیرے کا جو اس لیک کے اندر سیاحوں کو اپنی جانب بلاتا ہے جہاں سے ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کا ایک شاندار منظر دکھتا ہے۔

ہماری کار جھیل کے ساحل سے ذرا دور کھڑی تھی۔ ہم سردی ہونے کے باوجود باہر کھڑے جھیل کے پانیوں پر آہستگی سے گرتی برف کا نظارہ کر رہے تھے۔ پانیوں کی سطح برف کے

ٹکڑوں سے ڈھکی تھی۔ اس شدید ٹھنڈ نے پانی کو برف بنا ڈالا تھا۔ میں تھوڑا سا تنہا ہوکر دور جا کھڑا ہوا۔ دھند کی چادر کے پار برف کے ذرے فضا میں معلق تھے جو گررہے تھے یا میری طرح منجمد تھے۔ میں نے اس منظر کو برسوں اپنے ذہن میں تخلیق کیا تھا۔ مجھے تو اس کے چمکتے، لشکارے مارتے پانیوں کو دیکھنا تھا مگر یہاں ایک کہر زدہ منظر تھا۔ سامنے ایک سیاہ اور سلیٹی چادر تھی اور مجھے معلوم تھا کہ اس چادر پر مجھے اپنے پاؤں نہیں پھیلانے۔

اتنے میں سرجی کھسکتے ہوئے میرے قریب آگئے اور کہنے لگے۔ ”خان بار بار پوچھ رہا ہے کہ یہ مایا کون ہے؟ اب میں اسے کیا بتاؤں؟“

میرا دھیان سرجی نے بھٹکا دیا تو میں نے جل کر کہا۔ ”اسے کہو شہباز پر ڈورے ڈال رہی ہے اور شہباز ہمت باندھنے کے مراحل میں سے گزر رہا ہے۔“

یہ سن کر شاہ جی رخصت ہوگئے اور میرا کہا ایک ایک لفظ خان کو گوش گزار کردیا۔ اس کا مجھے ایسے پتا چلا کہ شہباز کی زور زور سے قسمیں کھانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ خان گالیوں کے مصالحے لگا کر کچھ کہے جارہا تھا اور سرجی گاڑی کے پیچھے چھپے کھڑے یہ سب بڑے سکون سے سن رہے تھے۔

میں قریب پہنچا تو شہباز کا چہرہ اس ٹھنڈ میں بھی پسینے سے بھرا ہوا تھا اور وہ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ ”سرجی نے پھر سیاپا ڈال دیا ہے۔“

میں نے بلند آواز سے سرجی سے پوچھا۔ ”کیا کہہ دیا ہے؟“

وہ معصومیت سے بولے۔ ”جو آپ نے کہا تھا وہی تو دہرایا ہے۔“

اب شہباز مجھے خفگی سے دیکھ رہا تھا۔

گاڑی میں دوبارہ روانہ ہوئے تو میں نے خان سے کہا۔ ”ایک تو شہباز کنوارہ ہے اور دیکھو کتنا ہینڈسم ہے۔“

”ہینڈسم“ پر سرجی کی بھی ہنسی نکل گئی اور شہباز کے پسینا زدہ چہرے پر ایک بار زردی پھیل گئی۔

خان نے پہلے کھی کھی والی اپنی ہنسی کو روکا پھر بولا۔ ”تمہاری دونوں باتوں میں سے کنوارے والی بات کو میں مانتا ہوں مگر مجھے ایک بار مایا سے ملاؤ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کہیں نشے میں تو نہیں تھی۔“

نشے کا سن کر میرے اور سرجی کے قہقہے جو بلند ہوئے تو گاڑی پھر سے کھڑکھڑانے لگی۔

ہم ہنستے اور قہقہے لگاتے ڈاؤن ٹاؤن کے قریب ہونے لگے۔ دور سے مجھے آسمانی بلندیوں کو چھوتا سی این ٹاور نظر آیا۔ اسی ٹاور کا پوسٹر میں نے اکثر پی آئی اے کے دفتروں میں دیکھا تھا۔ میں اسے لگاتار دیکھتا رہتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے کینیڈا آنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ اس ٹاور کی بناوٹ اور ساخت مجھے حیران کردیتی تھی کیونکہ یہ اپنی ذات میں تنہا اور اداس نظر آتا ہے۔ اس کے ارد گرد روشنیوں کا دریا موجیں مار رہا تھا اور اسے ذرا برابر بھی پرواہ نہ تھی۔ اس کے چاروں جانب ایک شور برپا تھا مگر یہ کسی بہرے کی مانند خاموش تھا۔ اٹھارہ سو سے زائد فٹ لمبا ہونے کے باوجود رنجیدہ تھا۔ آتا جاتا اسے دیکھتا تھا مگر یہ اپنی دنیا میں اکیلا تھا۔ مجھے اس سے اتنا خائف نہیں ہونا چاہیے تھا مگر میں اسے برسوں اپنے خیالوں میں پالتا آیا تھا۔

ہم اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ سب کی نظریں اسے تاک رہی تھیں۔ آس پاس کی بلند و بالا عمارتوں کے اندر جیسے لاکھوں جلتے بلب قید ہیں اور وہ باہر نکلنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہوں۔ برف باری تھم چکی تھی اور ٹھنڈ وہیں ساکت کھڑی تھی۔ ہم اس کے سامنے ہوئے تو پہلی بار میں نے کسی مغربی ڈاؤن ٹاؤن کا منظر دیکھا۔ جیسا سوچا تھا یہ اس سے بڑھ کر تھا۔ لاتعداد بلند و بالا جگ مگ کرتی عمارتیں ایک جانب تھیں اور ہماری دائیں جانب لیک اونٹاریو کی ازلی تاریک خاموشی تھی۔ ایک جانب بلند اور دیدہ زیب عمارتوں کا دمکتا نظارہ آنکھوں کو خیرہ کررہا تھا تو دوسری جانب ایک سرد تنہائی اس منظر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سی این ٹاور کے بغل میں ایئر کینیڈا سینٹر کی دلکش عمارت نظر آرہی تھی۔ یہ ہمارے آنے سے دو سال پہلے بن کر تیار ہوا تھا۔ ٹورنٹو کے کھیلوں میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ باسکٹ بال اور آئس ہاکی کا مرکز ہے۔

ہم ڈاؤن ٹاؤن کے باہر کا نظارہ کرتے کرتے چند ہی لمحوں میں اس کے سامنے سے گزر گئے۔ ہمیں جیرالڈ اسٹریٹ جانا تھا۔ ڈاؤن ٹاؤن کے سامنے تو ہماری بولتی بند ہوگئی تھی۔ جیسے ہی وہاں سے نکلے تو پھر سے تکرار شروع ہوگئی۔ خان، مایا کا پیچھا نہ چھوڑ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی سوئی مایا پر آکر اٹک گئی ہو۔ آخر کار سرجی نے سنجیدہ انداز اپنایا اور خان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ مایا یونیورسٹی میں ہماری کلاس فیلو ہے اور پہلے شہباز سمجھتا رہا کہ یہ ہر وقت سوئی رہتی ہے، شاید نشہ کرتی ہے۔“ پھر ذرا سا اکڑ کر بولے۔ ”پھر میں نے

پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ اسے شہباز کے عشق کا نشہ ہے۔"

سرجی پھر بولتے چلے گئے اور شہباز اپنے بھاری وجود میں ایک گھمنڈ کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھا ذرا مغرور ہو کر مسکراتا رہا۔ میں سرجی کی شرارت کو سمجھ رہا تھا کہ وہ شہباز کو غلط فہمی کے مینار پر چڑھائے چلے جا رہے ہیں۔

سرجی کی بات کو میں نے اختتام لگایا۔ "مایا کی عشق میں حالت ایسی ہے جیسے آ بیل مجھے مار۔"

خان کے قہقہے سے کار پھر سے لرزنے لگی۔ شہباز بہت سخت خفا ہوا کہ تم نے مجھے بیل بنا دیا ہے؟ میں نے وضاحتیں دے دے کر اسے دوبارہ موم کیا۔

"میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ وہ جہاز ہے، نشہ کرتی ہے ورنہ وہ اس پر......" یہ کہہ کر خان نے شہباز کو ایک نظر دیکھا اور پھر اسے دیکھ کر بولا۔ "یار وہ تم پر مرمٹی ہے۔ واہ واہ...... کیا اسے شرم بھی نہ آئی؟"

خان سرجی کی بات سن کر ہی چپ ہوا جب انہوں نے خان سے کہا۔ "آپ خان والی نظروں سے نہیں بلکہ مایا والی نظروں سے دیکھیں تو آپ بھی گھائل ہو جائیں گے۔"

خان نے کھا جانے والی نظروں سے سرجی کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ میں نے شیشے پار دیکھا۔ ہم جیرالڈ اسٹریٹ پہنچ چکے تھے۔

جیرالڈ اسٹریٹ ایک بڑا بازار تھا۔ گاڑی روڈ کنارے پارک کرنے کے بعد ہم باہر نکلے تو موسم کی شدت مدھم پڑ چکی تھی۔ دونوں جانب درجنوں دکانیں تھیں۔ پان شاپ دستور کے مطابق ایک کونے پر نظر آئی۔ کپڑوں، گروسری، وڈیو کی دکانیں تھیں۔ کئی ایک دیسی ریسٹورنٹ کھلے تھے۔ اتنا رش نہ تھا مگر ہم بہت سے پاکستانیوں کو پہلی بار ایک ساتھ مٹر گشت کرتے دیکھ رہے تھے۔ سرجی ایک ملبوسات کی دکان میں جا گھسے۔ ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ کچھ لڑکیاں یہ دکان چلا رہی تھیں۔ سرجی نے شلوار قمیص کے نرخ معلوم کیے۔ لڑکیوں نے اپنے اسٹول سے اترے بغیر ہمیں قیمتیں بتائیں۔ انہیں ہماری شکلوں سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ہم شغل ہی کے لیے آئے ہیں خریداری کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کشمیری چائے اور وہ بھی وطن سے دور میں نے اسی طرف رخ کر لیا۔ آگے چلے تو ایک جگہ کشمیری چائے تیار ہو رہی تھی۔

ہمیں اس سرد موسم میں چائے امرت سے بہتر لگی۔ روح تب سیراب ہوئی گویا وہ چائے نہ ہو آب حیات ہو۔ پہلا سپ لیا تھا کہ ذہن کے کینوس پر مری کا مال روڈ ابھر آیا۔ ہم دکانوں میں جھانکتے جھانکتے ایک گروسری کی بڑی سی دکان کے اندر گئے۔ وہ ایک بڑا جنرل اسٹور تھا۔ ڈالڈا گھی کا ڈبہ سب نے اٹھا کر اس میں پاکستان کی خوشبو سونگھنے لگے۔ چائے کی پتی کے سارے مشہور برانڈ موجود تھے۔ آٹا، چاول، مرچ مصالحے سب چیزیں تھیں۔ میری نظر ایک کونے پر پڑی تو وہاں پاکستان سے آئے ہوئے اردو کے اخبارات، جرائد، رسالے اور ڈائجسٹ بھی موجود تھے۔ مجھے پاکستان کے بارے میں ان دنوں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔

اسی لیے میں نے اخبارات اور کچھ رسالے خرید لیے۔ پاکستان سے لائی گئیں سبزیاں، پھل بھی دستیاب تھے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تازہ مولیاں تک بک رہی تھیں۔ مالک بوریوں کے پیچھے کان میں پینسل اٹکائے کھڑا ہمیں دیکھ اور تول رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم کینیڈا میں نئے ہیں۔ اس نے نہایت مہذب انداز میں کہا۔ "اگر دس کالنگ کارڈ لیں گے تو ایک کارڈ دس ڈالر کے بجائے آٹھ ڈالر میں دوں گا۔"

مجھے اپنا پہلا چیک مل چکا تھا۔ اس لیے فکر نہ تھی۔ کیونکہ کالنگ کارڈ میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ کیونکہ کارڈ ہی سے میں اپنے بیوی بچوں سے بات کر سکتا تھا۔ آخر سنتے ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنے تینوں دوستوں کو حیرت میں ڈال کر دس کارڈ خرید لیے تھے۔

چند ماہ بعد جب میری فیملی آ گئی تو ہم گلانی اسٹور کے سامنے والی بلڈنگ میں ایک اپارٹمنٹ لے کر شفٹ ہو گئے۔ اسی بلڈنگ میں ایک صاحب رہتے تھے۔ جن سے میری علیک سلیک ہو گئی۔ وہ پاکستان سے تازہ سبزیاں اور پھل منگواتے تھے۔ ہفتے میں تین جہاز آتے تھے ہر بار ان کا سامان بھی آتا۔ اسی طرح ہم پاکستان کی تازہ سبزیاں، جن میں پالک، بھنڈی، توری اور کریلے تک ہوتے، وہ مجھے دروازے پر لا کر دیتا تھا۔

ہماری آج کی دیسی خریداری ختم ہوئی تو شہباز چلانے لگا۔ "مجھے بھوک لگی ہے اور تم اخبارات خرید رہے ہو؟ چلو پہلے کھانا کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کھا کھا کر بیل کی طرح پھول گئے ہو...... تو مایا......"

میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک دم ہی میں پھٹ پڑا اور سرجی سے لڑنے لگا۔

"تم نے میرا راز فاش کر دیا۔ اب ہر وقت ان کی

بکواس سننی پڑے گی۔"

سرجی نے شہباز کی سنی اَن سنی کردی اور منت کرنے لگے۔"یہاں مٹھائی کی دکان میں نے دیکھ لی ہے، جانے سے پہلے جلیبیاں ضرور خریدیں گے اور وہ بھی شیرے والی۔"

جیرالڈ اسٹریٹ پر بہت سے حلال ریسٹورنٹ تھے۔ شہباز کا بھوک سے برا حال تھا۔ میری اپنی حالت بھی کوئی خاص ٹھیک نہ تھی۔ سڑک پر چلنے والے کم تھے مگر دکانوں میں رش تھا۔ ہم نے ایک مشہور و معروف ہوٹل کو پسند کیا۔ اس کا نام میں کئی بار سن چکا تھا اس ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچے تو دیکھا کہ لان پاکستانی انداز میں آراستہ ہے۔ اس نے ریسٹورنٹ کے چھوٹے سے لان میں ایک رکشا بھی کھڑا کر رکھا تھا کہ پاکستان کی کوئی جھلک نظر آئے۔ وطن سے دور وطن کی کوئی چیز نظر آجائے تو دل خوشی سے نہال ہو جاتا ہے۔ میں رکشے پر نظر ڈالتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔

ہوٹل کا چھوٹا سا ہال تھا جس میں اس وقت پانچ چھ میزیں پڑی تھیں۔ لکڑی سے بنے ہال میں ہم کھڑے تھے۔ دیواروں پر پاکستانی ثقافت کی پینٹنگز لگی تھیں۔ اسپیکر پر کوئی ہلکی سی پنجابی نغمے کی دھن بج رہی تھی۔ ہمارے علاوہ کچھ افراد ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ایک صاحب کاؤنٹر پر آئے تو ہم ان کی طرف بڑھے۔ اس نے نستعلیق انداز میں السلام علیکم کہا۔ ہم نے بھی جواباً سلام دیتے ہوئے چکن کڑھائی اور دال کا آرڈر دیا پھر ایک خالی میز کے گرد بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

یہاں باہر جا کر ڈنر کرنا بہت اچھی تفریح ہوتی ہے۔ یہاں کیا پاکستان میں بھی یہی حال ہے۔ روز کے معمول سے عورت بھی نکل آئی ہے۔ ورنہ صبح اسی سوچ میں اٹھتی ہے کہ آج کھانے میں کیا بنائے گی؟ جب رات کو ڈنر پر جانا ہو تو وہ بہت ریلیکس ہوتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر یہاں باہر جا کر ڈنر کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کچھ کھا ہی نہیں سکتا۔ مجھے جو چیز باہر کھانے میں سب سے اچھی لگتی ہے وہ تندور کی گرم روٹیاں ہوتی ہیں۔ باقی چیزوں کا ذائقہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہم جس ریسٹورنٹ میں آج بیٹھے تھے، یہاں چند ماہ قبل میرا ایک دوست اور اس کے بیٹے کام کرتے تھے۔ وہ مجھے بتاتے تھے کہ یہاں گریبی کے بڑے ٹین ڈبے بھرے رہتے ہیں۔ آپ دال، کڑاہی گوشت، بریانی یا کسی چیز کا آرڈر کریں تو اسی بنی بنائی گریبی میں تیار کی جاتی ہے۔ وہ اپنا کھانا گھر سے لاتے تھے مگر پورے ٹورنٹو میں یہ ریسٹورنٹ مشہور تھا کہ یہاں کا کھانا سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں اس ریسٹورنٹ کا نام نہیں لکھ رہا۔

ہم نے آج مزے لے لے کر کھانا کھایا تھا اور تعریفوں میں زمین و آسمان ملا رہے تھے۔ کئی مہینوں بعد تندور کی گرم روٹیوں پر ہم ندیدوں کی مانند ٹوٹ پڑے۔ ہم ایک دوسرے کے دشمن بنے خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ خان کا شکریہ بھی ادا نہ کرتے تھے۔ واپسی پر خان سڑک پر نظریں گاڑے گاڑی چلا رہا تھا اور میرے علاوہ سب اونگھ رہے تھے۔ میں خاموشی میں سردی سے لپٹا ٹورنٹو دیکھ رہا تھا اور سرجی اب جلیبیوں سے بھرا لفافہ تھامے ہم سے منہ پھیرے بیٹھے تھے۔ چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔

اگلے دن میں کین سینٹر سے سیدھا ہولڈنگ سینٹر جاب کے لیے پہنچا تو سب قیدی کمروں میں لیٹے تھے۔ ایک گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیدی کسی غور و فکر میں ڈوبا ہیڈ گارڈ کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھا تو بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ اس کا رویہ بہت ہی اچھا ہو گیا تھا جب سے میں نے اسے کینیڈا کا قانون پڑھایا تھا۔ بیدی کے بدلتے اچھے رویے سے میں تو مطمئن تھا مگر جمیل کی پریشانی خاصی بڑھ چکی تھی۔ وہ اور بیدی مل کر مجھے تنگ کر رہے تھے مگر جب سے بیدی بدلا تھا تو جمیل حیران و پریشان بیٹھا ہمیں کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا تھا۔

بیدی بولا۔"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ایک قیدی اسپتال میں ہے۔ تم پابل کے ساتھ وہاں چلے جاؤ، کام کچھ نہیں ہے۔ وہ بیڈ پر سویا ہوگا اور تم گھومتے رہنا یا بیٹھ کر اپنی کتابیں پڑھتے رہنا جو تم ہر وقت اپنے بیگ میں ڈالے پھرتے ہو۔"

بیدی ایک طرح سے میرے ساتھ بھلائی کر رہا تھا۔ کہنے لگا کہ جاب کے اختتام پر ویکن ہٹ کی گاڑی تمہیں گھر بھی چھوڑ آئے گی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ دوسرا گارڈ انڈیا کا تھا۔ نام پابل اور شکل سے شریف انسان لگ رہا تھا۔ گاڑی نے ہمیں اسپتال کے گیٹ پر اتارا۔ ڈرائیور نے رات بارہ بجے آنے کا کہہ کر اپنی راہ لی اور ہم دونوں مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

پچھلی بار ہم ایک قیدی کو کسی دوسرے اسپتال لے کر آگئے تھے۔ آج کوئی اور اسپتال تھا جو پہلے سے بہت بڑا تھا۔ سات یا آٹھ منزلہ عمارت ایک پرشکوہ انداز میں دھند میں لپٹی تھی۔ اندر سے یہ کوئی اسپتال نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی بڑا فائیو اسٹار ہوٹل ہے یا کسی بہت بڑی امریکن فنانشل کمپنی کا ہیڈ آفس ہے۔ اسپتال کا اندازہ صرف اسٹاف

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کی وردیوں سے ہی ہو سکتا تھا۔ مریضوں کے چہروں پر لاچارگی مجھے لابی میں نظر نہیں آئی ۔ سامنے ایک شاندار ریسپشن تھا جس کے پیچھے اُجلے چہروں والے درجنوں لوگ مصروف تھے۔ اس کے بائیں جانب کافی شاپس، گفٹس شاپس، آرام دہ صوفے، دبیز قالین جس میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ یہاں علاج کے لیے ضروری نہ تھا کہ کوئی امیر کبیر انسان ہی اس میں آسکتا ہے۔ جس کو بھی ضرورت ہے، چاہے وہ کوئی مزدور ہو یا کسی بڑے کاروبار کا مالک، وہ یہاں آکر اسی قطار میں اپنی باری کا انتظار کررہا ہوتا ہے۔ ان کے چہروں کو نہیں ان کی بیماری کو دیکھا جاتا ہے، میں ششدر کھڑا آس پاس دیکھ رہا تھا کہ پابل نے ٹہوکا لگایا کہ چلو۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ قیدی کے کمرے میں جائے، میں کچھ دیر میں آرہا ہوں۔

دراصل مجھے میز پر ایک لڑکی کتابیں رکھے نظر آگئی تھی۔ پابل چلا گیا تو میں اس میز کے ساتھ آکھڑا ہوا اور ان کتابوں کو دیکھنے لگا۔ وہ پچاس سینٹ میں ایک کتاب بیچ رہی تھی۔ پوچھنے پر بتایا کہ لوگ پڑھنے کے بعد اپنی کتابیں ہمارے ادارے کو مفت دے دیتے ہیں۔ ہم انہیں بیچ کر بچوں کی فلاح و بہبود کے ایک ادارے کو یہ رقم دے دیتے ہیں۔ میں نے ایک ڈالر میں فکشن پر دو کتابیں خریدیں۔

دس سے زیادہ لفٹس ایک لائن میں تھیں۔ میں ان میں سے ایک برق رفتار لفٹ سے ساتویں فلور پر پہنچا۔ مٹی کا ایک ذرہ نظر نہ آتا تھا۔ صفائی والے ہر جگہ اور ہر وقت موجود تھے۔ مجھے معلوم نہ ہوا کہ وہ اس وقت اوپر کے فرشوں کو کیوں چمکا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ رگڑ رگڑ کر ان کی چمک کہیں ختم نہ کردیں۔

میں اسپتال کے اس کمرے میں پہنچا جہاں اس قیدی کو رکھا گیا تھا۔ دو بیڈ ایک دوسرے سے ذرا سے فاصلے پر پڑے تھے۔ ان کے درمیان پردہ تھا مگر وہ اب ہٹا ہوا تھا۔ سامنے ایک بڑی کھڑکی کے ساتھ دو آرام دہ کرسیوں کے بیچ میز تھی اور اس پر رکھے گلدان میں پھول تھے۔ فرش چمکدار تھا۔ یہ ساتواں فلور تھا اور باہر گردونواح کے شاندار منظر کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل میں بیدی کا شکریہ ادا کیا کہ ہولڈنگ سینٹر کے گھٹے ماحول سے نکال کر مجھے یہاں بھیج دیا۔

ایک بیڈ پر سری لنکا کا وہ قیدی تھا جس نے سیاسی پناہ کی درخواست امیگریشن میں جمع کروا رکھی تھی۔ معلوم نہیں اسے کیا بیماری تھی۔ ساتھ والے بستر پر ایک بوڑھا گورا لیٹ کر ہمیں خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کمرے میں اور لوگوں کی موجودگی سے کڑھ رہا تھا۔ ہر بیڈ پر ایک علیحدہ سلائیڈنگ ٹی وی مریض کے آگے لگا تھا۔ چینل تو بہت سے فری میں آتے ہیں مگر آپ ادائیگی کر کے کچھ اور چینل بھی خرید سکتے ہیں۔ اس بوڑھے نے کچھ چینل خریدے ہوئے تھے۔ اب مجھے اس کی ہم سے بیزاری کی وجہ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ ایسے کہ موصوف نے ایک ایسا چینل خریدا تھا جس پر ننگی فلمیں آتی تھیں اور ہم اس کے اس دید نظارہ میں حائل ہوگئے تھے یا وہ ایسا سمجھ بیٹھا تھا۔ اب وہ چند ساعت ہم سے منہ موڑ کر ٹی وی پر نظریں گاڑتا اور پھر ہماری جانب گھوم کر ہمیں گھورنا شروع کردیتا۔ اس کا مزہ کرکرا ہوگیا تھا۔ پابل بھی اس کی اس حرکت پر مسکرا رہا تھا۔ ہمارا قیدی مریض بھی اپنی بیماری کو بھول کر اس مفت کے شغل میں محو تھا۔ بوڑھے مریض نے اپنے ٹی وی کا ہیڈ فون کانوں میں لگا رکھا تھا۔ فلم دیکھتے دیکھتے اس سے کچھ بن نہ پاتا تو کھانسنا شروع کردیتا یا اگر ہم کو بھی محو دیکھتا تو ہونکنا شروع کردیتا اور ٹی وی سے پیٹھ پھیر کر روٹھ کر لیٹ جاتا۔

ایک نرس ان دونوں کا کھانا ایک ٹرالی پر لیے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہر مریض کی علیحدہ ٹرے تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر دونوں کے لیے مختلف مینو تھا۔ سوپ، جوس، چاول، دودھ، ابلی سبزیاں، مچھلی اور بھی بہت کچھ تھا۔ بوڑھے نے کھانے کو دیکھا تو زیادہ ندیدہ ہوگیا۔ ٹی وی کو بند کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹوں میں سب صاف کر ڈالا۔

میں نے کھڑکی کے ساتھ والی آرام دہ کرسی سنبھالی اور باہر بچھے گھروں، درختوں، سڑکوں، پارکس اور آسمان کو دیکھنے لگا جنہوں نے برف کا سفید لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ شام کا خوب صورت منظر یہاں سے نہایت ہی فسوں ساز تھا۔ میں تادیر اس منظر میں کھویا رہا۔ جب سے میں آیا تھا، شاید ایک دو بار ہی سورج کی شکل دیکھی تھی ورنہ ہر وقت ایک دھندی چھائی رہتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگلے چند مہینوں بعد جب یہ... برفیں پگھلیں گی تو اندر سے کیا برآمد ہوگا؟ آسمان اور زمین کے رنگ کیسے ہوں گے؟ جس کینیڈا کی تلاش میں، میں اِدھر... آ بھٹکا تھا، کیا وہ یہی ہے یا کسی اور روپ میں سامنے آئے گا۔ شام کی سیاہی نے منظر پر جب مکمل پردہ ڈالا تو میں کھڑکی کے آگے سے ہٹ گیا۔

آج شہباز کی تو جاب تھی مگر سر جی آج فارغ گھر پر بیٹھے تھے۔ مفتی بھی گھر پر تھا اور میں نے اس سے معلوم کرنا تھا کہ میرا Resume اس نے کمپنی کو دے دیا ہے؟ کمرے

میں ایک فون تھا جو اس بوڑھے مریض کے بیڈ کے ساتھ ایک میز پر رکھا تھا۔ میں نے فون اٹھایا تو اس نے نخوت سے مجھے فون کرنے سے روک دیا اور بولا۔ ''یہ میرا فون ہے، اسے ہاتھ مت لگاؤ۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کیبل کی طرح اس کا بل دیتے ہو؟''

ہمارا مریض اپنے کھانے سے اب فارغ ہو گیا تھا۔ وہ بولا۔ ''نہیں! یہ روم کا فون ہے اور آپ کہیں بھی کر سکتے ہیں۔'' مگر وہ بوڑھا اپنی بات پر جم گیا اور فون پر اس نے اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ میں بھی اب طیش میں آ چکا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا کہ وہی نرس کھانے کی ٹرے لینے ٹرالی گھسیٹتی اندر داخل ہوئی۔ اس نے بوڑھے مریض کو لڑتے دیکھا تو برا سا منہ بنایا۔ شاید وہ اس کے مزاج کو پہلے سے ہی جانتی تھی۔ میں نے فون کا پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ یہ کوئی پرائیویٹ فون نہیں ہے، کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اس پر میں نے بوڑھے کو تنبیہی انداز سے دیکھا تو اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

میں نے اپارٹمنٹ فون کیا اور مغنی نے میری آواز سنتے ہوئے کہا۔ ''پریشان لگ رہے ہو؟''

میں نے مختصر طور پر اسپتال میں جاب کا بتا کر اس سے اپنے Resume کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ''میں نے وہ دے دیا ہے اور ان کو تمہارا فیکس بھی مل گیا ہے اور Resume بھی آ رہے ہیں۔ سپروائزر کہہ رہا ہے کہ ہم چھانٹی کر کے کچھ دن بعد انٹرویو کال کریں گے۔''

میں مطمئن ہو گیا۔ فون بند ہوا تو میں ایک کتاب لے کر کھڑکی کے ساتھ آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر مطالعے میں غرق ہو گیا۔ پابل اونگھ رہا تھا۔ بوڑھا مریض اپنے ٹی وی میں دوبارہ سے کھو گیا تھا۔

بہت دیر بعد میں بھی تھک گیا۔ مجھے اپنے آپ کو چوکس رکھنے کے لیے چائے کی طلب ہونے لگی مگر کیا کرتا چائے یہاں ملتی نہیں تھی۔ میں نے پابل سے کہا کہ لابی سے نیچے فلور پر کافی ملتی ہے۔ اگر تم کہو تو میں پی کر آ جاؤں اس نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔ میں نے بیگ لپیٹا اور پابل کو وہیں چھوڑ کر لفٹ کے ذریعے لابی سے نچلے فلور پر آ گیا۔

یہاں ہو کا عالم تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کوئی کاؤنٹر ہوگا اور لڑکیاں کافی پیش کر رہی ہوں گی۔ میزیں اور کرسیاں رکھی ہوئی ہوں گی مگر یہاں تو چند الماریاں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ ان میں، چاکلیٹ، کیک، آلو کے چپس رکھے تھے۔ ایک کے اندر ڈرنکس اور مختلف اقسام کے جوس پڑے تھے۔ ایک دوسری الماری میں کئی ایک ذائقوں کی فریش کافی تھی۔ وہیں پر دودھ اور چینی بھی مختلف خانوں میں رکھی تھیں۔ آپ الماری کا دروازہ کھول کر کچھ نہیں نکال سکتے۔ ہر چیز کے آگے نمبر اور قیمت درج تھی۔ آپ ایک سلاٹ میں ڈالر یا سکے ڈالتے ہیں اور پھر اس چیز کا نمبر دبا دیتے ہیں اور وہ چیز باہر آ جاتی ہے۔

میں نے کافی کے لیے دو ڈالر ڈالے اور نمبر دبایا تو الماری کے اندر سے گڑگڑاہٹ آنی شروع ہوئی۔ پھر ایک کپ آیا اور اس میں فریش کافی بھر گئی۔ مشین نے احتیاط سے اس کپ کو نیچے پہنچایا۔ ایک کھڑکی سی کھلی اور کپ میرے ہاتھ میں تھا۔ کافی سے بھاپ نکل رہی تھی۔ دودھ کم تھا اور چینی تو بہت ہی کم تھی۔ ایک اور بٹن دبایا تو ایک چھوٹے کپ میں دودھ وصول کیا۔ چینی باہر میز پر بھی رکھی تھی۔ میں حیرانگی سے یہ سب پہلی بار کرتا جا رہا تھا۔ ڈیڑھ ڈالر مشین نے اپنے پاس رکھ لیے اور پچاس سینٹ نیچے ایک خانے میں میرے لیے پھینک دیے۔ میں تعجب سے سب کچھ کر رہا تھا۔ اسے وینڈنگ مشین کہا جاتا ہے۔

اتنے میں لفٹ کھلی اور ایک عورت وہیل چیئر گھسیٹتی باہر نکلی۔ وہیل چیئر پر بوڑھا مریض تھا۔ اس عورت نے بوڑھے کے لیے چاکلیٹ نکالی اور پھر تازہ جوس لیا۔ پہلے اسے چاکلیٹ کھلائی۔ اس کا منہ ٹشو سے صاف کیا۔ پھر اسی منہ پر جوس کا کپ لگا دیا۔ وہ بابا لاڈ کر رہا تھا اور وہ عورت خندہ پیشانی سے مسکرا کر اس کا کہا مانے جا رہی تھی۔ وہ جوس کے کچھ گھونٹ بھرتا اور کچھ اس کے دہانے سے باہر بہہ جاتا۔ وہ ٹشو سے پہلے اسے صاف کرتی اور پھر بہت محبت سے پلانے لگتی۔

میں حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میرا کپ ابھی تک ہاتھ میں ہی تھا۔ کبھی بابا ضد کرنے لگتا کہ اسے سگریٹ پینی ہے۔ عورت نے اس کی جیکٹ ٹھیک کی اور اسے گھسیٹتی ہوئی سامنے ایک شیشے کے گیٹ سے باہر لے آئی۔ میں بھی ساتھ ساتھ باہر آ گیا۔ اب میں رات کی سیاہی اور خنک ہواؤں کے درمیان گرم کافی پی رہا تھا اور بابا اپنی سگریٹ پھونک رہا تھا۔

کل صبح آٹھ بجے مجھے پوری کلاس کو مین لائبریری لے جانا تھا اور شام چار بجے مجھے دوبارہ جاب پر ہولڈنگ سینٹر پہنچنا تھا۔ میں اسپتال کے کمرے میں پہنچا تو پابل نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''سینٹر سے فون آیا ہے کہ کل تم ہولڈنگ سینٹر کی بجائے ڈاؤن ٹاؤن اس بلڈنگ میں تین بجے

جاب کے لیے جاؤ گے۔"

میں حیران تھا کہ وہاں سب دفاتر ہیں جو پانچ بجے بند ہو جاتے ہیں اور تین بجے سے رات دس تک مجھے کس کی چوکیداری کرنی ہوگی؟ میں نے پرچہ بیگ میں رکھ لیا۔

پچھلے کئی ہفتوں سے میں گھر سے صبح منہ اندھیرے نکلتا تھا اور رات ایک بجے کے قریب اپارٹمنٹ پہنچتا تھا۔ بیچ میں صرف ایک دو دن مجھے جاب پر نہیں جانا پڑا تھا اس وجہ سے میں اندر سے تھک گیا تھا۔ خوراک بھی ٹھیک سے نہیں مل رہی تھی اور نیند کی مسلسل کمی چلی آرہی تھی۔ ہم میں سے صرف مفتی مزے میں تھا۔ وہ صبح سات بجے نکلتا تو تین بجے گھر آجاتا اور پھر رات تک ٹی وی کے آگے بیٹھا رہتا۔ دوسرا عذاب ہم پر اس موسم کا تھا۔ نہ آسمان دکھتا تھا اور نہ زمین۔ ہر وقت فضا میں دھواں اور بادل رہتے تھے۔ مسلسل برف باری نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ پاکستان میں ہوتا تو یہ برف باری ایک رومانوی موسم کی مانند ہوتی یہی وجہ تھی کہ جیسے یہاں سرجی کا ابھی تک شوق پورا نہ ہوا تھا۔ میں شروع میں تو کچھ دن برف کو گرتا دیکھتا رہا تھا مگر اب شیشے کے پار یہ منظر دیکھتا تو دل کرتا کہ رضائی میں گھس کر لمبی تان کر سو جاؤں مگر یہاں تو تھکا ماندہ سونے کے لیے رات کو بستر پر جاتا اور اسی تھکاوٹ کو اوڑھے منہ اندھیرے بیدار ہو جاتا تھا۔ کچھ ٹائم ملا تو ناشتا یا کھانا بنا لیا ورنہ ڈبل روٹی کے چند سلائس، ابلے آلو اور انڈا فرائی ہی پر گزارہ چل رہا تھا۔

رات ایک بجے سے پہلے اپارٹمنٹ پہنچا تو سردی، بھوک، تھکاوٹ اور ذہنی دباؤ نے مجھے ادھ موا کیا ہوا تھا۔ ایک ایک قدم بھاری تھا۔ بمشکل کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر جا گرا۔ تھکاوٹ اتنی زیادہ تھی کہ نیند نہیں آرہی تھی۔ شہباز اور سرجی مل جل کر خراٹے لے رہے تھے۔ یہ ایک اور عذاب تھا۔

میں بے آرامی سے کروٹیں بدلتا رہا اور ہوا کمرے کی ڈور وال کے شیشوں پر دستک دیتی رہی۔ ابھی میں سویا ہی تھا کہ سرجی نے اٹھا دیا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج سب نے لائبریری جانا ہے۔" یہ کہہ کر ذرا توقف کیا اور پھر سوال داغا۔ "نسرین بھی کیا آرہی ہے؟"

میں نے کچی نیند میں انہیں جب گھور کر دیکھا تو یہ کہتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گئے۔ "کوئی بھی اپنے دل کے راز نہیں بتاتا اور ہم ہیں کہ سب کچھ بنا پوچھے بتائے چلے جارہے ہیں۔"

ہم تینوں ایک ساتھ کھڑے سر اٹھائے اس عظیم وشان اور کثیر منزلہ عمارت کو سڑک پر کھڑے دیکھ رہے تھے جس کو لائبریری کہا جاتا ہے۔ اس پر گھنے بادل چھائے تھے جو کسی وقت بھی برس سکتے تھے۔ آج برف باری نہ تھی مگر یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں۔ ہم نے اپنے آپ کو مکمل طور پر ڈھانپا ہوا تھا۔ سرجی مسلسل بضد تھے کہ ہم غلط مقام پر آگئے ہیں۔ یہ کوئی شاپنگ سینٹر ہے کیونکہ اتنی بڑی لائبریری ہو ہی نہیں سکتی۔

میں نے انہیں لائبریری کا سائن دکھایا تو وہ پھر بھی انکاری تھے۔ دروازے کے قریب مارک، میا ہو اور ین کو دیکھا تو سرجی کی کچھ تسلی ہوئی مگر پھر بھی یہی کہے چلے جاتے تھے کہ یہ بھی دھوکا کھا گئے ہوں گے۔

مارک قریب آیا اور میرے کان میں بولا۔ "وہ تمہاری گرل فرینڈ نسرین بھی آئی ہوئی ہے۔"

میں نے جواب میں اسے کہا۔ "مارک! میں سخت تھکا ہوا ہوں اور لاغر بھی ہوں اس ناتواں کندھوں پر کسی گرل فرینڈ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔"

اس نے ہنس کر اپنا بھاری ہاتھ میرے کندھے پر کسی ہتھوڑے کی طرح مارا اور کہا۔ "یہ موقع جانے نہ دو۔ وہ بھی تم میں دلچسپی لے رہی ہے اور میں سب دیکھ رہا ہوں۔"

سرجی مارک کی بغل میں کھڑے تھے، وہیں سے منمنائے۔ "ماشاءاللہ بہت حسین ہے۔ ہرنی کی طرح اس کی آنکھیں ہیں۔ سیب کی طرح سرخ رنگت ہے۔ مجھے تو موم کی گڑیا لگتی ہے۔" وہ یہ سب اردو میں کہہ رہے تھے۔

مارک نے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ مجھے شہباز بنا رہا ہے۔" مطلب یہ تھا کہ جس طرح سرجی نے شہباز کو مایا کے عشق میں یک طرفہ پھنسا دیا تھا اسی طرح مجھے بھی سبز باغ دکھا رہے ہیں۔ مارک کو بات سمجھ میں آئی تو اس کے بھرپور قہقہے نے تھکاوٹ کی موت سے نکل کر زندگی کی لہر میں پھینک دیا۔ دوست زندہ دل ہو تو زندہ رہنے کا مزہ آجاتا ہے۔ میں نے یہ بات یہاں بھی محسوس کی تھی کہ آپ کسی لڑکی سے بات کریں تو لگاتار کریں، تو یورپین بھی باتیں بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہ تھا مگر سب یہی سمجھ رہے تھے کہ ہمارا کوئی چکر چل رہا ہے۔

اتنے میں الزبتھ لشکارے مارتی، ہنستی مسکراتی اور سب کو ہاتھ ہلا کر صبح بخیر کہتی ہوئی آپہنچی۔ سرجی اب اس کے قریب کھڑے اسے سونگھ رہے تھے۔ اتنے میں مایا، ین اور

نسرین بھی آپہنچیں۔ نسرین نے فر کا نیلا کوٹ پہن رکھا تھا جو اس پر بہت بج رہا تھا۔ مارک نے اسے دیکھ کر مجھے آنکھ ماری، نسرین نے دیکھ لی۔ قریب آکر بولی۔ ”مجھے سب معلوم ہے کہ مارک یہی سمجھتا ہے کہ ہم دونوں کا کوئی چکر چل رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم ہی اس کی یہ غلط فہمی دور کردو۔“

وہ بولی۔ ”مجھے کیا پڑی ہے کہ لوگوں کو صفائیاں دیتی پھروں اور یہ مارک کچھ غلط بھی تو نہیں سمجھتا۔“ یہ کہہ کر ہنس پڑی اور سرجی پھر سے ہمارے قریب کھنچے چلے آئے۔

سرجی قریب آکر ایسے کھڑے ہوئے جیسے یا تو کچھ کہنا چاہتے ہوں یا سننا چاہتے ہوں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ بڑی معصومیت سے بولے۔ ”کچھ بھی تو نہیں۔“

میں ان کی اس ادا پر ہنس پڑا اور ہنستے ہوئے ہم سب لائبریری میں داخل ہوگئے۔

ٹورنٹو مجھے آئے ہوئے دو ماہ سے زائد ہو چکا تھا۔ میں اتنے عرصے میں مالوں میں گھما رہا تھا۔ بڑی بڑی عمارتیں، اپارٹمنٹ، بلڈنگز، بڑے بڑے دفاتر دیکھے تھے۔ اسپتالوں کی شاندار عمارتیں بھی دیکھ چکا تھا مگر جو حیرت کے جھٹکے مجھے اس لائبریری کو دیکھ کر لگ رہے تھے وہ پہلے نہ لگے تھے۔

کئی منزلہ عمارت تھی جس کے بیچ میں آخری منزل کی چھت تک خلا تھا اور پوری عمارت بیچ میں کھلی تھی۔ اردگرد چاروں جانب بہ درجہ منزلیں تھیں۔ سامنے فوارے چل رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک نیم دائرے کی شکل کا بہت بڑا کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے تازہ دم اور دمکتے چہرے مسکراتے نظر آرہے تھے۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک خاص ترتیب سے میز اور کرسیاں رکھی تھیں، جہاں لوگ بیٹھے کچھ نہ کچھ پڑھ رہے تھے۔ فرش پر قالین بچھے تھے، روشنیاں اتنی کہ فرش پر پڑی سوئی بھی آسانی سے نظر آجائے اور خاموشی ایسی کہ سرجی کی کان میں سرگوشی بھی ناگوار گزرتی تھی۔ ایک نظم وضبط تھا، ایک ترتیب تھی۔ ایک مہذب معاشرے کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ ہم اتنے مرعوب تھے کہ سرگوشیوں میں بات کررہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر کوئی اونچا بولے گا تو یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔

الزبتھ ہمیں پہلے فرسٹ فلور پر لفٹ سے لے آئی۔ ہم میکانکی انداز سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ فرسٹ فلور پر دور دور تک چاروں جانب کتابوں سے بھرے ریک رکھے تھے۔ عملے کے لوگ ٹرالیوں میں کتابیں بھر کر ایک ترتیب سے انہیں رکھ رہے تھے۔ یہ وہ کتابیں تھیں جن کو لوگ پڑھ کر واپس لوٹا گئے تھے۔ بہت سی میزوں پر کمپیوٹر رکھے تھے۔ وہاں موجود لوگ یا تو کمپیوٹر پر کام کررہے تھے یا کچھ دوسری میزوں پر بیٹھے ورق گردانی کررہے تھے۔ ہر موضوع پر کتابیں دستیاب تھیں اور ہر موضوع کا اپنا علیحدہ سیکشن تھا۔

بیس منٹ میں اترے تو یہاں دنیا بھر کے تمام اخبارات موجود تھے۔ وہ جو آج چھپے تھے اور وہ بھی جو سو سال پہلے چھپے تھے۔ ان اخبارات کی مائیکرو فلم بھی موجود تھیں۔ یہ اخبارات ہر ملک کی ہر زبان میں دستیاب تھے۔ آپ کسی اخبار کی فلم لے کر پروجیکٹر پر لگائیں اور پرانے اخباروں میں چھپے آرٹیکل پڑھ لیں۔ یہاں صحافی، فلم میکر، تاریخ داں سب اپنے مطلب کے آرٹیکل ڈھونڈتے ہیں اور اپنے پیپرز اور نوٹس تیار کرتے ہیں۔ میں نے پاکستانی اخبار ڈان کے پچاس سال پہلے چھپے صفحات دیکھے۔

تیسرا فلور بزنس کے جرائد سے بھرا پڑا تھا۔ کاروباری دنیا میں کہاں کہاں کیا کچھ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں کتابیں اور میگزین موجود ہیں۔ چوتھے فلور پر دنیا بھر کی انڈسٹری کے متعلق مواد دستیاب تھا۔ ایک فلور پر آرٹ گیلری، ڈاکومنٹری ویڈیوز، نقشے، ہر ملک کے ہر شہر اور ہر موضوع پر بنی، ہر زبان میں ویڈیو دستیاب تھی۔ آپ اپنی پسند کی ویڈیو لیں۔ کسی میز پر لگی اسکرین کے آگے بیٹھ کر ویڈیو کو وی سی آر سے ہیڈ فون لگا کے دیکھ سکتے ہیں۔ پانچویں فلور پر انگریزی سیکھنے کے لیے کیا کیا مواد موجود ہے کہ اللہ کی قدرت یاد آتی ہے۔ بندہ دیکھتا جائے اور حیران ہوتا جائے۔

ایک فلور تحقیقی جرائد کا تھا۔ دنیا بھر میں کسی بھی موضوع پر جو بھی ریسرچ ہو رہی ہے اور اس کے مقالے چھپ رہے ہیں۔ وہ یہاں نظر آئے ہر جریدہ نیا ہو یا پرانا، یہاں موجود ہے۔ میری ایسی حالت تھی جس طرح کسی بچے کو کھلونوں کی دکان میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ میں کبھی ایک چیز کو دیکھتا اور کبھی دوسری کو۔ کسی نے الزبتھ سے پوچھا۔ ”ہم اپنے مطلب کی کتاب یا کوئی مقالہ کیسے ڈھونڈیں گے؟“

وہ کہنے لگی۔ ”میں یہی سکھانے آئی ہوں۔ آپ کمپیوٹر پر کسی بھی مصنف، بزنس، کسی بھی موضوع کو ٹائپ کریں۔ اس طرح سے ..... آپ کچھ دیر بعد اپنی کتاب، اخبار یا میگزین کو ٹریک کرلیتے ہیں۔ اس کا ریفرنس نمبر کاؤنٹر پر دیں تو چند منٹ میں وہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔“

پھر الزبتھ نے ہم سب کو علیحدہ علیحدہ کتابوں کے نام

دیے کہ ان کا ریفرنس نمبر تلاش کرنا ہے۔ شروع میں مشکل ہوئی مگر آہستہ آہستہ ہم سیکھتے گئے۔ میں نے اردو کی کتابیں تلاش کیں تو ہزاروں کی تعداد میں موجود تھیں۔ پاکستان ٹی وی ڈرامے ڈھونڈے تو مجھے ''لاوارث'' ڈراما مل گیا۔ سرجی زینت امان کے گانوں کا گیت مالا ڈھونڈ لائے۔ اب تو یہ حال ہے کہ آپ گھر سے کیٹلاگ تلاش کریں اور اپنے اکاؤنٹ میں جا کر اسی کتاب کا آرڈر کر دیں۔ دوسرے دن لائبریری میں آپ کے لیے رکھی ہوگی۔ اگر کوئی کتاب موجود نہیں تو آپ کو دس دن میں دستیاب کر کے دے دیں گے۔ ٹورنٹو کی سب لائبریریاں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اگر کوئی کتاب ایک لائبریری میں موجود نہیں تو آپ کو دوسری لائبریری سے مہیا کر کے دے دیں گے۔ آپ کو ضروری نہیں کہ اس لائبریری میں آنا پڑے۔ ہر علاقے میں ایک بڑی لائبریری موجود ہوتی ہے۔ اب تو موبائل لائبریری بھی ہوتی ہے۔ ہفتے میں دو یا تین دن آپ کے علاقے میں چلتی پھرتی لائبریری کی گاڑی آتی ہے۔ آپ اپنا آرڈر وہاں سے بھی وصول کر سکتے ہیں اور کوئی کتاب لوٹا بھی سکتے ہیں۔

ہر لائبریری میں خاموش کمرے ہوتے ہیں، جہاں چھینکنے کی بھی اجازت نہیں آپ ان کمروں میں بیٹھ کر اپنے امتحان کی تیاری کر سکتے ہیں۔ میں نے جب بعد میں اپنے امتحانات دیے تو پورا دن لائبریری میں گزارتا تھا۔

میں اس کو تفصیل سے صرف دو چیزوں کی وجہ سے بتا رہا ہوں۔ ایک تو پڑھنے والوں کو معلوم ہو کہ ترقی یافتہ قوموں میں لائبریری کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور دوسری وجہ بھی یہی ہے، جو قوم پڑھنے اور ریسرچ سے پیچھے رہ جائے تو دوسری اس سے بہت آگے نکل جاتی ہیں۔ ہمارے ملک کے حکمران تک کوئی بھی مطالعہ نہیں کرتا اور تو اور ہماری اسمبلی کے گھس بیٹھیے تو ایک فقرہ بھی نہیں پڑھ سکتے اور اگر پڑھ لیں تو سمجھ نہیں سکتے۔ میں نے جب بھی کسی ٹرین، بس یا جہاز میں سفر کیا ہے تو ہر ایک کو کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے دیکھا ہے۔ کوئی اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہا ہے تو لاؤنج میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ کوئی ٹریڈمل پر ورزش کر رہا ہے تو سامنے کتاب یا کوئی رسالہ کھلا ہے۔ کوئی پارک میں لیٹا ہے تو چہرے پر کتاب کھلی ہے۔ کوئی منٹ بھی ضائع نہ چلا جائے۔ یہ آپ یہاں آ کر دیکھیں لیکن ہم کیا کرتے پھر رہے ہیں، یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سوال اپنے آپ سے کر کے دیکھیں کہ ہم تو فون کے پیکیج ڈھونڈنے میں ہی اپنا کتنا وقت مٹی میں ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں ملک ہمارے خلاف سازش کر رہا ہے۔

سب تھک چکے تھے۔ سب کے لیے یہ جگہ اتنی دلفریب نہ تھی۔ بہت سے بیزار تھے اور وہاں سے نکلنے کی سوچ رہے تھے۔ ان میں شہباز سرفہرست تھا۔ مایا نشے کے عالم میں تھی۔ ایمانداری سے بتاتا ہوں کہ اس دن یہاں دلچسپی مجھے اور چینی ین کو زیادہ تھی۔ شہباز کی آج شام کسی فوڈ فیکٹری میں سیکورٹی کی جاب تھی۔ سرجی کو اپنی جاب پر کہیں جانا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''مجھے معلوم ہے آپ تو رکیں گے اور آج باہر ملاقاتیں ہوں گی۔'' اس کا اشارہ نسرین کی جانب تھا۔

میں نے اکتا کر کہا۔ ''مجھے بھی ڈاؤن ٹاؤن جاب پر جانا ہے۔''

وہ لہک کر بولے۔ ''یہ بہانے کسی اور کو سنائیں۔ جاب پر بغیر وردی کے جانا ہے؟''

میں نے کہا کہ وہ میرے بیگ میں ہے تو ضد کرنے لگے کہ وردی دکھلاؤ۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ پھر اور کہتے کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ''وہ شہباز، مایا کے پیچھے پیچھے ہے۔ جا کر دیکھو ماجرا کیا ہے؟''

یہ سنا اور شہباز کی جانب دیکھا، جو مایا کے بیگ کی تلاشی لینے کے چکر میں تھا اور سرجی ادھر کو ہی بہہ گئے۔ میں نے کھسکنے ہی میں عافیت جانی۔

میں نے بیگ سے آج کی جاب کا پتا نکالا۔ نقشے کی مدد سے اندازہ ہوا کہ بیس منٹ پہنچنے میں لگ جائیں گے۔ ابھی ایک گھنٹا رہتا تھا اگر میں وہیں رک جاتا تو سرجی اپنی جاب بھول کر میرے پیچھے پڑ جاتے۔ میں نے نسرین سے ہاتھ ملایا اور بس اسٹاپ کی جانب بڑھ گیا۔

برف باری نہ تھی۔ موسم بہت بہتر تھا اور اب برف کی جگہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ڈاؤن ٹاؤن پہنچا تو وہی اونچی اونچی عمارتیں اور ان کے نیچے چلتے بھاگتے لوگ تھے۔ سورج اگر نکلا بھی ہو تو ڈاؤن ٹاؤن میں روشنی اونچی عمارتوں کی وجہ سے کم پڑ رہی تھی۔ آج تو ویسے ہی گھنے بادل چھائے تھے اور وہاں شام محسوس ہو رہی تھی۔ میں بارش کی بوندوں سے بچتا بچاتا جب مطلوبہ بلڈنگ کے سامنے پہنچا تو حیران ہوا کہ یہ جگہ تو ویران لگتی ہے۔ پہلے سوچا کہ غلط نمبر پر تو نہیں آ گیا مگر جب نمبر ملایا تو وہی گہرے سرخ رنگ کے پتھروں والی عمارت آج میری منزل تھی۔ مرکزی دروازہ جو کچھ سیڑھیاں چڑھ کر تھا، وہ مجھے بند ملا۔ وہ ایک بارہ منزلہ بڑی عمارت تھی۔ میں اندر داخل ہونے کے لیے کوئی دروازہ تلاش کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ

کہیں مجھے کوئی مغالطہ تو نہیں ہو گیا مگر میں آسانی سے نکلنے والا بھی نہ تھا۔ پانی کی بوندیں بادلوں سے ڈھکے آسمان سے کبھی کبھی نیچے گرنے لگتی تھیں۔ میں عمارت کی وکٹورین اسٹائل والی کھڑکیاں دیکھ رہا تھا جو ایک خوب صورت ترتیب سے ایک دوسرے سے ایک ہی فاصلے پر ایک لائن میں لگی تھیں۔ ان پر بنے نقش و نگار اس عمارت کے رعب و دبدبہ میں اضافہ کر رہے تھے۔ ہر منزل پر درجنوں کھڑکیاں اوپر نیچے ایک شاندار اور پُر وقار منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ باہر سے اس عمارت کا یہ حال ہے تو اندر سے کیا ہوگا۔ یہ عمارت لگ بھگ ڈیڑھ سو سال سے زائد پرانی لگتی تھی۔ میں اندر سے خوش ہو رہا تھا کہ آج جاب کے بہانے اس عمارت کا ایک ایک گوشہ دیکھوں گا۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ سڑک پر ٹرامیں چل رہی تھیں۔ سامنے ایک چرچ کی پرانی عمارت دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چوک سا تھا جہاں کچھ مجسمے نصب تھے۔ اس کے سامنے کچھ ریسٹورنٹ اور بیکری تھی۔ اچانک ایک چھوٹے سے دروازے سے سیکیورٹی گارڈ نکلا، وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے اسے وردی سے پہچانا۔ وہ بھی سکھ تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھ کر بولا۔ ”یونیفارم کے بغیر ڈیوٹی کرو گے؟“

میں نے اپنے بیگ کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں ہے اور میں سیدھا کلاس سے آ رہا ہوں۔

میں دروازے کے اندر داخل ہوا تو مجھے اندھیرا محسوس ہوا۔ جب ذرا آنکھیں کھلیں تو میں حیران و پریشان کھڑا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک ملبا تھا جو ہر جانب گرا ہوا تھا۔ زمین کا پرانا فرش اکھاڑا جا چکا تھا اور اب سیلن زدہ مٹی تھی جو رنگت میں سیاہ پڑ چکی تھی۔ کمروں کے دروازے غائب تھے یا ٹوٹے ہوئے تھے اور ان کے اندر کچرا بھرا تھا۔

اندر کی عمارت کو دوبارہ سے اسی پرانے طرز پر بنایا جا رہا تھا۔ بلکہ پرانی عمارت کی نئے سرے سے مرمت کی جا رہی تھی۔ کمروں، راہداریوں، سیڑھیوں اور برآمدوں کو ایک طرح سے کھودا جا چکا تھا اور ان کو نیا مگر وہی پرانی طرز کا رخ دیا جا رہا تھا۔ روشنی نہایت ہی کم تھی۔ ایک کمرے میں چند کرسیاں تھیں، ایک میز اور اس پر ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ اس گارڈ نے مجھے بتایا کہ یہ لاگ بک ہے جس پر تم نے ہر آدھ گھنٹے بعد رپورٹ لکھنی ہے۔ یہ کرسی اور یہ میز اور یہ فون، یہ کل اثاثہ ہے جو تمہاری دسترس میں رہے گا۔ وہ کہنے لگا کہ پانچ ملین ڈالر کا منصوبہ ہے۔ جس سے اس عمارت کو دفاتر میں تبدیل کیا جائے گا۔ باہر سے قانونی طور پر تبدیل نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ ان کا قومی ورثہ ہے۔ اندر سے اسے مرمت کر کے اسے قابل استعمال لا سکتے ہیں مگر اس کو گرا کر کوئی پلازہ کھڑا نہیں کر سکتے۔

میں نے پوچھا۔ ”مجھے یہاں کرنا کیا ہوگا؟“

کہنے لگا۔ ”پیچھے کا ایک راستہ کھلا ہوا ہے اور کوئی بھی اندر آ سکتا ہے۔ پہلے جب یہ عمارت متروک ہو چکی تھی تو نشہ باز یہاں رات کو آ جاتے تھے۔ دسیوں سالوں سے یہ ویران پڑی تھی۔ حکومت نے کسی بڑی کمپنی کو سستے داموں اسے بیچ دیا ہے اور وہ اب اس پر جتنا خرچ کریں گے اس سے دس گنا زیادہ کمائیں گے۔ جاتے جاتے مجھے ہدایت کی کہ ان خستہ حال سیڑھیوں سے اوپر نہ جانا۔ پھر مجھے پیچھے سے ایک کھلا راستہ دکھایا جو ایک تنگ سڑک پر کھل رہا تھا۔ یہاں سے کوئی بھی اندر آ سکتا تھا اور مجھے اسی راستے پر نظر رکھنی تھی۔

وہ گیا تو اپنے پیچھے ایک مکمل خاموشی، تاریکی، خوف یا دہشت چھوڑ گیا۔ میں نے جو نظریں اٹھا کر ارد گرد اوپر نیچے دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں کسی تاریک اور ویران کھنڈر میں اکیلا کھڑا ہوں۔ گو باہر سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی مگر یہاں باہر کا شور موٹی دیواروں کی وجہ سے اندر نہیں پہنچتا تھا۔

میں نے اپنا بیگ میز پر رکھا۔ وردی نکالی اور تبدیل کی۔ کرسی پر ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ بیگ سے کچھ کتابیں نکالیں اور متوقع انٹرویو کی تیاری کے لیے ان کو پڑھنے لگا مگر دماغ اسی عمارت کے سناٹے میں گھومنے لگا۔ کئی سالوں سے شاید پچاس سال سے ویران یہ عمارت ویران کیسے رہ سکتی ہے؟ ضرور کسی آسیب کا سایہ یہاں ہوگا۔ جن بھوتوں کے مسکن یہاں ضرور ہوں گے۔ پاکستان میں اگر کوئی جگہ دو سال بھی بے آباد رہے تو وہاں کے دروازے بجنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پورے علاقے میں وہ جگہ جنوں والی جگہ مشہور ہو جاتی ہے۔ یہ تو پچاس سال سے ویران ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہاں کوئی دوسری مخلوق نہ ہو۔ یہ خیالات پہلے میرے وہم بنے اور جیسے جیسے سوچتا گیا ویسے ہی یہ یقین میں بدلتے گئے۔ پھر مجھے کچھ نامانوس آوازیں سنائی دینے لگیں، جیسے کوئی سیڑھیوں سے دبے پاؤں نیچے آ رہا ہو، کوئی شیشہ ٹوٹا ہو۔ کسی نے کسی کو پکارا ہو، کوئی سرگوشی میں باتیں کر رہا ہے۔ اب میرا دماغ اسی شکنجے میں پھنس چکا تھا۔ میں اب خوف کی کھائی میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ چاروں جانب نیم تاریک ماحول اور مہیب سناٹا تھا۔ کئی سالوں سے ویران بڑی عمارت جس کی مرمت کا کام

شروع ہوا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے یا اتر رہا ہے۔

میں نے گھبرا کر اپنا بیگ وہیں چھوڑا اور باہر سڑک پر کھڑا گہری گہری سانس لینے لگا۔ باہر شام کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ ابھی مجھے چھ گھنٹے اور بھی گزارنے تھے۔ میں سوچتا رہا کہ کس مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ کہیں بھی جاب پر جاتا ہوں تو کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے۔ معلوم نہیں آج کیا ہونے والا تھا۔

سامنے چرچ پر دھند بڑھ چکی تھی۔ کبھی کبھار پانی کی بوندیں ذرا سا برستیں اور پھر ختم جاتیں۔ دھند کی وجہ سے چرچ کی صلیب کا صرف کراس نظر آرہا تھا۔ میں اس کے سامنے رکھے ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ آتی جاتی ٹراموں، گاڑیوں اور پیدل چلتے لوگوں کو دیکھنے لگا جو تیزی سے کہیں بھاگے جارہے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ اس عمارت کے قریب پہنچتے ہیں تو اپنی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ گاڑیاں اپنی اسپیڈ زیادہ کر کے اس مقام سے جلد نکلنا چاہتی ہیں۔ یہ میرے توہمات تھے جو اب مجھ پر حاوی تھے۔ میں سامنے اس عمارت کو دیکھتا تو مجھے ڈریکولا کا محل دکھائی دیتا۔ مجھے اندر جانے کے لیے ایک ہمت چاہیے تھی جو مجھ میں اب نہیں رہی تھی۔ مجھے اندر تو جانا ہی تھا کیونکہ ہیڈ آفس سے کبھی کبھار فون بھی آجایا کرتا ہے۔ وہ لوگ چیک کرنے کے لیے فون کرتے رہتے ہیں کہ کہیں گارڈ بھاگ تو نہیں گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا خوف بے جا تھا۔ کوئی ایسی انہونی بات نہ تھی کہ میں دہشت زدہ ہو جاتا۔ اندر کے سکوت، تنہائی، تاریکی اور کھنڈر زدہ ماحول نے مجھے دہلا دیا تھا۔ میں نے اپنے اندر ہمت پھونکی، خود ہی اپنی بزدلی کو مصنوعی مسکراہٹ سے بھگانے کی سعی کی اور اردگرد پُراعتماد نظروں سے دیکھا اور سڑک پار کر کے اس اندھیری قبر میں اتر گیا۔

اندر داخل ہوا تو پھر سے پہلے کی طرح باہر کا شور باہر رہ گیا اور میں کسی ٹائم مشین سے ڈریکولا کے ویران محل میں جا کھڑا ہوا تھا۔ میں بزدل نہ تھا، جنوں، بھوتوں، روحوں سے مجھے کبھی اتنا ڈر نہ لگا تھا کہ میں چھپتا پھرتا۔ اس موقع پر مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔

میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے پرائمری اسکول کا نام کھگل فقیر اسکول تھا۔ ایک جانب چار کمرے تھے اور بیچ میں سیڑھی جو چھت پر جاتی تھی۔ پرانے اور بوسیدہ کمرے جن میں سانپوں کے بل تھے۔ کمروں کے سامنے بہت بڑا کچا صحن تھا اور اس کی تین اطراف میں چھپر ڈالے ہوئے تھے۔ یہ سب چھپر ہمارے کلاس روم تھے۔ کمروں کی مخالف سمت میں، صحن کے پار ایک بیری کا درخت تھا۔ اس درخت کے ساتھ اسکول کی بیرونی دیوار تھی اور دیوار کے پار لڑکیوں کا مڈل اسکول تھا۔

میرے سمیت پانچ چھ بچے اپنے محترم ٹیچر، استاد رزاق سے شام سے پہلے ٹیوشن پڑھا کرتے تھے۔ ہم سب اسی اسکول میں اکٹھے ہوتے۔ بند کمروں سے ٹاٹ نکالنے جاتے تو کچی زمین پر سانپ رینگ رہے ہوتے اور ان کے رینگنے کے نشان لکیروں کی صورت پورے کمرے میں جا بجا پھیلے ہوتے۔ ہمیں دیکھ کر سانپ دوبارہ اپنے بلوں میں گھس جاتے تھے۔ ہم ٹاٹ اٹھا کر صحن میں بچھاتے اور تختی پر استاد محترم املا اور حساب کے سوال حل کرواتے تھے۔ میں سب سے چھوٹا تھا تو مجھے دس منٹ کا وقفہ دیتے اور میں اس وقفے میں اپنے منہ سے موٹر کی غوں غوں کی آواز نکالتا صحن میں بھاگا پھرتا اور اپنے ہاتھوں کو ایسے رکھتا کہ جیسے گاڑی کا اسٹیئرنگ وہیل پکڑا ہے۔

ایک دن میں اسی طرح وقفے کے دوران اپنے آپ کو موٹر گاڑی بنائے بھاگا پھر رہا تھا۔ کبھی ریورس لگا لیا اور کبھی بھاگتے ہوئے موڑ کاٹ لیا۔ اسی رفتار سے یہ گاڑی چلاتا میں اسی بیر کے درخت تلے آ کھڑا ہوا۔ وہاں سے ہمارے اسکول کا صحن نظر نہ آتا تھا۔ میں نے گاڑی کو بند نہ کیا اور ''انجن'' اسٹارٹ رکھا۔ لڑکیوں کے اسکول کے نئے کمرے تعمیر ہو رہے تھے اور بیچ کی کچی دیوار گرادی گئی تھی تاکہ وہاں پکی اینٹوں کی نئی دیوار تعمیر کی جاسکے۔ اب میرے سامنے لڑکیوں کے اسکول کا ایک کمرا تھا بلکہ کمرے کی کھڑکی تھی جس پر جالی لگی تھی۔ شام کی سیاہی ابھی نہیں اتری تھی مگر دھوپ پھیکی پڑتی جارہی تھی۔ سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اتنے میں میری چلتی ''موٹر'' کے سامنے جالی کے پار ایک بچی میری طرح موٹر چلاتی آگئی۔ نیلی فراک اور سفید شلوار۔ مجھے اس کے چہرے کے نقوش ابھی تک یاد ہیں۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ نہ آیا کہ شام کے وقت، ویران زیر تعمیر اسکول کے ایک کمرے میں کوئی لڑکی کیسے آسکتی ہے۔ اس بچی نے بھی میری طرح اپنے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ بنایا ہوا تھا۔ وہ موٹر کی آواز نکالتی اور ہاتھوں سے اسٹیئرنگ سے موڑ کاٹتی تو میں زیادہ رفتار سے اپنی ''گاڑی'' چلاتا اور ہاتھوں کے اسٹیئرنگ کو کسی ماہر ڈرائیور کی طرح گھماتا۔ ہمارا مقابلہ شروع ہوا۔ یہ مقابلہ کبھی ختم نہ ہوتا اگر مجھے دور کھڑا اللہ دوسایا چیخ چیخ کر نہ بلاتا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''جلدی آؤ استاد صاحب بلا رہے ہیں۔'' اس کا رنگ

اڑا ہوا تھا۔

میں نے اپنی موٹر کو ریورس گیئر پر ڈالا۔ لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور وہیں تحلیل ہو گئی۔ میں نے کوئی نوٹس نہ لیا کہ وہ گئی نہیں بلکہ غائب ہو گئی ہے۔ میں اسی طرح گاڑی دوڑاتا جب صحن میں پہنچا تو دیکھا کہ استاد رزاق صاحب سمیت تمام بچے ٹاٹ لپیٹے، کاپیاں اور تختیاں بغلوں میں دبائے کھڑے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ میں نے اپنی گاڑی ان کے قریب لے جا کر بریک لگائی۔ استاد رزاق صاحب نے کہا۔ "اپنا بستہ اٹھاؤ اور یہاں سے جلد از جلد بھاگو۔"

میں نے اپنی تختی اور کاپی اٹھائی تھی مگر متحیر تھا کہ ماجرا کیا ہے جو آج جلدی چھٹی ہو گئی۔ اللہ وسایا سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "بیر کے درخت پر دیکھو کیا ہے؟"

میں نے وہاں دیکھا تو نیلی قمیص میں ایک شخص آسمان کی جانب منہ کیے، درخت کی چوٹی پر بیٹھا خلاؤں میں کچھ تکے جا رہا ہے۔

استاد رزاق صاحب نے کہا۔ "یہ جن ہے۔" اور پھر مجھے کہا۔ "جس لڑکی سے تم کھیل رہے تھے وہ بھی جنات تھی۔" میں جن کو دوبارہ غور سے دیکھنا چاہتا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور وہ جن ابھی تک اسی حالت میں خاموشی کے ساتھ خلاؤں میں سوچ رہا تھا یا کچھ دیکھ رہا تھا۔

استاد صاحب نے جب دوڑ لگائی تو مجھے بھی دوڑ لگانی پڑی۔

اس کے بعد شام سے پہلے میں کئی بار اسکول کے پھاٹک سے اکیلا اندر کودتا۔ بیری کے درخت تلے، آس پاس، درخت کے اوپر جن تلاش کرتا۔ ایک بار جن نہ ملا تو میں درخت کے اوپر چڑھ گیا۔ وہاں بھی نہ تھا۔ پھر میں اکثر عیدگاہ کے ساتھ ویرانوں میں گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں جن تلاش کیا کرتا تھا۔ کھجوروں کے درختوں پر ٹالی اور بوہڑ کے درختوں پر مگر پھر دیدار یار نصیب نہ ہوا۔ بس ایک دو بار جھلک دیکھی اور وہ بھی سرسری سی مگر اس دیدار کی پیاس نہ بجھی۔

ہماری پڑوس کی لڑکی پر جن آتا تو وہ بے ہوش ہو جاتی۔ وہ مردانہ آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیتی۔ مجھے خبر ملتی کہ شیدی پر جن آیا ہوا ہے تو میں خوشی سے پھولے نہ سماتا اور کہیں بھی ہوتا دوڑتا ہوا وہیں پہنچ جاتا۔ جن کو سلام کرتا، ہاتھ ملاتا۔ وہ جن صاحب اکثر کہتے کہ اتنی دیر کیوں کر دی۔ میں معذرت کرتا۔ وہ ہنس پڑتے۔ میں کہتا۔ "اپنا چہرہ تو دکھاؤ تو وہ ٹال جاتے۔ دو دو گھنٹے باتیں ہوتیں۔ میں ہونے والے پرچوں کے سوالات پوچھتا تو ہنسنے لگتے۔ پھر لڑکی کے ماں باپ ایک سید صاحب کو پکڑ لائے۔ انہوں نے جن سے میرے سامنے جھگڑا کیا کہ لڑکی کی جان چھوڑ دے۔ وہ بضد تھا۔ مار لڑکی کو پڑ رہی تھی مگر مرد کی آواز میں جن چیخ رہا تھا۔ آخر کار وہ مانا کہ اگلی جمعرات کے بعد نہیں آئے گا۔ مجھے یقین تھا کہ جمعرات کو تو ضرور آئے گا۔ میں نے بیماری کا بہانہ بنا کر جمعرات کو چھٹی کی۔ وہ شام سے پہلے آیا۔ ہم نے خوب باتیں کیں اور جانے سے پہلے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور کہا اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ گیا تو شیدی نے اٹھ کر کلمہ پڑھا اور ماں نے بیٹی کو پانی پلایا۔ وہ پھر نہ آیا۔ میں اکثر شیدی کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ وہ کپڑے دھو رہی ہوتی یا جھاڑو دے رہی ہوتی یا برتن مانجھ رہی ہوتی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ رہتا کہ شاید وہ ملنے آ جائے۔ وہ نہ آیا اور پھر شیدی کی شادی ایک ریڑھے والے سے جب ہوئی تو میری یہ اُمید بھی ہمیشہ کے لیے دم توڑ گئی۔ مجھے اس کا دولہا بہت خوش قسمت لگا اور اس کی قسمت پر رشک آنے لگا تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اس جن سے ملے گا۔

لیکن آج میں اس عمارت کی ویرانگی سے ڈر رہا تھا۔ جنات سے کم مگر انہونی آوازوں سے ڈرتا تھا۔ میں کھسکتا کھسکتا اس کمرے میں آ بیٹھا جہاں لیمپ روشن تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر ڈائری لکھنے لگا۔ خوف مدھم پڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں ماحول کا عادی ہوا تو بے خوف ہو گیا۔ سرجی اپارٹمنٹ میں ہوتے تو ان سے بات کر لیتا۔ شہباز کا سیا پاس لیتا مگر دونوں جاب پر تھے مگر اب میں ذرا بے خوف ہو کر بیٹھا تھا۔ سناٹا اپنی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ اچانک میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ دبی دبی چیخ میرے حلق سے نکلی۔ وہ کسی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز تھی۔ کچھ دیر وہ آواز آتی رہی اور جب وہ ختم ہوئی تو پھر اس کی بازگشت مسلسل آتی رہی۔ میں کرسی پر بیٹھا کسی خوف میں گھرا بیٹھا تھا۔ اگر چیخنا بھی چاہتا تو حلق سے آواز نہ نکلتی۔ میں نے صاف طور پر اپنے کانوں سے اپنے اردگرد وہ آواز سنی تھی۔ پھر مہیب خاموشی چھا گئی۔ ایک بھیانک سناٹا عود آیا۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ اپنے اندر پہلے سے موجود خوف کا عکس جانا۔ ابھی دل کو دلاسے دے ہی رہا تھا کہ پھر سے کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ اب کی بار میں کرسی سے اٹھ کر باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے تھا۔ میں ہانپتا کانپتا بیرونی دروازے کے قریب پہنچا۔ وہاں ادھڑے فرش پر گیلے قدموں کے نشانات تھے۔ باہر کا دروازہ تو کھلا رہتا تھا اور پچھلی دیوار

میں بھی خلا موجود تھا۔ میں نے کچھ لمحے سوچا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی یہاں سے پچھلی سڑک پر جانے کے لیے شارٹ کٹ مار گیا ہے۔ ایک لمبے چکر سے بچنے کے لیے یہ آسان تھا کہ یہاں سے پیچھے جایا جائے۔ ایک نہیں بلکہ شائد بہت سے لوگ یہی کرتے ہوں گے۔ انہیں یہ معلوم تھا سیکیورٹی موجود ہے، اسی لیے بھاگ کر نکلے ہوں گے۔ میں نے اسی نقطے پر جب سوچا تو اندر سے مطمئن ہو گیا۔

میں واپس اپنی میز پر آیا اور کمپنی کے کنٹرول روم کو فون ملایا۔ اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ جتنا وہ سمجھ سکا، اس کے حساب سے یہ صرف کراسنگ تھی۔ مجھے کہا کہ لاگ بک پر سب درج کر لو اور دس بجے جو گارڈ آئے اسے بھی خود بتا دینا۔

جب میرا خوف ختم ہو چکا تو میں نے سوچا ذرا اوپر جا کر اس عمارت کا جائزہ تو لیا جائے۔ گول، چوڑی سیڑھیاں جن کا پلستر اکھاڑا جا چکا تھا۔ ان کو آہستگی سے پھلانگتا ہوا میں پہلی منزل پر آیا۔ وہاں بھی ایک بلب ناکافی روشنی پھیلا رہا تھا۔ اونچی چھتیں اور چوڑی بالکونیاں تھیں۔ چھتوں کو لکڑی کے شہتیروں نے سنبھال رکھا تھا۔ کمروں کے دروازے نکلے ہوئے تھے اور فرش پر ملبا پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ کام کچھ دن پہلے ہی شروع ہوا ہے۔ کمرے بڑے اور چوڑے تھے۔ سالوں پہلے یہ عمارت کسی شپنگ کمپنی کا دفتر رہی تھی۔ وہ کمپنی افریقا سے غلاموں کو بحری جہازوں میں بھر کر لاتی تھی۔ آج غلاموں کے ساتھ یہ کمپنی ناپید ہو چکی ہے۔ اسی طرح میں دوسرے اور تیسرے فلور پر گیا۔ ہو کا عالم تھا۔ پوری عمارت سائیں سائیں کر رہی تھی۔ میں اب بے خوف ہو کر اس کے کونے کھدرے دیکھ رہا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ سو سال پہلے یہاں کس طرح سے تعمیرات ہوتی ہوں گی۔

دس بجے دوسرا گارڈ آیا۔ میں نے نظام اس کے سپرد کیا اور اپنے آپ کو باہر کی ٹھنڈ سے بچانے کے لیے مکمل طور پر لپیٹا۔ ایک گھنٹے بعد میں اپارٹمنٹ میں شاور لے کر سب کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

شہباز کا موڈ سخت خراب تھا۔ سرجی تو لائبریری میں جاب کرنے گئے تھے اور شہباز کسی فوڈ فیکٹری میں سیکیورٹی گارڈ کی جاب کر کے ابھی آیا تھا۔ مفتی ہم سب میں اچھی جاب پر تھا مگر خاصا غیر مطمئن لگتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”اس بار میری تنخواہ سب سے کم بڑھی ہے۔ مجھ سے زیادہ منظر وائیں کو ملا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے بچے ساتھ ہیں۔ اس کی ضرورتیں تم سے زیادہ ہوں گی۔“

کہنے لگا۔ ”کمپنی والوں کو معلوم ہے کہ اس کے بچے ساتھ ہیں؟ اور وہ کیا بچوں کی تعداد دیکھ کر تنخواہ بڑھاتے ہیں۔“ اسی وقت سرجی داخل ہوئے۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے سرجی کو دیکھا پھر جواب میں کہا۔ ”اللہ کو تو سب پتا ہے۔ وہ تو ہماری ضرورتوں کے مطابق ہمیں دیتا ہے۔ تم بھی بچے لے آؤ تو دیکھو کس طرح تمہاری آمدن بڑھتی ہے۔“

یہ سن کر نوالہ اس کے منہ کے پاس رک گیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ کچھ کہنے لگا تھا مگر رک گیا اور تائیدی انداز سے سر ہلانے لگا۔

شہباز کی خفگی کی وجہ فوڈ فیکٹری میں وہ بدبو تھی جو ان مچھلیوں سے اس کے نتھنوں تک پہنچی تھی پھر وہاں سے دماغ میں گھس بیٹھی تھی، جنہیں ٹن ڈبوں میں پیک کیا جا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ وہاں وہ کئی بار قے کر چکا ہے۔ وہ برا سا منہ بنائے ہمیں اپنی درد بھری داستان سنا رہا تھا۔

”یہاں سیاپا ہی سیاپا ہے۔ ہم تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ یہاں فضا میں ہر جانب خوشبو بکھری ہوتی ہے۔ معطر آب و ہوا ہوتی ہے مگر یہاں......“

سرجی ایک ثقیل گالی سن کر ذرا تازہ دم ہوئے تو بولے۔ ”ہم بھی تو بدبو سے دوچار ہیں مگر ہمارے منہ سے کوئی شکایت سنی ہے؟“

شہباز تنک کر بولا۔ ”تم نے آج لائبریری کے کیا واش روم صاف کیے ہیں؟“

کہنے لگے۔ ”میں اس بدبو کی بات کر رہا ہوں جو تم اپنے ساتھ فیکٹری سے لا کر یہاں پھیلا رہے ہو اور ہم بھی تو جبر کیے بیٹھے ہیں۔“

شہباز نے سنا تو غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ کہتے تھے کہ یہ بہت معصوم شخص ہے۔ اس کی باتیں سن رہے ہیں؟“

سرجی بولے۔ ”کیا معصوم بندے کی ناک بند ہوتی ہے؟“

مجھے معلوم تھا کہ شہباز سے کوئی بو نہیں آ رہی تھی۔ سرجی بات کو مناظرے کی جانب لا رہے تھے۔ میں نے اتنے دنوں میں جان لیا تھا کہ سرجی اپنا مذاق بھی بنواتے تھے اور دوسروں کے ساتھ بھی چہلیں کر لیا کرتے تھے۔ میں اور مفتی ان باتوں پر ہنستے رہے اور سرجی اتنی دیر میں دودھ گرم کر کے اس میں جلیبیاں ڈال چکے تھے۔

فروری کا مہینا شروع ہو چکا تھا۔ برف، ٹھنڈ اور ڈھکے آسمان نے اب دماغ کو قید کر کے رکھ دیا تھا۔ لگتا تھا کہ میں سالوں سے کسی فریزر میں پڑا ہوا منجمد ہو چکا ہوں۔ کھلے آسمان کو دیکھنے میں کہیں بھی جاتا تو ایک ہی ٹھٹھرا ہوا منظر سامنے ہوتا۔ زمین، آسمان اور اس کے درمیان ہر چیز کی ساخت ایک ہی جیسی تھی۔ فرق یہ تھا کہ کبھی برف اور کبھی بیچ میں ٹھہرے بادل، زندگی جیسے رک سی گئی تھی۔ میں متحرک تو تھا مگر ایسا محسوس ہوتا کہ ایک ہی دائرے میں چل رہا ہوں۔ کوئی سرا نہیں مل رہا تھا کہ جسے پکڑ کر کسی اور جانب چل کر کھلے موسموں کو دیکھوں۔ میں اس موسم کا عادی نہ تھا اور ان موسموں کو میری ذرا برابر بھی پروا نہ تھی۔

آج میں کین سینٹر اس خوشی سے گیا کہ اس کے بعد سہ پہر مجھے ہولڈنگ سینٹر جاب پر نہ جانا تھا بلکہ اسکاربرو میں کسی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک سیکورٹی کی جاب پر پہنچنا تھا۔ گھر سے وہاں تک کا ٹائم ناپا تو ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ میں نے شام ساڑھے آٹھ بجے ٹرین کی بجائے گلائی کے سامنے بس پر وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تین بجے سے آٹھ بجے شام تک میں اپارٹمنٹ میں آرام کر سکتا تھا جس کی مجھے اشد ضرورت تھی۔

کین سینٹر میں یہ چرچا تھا کہ ندیم کو انٹرویو کی کال آئی ہے یا نہیں۔ کوئی بھی ٹکراتا تو یہ سوال ضرور داغتا۔ البتہ کلاس میں کہنے لگی۔ ”جب بھی ندیم کو انٹرویو کی کال آئی تو ہم سب مل کر اس کی تیاری کروائیں گے۔“

میں اب اسی حوالے سے کلاس کے اندر سب کی نظروں میں آ چکا تھا۔ شہباز مجھے ندیم انٹرویو والا کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ سرجی دبے دبے الفاظ میں ندیم، نسرین والا کہہ گئے تھے۔ میں نے سختی سے گھورا تو پھر دوبارہ یہی کہہ دیا۔

سرجی اور شہباز میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ سرجی پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس کے کان میں کوئی منتر پھونکتے تو جواب میں وہ پہلے زرد پڑتا اور پھر فوری طور پر سرخ ہو جاتا اور پھر بری طرح سے شرماتا۔ اس کے بعد جھک کر سرجی کے کان میں کوئی پیغام ڈالتا جو وہ مایا کو پہنچانے کی بجائے مجھے بتا دیتے اور شہباز سے کہتے کہ مراسلہ پہنچا دیا ہے۔

میں کہتا کہ مایا کو کیوں نہیں بتاتے تو کہتے اس بے چاری کو تو کچھ معلوم ہی نہیں۔

نسرین کو ساری واردات کا علم تھا اور وہ بھی اس کہانی میں مجھ سے بڑھ کر دلچسپی لیتی تھی۔ میں اسے کہتا کہ یہ پاکستانیوں کی ثقافت کا مسئلہ ہے تم مت پڑو تو کہتی یہ مسئلہ ایران کا بھی ہے۔

آج شہباز مایا کے ساتھ جڑا بیٹھا تھا اور اس نے اپنے بیگ کو سختی سے تھام رکھا تھا کہ کہیں اس کے برگر پر ڈاکا نہ پڑ جائے۔ وہ اپنے برگر کی حفاظت میں پریشان بیٹھی تھی اور ڈری ڈری نظروں سے شہباز کو دیکھ رہی تھی۔ شہباز اسے ادائے پیار سمجھ کر اپنی چاہت کے تیر پھینک رہا تھا۔ نہ مایا شہباز کو سمجھ رہی تھی اور نہ شہباز مایا کو۔ میں اور نسرین دور بیٹھے ہنس رہے تھے کیونکہ ہم ان دونوں کے جذبات اور خیالات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ شہباز پوری طرح قائل ہو چکا تھا کہ مایا کی زندگی اس کے بنا اس پیڑ کی طرح ہے جو نہ پھل دیتا ہے اور نہ سایہ۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس پر کون سا پھل لگانا چاہتا ہے۔ میں نے سرجی سے یہ پوچھا تو کہنے لگے کہ شاید آلوچے ہی لگ جائیں۔

میں نے شہباز سے بڑے احترام سے پوچھا کہ تم کو مایا میں یا مایا کو تم میں آخر نظر کیا آتا ہے تو کہنے لگا کہ کبھی اس کو آنکھوں میں غور سے دیکھا ہے؟

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

کہنے لگا۔ ”ایک بجلی سی بھری ہے جو مجھے خاکستر کر رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اس سے اپنی آنکھیں ٹھیک سے کھلتی نہیں تو یہ بجلی کہاں سے تم نے کودتے دیکھ لی؟“

اس بات کا وہ برا مانا گیا اور پورا دن گھومتا رہا۔

اپارٹمنٹ پہنچے تو سرجی نے اعلان کر دیا۔ ”آج وہ ایسی چیز کھانے میں بنا رہے ہیں کہ آپ لوگوں نے کبھی نہ کھائی ہو گی۔“

شہباز نے بار بار اصرار کیا کہ کیا بنا رہے ہیں تو بتانے سے انکار کر دیا اور شہباز سے بولے۔ ”جس طرح میں مایا کا تم سے عشق کا قصہ کسی کو نہیں بتایا، اسی طرح اس ڈش کا بھی نہیں بتاؤں گا۔“

شہباز جھنجھلا اٹھا۔ ”تو بھی نرا سیاپا ہے۔ ایک مختلف بات کو دوسری سے کہاں جا کر جوڑتا ہے؟“

میں ماتھے پر ہاتھ رکھے ہنس رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ دونوں ان حالات میں میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ سرجی نے ماحول کو رنگ دار بنا رکھا تھا۔ شہباز کی ان سے بحث بھی ہوتی رہتی تھی مگر ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہ سکتے تھے۔ سرجی کو دیکھ کر مجھے بار بار تا لگا

پربت والے شاہ جی یاد آجاتے۔ دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ بے ضرر، خیال رکھنے والے اور کھرے۔ میں یہ اعلان کر کے کمرے میں سونے چلا گیا کہ مجھے آج رات جاب پر جانا ہے اور کئی دنوں کی تھکاوٹ بھی ہے۔ ''میں سونے جا رہا ہوں اور مہربانی کر کے کوئی کمرے میں نہ آئے۔''

میں تین گھنٹے گہری نیند لے کر اٹھا تو تازہ دم تھا۔ میرا ذہنی دباؤ اور جسمانی تھکاوٹ بہت حد تک زائل ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک گرم بھاپ اڑاتے پانیوں سے شاور لیتا رہا تو ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ بھوک لگی تھی اور ذہن میں یہ تھا کہ سرجی نے آج کوئی خاص چیز بنائی ہو گی جس کا ذکر وہ کر رہے تھے۔ میں نے ڈوروال سے باہر دیکھا تو برف باری تیزی سے ہو رہی تھی۔ ہوائیں برف کو لیے اڑتی پھر رہی تھیں۔ ہواؤں کی تیز سیٹیاں مجھے اندر بیٹھے سنائی دیتی تھیں۔ میرے لیے اس موسم میں پہلے گلاٹی اور پھر وہاں سے بس پر ایک گھنٹا سفر کر کے جاب پر جانا تھا جو کسی ایک عذاب سے کم نہ تھا مگر جانا ضروری تھا اور فرار ممکن نہ تھا۔

میں نے یونیفارم پہنی۔ اس پر ایک جرسی اور پھر وہ لمبا اونی کوٹ جو میں نے لاہور کے لنڈے بازار سے خریدا تھا، اسے پہنا، پہن کر جھجکا کہ معلوم نہیں اس میں کیسا لگ رہا ہوں گا مگر اب مجھے اس شدید موسم میں اچھے اور عجیب لگنے کی پرواہ نہ تھی۔ مجھے تو اس سردی اور برف سے اپنا بچاؤ کرنا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی اور مفلر بھی لے لیا۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ اپارٹمنٹ بلڈنگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے؟

تیار ہو کر لیونگ روم میں آیا تو شہباز اپنا موڈ انتہائی حد تک خراب رکھے کارپٹ پر پڑا ہنکار رہا تھا۔ سرجی مفتی کے میٹرس سے ٹیک لگائے اداس بیٹھے چھت کو تک رہے تھے۔ جب سے مفتی پاکستان سے آیا تھا وہ اس کے میٹرس پر چڑھنے کی ہمت بھی نہ کرتے تھے۔ میں نے ان دونوں سے بیزارگی کی وجہ نہ پوچھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پھر کوئی بحث ہوئی ہو گی۔

سرجی سے پوچھا۔ ''وہ نایاب کھانا تیار ہے؟''

سرجی خاموش رہے اور شہباز نے مجھے دیکھ کر غصے سے منہ پھیر لیا۔ میں نے جب کچن میں جا کر دیگچی کا ڈھکن اٹھایا تو سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بنا ہوا کیا ہے؟

سرجی سے پوچھا تو وہ خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ شہباز سے پوچھا تو وہ غصے بھرے انداز میں کہنے لگا۔ ''میں تو سمجھا تھا کہ آج معلوم نہیں کیا توپ چیز بنا رہے ہیں۔''

انہوں نے تو بینگن بنا کر اس میں انڈے ڈالے ہوئے ہیں۔'' معلوم ہوا کہ شہباز کا موڈ اسی لیے خراب ہے کیونکہ آج مایا کے بیگ پر بھی اس کا ہاتھ نہ پڑ سکا تھا اور بھوک سے بھی بلبلا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''سرجی! یہ ڈش آپ نے کہاں سے سنی یا سیکھی۔''

کہنے لگے۔ ''ایسی چیزیں ہوٹلوں میں کہاں ملتی ہیں۔ یہ تو خاص خاص موقعوں پر ہی بنائی جاتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ خاص خاص موقع کون سا ہوتا ہے۔''

وہ شرما کر کہنے لگے۔ ''آپ کی بھابی شادی کی سالگرہ پر بناتی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''چلو یہ ہی بتا دیں کہ اس کو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے یا چمچ سے؟''

جواب میں کہنے لگے۔ ''نہیں! چاولوں پر ڈال کر۔''

میں نے کہا۔ ''تو چاول کب بنائیں گے؟''

تو جواب یہ دیا۔ ''انشاء اللہ کل بناؤں گا۔''

اسی دوران میرا سر خاصا گرم ہو چکا تھا۔ میں نے سر سے اونی ٹوپی اتاری اور اپنے آپ کو مشتعل ہونے سے بچانے کے لیے جتن کرنے لگا۔ اس ملغوبے کو پلیٹ میں ڈالا۔ تادیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر چمچ سے اسے کھانے لگا۔ معلوم نہ پڑتا تھا کہ انڈے ہیں یا بینگن۔ سرجی اور شہباز مجھے کھاتے ہوئے غور سے دیکھتے رہے۔ میں نے وہ نامعلوم ڈش کھا کر سرجی کو دیکھا تو انہوں نے سر جھکا لیا۔ میری ہنسی نکل گئی اور ساتھ ہی میں اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

آج برف باری اپنے ہی ریکارڈ توڑے دے رہی تھی۔ گو یہ تھم چکی تھی مگر اپنے نشانات ہر جانب برف کے ڈھیروں کی صورت بکھیر چکی تھی۔ یخ ہوا چل رہی تھی جس سے میں کسی خزاں رسیدہ ٹہنی کی مانند لرزنے لگتا۔ میں اس وقت سڑک کے پار شیشے کے کیبن میں کھڑا اس بس کا انتظار کر رہا تھا جو مجھے گلاٹی اسٹاپ پر لے جاتی۔ وہاں سے مشرقی سمت کو جاتی بس ایک گھنٹے کی مسافت کر کے مجھے اپنی جاب کے اس پاس اتارتی۔

سڑکیں ویران تھیں۔ اکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ سب مکین کسی انجانے خوف سے ڈر سے چھپے بیٹھے ہوں۔ اسٹاپ پر میں اپنا لمبا کوٹ پہنے اکیلا کھڑا تھا۔ اس کوٹ نے مجھے سردی سے بہت حد تک بچا رکھا تھا۔ میں اس میں

محفوظ تھا۔ میں بس سے گلائی پر اترا تو اگلی بس کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ بس ایک گھنٹے میں متعدد اسٹاپس پر رکی۔ ایک گھنٹا میں اپنے ممکنہ انٹرویو کی تیاری کے نوٹس پڑھتا رہا۔ مجھے آس پاس کا کوئی ہوش نہ تھا۔ بس رکتی اور کچھ تھکے اور لاغر چہرے سوار ہوتے اور کچھ تیزی سے اتر جاتے۔

ایک گھنٹے بعد مجھے ایک اسٹاپ پر اترنا پڑا کیونکہ یہاں سے وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ، جہاں میری جاب تھی، وہ قریب تھی۔

میں بس سے اترا تو چاروں جانب برفوں کے ڈھیر تھے۔ رات کی سیاہی اور بھیانک خاموشی نے ماحول کو پراسرار بنا دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آس پاس سر اٹھائے کئی اپارٹمنٹ بلڈنگز آپس میں سر جوڑے کسی راز و نیاز میں محو ہیں۔ میں نے اپنی بلڈنگ کا نمبر ایک بار پھر سے دیکھا اور ایک خالی سڑک کے بیچ چلنے لگا جس کے دونوں جانب برف کے سفید ڈھیر پڑے تھے۔

میں اس ماحول میں تنہا چل رہا تھا، خوف نہ تھا پر اداسی زیادہ تھی۔ پاکستان میں ذرا سی بھی سردی پڑی تو چکن کارن سوپ بن جاتا تھا۔ وہاں سردیوں کو ایک اہتمام اور قرینے سے مناتے تھے اور یہاں ان کو کھٹن سے کاٹتے ہیں۔ دسمبر کے مہینے میں یہاں کوئی آپ کو دیکھ کر سرد چادر پہنا دیتا ہے۔ اگلے چار مہینے یہ آپ کے وجود سے لپٹی رہتی ہے۔ آپ کے اندر کا موسم سرد ہو یا گرم مگر یہ آپ کے جسم کا حصہ بنی رہتی ہے۔ مجھے تو یہ آتے ہی پہنا دی گئی تھی اور آج میں اس کے بوجھ سے تھک چکا تھا۔ میں چلتا جا رہا تھا اور میری بلڈنگ شاید وہاں نہیں تھی۔ سامنے ایک چوک سا آیا۔ ارد گرد ذرا ہٹ کے پانچ بلند عمارتیں سر اٹھائے ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر تھیں مگر ایک دوسرے کی تنہائی کی ساتھی بنی کھڑی تھیں۔ میں اگر اندازے سے کسی ایک عمارت کا رخ کرتا اور اگر وہ میری مطلوبہ بلڈنگ نہ ہوتی تو دوسری تک جانے کے لیے مجھے دوبارہ دس منٹ چلنا پڑتا۔ اب یہ معرکہ میرے سامنے تھا جو مجھے ہی سرانجام دینا تھا۔

چوک کے بیچ میں مجھے ایک کیبن نظر آیا اور کچھ ہلچل بھی محسوس ہوئی۔ میں بے اختیار اسی جانب بڑھتا چلا گیا۔ وہ کسی سیکیورٹی کمپنی کا فیلڈ آفس تھا۔ آس پاس کی تمام عمارتوں کی نگہداشت اس کمپنی کے سپرد تھی۔ ان تمام بلڈنگز کو اپنا اپنا گارڈ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تین چار گارڈ کمپنی کی گاڑی میں بیٹھ کر ان کے ارد گرد پیٹرولنگ کر لیا کرتے تھے۔

میں نے اس کیبن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولنے والے نے میری یونیفارم کو دیکھا تو جان گیا کہ میں بھی انہی کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے اپنی بلڈنگ کا نمبر دکھایا تو وہ ان عمارتوں کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ”وہ تو ان سے ذرا پرے ہے۔“

اس نے ایک جانب اشارہ کیا تو دور سے کوئی بیس بائیس منزلہ عمارت خاموشی کی چادر اوڑھے تنہا کھڑی نظر آئی۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے وہاں تک اپنی گاڑی میں ڈراپ کر دیں گے مگر وہ چپ سادھے کھڑے رہے اور میں بوجھل قدم اٹھاتا چل پڑا۔ پندرہ منٹ انہی سرد ہواؤں اور تاریکی کے بیچ چل کر آخرکار میں وہاں پہنچا اور سکون کا سانس لیا کہ میں منزل تک پہنچ چکا تھا۔

شیشے کا دروازہ کھول کر گرم لابی میں ذرا سکون ہوا اور وہیں سے سپر کے اپارٹمنٹ کا نمبر دبایا۔ پینل پر کئی بٹن لگے تھے اور ہر بٹن پر اپارٹمنٹ کا نمبر درج تھا اور سپر کے اپارٹمنٹ کے نمبر پر سپر ہی لکھا تھا۔ جواب میں ایک کرخت آواز سنائی دی۔ وہ کچھ پوچھ رہا تھا جو میرے پلے نہیں پڑا۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے صرف ”سیکیورٹی گارڈ“ کہا۔

اس نے پھر سے چلا کر کچھ کہنا شروع کیا۔ میں نے اپنے الفاظ دہرائے۔ اس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے اور میں پہلے کی طرح کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اب کچھ مکالمے شروع ہوئے جن کو نہ وہ سمجھ رہا تھا اور نہ میں۔ میں صرف دو بول سمجھ سکا تھا۔ ”یہاں کسی گارڈ کی مجھے ضرورت نہیں، دفع ہو جاؤ۔“ میں نے اپنی بہت ہتک محسوس کی۔ سوچا اب کیا کروں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سناٹا زیادہ امڈ آیا تھا۔ سوچا واپس گھر چلا جاؤں مگر اس طرح واپس جانا بھی اپنی جاب کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔ سوچا اسی کیبن والوں کے پاس جا کر کنٹرول روم فون کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔

پھر وہی لمبا سرد اور ٹھٹھرتا ہوا راستہ تھا۔ سرد جھکڑوں اور اڑتی برف کے بیچ ایک کلومیٹر چل کر وہاں پہنچا۔ انہوں نے فون کرنے کی اجازت دے دی۔ فون پر سب ماجرہ سنایا جس میں صرف وہی دو جملے تھے جو میری سمجھ میں آئے تھے۔ جواب آیا کہ دوبارہ جاؤ اور اس سے کہو کہ وکین ہٹ سیکیورٹی کمپنی سے آیا ہوں۔ وہاں سے یہ بھی کہا گیا کہ یہ سپر اس وقت نشے میں ہوتا ہے۔

نشے میں ہونے کا سن کر یہ ڈھارس بندھی کہ میں غلط نہیں بول رہا تھا بلکہ وہی غلط سمجھ بھی رہا تھا اور بک بھی رہا تھا۔ پھر اسی راستے سے دوبارہ پہنچا۔ وہی مکالمے دوبارہ دہرائے

گئے۔ اس بار فرق صرف یہ تھا کہ اس کا لہجہ زیادہ کرخت ہو گیا تھا۔ ایسا کہ اگر آمنے سامنے ہوتے تو گتھم گتھا ہو چکے ہوتے یا وہ مار کھا رہا ہوتا یا میں پٹ چکا ہوتا۔

میں نے سرائیکی میں اسے ماں بہن کی گندی گندی گالیاں دیں۔ اس نے ان کا کوئی برا نہیں منایا اور اپنی بکتا رہا۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا اور اب میں یہ سوچ کر کیبن کی طرف گیا کہ فون کر کے کنٹرول روم والوں کو بتا دوں گا کہ میں تو اب گھر واپس جا رہا ہوں۔

دوبارہ وہاں پہنچا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی خاموشی سے فون میرے آگے سرکا دیا۔ میں نے نمبر ملایا۔ اپنا فیصلہ سنایا تو جواب یہ آیا کہ اگر گھر گئے تو جاب سے بھی گئے۔ میں نے فوری طور پر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی۔ انہوں نے کہا۔ ''واپس اس بلڈنگ پر جاؤ اور ابھی سپروائزر وہیں پہنچتا ہے۔''

تیسری بار وہاں پہنچا تو میں ٹھنڈ سے جم چکا تھا۔ اس ساری کارروائی میں ڈھائی گھنٹے صرف ہو چکے تھے۔ کچھ دیر میں سفید لشکارے مارتی ہوئی گاڑی آرکی۔ اس پر بڑے بڑے حروف میں ویکن ہٹ سیکیورٹی لکھا تھا۔ چھ فٹ سے زائد لمبا سپروائزر جس نے کسی پولیس افسر کی طرح کی وردی پہنی تھی اور سر کو ٹنڈ کیا ہوا تھا۔ اس نے سپر سے کوئی بات نہ کی۔ اپنی بیلٹ سے بندھا پلاسٹک کا ایک کارڈ نکالا اور اسے دروازے کی کسی چپ سے مس کیا تو ایک چر کی آواز سے دروازہ کھل گیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا جہاں ایک بنچ پڑا تھا۔ میرے حوالے وہ کارڈ کیا اور بولا۔ ''یہ بلڈنگ مکمل طور پر محفوظ ہے اور تم آرام سے یہاں سو جاؤ۔'' پھر معذرت کی کہ مجھے تکلیف اٹھانی پڑی۔ پھر جاتے جاتے اس نے سپر کو انگلش میں وہی گالیاں دیں جو میں اپنی زبان میں پہلے ہی دے چکا تھا اور کہا۔ ''یہ رات کو نشہ کر کے سوتا ہے۔ تمہاری پہلی شکایت نہیں ہے اور لوگ بھی شکایت کر چکے۔'' یہ کہہ کر وہ فراٹے بھرتا چلا گیا اور پیچھے وہی سناٹا تھا۔ سرد ہوائیں تھیں اور اردگرد کی تاریکی میں وہ بلڈنگ جگمگا رہی تھی۔

کمرے کے اندر میں نے اپنا کوٹ اتارا کیونکہ یہاں گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ کوٹ کا تکیہ بنایا۔ شولڈر بیگ کو فرش پر رکھا اور چند لمحوں بعد گہری نیند میں پہنچ گیا۔

معلوم نہیں کیا وقت ہوا تھا کہ لابی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ باہر آ کر دیکھا کہ ایک صاحب آج کے اخبارات کے بنڈل اٹھائے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ اس کی وین باہر کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ اخبارات لابی میں چھوڑ جاؤ گے۔''

''نہیں، ایک ایک کر کے ہر اپارٹمنٹ کے دروازے کے آگے رکھوں گا۔''

''یہاں کے علاوہ بھی کہیں اور بانٹو گے؟''

''ہاں! ان تمام بلڈنگز میں جا کر بانٹوں گا۔''

پھر اس سے اس کام کی تفصیل معلوم کی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ وہ رات دو بجے سے صبح سات بجے تک اپنا یہ کام ختم کر لیتا تھا۔ اس کام سے اسے اچھی آمدن ہو جاتی تھی مگر بارش ہو یا طوفان، اسے یہ کام پورے ہفتے رات دو سے صبح سات بجے تک کرنا ہوتا اور وہ پچھلے دو سال سے یہ کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اب میں تھک گیا ہوں مگر کیا کروں۔ اس کے علاوہ کوئی روزگار ہی نہیں ملا۔ وہ آدھے گھنٹے میں اخبار ڈال کر چلا گیا۔ وہ لاہور کا رہنے والا وسیم تھا اور پیشے کے حساب سے انجینئر تھا۔

میں صبح اپارٹمنٹ پہنچا تو مفتی اپنے میٹرس پر سویا ہوا تھا۔ سرجی اور شہباز آہستگی سے کین سینٹر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے کہ مفتی کی نیند خراب نہ ہو۔ میں بے حد تھک چکا تھا اور معذرت کی کہ آج مجھے نہیں جانا سرجی اور شہباز نے میری تائید کی۔ میں نے یونیفارم تبدیل کیا اور بستر میں گھس گیا۔

مجھے گہری نیند نے جکڑ لیا تھا۔ معلوم نہیں کتنی دیر اور سوتا رہتا کہ نیند کے عالم میں کسی کی زور زور سے بولنے کی آوازیں سنیں۔ پھر کوئی کمرے میں آیا اور میری رضائی کھینچ کر ایک جانب پھینک دی۔ وہ مفتی تھا۔ میں تو اسے وضع دار شخص سمجھتا تھا اور مجھے اس سے اس بے ہودگی کی توقع نہ تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ چلائے چلا جا تا تھا۔

''جلدی اٹھو! تمہارا ایموسال سے فون آیا ہے۔'' یہ الفاظ سن کر میرا دماغ بھی بیدار ہو گیا۔ فون کی ایک لائن کمرے میں بھی تھی۔ میں نے فون اٹھایا اور مفتی وہیں میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے ہیلو کہا اور دوسری جانب ایک عورت تھی۔ نہایت ہی خوشگوار لہجے میں بولی۔ ''کیا تم ندیم ہو؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہنے لگی۔ ''لگتا ہے تم سو رہے تھے۔ تمہیں بے آرام کیا، اس پر معذرت خواہ ہوں۔'' پھر بولیں۔ ''ہم آپ کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں آج جمعرات ہے۔ اگلے ہفتے کون سا دن اور ٹائم آپ کے لیے مناسب ہوگا۔''

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرر بار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہریار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

بہت جلد

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

میں نے کچھ سوچا اور کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر تو ایسے ہی کہہ دیا۔ "اگلی جمعرات کو یہی ٹائم مناسب ہوگا۔"

سامنے لگے وال کلاک پر دیکھا تو دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ آفس میں اسسٹنٹ منیجر مائیک شولز پہلے آپ کا انٹرویو کرے گا اور اگر اس نے آپ کو منتخب کر لیا تو سپروائزر آپ کا انٹرویو کریں گے اور پھر نیک تمناؤں کا اظہار کر دیا۔

مجھے یہ جاب چاہیے تھی۔ میں نے اللہ پر توکل کر کے بچوں کو اسپانسر کر دیا تھا۔ ان کا ویزے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ سمیہ کو کاغذات مل گئے تھے اور اب اس نے اپنے دستخط کرنے تھے اور کسی سے اپنے دستخط کی تصدیق کروانی تھی۔

پچھلے سال جولائی میں ہمارا میڈیکل ہو چکا تھا اور یہ میڈیکل ایک سال تک فعال رہتا ہے۔ ان کو جولائی سے پہلے ویزا ملنا ضروری تھا ورنہ پھر سے میڈیکل ہوتا اور بات مہینوں آگے جا سکتی تھی۔ ان کے آنے سے پہلے مجھے ایک باوقار اور اچھی جاب چاہیے تھی۔

میں نے توکل پر غور کیا تو کچھ راز کھلے۔ جب اپنے مختلف کاموں کے لیے انسانی ذات ان کاموں کی تکمیل پر قادر نہ ہو تو انسان اس ذات کا انتخاب کرتا ہے جو ان کاموں کو مکمل کرنے کی طاقت بھی رکھتی ہو اور اسے آپ سے ہمدردی بھی ہو۔ آپ پھر اس ذات کی طاقت پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے کام اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پھر انسان اس ذات کی قوت سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور اس کی طاقت اور صلاحیت سے فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ جب انسان کے راستے میں مشکلات اور پیچیدگیاں آئیں تو وہ اپنے خالق اور رب کائنات کو اپنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسا بھی کرے۔ خود بھی جدوجہد اور عمل کرتا رہے اگر جہاں انسان خود کسی کام کو سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتا بھی ہو تو تب بھی موثر حقیقی اپنے رب کو مانے کیونکہ وہی تمام قوتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ ہے توکل ایک قوت بخش احساس ہے جو ایک بھروسے کی بدولت آپ کو حاصل ہوتا ہے۔ بھروسا کیا ہے؟ آپ ایک ارادہ کرتے ہیں اور پھر جدوجہد شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی آپ کا عمل آپ کو رائیگاں جاتا نظر آتا ہے۔ کبھی کوئی انہونی بات آپ کے عمل کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیتی ہے اور بھروسا ڈگمگانے لگتا ہے اور یہیں پر حقیقی امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ انسان مایوسی میں توکل کھونے لگتا ہے مگر یہاں اپنا بھروسا مضبوط رکھیں تو بگڑتی نظر آتی چیزیں آپ کو درست جانب سفر کرتی نظر آتی ہیں۔

میرے دل نے اللہ کو اپنا وکیل بنا لیا تھا۔ میں ایک مشکل وقت سے گزر رہا تھا۔ اپنا سارا بوجھ اٹھا کر اپنے خالق کے حوالے کر دیا تھا اور خود مطمئن ہو گیا۔ جدوجہد جاری رکھی۔ جہاں کہیں مایوسی اتری تو یہی خیال کیا کہ وہی سب کچھ کر رہا ہے تو ٹھیک ہی کرے گا، مجھے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ایک کمزور انسان تھا۔ بہت بار مایوس ہوا نا امید ہوا مگر پھر جھٹ سے اللہ کا در پکڑ لیا۔

مجھے ابھی انٹرویو کی کال موصول ہوئی تو یہی جانا کہ ایک عمل شروع ہے جو میری کامیابی اور اطمینان کی جانب ہی بڑھے گا۔ میں ان دنوں حیران رہ گیا تھا کہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سب مل کر میری مدد کر رہے ہیں۔ پاکستان میں رہنے والے دعا کر رہے تھے اور کینیڈا میں جاننے والے ایک میکانکی انداز میں مجھ سے جڑ چکے تھے۔ آپ آگے دیکھیں گے کہ کس طرح سب نے مل کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور مجھے پکڑ کر اطمینان کی جانب رواں ہو گئے تھے۔

فون رکھنے کے بعد مفتی خوشی سے دمک رہا تھا۔ کہتا تھا۔ "دنیا میں تم واحد انسان ہو جس پر میں نے اعتبار کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم ہیمو سال میں جاب حاصل کر لو۔"

خوشی میرے چہرے پر زیادہ نہ تھی بلکہ وہ میرے اندر ایک پُروقار انداز میں بیٹھ کر میری خود اعتمادی میں بدل چکی تھی۔

میں تادیر گرم پانی کے نیچے شاور لیتا اپنی خود اعتمادی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ گو ابھی مجھے انٹرویو کی کال ہی آئی تھی مگر گمان غالب یہی تھا کہ یہ جاب مجھے ہی ملے گی گو یہ جاب بہت اونچے درجے کی نہ تھی مگر نئے آنے والے کے لیے یہ ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ اس تنخواہ میں کوئی بھی صبر و شکر کرنے والا آسانی سے یہاں کینیڈا میں اپنی فیملی کو با آسانی رکھ سکتا تھا۔

مجھے آج ہولڈنگ سینٹر جاب پر بھی جانا تھا۔ کل رات میں نے کڑی گزاری تھی اور دو تین گھنٹے کی نیند لی تھی مگر میرا کام جہد مسلسل تھا۔ سرجی اور شہباز کین سینٹر سے آئے۔ انہوں نے ایک گھنٹے بعد اپنی جاب پر نکلنا تھا۔ سرجی آتے ہی میرے کان میں کہنے لگے۔ "آپ کا نسرین بہت پوچھ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ میری طرف سے مزاج پوچھ لینا۔"

میں نے کہا۔ "ایسی باتوں میں نہیں آنے والا اور میں

شہباز بھی نہیں ہوں۔''
وہ قسمیں کھانے لگے۔ مفتی نے جب یہ بتایا کہ ندیم کو ہیوسال سے انٹرویو کی کال آئی ہے تو سر جی اور شہباز نے گلے لگ کر مبارک باد دی۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ سر جی پھر دوبارہ میرے کان کے قریب آئے اور بولے۔ ''اس خوشی کے موقع پر میں جھوٹ بول کر بدشگونی تو نہیں پھیلاؤں گا۔ وہ آپ کا بار بار پوچھ رہی تھی۔''
شہباز نے کل مفتی کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ میرے لیے اپنی فیکٹری سے ایک ماسک لے آئے کیونکہ اسے فوڈ فیکٹری میں پچھلی بار بدبو نے خاصا عاجز کیا تھا۔ اب ہم کھانا کھا کر اپنی وردیوں میں ملبوس پر تولے کھڑے تھے۔ شہباز نے ماسک لگا کر اپنے آپ کو شیشے میں دیکھا تو سر جی بولے۔ ''قسم سے مکمل نرس لگ رہے ہو۔''
شہباز نے اس پر اپنا کوئی بیان نہ دیا اور کھڑا شیشے میں اپنے آپ کو ہر زاویے سے دیکھنے لگا۔ سر جی اپنی وردی میں لاہور کا وہ ٹریفک وارڈن لگ رہے تھے جو پورا دن ڈیوٹی کر کے کہیں کونے میں کھڑا سستا رہا ہوتا ہے۔
آج ہولڈنگ سینٹر جاب پر آیا تو باجوہ ہیڈ گارڈ کی کرسی پر بیٹھا شاید میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔ ''کاکا اقبال! پہلے نیچے شاپ سے لاٹری کے دو ٹکٹ لے آؤ۔''
میں نے پوچھا۔ ''پچھلی بار کوئی انعام نکلا تھا کہ نہیں؟''
خوشی سے کہنے لگا۔ ''ساڑھے تین سو کی لاٹری نکلی تھی۔''
پھر میرا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے لیے لکی ثابت ہوئے ہو۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی اپنے لیے دو ڈالر کی ٹکٹ لے لو۔''
میں بولا۔ ''باجوہ صاحب! اگر میں نے خرید لی تو آپ کا انعام نہیں نکلے گا اور پھر میرا ہی نکلے گا۔''
یہ سن کر کچھ لمحے اس نے سوچا اور پھر بولا۔ ''مل کر لیتے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''ایسا نہ ہو کہ آپ کی نحوست اس میں شامل ہو جائے اور کوئی انعام ہی نہ نکلے۔'' اس بات پر وہ ذرا بھی خوش نہ ہوا اور اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولا۔ ''چلو میرے لیے تو لے آؤ اور یہ نحوست والی باتیں مت کیا کرو۔''
میں نے ہامی بھری اور پھر اس کی ٹکٹ لے آیا۔ اگلے دن اس نے ڈھائی سو کا انعام پھر سے جیت لیا تھا۔
باجوہ نے مجھے پھر راہداری کے آخر میں ایک آرام دہ کونے پر بٹھا دیا جہاں مکمل خاموشی تھی۔ میں اپنے انٹرویو کے لیے کیمسٹری کے وہ باب پڑھنے لگا جن کا تعلق ہیوسال کے کام سے تھا۔ میں اپنے آپ کو مکمل تیار کر کے انٹرویو پر جانا چاہتا تھا۔ اتنے میں گرنام سنگھ اپنی خفیہ پوسٹ سے نکلا اور میری جانب چلا آیا۔ قریب آ کر ایک اخبار مجھے تھما دیا۔ وہ اردو کا مقامی اخبار تھا۔ کہنے لگا۔ ''کل اپنی گروسری کے لیے گیا تو تمہارے لیے اخبار اٹھا لیا۔''
میں نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہر ہفتے وہ باقاعدگی سے میرے لیے اخبار لاتا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تم نے باجوہ پر کیا جادو کیا ہے کہ ہر وقت تمہارے گن ہی گاتا رہتا ہے۔''
میں نے لاٹری کے ٹکٹ کی کہانی سنائی تو ہنسنے لگا اور بولا۔ ''جب وہ ہارنا شروع ہوا تو تم سے بدک جائے گا اور ایسا نہ ہو کہ تنگ کرنے لگے۔''
میں نے جواب دیا۔ ''وہ جو نمبروں والا رجسٹر بغل میں دبائے پھرتا ہے، میں وہی چرا لوں گا اور پھر اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔''
ہنستے ہنستے گرنام نے وہی اخبار میز سے دوبارہ اٹھایا اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب کچھ نہ سمجھ سکا تو اسے میز پر پٹخ کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔
وہیں آخری کمرے میں ایک قیدی گرمیت سنگھ تھا۔ وہ چھ ماہ سے قید میں تھا۔ اس کے کیس کا فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ پڑھتا پڑھتا تھک گیا تو اس سے باتیں کرنے لگا۔ مجھے بھی ہر ایک سے اس کی کہانی سننے کا شوق تھا۔
وہ اپنے کمرے کے دروازے سے ٹیک لگائے، اداسی میں ڈوبا ہوا مجھے خالی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پوچھنے پر بتانے لگا۔ ''وہ نو سال پہلے کینیڈا آیا تھا۔ دو ماہ بعد بچوں کو بھی بلا لیا۔ ان دنوں کینیڈا سے امریکا داخل ہونا مشکل نہ تھا اور وہ بچوں سمیت امریکا جا بسا۔ چھ ماہ پہلے اکیلا کینیڈا کسی کام سے چند دن کے لیے آیا تھا۔ دماغ میں کیا سمائی کہ پیسے بنانے کے چکر میں ایک فیکٹری میں کام کرنے چلا گیا۔ رات کی شفٹ تھی کہ فیکٹری کو امیگریشن پولیس نے گھیرے میں لے لیا اور جو بھی غیر قانونی تھے انہیں پکڑ لیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی نرغے میں آ گیا۔ بیوی بچے اب بھی امریکا میں ہیں اور وہ چھ ماہ سے یہاں قید ہے۔''
کچھ توقف کیا اور اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''میں آج کل بہت زیادہ اسٹریس میں ہوں۔ کبھی دل کرتا ہے کہ خودکشی کر لوں۔''
دیکھنے والے کو یہاں بہت آزادی نظر آتی ہے اور واقعی

ہے بھی مگر آپ ہمیشہ نظروں میں رہتے ہیں۔ ایک نگرانی میں ہوتے ہیں۔ جب خدانخواستہ آپ کہیں جوابدہ ہوتے ہیں تو آپ کا ایک ایک ریکارڈ آپ کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے جس سے آپ انکاری بھی نہیں ہو سکتے اور شرمندہ کھڑے رہتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسے ہی ہمارا ریکارڈ جب روز محشر ہمارے سامنے رکھا جائے گا اور ہم انکاری بھی نہیں ہو سکیں گے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ اللہ اپنی معافی تو دے دے گا مگر جو ہم کسی دوسرے انسان کے ساتھ کر چکے ہوں گے اس کا تو انصاف ہو گا۔ کوئی رحم نہیں برتا جائے گا۔ میں یہ لکھ کر کسی کو نصیحت نہیں کر رہا بلکہ اپنے آپ سے سوال پوچھ رہا ہوں۔ پڑھنے والے اپنا دل میلا نہ کریں۔

میری اگلی پوسٹ پر ایک پاکستانی گارڈ بیٹھا تھا۔ نام کے آخر میں بٹ لگا تھا۔ اسی لیے اسے بٹ صاحب ہی کہوں گا۔ اللہ نے قسم قسم کے لوگ بنائے ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے جدا، عمر کوئی ساٹھ پینسٹھ کے بیچ تھی۔ گوری رنگت، سیاہ رنگے بال اور گٹھا ہوا جسم۔ جہاں وہ بیٹھے ہوتے ہر کوئی ان سے دور بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا اگر وہ خاموش رہیں تو بہت مہذب لگیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہر وقت اسکیچ بنانے کی ایک کاپی اور ایک دو پینسلیں رہتی تھیں۔ فارغ تو سب ہی بیٹھے رہتے تھے اور اسی فراغت میں کوئی کتاب پڑھتا تھا اور کوئی اخبارات، کوئی سوچتا رہتا تھا اور کوئی دماغ میں قلم چلائے بیٹھا ہوتا تھا مگر بٹ صاحب کاپی پر کوئی نہ کوئی اسکیچ بنا رہے ہوتے تھے۔ آپ ساتھ بیٹھ جائیں تو پہلے آپ کو اپنا تازہ اسکیچ دکھائے گا جو ہمیشہ عورت ذات کا ہوتا اور اعضا کہیں کے کہیں لگے نظر آتے تھے۔ لگتا تھا کہ اس اسکیچ پر کوئی خودکش دھماکا ہوا ہے اور تمام جسم ٹکڑے ہو گئے ہیں اور بٹ صاحب نے اپنی دانست میں انہیں جوڑ دیا ہے۔ دیکھنے میں اسکیچ ایک عورت کا نہیں بلکہ عورت کی توہین لگتا۔ اسے الٹا دیکھیں یا سیدھا، پر وہ ہمیشہ الٹا ہی نظر آتا۔ بقول بٹ صاحب کے، ان کی ایک بیٹی بوسٹن میں ہے۔ بہت بڑی آرٹسٹ ہے اور امریکا بھی اس کی صلاحیتوں کا معترف ہے۔ اسّی فیصد ان کی باتیں اپنی بیٹی سے متعلق ہوتیں اور بقایا بیس فیصد اپنی ''تخلیقات'' کے بارے میں۔ پہلے دن میں بڑے ادب سے ان کے ساتھ بیٹھا، سلام کیا، مصافحہ کیا اور غلطی سے اپنی عادت کے مطابق ان کے بارے میں جاننے لگا۔ پہلی بار اپنی اس عادت کی خرابی دکھائی دی جب بٹ صاحب نے بات اپنی بیٹی سے شروع کی۔ کہنے لگے کہ اس نے بوسٹن کے میوزیم کے لیے ایک پینٹنگ تخلیق کی ہے اور وہ اب مرکزی دروازے پر لگی ہے۔ بیٹی نے تو اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیا۔ پھر کہنے لگے۔ ''بیٹی مجھے کہتی ہے کہ آپ میں تخلیقی صلاحیت بہت زیادہ ہے اور آپ اپنے اس فن کو کمال پر پہنچائیں۔'' اور ساتھ ہی کوٹ کی دائیں جیب سے اپنی صلاحیتیں نکال کر میرے سامنے پھیلا دیں۔ میں نے پہلے ان فن پاروں کو الٹا کر کے دیکھا، سیدھا کیا، پھر ورق الٹ کر پیچھے سے دیکھا اور پھر بٹ صاحب کی طرف دیکھا۔ دوسرے گارڈز دور بیٹھے میری جانب دیکھ کر مسکرائے تو میں بات کی تہ تک پہنچ گیا کہ بقول شہباز ''نرا سیاپا ہے۔''

دوبارہ ملے تو بھول چکے تھے کہ پچھلی ملاقات میں بیٹی کی شان میں کیا کہا تھا۔ اب کی بار کہنے لگے۔ ''بوسٹن کی پینٹنگ پر آٹھ ہزار ڈالر اسے انعام میں ملا تھا۔ اگلی بار یہ انعام بڑھ کر سولہ ہزار ڈالر تک جا پہنچا تھا۔ کہنے لگے کہ بیٹی کہہ رہی ہے کہ میں بھی امریکا شفٹ ہو جاؤں اور اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لے آؤں۔''

وہ دراصل اپنے آپ کو مائیکل انجیلو سمجھ بیٹھے تھے اور ان سے ڈالر بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کچھ دنوں میں میری یہ حالت ہو گئی کہ ادھر انہیں بیٹھے دیکھا تو ادھر چہرے کو کتاب میں چھپا لیا۔ متوجہ کرنے کے لیے وہ کھنکھارتے، کرسی گھسیٹتے، دور سے پھر اپنی تخلیقات دکھلاتے مگر میں جنبش بھی نہ کرتا تھا۔

آج میں بے نیاز بیٹھا رہا تو میری جانب کھنچے چلے آئے اور بولے۔ ''آج میں تمہارا اسکیچ بناتا ہوں۔'' پھر دور سے بیٹھ کر کاغذ پر لکیریں کھینچنے لگے۔ آدھ گھنٹے بعد جو مجھے دکھایا تو میں خود زمین میں گڑھ گیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی اس حرکت پر کینیڈا کے مروجہ قوانین کے مطابق ہتک عزت کا دعویٰ بنتا تھا۔

میں خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا اگر ذرا سی بھی میری تشبیہ ہوتی یا کرسی میز بھی واضح ہوتی تو میں کچھ نہ کچھ داد دیتا مگر وہ اب داد طلب نظروں سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ اس دن میں سوچتا تھا کہ کاش میں منہ پھٹ ہوتا اور سب بک دیتا جو میرے دماغ میں چل رہا تھا لیکن اب خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس دن کچھ بکا نہیں۔ اگر بک دیتا تو وہ کچھ دیکھنے کو نہ ملتا جو آج بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہوا یہ تھا۔

(جاری ہے)

جھوٹے لوگ

راحیلہ کاشف

تاریخ کے اوراق ایسے لوگوں سے پُر ہیں جن کو کذاب کہنا چاہیے تھا پھر بھی انہوں نے خوب شہرت بٹوری۔ ایسے ہی چند بدنام زمانہ افراد کا تذکرہ۔

انہوں نے جھوٹی شہرت کے لیے خود کو مشہور کیا

یہ دنیا مکروفریب سے کبھی خالی نہیں رہی ہے۔
لوگ دوسروں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر انہیں ورغلاتے ہیں اور فائدہ اٹھالیتے ہیں۔ خاص طور پر مذہبی اعتقادات کا۔
آپ نے اشتہارات تو دیکھے ہوں گے طرح طرح کے بابا دومنٹ میں کام کردینے والے، دشمن کو جلا کر راکھ کردینے کا دعویٰ کرنے والے اور نہ جانے کیا کیا۔
ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صرف عورتیں ہی کمزور عقیدوں کی ہوتی ہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ مرد حضرات بھی اس معاملے میں کم نہیں ہیں۔
ایسے ایسے عقل مند حضرات ان دھوکے بازوں کی گرفت میں آجاتے ہیں اور وہ انہیں اپنے حربوں سے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں پھر بھی کمزور عقیدہ لوگ ان کی دست بوسی کرتے

خبازة العرب بغداد

رہتے ہیں۔
ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس شیطانی قوتیں ہوتی ہیں۔ وہ کالے جادو وغیرہ کے عامل ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے دوسروں کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور جو الٹا سیدھا کام کروانا چاہیں کرواتے رہتے ہیں۔
یہ پوری دنیا میں ہوتا ہے۔ ہر جگہ ایسے لوگ موجود ہیں۔ امریکا میں، روس میں (راسپوٹین کی مثال) ہندوستان میں (بے شمار بھگوان) اور ہر دور میں۔
پاکستان میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے۔
اب ایسے لوگوں کے درجات دیکھیں۔ نمبر ایک وہ لوگ جو خود کو اللہ کا خاص بندہ قرار دیتے ہیں جیسے جعلی پیر اور عامل وغیرہ۔
دوسرے درجے کے وہ کاریگر ہیں جو نبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کی بھی تعداد سینکڑوں میں ہے۔
تیسرے درجے والے سب سے بڑے کاریگر ہوتے ہیں۔ وہ پیر عامل یا نبی ہونے کے چکر میں نہیں پڑتے بلکہ براہِ راست خدائی کا دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسوں کی تعداد کم ہے۔ لیکن ایسے لوگ ہیں۔
اس مضمون میں ایسے حضرات کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے نبی ہونے کے دعوے کیے۔ یعنی دوسرے درجے کے لوگ۔ یہ ذکر صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی رہیں۔
بہت سے جھوٹے نبی عباسی خلفاء کے دور میں سامنے آئے۔ یہ بہت دلچسپ کردار ہوا کرتے تھے۔ اس کتاب کا ماخذ جناب نثار احمد خاں مفتی کی کتاب کے علاوہ گوگل ہے۔
خلیفہ مہدی عباسی کے عہد میں ایک شخص نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ اسے پکڑ کر خلیفہ کے سامنے پہنچا دیا گیا۔
مہدی نے پوچھا۔ ''تم نبی ہو؟''
بولا۔ ''جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔''
مہدی نے سوال کیا۔ ''کن لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہو؟''
اس نے جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت آپ نے کسی کے پاس جانے کا موقع ہی کہاں دیا۔ اِدھر میں نے دعویٰ کیا اُدھر آپ کے بندے مجھے پکڑ کر آپ کے سامنے لے آئے۔ اب میں کیا بتاؤں کہ میں کس قوم کے لیے اتارا گیا ہوں۔ مجھے تو ٹائم ہی نہیں ملا۔''
یہ جواب سن کر مہدی بہت ہنسا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس نے آئندہ اس قسم کی کوئی بات کی تو اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔
بصرہ میں ایک شخص نے پیغمبری کا دعویٰ کیا۔
لوگ اسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ اس زمانے میں سلمان بن علی وہاں کا حکمران تھا۔ سلمان نے دریافت کیا۔ ''کیا تم خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہو؟''
بولا۔ ''جی، لیکن اس وقت تو قیدی ہوں۔''
سلمان نے غصے سے کہا۔ ''کم بخت تجھے کس نے نبی بنایا ہے۔''
اس نے کہا۔ ''بادشاہ ذرا خود سوچو کیا پیغمبروں کے ساتھ اس طرح بات کی جاتی ہے اگر میں گرفتار نہ ہوتا تو جبرئیل کو حکم دیتا کہ تم سب کو ہلاک کر دیں لیکن کیا کروں۔ قید ہو گیا ہوں۔''
سلمان نے پوچھا۔ ''کیا قیدی کی دعا قبول نہیں ہوتی؟''
اس نے جواب دیا۔ ''عام قیدیوں کی تو ہو جاتی ہے لیکن پیغمبروں کی نہیں ہوتی۔ ان کی دعائیں آزاد ہو کر اثر دکھاتی ہیں۔''
سلمان ہنس پڑا۔ پھر کہا۔ ''اچھا چلو میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ اب آزاد ہو کر جبرئیل کو حکم دو کہ وہ ہم سب کو ہلاک کر دیں۔''
اس نے کہا۔ ''بادشاہ سلامت کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ پیغمبر بغض نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ کسی سے انتقام لیتے ہیں۔ جو ہو گیا وہ ہو گیا۔''
سلمان نے تنبیہ کی کہ اگر ایسی کوئی حرکت کی تو گردن اڑا دی جائے گی اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔
مامون کے بعد ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہی ابراہیم خلیل اللہ ہے۔ جب وہ گرفتار ہو کر مامون کے سامنے پیش ہوا تو اس وقت مامون کے پاس ثمامہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔
مامون نے اس نبوت کا دعویٰ کرنے والے کے لیے کہا۔ ''میں نے ایسا جری شخص نہیں دیکھا کہ خدا پر بھی تہمت لگائے۔''
ثمامہ نے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو میں اس سے گفتگو کروں۔'' مامون نے اجازت دے دی۔
ثمامہ نے کہا۔ ''اے شخص حضرت ابراہیم کے پاس تو نبوت کی دلیلیں تھیں۔ تمہارے پاس کون سی دلیل ہے۔''
اس نے پوچھا۔ ''کون سی دلیل تھی ان کے پاس۔''
ثمامہ نے کہا۔ ''آگ جلائی گئی اور وہ آگ میں ڈال دیئے گئے مگر آگ ان کے لیے ٹھنڈی اور آرام دہ ہو گئی۔ تو ہم بھی

خوشخبری

شاعری انٹرنیشنل انتخاب بہت
جلد منظر عام پر آرہا ہے

داستان دل ڈائجسٹ کی ٹیم شاعری انٹرنیشنل انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں سب شاعر شامل ہو سکتے ہیں اور جو شاعر نہیں وہ کسی بھی شاعر کی دو غزلیں انتخاب کر سکتے ہیں انشاء اللہ یہ کتاب بہت جلد مارکیٹ میں آرہی ہے شامل ہونے کے لیے آج ہی ہم سے رابطہ کریں

مزید معلومات کے لیے رابطہ

03225494228
abbasnadeem283@gmail.com

سلسلہ انچارج

اس انتخاب میں شامل لازمی ہوں انشاء اللہ یہ کتاب پاکستان کے علاوہ امریکہ، دوبئی، سعودی عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں پڑھی جائے گی انشاء اللہ۔ اس میں ہر ممالک سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اور شامل ہونا بھی آسان ہے آپ اپنی پسند کی دو غزلیں دے سکتے ہیں اور جو فیس دیں گئیں ان کی کتابیں مل جائیں گے ایسا چانس بار بار نہیں ملے گا اس لیے سب سے اپیل ہے کہ آپ سب شامل ہوں مزید معلومات کے لیے واٹس اپ 03225494228 یا فیس بک 03377017753 پر رابطہ کریں شکریہ
منجانب: داستان دل ڈائجسٹ ٹیم

تمہارے لیے آگ جلوا کر تمہیں اس میں ڈال دیتے ہیں اگر آگ تمہارے لیے بھی ٹھنڈی کر دی گئی تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔"

یہ سن کر اس کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے کہا۔ "نہیں یہ میرے لیے اس لیے مشکل ہے کہ میں ان سے کم درجے کا پیغمبر ہوں کوئی اور دلیل پوچھو۔"

" پھر ثمامہ نے حضرت موسیٰ کی دلیل دی کہ ان کے پاس عصا تھا۔ جب اسے زمین پر ڈال دیتے تو اژدہا بن جاتا۔ انہوں نے اس عصا کو مار کر سمندر کو ٹھہرا دیا تھا۔"

کہنے لگا۔ "یہ حضرت موسیٰ کا معجزہ تھا۔ ہر پیغمبر کے لیے معجزے الگ ہوتے ہیں۔ وہ معجزہ حضرت موسیٰ کا تھا۔ میرے لیے اس سے آگے بات کرو۔"

" پھر ثمامہ نے کہا کہ حضرت عیسیٰ مُردوں کو زندہ، اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے تھے تم ایسی کوئی بات کر کے دکھاؤ۔"

اس نے کہا۔ "میں پیغمبر ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ حکیموں اور طبیبوں کا رزق چھیننے لگ جاؤں اگر میں یہ سب کرنے لگوں تو وہ بے چارے تو بھوکے مر جائیں گے۔"

ثمامہ نے غصے سے پوچھا۔ "پھر تیرے پاس کیا دلیل ہے۔"

" اس نے کہا، تم لوگوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے کہ تم لوگ ہر پیغمبر سے دلیل مانگنے لگتے ہو۔ ارے کسی پیغمبر کو بغیر دلیل کے بھی مان لیا کرو۔ کیا ضروری ہے کہ سب دلیل ہی لے کر آئیں۔"

ثمامہ اور مامون دونوں ہی اس جواب کو سن کر ہنس پڑے اور اسے بھی چھوڑ دیا گیا۔

اس طرح ایک اور شخص خلیفہ مہدی کے پاس لایا گیا۔

خلیفہ نے پوچھا۔ "تم کب مبعوث ہوئے؟"

کہنے لگا۔ "آپ کو تاریخ سے کیا لینا دینا۔ آپ اپنا کام کریں، مجھے اپنا کام کرنے دیں۔"

مہدی نے پوچھا۔ "تمہیں کہاں نبوت ملی۔"

کہنے لگا۔ "خدا کی قسم یہاں تو ایسی باتیں پوچھی جا رہی ہیں جن کا پیغمبری سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اگر میری نبوت مانتے ہیں تو مانیے اور اس کی پیروی کیجیے اور اگر مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں تو جانے دیں مجھے۔ آپ اپنے گھر خوش میں اپنے گھر خوش۔"

مہدی نے کہا۔ "تمہیں کیسے چھوڑ دوں۔ تمہاری وجہ سے دین میں فساد پھیلے گا۔"

کہنے لگا۔ "کمال ہے۔ آپ کو اس بات کا تو اندیشہ ہے کہ میری وجہ سے آپ کے دین میں فساد پھیل جائے گا لیکن اس بات کی پروا نہیں ہے کہ آپ کی وجہ سے میری پیغمبری خطرے میں پڑ گئی ہے۔"

اس دلچسپ جواب پر خلیفہ کو ہنسی آگئی اور سرزنش کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔

ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے میں اس قسم کے پیغمبر تھوک کے حساب سے پیدا ہو گئے تھے اور اس پیداوار کا پس منظر کیا تھا۔ اس کے لیے اس زمانے کے پورے ماحول کو دیکھنا ہوگا۔

یہ مضمون چونکہ اس بات کا احاطہ نہیں کرتا، اس لیے صرف ایسے لوگوں کا معمولی سا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ایک دن عبداللہ بن حازم کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا۔

اس نے بھی پیغمبری کا دعویٰ کر رکھا تھا۔

اس سے پوچھا گیا۔ "تم کس قوم پر مبعوث ہوئے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "مجھے انسانوں پر مبعوث نہیں کیا گیا۔ بلکہ شیطانوں پر کیا گیا ہے اور انسانوں سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔"

حازم نے کہا۔ "اسے چھوڑ دو۔ تاکہ یہ اپنی قوم کے پاس واپس چلا جائے۔"

ثمامہ ابن اشرس کا بیان ہے کہ ایک بار ان کے پاس ایک ایسا آدمی لایا گیا جو انتہائی مہذب اور باوقار دکھائی دیتا تھا۔

ثمامہ نے حیرت سے پوچھا۔ "جناب! آپ جیسے شخص نے کیا جرم کر دیا ہے کہ آپ کو اس طرح میرے پاس لایا گیا ہے۔"

"کوئی جرم نہیں، بس پیغمبری کا دعویٰ کر دیا تھا کہ حسبِ دستور لوگوں کو برا لگ گیا۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"کمال ہے۔ آپ جیسا مہذب آدمی اور ایسی حرکت۔"

"یہ کیا بات ہے کہ جتنے پیغمبر ہوئے ہیں وہ مہذب نہیں تھے۔" اس نے کہا۔ "ارے بھائی مہذب ہی لوگوں کو پیغمبری ملی ہے۔"

ثمامہ نے پوچھا۔ "کیا آپ کے پاس اپنی اس نبوت کے حق میں کوئی دلیل ہے؟"

اس نے کہا۔ "کسی بھی لڑکی سے میرا رشتہ قائم کرو اور ایک سال کے اندر وہ لڑکی ایک بچے کو جنم دے دے گی۔ اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہیے۔"

ہارون رشید کے دربار میں ایک شخص کو پکڑ کر لایا گیا۔ اس

کو پکڑ کر لانے والا شہر کا کوتوال تھا۔ ہارون نے پوچھا۔ ”بتا تیرے پاس نبوت کا کوئی ثبوت ہے؟“

اس نے کہا کہ ”آپ ایک تلوار دیں۔ میں آپ کے سامنے اس کوتوال کی گردن اڑا کر اس کو زندہ کردوں گا۔“

مامون کے زمانے میں ایک اور شخص نے دعویٰ نبوت کیا۔ مامون نے قاضی یحییٰ ابن اکثم سے کہا کہ چلو بھیس بدل کر اس شخص سے ملتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیا ہے اور کس طرح لوگوں کو گمراہ کررہا ہے۔

چنانچہ دونوں بھیس بدل کر اس کے پاس پہنچ گئے۔

اس نے دریافت کیا۔ ”معزز لوگوں کیسے آنا ہوا۔“

کہا۔ ”ہم دونوں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ پر ایمان لائیں۔“

اس نے کہا۔ آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔

اجازت پا کے مامون اس کے دائیں جانب اور قاضی صاحب بائیں جانب بیٹھ گئے۔ اب مامون نے پوچھا۔ ”آپ کن لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔“

بولا۔ ”ساری خلقت کے لیے۔“

مامون نے پوچھا۔ ”کیا آپ پر وحی نازل ہوتی ہے؟ کیا آپ خواب بھی دیکھتے ہیں؟ دل میں القا ہو جاتا ہے یا آپ سے فرشتہ آ کے گفتگو کرتا ہے۔“

بولا۔ ”فرشتہ گفتگو کرتا ہے۔“

پوچھا۔ ”کون فرشتہ آتا ہے۔“

جواب دیا۔ ”جبرئیل۔“

سوال کیا گیا۔ ”آخری بار کب آئے تھے؟“

جواب دیا۔ ”ابھی تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے آئے تھے اور ایک وحی بھی لے کر آئے تھے۔“

”وہ وحی کیا تھی؟“

”وہ وحی یہ تھی کہ عنقریب تمہارے پاس دو آدمی آئیں گے۔ جو تم سے الٹے سیدھے سوالات کریں گے۔ ان میں سے ایک تمہاری دائیں طرف بیٹھے گا اور دوسرا بائیں طرف اب دیکھ لو یہی ہوا ہے۔“

دونوں اس کی بات سن کر ہنس پڑے اور اس پر خود کو ظاہر کر کے یہ تنبیہ کردی کہ اگر آج کے بعد اس نے اپنا یہ ناٹک جاری رکھا تو اسے سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔

اس قسم کا دعویٰ کرنے والے عام طور پر حاضر جواب بھی ہوا کرتے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جنھوں نے عملیات بھی سیکھ رکھے تھے۔ وہ شعبدے بازی جانتے تھے اور شعبدے دکھا کر لوگوں کو مرعوب کردیا کرتے۔

ان میں سے چند ایسے تھے جو ذہنی مریض تھے اور زیادہ تر ایسے تھے جو اپنے مفادات کے لیے ڈھونگ رچاتے اور اس قسم کے دعوے کرتے۔

جن چند کرداروں کا ذکر آرہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ذہنی مریض تھے۔ کیونکہ ان کی ذات سے کوئی بڑا فتنہ برپا نہیں ہو پایا تھا۔

جیسے خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا مسلیمہ کذاب۔

یہاں تک اس بڑے فتنے سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ حضرت خالدؓ کی سربراہی میں اور ہزاروں کو قتل کر کے مسلیمہ کا قصہ ختم کردیا گیا۔

اسود عنسی۔ یہ شخص بھی آنحضرتؐ کے زمانے میں یمن میں نمودار ہوا تھا اور اس کو بھی قتل کر کے اس فتنے کا سدباب کیا گیا۔

علیمہ اسدی۔ اس شخص کا تعلق قبیلہ بنو اسد سے تھا اور یہ بھی عہد رسالت میں نبوت کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ سے اس کا ٹکراؤ ہوا۔ جس میں اس کو شکست ہوئی۔ بعد میں اس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

سباح بن حارث۔ یہ عورت تھی اپنے زمانے کی مشہور کاہنہ تھی۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔

سباح نے مسلیمہ سے نکاح کرلیا تھا۔ جس سے اس پر ”ایمان“ لانے والے اس سے بدگمان ہوگئے۔ اس عورت نے بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا اور اتنی متقی اور پرہیزگار ہوگئی تھی کہ صحابیٔ رسول حضرت سمرہ بن جندبؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

اس طرح ایک حارث کذاب بھی تھا۔

ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ایسے لوگ بہت ہوا کرتے تھے۔

عباسیوں کے دور میں تو لائن لگ گئی تھی۔ اس کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے کم ہوتے چلے گئے۔

ایک شخص نے اس زمانے میں قرآن شریف کا جواب لکھنے کی جسارت کی تھی۔

کوفہ کے ایک شخص کا بیان ہے کہ ایک دن ان کے پاس ایک دوست آئے اور کہا۔ ”سنا تم نے یہاں ایک پیغمبر صاحب

پیدا ہو گئے ہیں۔"

"اچھا تو چلو چل کر ملتے ہیں۔ دیکھیں تو سہی وہ کیا کہتے ہیں۔"

ہم دونوں اس جھوٹے نبی کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ایک کریہہ صورت خراسانی بڈھا تھا اور بھینگا بھی تھا۔

اتفاق یہ ہے کہ میرے دوست صاحب کانے تھے۔

میں نے جب اس نبی سے گفتگو کرنی چاہی تو میرے دوست نے میرا ہاتھ دبا کر آہستہ سے کہا۔ "تم چپ رہو، مجھے اس بڈھے سے بات کرنے دو۔ دیکھو میں اس کا کیا حال کرتا ہوں۔"

میں خاموش رہا۔

میرے دوست نے اس بڈھے سے پوچھا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ پیغمبر ہیں؟"

"ہاں، اس میں کیا شک ہے؟"

"کیا آپ کے پاس کوئی دلیل ہے؟"

"بالکل سامنے کی دلیل ہے۔ یعنی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ابھی ہو جائے گا۔"

"اور وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ ہے کہ تم ایک آنکھ سے کانے ہو۔ تم اپنی دوسری آنکھ بھی پھوڑ لو۔ میں ابھی دعا کر کے تمہیں اچھا کر دوں گا۔"

میرا دوست جھنجلا کر اسے برا بھلا کہنے لگا۔ "کم بخت بڈھے تو خود اپنی دونوں آنکھیں پھوڑ کر اندھا ہو جا۔ اس کے بعد دعا کر کے ٹھیک ہو کر دکھا دے۔ پھر دیکھتے ہیں تو کتنا بڑا پیغمبر ہے۔"

بہرحال میرا وہ دوست اس بڈھے کو برا بھلا کہے جا رہا تھا اور میں ہنس ہنس کر بے حال ہو رہا تھا۔ میں لاحول پڑھتا ہوا اس مکان سے باہر آ گیا۔

ایک بار مامون کے سامنے ایک دعویٰ کرنے والے کو پیش کیا گیا۔

مامون نے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس کوئی معجزہ ہے؟"

اس نے کہا۔ "بالکل ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جو آپ میرے بارے میں اپنے دل میں سوچ رہے ہیں وہ میں فوراً بتا دوں گا۔"

"چلو بتا دو کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں۔"

"یہی کہ میں ایک نمبر کا جھوٹا ہوں اور میں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔"

مامون نے کہا کہ یہ تو تو نے بالکل سچ کہا۔ اس کے بعد مامون نے اسے قید خانے میں ڈلوا دیا۔ کچھ عرصے بعد مامون نے اسے قید خانے سے نکلوا کر پوچھا۔ "ہاں اب بتا کوئی وحی نازل ہوئی؟"

اس نے کہا۔ "نہیں جناب۔ قید خانے میں وحی کا نازل ہونا حضرت یوسفؑ کے بعد ہی ختم کر دیا گیا تھا۔"

مامون نے اسے دوبارہ قید خانے بھجوا دیا۔

معتصم باللہ کے سامنے بھی ایک شخص لایا گیا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ "تم نبی ہو؟"

کہا۔ "جی ہاں۔"

پوچھا۔ "کس کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہو؟"

کہا۔ "آپ کی ہدایت کے لیے۔"

معتصم نے کہا۔ "تو پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ذلیل اور جاہل ہو۔"

اس نے جواب دیا۔ "آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا۔ کیونکہ جیسی قوم ہوتی ہے ویسے ہی پیغمبران پر اتارے جاتے ہیں۔"

بادشاہ یہ سن کر شرمندہ ہوا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔

ایک اور دلچسپ واقعہ سن لیں۔

مامون ہی کے دربار میں ایک اور شخص کو پیش کیا گیا۔ اس سے وہی سوال کیا گیا۔ "کیا تم پیغمبر ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "بے شک۔"

مامون نے کہا۔ "کوئی دلیل دو۔"

اس نے کہا۔ "دلیل آپ بتائیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

مامون نے کہا۔ "اچھا! اس وقت ایک خربوزہ حاضر کر دو۔"

اس نے کہا۔ "بادشاہ ذرا انصاف کریں۔ وہ خدا جو پوری کائنات کا مالک ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے وہ جب خربوزے کو چھ مہینے میں پیدا فرماتا ہے تو آپ ایک پیغمبر سے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ابھی حاضر کر دے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔"

مامون اور اہل دربار اس کے اس جواب سے بے حد محظوظ ہوئے اور اسے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

یہ تو صرف چند لوگ تھے۔ ورنہ پوری دنیا ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ نفسیاتی ماہرین کا یہ خیال ہے کہ ایسے لوگ ذہنی مریض ہیں اور یہ خود کو واقعی اس درجے کا انسان سمجھنے لگتے ہیں یہ صرف ان کے ذہن کی کرشمہ سازیاں ہوتی ہیں۔

یہ کہانی 1888ء میں شروع ہوئی تھی جب ایک امریکی چمڑے سکھانے والے شخص جان لاؤڈ نے رولر بال پین کو پیٹنٹ کرایا جس سے مارکنگ کی جاسکتی تھی۔ لاؤڈ کے قلم میں ایک رولر بال تھا جو چمڑے پر گاڑھی سیاہی پھینکتا تھا لیکن افسوس لاؤڈ کا قلم تجارتی بنیاد پر مارکیٹ میں نہ آسکا۔ اس کے بعد بھی اس طرح کے ساڑھے تین سو قلم مزید پیٹنٹ کرائے گئے تھے، مگر کاروباری کمپنیوں نے انہیں درخور اعتنا نہ سمجھا۔ جس کی وجہ سے ایسے قلم فروخت کے لیے بازار

بال پین

شکیل صدیقی

کبھی پرندوں کے پروں سے تو کبھی بانس کی قمچی سے لکھا جاتا تھا۔ روشنائی الگ اور قلم بنانے والے الگ ہوتے تھے۔ پھر فاؤنٹین پین کا دور آیا جس نے مقبولیت بھی حاصل کرلی لیکن یہ زمانہ ہے بال پین کا۔ ہر ایک کے استعمال میں یہی قلم ہے لیکن یہ قلم بنا کیسے، ایک مختصر سی معلومات افزا تحریر۔

معلومات حاصل کرنے والوں کی مدارات

میں نہ آسکے۔ بال پوائنٹ کے شائقین کو سب سے بڑا مسئلہ روشنائی کا تھا۔ اگر وہ پتلی ہوتی تو وہ خود بخود باہر نکل پڑتی۔ جب کہ گاڑھی ہونے کی صورت میں جام ہوجاتی۔ اس میں درجہ حرارت کا بھی دخل ہوتا تھا۔ سردیوں میں روشنائی جم جاتی اور گرمیوں میں پتلی ہوکر بہنے لگتی۔

اس مسئلے کو حل کرنے میں پچاس برس .... لگ گئے۔ 1935ء میں ہنگری کے لیڈلاس بریو اور اس کے بھائی جارج نے اس میں یہ تبدیلی پیدا کی۔ لیڈلاس بہت ہنرمند اور ذہین تھا۔ اس نے طب، آرٹ اور ہپناٹزم کا مطالعہ کیا تھا۔ گزر بسر کے لیے وہ ایک چھوٹے سے اخبار میں کام کرتا تھا۔ وہ اس بات سے کڑھتا تھا کہ اس کا زیادہ تر وقت قلموں میں روشنائی بھرنے میں گزر جاتا ہے اور اگر روشنائی گر جاتی ہے تو... اسے اچھی طرح سے صاف کرنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ اخبار کے سادہ کاغذ پر لکھتا تو قلم سے اس پر جھری بن جاتی یا وہ پھٹ جاتا۔

اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اس سے بہتر کوئی قلم بنائے گا۔ اس کا بھائی جارج بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا (وہ کیمیا سے شغف رکھتا تھا)۔ انہوں نے سوچا کہ نہ صرف قلم کا ڈیزائن نیا ہونا چاہیے بلکہ اس کی روشنائی بھی مختلف ہو۔

لیڈلاس چونکہ ایک پریس میں کام کرتا تھا، چنانچہ اس کا مشاہدہ تھا کہ جب اخبار چھپ کر ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے تو اس کی روشنائی تھوڑی سی دیر میں خشک ہوجاتی ہے۔ اس نے یہ بات اپنے بھائی جارج کو بتائی کہ قلم کے لیے ایسی روشنائی استعمال کرنا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ نیچے آئے۔ اس میں ایک فولادی گیند لگی ہو، تا کہ روشنائی اس پر گرے اور پھسلتی ہوئی کاغذ پر آجائے۔ گویا قلم میں نب کی جگہ بال استعمال کی جائے۔

ایک بار گرمیوں میں جب دونوں بھائی ساحل سمندر پر ٹہل رہے تھے تو انہیں ایک معمر شخص ملا۔ جس کا نام آگسٹائن جسٹو تھا۔ وہ ارجنٹائن کا صدر تھا۔ جب دونوں بھائیوں نے بتایا کہ آجکل وہ کس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں تو وہ خوش ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اس میں کامیاب ہوگئے تو اس نئے قلم کی فیکٹری ارجنٹائن میں لگائی جائے گی۔ دوسری جنگ عظیم کے چند برس بعد دونوں بھائیوں نے ارجنٹائن کا سفر کیا۔

ارجنٹائن پہنچ کر دونوں بھائیوں نے جب لوگوں کو اپنی آمد کا مقصد بتایا تو بہت سے سرمایہ دار اس پروجیکٹ پر سرمایہ لگانے کے لیے تیار ہوگئے۔ 1943ء میں ارجنٹائن میں ایک فیکٹری لگائی گئی اور لیڈلاس کے فارمولے کے تحت بال پوائنٹ تیار ہونے لگے۔

بدقسمتی سے یہ بال پوائنٹ ناکام ہوگئے۔ اس لیے کہ بال پوائنٹ کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا کہ اس کا تعلق کشش ثقل سے تھا۔ یعنی بال پوائنٹ اس وقت کام کرتا تھا جب اسے تقریباً سیدھا رکھا جاتا۔ اس کے علاوہ روشنائی بعض اوقات بہت گاڑھی ہوجاتی جس سے لکھنے میں دقت ہوتی اور کاغذ پر دھبے پڑنے لگتے۔

انہوں نے لیبارٹری میں جا کر تجربات کیے اور اس خامی کو دور کیا تا کہ روشنائی صحیح طور پر نکلے۔ اب بال پوائنٹ کے لیے ضروری نہیں تھا کہ اسے بالکل سیدھا تھاما جائے۔

ایک برس بعد دونوں بھائی اپنی اس نئی ایجاد کو ارجنٹائن میں فروخت کرنے لگے۔ مگر اس کی فروخت اعلا پیمانے پر نہیں ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بھائیوں کی جیبیں خالی ہوگئیں۔

ایئر فورس کا ایک افسر جسے بال پوائنٹ ہر دل عزیز تھا، اس نے دونوں بھائیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اعلا افسران سے ملاقات کریں اور اس بال پوائنٹ کی خصوصیات بتائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ جب ہواباز زیادہ بلندی پر جاتے ہیں تو فاؤنٹین پین کی روشنائی دباؤ کے تحت نب سے نکل آتی ہے اور تحریر کو متاثر کرتی ہے۔ اس نے اپنے طور پر بال پوائنٹ کو استعمال کیا ہے تو اسے مناسب پایا۔ ہواباز جو نقشے وغیرہ میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں تو بال پوائنٹ کو استعمال کر سکتے ہیں۔

ہواباز افسران کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور انہوں نے امریکی حکومت کو درخواست دی کہ ایسا بال پوائنٹ خرید کر انہیں دیا جائے۔ امریکی حکومت نے کمپنی کو 30,000 بال پوائنٹ بنانے کا آرڈر دے دیا۔ حکومت نے کہا کہ بال پوائنٹ کو مزید بہتر بنایا جائے تا کہ وہ ساری دنیا کی مارکیٹ پر قبضہ کرسکیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران یہودیوں کے خلاف مہم چلی تو صدر ارجنٹائن نے دونوں بھائیوں کو ملک سے نکل جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کہیں اور بال پوائنٹ کو پیٹنٹ کرالیں۔ دونوں بھائی امریکا جانے سے پیشتر پیرس میں ٹھہر گئے اور انہوں نے بال پوائنٹ کو پیٹنٹ کرالیا۔ جب وہ امریکا آئے تو ان کے کارنامے

کی خبر مقامی صنعت کاروں تک پہنچی اور تاجروں نے رابطہ کرنا شروع کر دیا۔

ایبر ہارڈ فیبر کمپنی نے دونوں بھائیوں کو پانچ لاکھ ڈالر ادا کیے اور ان سے بال پوائنٹ بنانے کے حقوق خرید لیے۔ اب اس بال پوائنٹ کو امریکا میں فروخت کیا جا سکتا تھا۔ ایبر ہارڈ فیبر نے بعد میں یہ حقوق ایور شارپ کمپنی کو فروخت کر دیے۔ مگر ان دونوں کمپنیوں میں کوئی بھی ہوشیار ثابت نہ ہوئی کہ دونوں بھائیوں نے اس بال پوائنٹ میں جو سقم چھوڑے تھے ان پر قابو پایا جا سکے۔ چنانچہ عام لوگوں کے لیے اب بھی اس میں کوئی دل کشی نہیں تھی۔

اس اثنا میں 54 سالہ ایک شخص رینالڈس نے بڑی حد تک ان کم زوریوں پر قابو پا لیا جو اب تک بال پوائنٹ میں موجود تھیں۔ وہ امریکی نژاد تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ اگر اس بال پوائنٹ کو امریکا میں فروخت کیا جائے تو زیادہ منافع کمایا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ پہلے اسے پیٹنٹ کرائے۔ اس نے دونوں بھائیوں کے ڈیزائن کی بڑی حد تک نقل تیار کی اور اسے پیٹنٹ کرا لیا۔

اس کے بعد رینالڈس، گمبلو اسٹور کے مالک کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ وہ اس کے اسٹور سے اسے فروخت کرنا چاہتا ہے۔ وہ راضی ہو گیا تو رینالڈس نے 300 کارکنوں کو بھرتی کیا اور ایک فیکٹری کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایلومینیم جو جنگ عظیم میں خرچ ہونے سے بچ گیا تھا اس کے کام آ گیا۔ اس نے ایلومینیم نہایت سستے داموں خرید لیا تھا۔ رینالڈس نے لاکھوں بال پوائنٹ بنائے اور خوب منافع کمایا۔ اس لیے کہ عوام بھی اب اس بال پوائنٹ کو پسند کرنے لگے تھے۔ کچھ اور کاروباری لوگوں نے بھی بال پوائنٹ تیار کرنا شروع کر دیے۔ اس کاروبار نے ایک مسابقت پیدا کر دی۔ رینالڈس نے ایک تیراک کی خدمات حاصل کیں اور اسے زیرِ آب ایک کاغذ پر لکھتے دکھایا گیا تھا۔ مگر یہ بال پوائنٹ بھی عام لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1948ء تک اس کی قیمت نیچے آ گئی اور یہ ساڑھے بارہ کے بجائے ساڑھے چھ ڈالر میں فروخت ہونے لگا۔

1951ء میں یہ حال ہوا کہ گاہک بال پوائنٹ سے بالکل ہی ناراض ہو گئے اور فاؤنٹین پین ایک بار پھر ان کی جیبوں میں لگا نظر آنے لگا۔

فاؤنٹین پین بنانے والی کمپنی نے جنوری 1954ء میں بال پوائنٹ بنایا اور فروخت کے لیے دکانوں پر رکھوا دیا۔ یہ بال پوائنٹ پہلے کے بال پوائنٹوں سے پانچ گنا زیادہ چلتا تھا اور ان کے مقابلے میں سستا تھا۔ اس کا نام "جوٹر" اور اس کی مجموعی فروخت ساڑھے تین لاکھ ہوئی۔ پہلے پہل اس کی قیمت تین ڈالر تھی جو ایک سال کے عرصے میں بڑھ بڑھا کر پونے نو ڈالر ہوگئی۔

پارکر کمپنی نے 1957ء میں ایک اور بال پوائنٹ ٹنگسٹن متعارف کرایا۔ جس کی فروخت جوٹر سے زیادہ ہوئی۔ اس کا اثر ایورشارپ کے بال پوائنٹ پر پڑا اور اس کی فروخت نیچے آگئی۔ 1960ء میں وہ دیوالیہ ہوگیا لہٰذا اس نے اپنی کمپنی پارکر والوں کو فروخت کر دی۔ اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

جرمنی میں BIC نام کا ایک بال پوائنٹ متعارف کرایا گیا جس کے مالک نے اسے یورپ بھر میں پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مارکیٹ میں 70 فیصد بال پوائنٹ اس کی کمپنی کے فروخت ہوتے ہیں۔ امریکا میں اپنے قدم جمانے کے لیے اس نے 1960ء میں واٹر مین کے سارے فاؤنٹین پین خرید لیے اور دو ڈالر کے بجائے 29 سینٹ میں فروخ کر دیے۔ اس کے باوجود وہ خسارے میں نہیں بلکہ نفع میں رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ گھاٹے کا سودا کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔

بال پوائنٹ کی فروخت میں بہرحال BIC کی کمپنی کے مالک کی قسمت نے یاوری کی اور اس کے بال پوائنٹ امریکا کے ہر اسٹال پر گرم کیک کی طرح فروخت ہونے لگے۔ اس نے شیفرز، پارکر اور واٹر مین کو نیچا دکھا دیا، بلکہ انھا کرز مین پر پٹخ دیا وہ اب چھوٹے فاؤنٹین پین اور مہنگے بال پوائنٹ فروخت کرنے پر مجبور ہوگئے۔

فی زمانہ BIC کے کرسٹل ایک کروڑ چالیس لاکھ کی تعداد میں ساری دنیا میں فروخت ہوتے ہیں، جب کہ پارکر کمپنی نے سیاہ بال پوائنٹ مارکیٹ میں فروخت کے لیے دیا ہوا ہے۔ اور اس کے ایک بال پوائنٹ سے پانچ میل لمبی لکیر کھینچی جاسکتی ہے۔

وقت گزرتا گیا اور بال پوائنٹ صرف لکھنے کا ایک آلہ ہی نہیں رہ گیا بلکہ اس کے ذریعے اشتہار بازی بھی ہونے لگی۔ مثال کے طور پر بڑے ہوٹل والوں نے اس پر اپنے ہوٹلوں کے نام لکھوا کر ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کو مفت پیش کرنا شروع کر دیے۔ 1963ء میں تیار ہونے والے بال پوائنٹس پر جان ایف کینیڈی کی شبیہہ تھی اور مرنے کا دن لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک یادگاری بال پوائنٹ بن گیا۔

بال پوائنٹ کے بارے میں مشہور مصور پال گوگین کہتے ہیں کہ جب میں نے بال پین کو مارکیٹ میں دیکھا تو یہ سوچا کہ اسے اپنا میڈیا بنانا چاہیے۔ میں نے اسے استعمال کیا تو دھوم مچ گئی۔ اس لیے کہ یہ ایک جدا میڈیا تھا۔ پینٹنگ کرنے کے لیے رنگ بہت مہنگے ہوتے ہیں اور ہر ایک مصور انہیں خرید نہیں سکتا، جب کہ بال پوائنٹ بے حد سستا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ بال پوائنٹ مختلف رنگوں میں بھی آنے لگے ہیں۔ جس سے مطلوبہ تاثر دیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر وہ مصور جو لائن ورک کرتے ہیں ان کے لیے بال پوائنٹ ایک نعمت ہے۔ وہ برش اور رنگوں کی ضرورت سے بچ جاتے ہیں۔ کاغذ کو بورڈ پر لگایا اور بال پوائنٹ کو ہاتھ میں تھام کر رنگوں سے پینٹنگ کرنے میں کوئی غلطی ہو جائے تو رنگ کا ایک اور برش چلا کر اس غلطی پر قابو پایا جاسکتا ہے، لیکن بال پوائنٹ سے کام کرتے وقت بہت محتاط رہنا پڑتا ہے، اس لیے کہ اس کی غلطی پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔

لکھنے کے معاملے میں فاؤنٹین پین کی روشنائی مدھم ہوسکتی ہے، لیکن بال پوائنٹ سے لکھی ہوئی تحریر قائم و دائم رہتی ہے۔ یہی معاملہ اخبارات کی روشنائی کا بھی ہے کہ ممکن ہے اس کا کاغذ گل سڑ جائے، لیکن چھپائی پڑھی جاسکتی ہے۔ اس سے پیشتر جب کہ کاتب سیاہی میں قلم ڈبو کر لکھتے تھے تب بھی وہ سیاہی نہیں اڑتی تھی۔

گزشتہ بیس برس میں بال پوائنٹ کے ڈیزائنوں میں بہت تبدیلی آئی، لیکن بنیادی طور پر بال پوائنٹ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا، یعنی ایک بال پر اوپر سے روشنائی گرتی ہے اور وہ اسے کاغذ پر پھیلا دیتا ہے۔ جدید دور کے بال پوائنٹوں میں اب پلاسٹک کی ٹیوب استعمال کی جاتی ہے، اس لیے کہ بال پوائنٹ کی روشنائی ختم ہونے کے بعد اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے، کیونکہ اس میں روشنائی نہیں بھری جاسکتی۔ بال پوائنٹ کا بال پیتل یا ٹنگسٹن کاربائڈ کا ہوتا ہے۔ کوئی اور دھات اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی۔ اپنے سستے پن کی وجہ سے دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی لکھنے کی چیز بال پوائنٹ ہے۔ 2006ء کے اعداد و شمار کے مطابق پوری دنیا میں ہر سیکنڈ میں 57 بال پوائنٹ فروخت ہوتے ہیں۔

ڈزاڈز

شکیل ادریس

قتل کے اوزار بنانا انسان کا پرانا شوق۔ ایسے ایسے ہتھیار بنائے گئے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ خاص کر پستول اور ریوالور کی ایجاد۔

معلومات حاصل کرنے کے شوقینوں کے لیے مختصر مگر جامع تحریر

آسانی سے ہاتھ میں تھاما جانے اور لگاتار فائر کرنے والے ہتھیار کو ریوالور کہتے ہیں۔اس میں ایک گھومنے والی گراری لگی ہوتی ہے ،فائرنگ کے لیے کم از کم ایک بیرل۔ پستول جیسا ہوتا ہے مگر اس سے مختلف۔ چونکہ اس کی گراری گھومتی ہے یعنی REVOLVE کرتی ہے،اس لیے اسے ریوالور کہتے ہیں۔ پرانے اور نئے تقریباً سب ہی ریوالوروں سے پانچ یا چھ فائر کیے جاسکتے ہیں۔اس لیے ان میں چھ چیمبر ہوتے ہیں۔ بعض افراد اسے ''سکس شوٹر'' بھی کہتے ہیں۔

ریوالور چلاتے وقت آپ کو اسے بار بار لوڈ نہیں کرنا پڑتا بس ٹریگر دباتے جایئے اور فائر کرتے جایئے۔ یہ ٹریگر حقیقت میں ایک ہتھوڑا ہوتا ہے جسے دبانے سے گراری گھوم

جاتی ہے اور نال کے سامنے دوسرا چیمبر آجاتا ہے۔ فائر کرنے والا اس ہتھوڑے کو دوسرے ہاتھ یا انگوٹھے سے پیچھے کھینچ لیتا ہے۔ جب چیمبر خالی ہوجاتا ہے تو اسے آسانی سے باہر کھینچ کر اس میں گولیاں بھری جاسکتی ہیں۔ چھ چیمبر والا یہ ریوالور سب سے پہلے سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں بنایا گیا۔ چونکہ اسے کمر سے بندھے ہولسٹر میں رکھا جاتا ہے، اس لیے یہ لوگوں میں بہت مقبول ہوا اور اس کی فروخت نہایت تیزی سے ہونے لگی۔ سب سے پہلا ریوالور فلنٹ لاک کہلاتا تھا جس کے حقوق ایلشا کولائر نے 1814ء میں اپنے نام محفوظ کرائے۔ ضرب پہنچانے والے ریوالور کے حقوق لیونارمنڈ نے پیرس میں 1820ء میں محفوظ کرائے۔ اس کے بعد فرانسسکو انتونیو نے 1833 میں اس سے بہتر ریوالور کے حقوق اپنے نام سے محفوظ کرائے۔ اسے 300 فرینک انعام دیا گیا۔ اس کا ایجاد کیا ہوا ریوالور سارڈینا کے حکمراں شاہ چارلس البرٹ کو دکھایا گیا جو اسے بھی پسند آیا۔ اسی اثنا میں ایک موجد سیموئل کولٹ نے اپنے ریوالور کے حقوق محفوظ کرائے اور اسے فروخت کے لیے مارکیٹ میں بھی لے آیا۔ اس کا ریوالور بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ان کے لیے یہ سہولت تھی کہ وہ اسے ہولسٹر میں رکھ لیتے تھے۔

اس کے بعد بیسویں صدی کی ابتدا میں آٹومیٹک پستول مارکیٹ میں متعارف کرایا گیا جسے تیزی سے لوڈ کیا جاسکتا تھا۔ پولیس اور ملٹری کے لیے اسے نصف صدی تک مناسب نہیں سمجھا گیا۔ پھر جب اس میں تبدیلیاں کردی گئیں تو یہ ان محکموں کے لیے قابلِ قبول ہوگیا۔

جدید عہد میں اب قانون کے محافظ بریٹا 92 اور گلوک 17 استعمال کررہے ہیں جو ترقی اور تبدل کی راہیں طے کرتے ہوئے 70ویں اور 80ویں صدی میں وجود میں آئے۔ ریوالور اب بھی عام لوگوں اور سیکورٹی گارڈز میں پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کی بہت سی اقسام مارکیٹ میں آچکی ہیں اور کچھ کو پولیس اور ملٹری کے جوانوں کے لیے خاص طور پر بنایا گیا ہے۔

شعلہ اگلنے والے ہتھیاروں میں عام افراد کو وہی ہتھیار پسند آتے تھے جو لوڈنگ کا وقت بچاتے تھے۔ ہتھیار کو لوڈ کرنے کے دوران وہ استعمال کے قابل نہیں ہوتا۔ لوڈنگ کے دوران ریوالور کو استعمال کرنے والا اس وقت تک اپنے دشمن کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے آنے والی گولی اس کا کام تمام بھی کرسکتی ہے یا شدید زخمی۔ فی منٹ اس کے فائروں کی تعداد بڑھانے کی طرف بھی موجدوں نے توجہ دی اور ایک کی بجائے کئی نالوں والے ہتھیار بنادیے۔ جن سے ری لوڈنگ کیے بغیر دو یا دو سے زیادہ فائر کیے جاسکتے تھے۔ ان بیرلوں کو گھومنے والا بھی بنایا گیا۔ بہرحال ریوالور کو موجودہ شکل تک آتے آتے کئی سو سال لگ گئے۔

امریکا میں 1836ء میں سیموئل کولٹ نے اپنے ریوالور کے حقوق محفوظ کرائے۔ ریوالور کثیر المقاصد تھا۔ سیموئل کولٹ کا بیان ہے کہ اپنے ریوالور کا آئیڈیا اسے ساحل سمندر پر ٹہلنے کے دوران آیا۔ اس نے ایک لنگر کو دیکھا جس میں ایسا میکنزم لگا تھا جو سیلنڈر کو گھماتا رہتا تھا۔ یہ اس نے اپنے ریوالور میں لگالیا۔ اس کا ریوالور مارکیٹ میں فروخت ہونے لگا اس لیے کہ سیموئل کولٹ ایک اچھا بزنس مین بھی تھا۔ اس کی حکمتِ عملی سے یورپ اور امریکا میں اس کے ریوالور کی فروخت خوب ہوئی۔

اس کے ہر چیمبر میں بارود بھرا جاتا تھا پھر آخر میں ایک گولی رکھ دی جاتی۔ نال کے آخر میں ایک ٹوپی لگا دی جاتی تاکہ ریوالور کا ٹریگر اس پر آکر چوٹ لگائے۔ جب فائر ہوجاتا اور دوسرا فائر کرنا مقصود ہوتا تو ریوالور والا نال کو آسمان کی طرف اٹھاتا اور ٹریگر کو پیچھے کی طرف کھینچ لیتا۔ اس طرح سے وہ ٹوپی بھی گرجاتی جو خالی نال پر چڑھی ہوئی تھی۔ یوں میکنزم جام نہیں ہوتا تھا اور فائر کرنے میں سہولت مل جاتی۔ اس اثنا میں گراری گھوم جاتی اور دوسری گولی ٹریگر کے سامنے آجاتی۔

اس موقع پر سیموئل کولٹ اور اسمتھ اینڈ ویسن نے اشتراکِ عمل سے ریوالور کو بہتر صورت دی اور خوب دولت کمائی۔ ریوالور کا نام انہوں نے ”امن بردار“ (PEACEMAKER) رکھا۔

☆☆☆

ایک انگریز جیمز پکل جو قانون داں اور مصنف تھا، نے 15 مئی 1718ء میں اپنی مشین گن کے جملہ حقوق محفوظ کرائے یعنی اس جیسی مشین گن کوئی دوسرا شخص مارکیٹ میں فروخت کے لیے نہیں لاسکتا۔ یہ دنیا کی پہلی مشین گن تھی جو پکل نے ایجاد کی تھی۔ مشین گن کی بھی یہاں وضاحت ضروری ہے۔ وہ گن جس میں مشین لگی ہو مشین گن کہی جاسکتی ہے۔

اس مشین گن سے ایک منٹ میں 9 راؤنڈ فائر کیے جاسکتے تھے اور اس کی نالیوں میں بارود بھرا جاتا تھا۔ جب کہ آج کل کی مشین گنوں سے ایک منٹ میں 500 سے 3000 راؤنڈ فائر کیے جاسکتے ہیں۔

جب پکل سے پوچھا گیا کہ اس نے مشین گن کیوں ایجاد کی ہے؟ کیا وہ آدمیوں کو مارنا چاہتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ میں دشمنوں کو مارنا چاہتا ہوں، میری خواہش ہے کہ اسے بحری جہازوں پر نصب کیا جائے اور اس سے پیشتر کہ وہ ہم پر حملہ آور ہوں ہم انہیں موت کی نیند سلا دیں۔ اس کے جواب سے مطمئن ہو کر شعبہ دفاع نے مشین گن کے حقوق اس کے نام محفوظ کر دیے۔

پکل جب اس مشین گن کو مارکیٹ میں فروخت کی غرض سے لایا تو اسے مایوسی ہوئی۔ عام افراد کو ایک دوسرے کو ہلاک نہیں کرنا تھا اور نہ انہیں ملکی دفاع سے دل چسپی تھی۔ اس کے لیے علیحدہ شعبہ قائم تھا اور فوج تھی۔ بہرحال دفاع کے محکمے نے چند مشین گنیں خرید لیں۔ ان دنوں جزائر لوسیا اور ونسنٹ پر جنگ ہو رہی تھی۔ خیال کیا گیا کہ ممکن ہے یہ مشین گن وہاں کام آئے۔ اس لیے کہ مشین گن تیز رفتار تھی۔ اس میں بارود دھاتی نلکیوں سے پھینکا جاتا تھا۔ جب کہ ان نلکیوں کو پیشگی بارود سے بھر کر رکھ لیا جاتا تھا اور وقت پڑنے پر تیزی سے گن میں لگا دیا جاتا تھا۔ گویا یہ توپ سے مشابہ تھی جس کی نال گھومتی تھی اور گولیاں پھینکتی تھی۔ آج کل کے لحاظ سے اس مشین گن کو ایجاد کر کے پکل نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، البتہ اس نے آگ برسانے والے ہتھیاروں کی بنیاد رکھ دی تھی، اس لیے اسے سراہا جاسکتا ہے۔

پکل 1667ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ 1700 سے پیشتر اس نے کوئی ایجاد نہیں کی۔ ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بری فوج کے کمانڈر کو ایک تلوار پیش کی تھی جو عام تلواروں سے بناوٹ میں مختلف تھی۔ 1717ء میں اس نے ''دفاعی بندوق'' بنائی جو ''پکل بندوق'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ بندوقوں کی اہمیت اس وقت بڑھ گئی جب امریکا میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ موجدوں نے اپنی کاوشوں سے اس میں تبدیلیاں پیدا کیں اور بندوقوں کو مزید بہتر بنایا۔

ولسن آگر نے یونین آرمی کو اپنی 54 بندوقیں فروخت کیں۔ اس کے بعد بلنگ ہرسٹ کی بندوق استعمال کی گئی جس میں 24 رائفل بیرل تھے اور فائر کرنے کے لیے فولادی پتری استعمال کی جاتی تھی جس پر انگوٹھے یا انگلی سے دباؤ ڈالنے کے بجائے ہتھوڑا استعمال کیا جاتا تھا۔ جس سے فریم میں شعلہ پیدا ہوتا اور 24 کارتوس میں آگ لگا دیتا، نتیجے میں یکے بعد فائر ہونے لگتے۔

رچرڈ جورڈن گیٹلنگ جو ایک دندان ساز تھا نے 1861ء میں ایک مشین گن بنائی۔ اس مشین گن میں چھ بیرل ہوا کرتے تھے جو گھومنے والے فریم میں لگے ہوتے تھے۔ امریکی فوج نے ان بندوقوں کو 1865ء میں خرید لیا۔ چند برس بعد یورپ کے کئی ممالک نے ایسی بندوقیں خریدنا شروع کر دیں۔ برطانیہ نے جزیرہ وول وک پر گیٹلنگ کی بنائی ہوئی بندوق تیار کی اور یہ ورطۂ حیرت میں پڑ گئے کہ اس بندوق سے دو منٹ میں 616 فائر کیے گئے۔ جن میں سے 369 اپنے اہداف پر جا کر لگیں۔

گارڈنر کی مشین گن 1879ء میں ٹیسٹ کی گئی اس نے 27 منٹ میں 10,000 راؤنڈ فائر کیے۔ فوج کے افسران اس سے متاثر ہوئے اور اگلے سال کے بجٹ سے برطانوی فوج نے ان بندوقوں کو خرید لیا۔

امریکا کا موجد ہرام میکسم پیرس کی ''بجلی کی نمائش'' دیکھنے گیا جہاں بجلی سے چلنے والی چیزیں رکھی گئی تھیں۔ جب وہ نمائش میں گھوم رہا تھا تو ایک شخص نے اس سے ملاقات کی جو اسے موجد کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر تم مال دار بننا چاہتے ہو تو کوئی ایسا ہتھیار ایجاد کرو جس سے یہ یورپی ممالک ایک دوسرے کو خون میں نہلا سکیں۔'' اس کی مراد تھی کہ آگ اگلنے والا کوئی ہتھیار ایجاد کرو۔

ہرام میکسم جب واپس امریکا گیا تو اس نے چند برسوں میں ایک مشین گن ایجاد کر ڈالی۔ 1885ء میں اس نے اپنی گن کا برطانوی فوج کے سامنے مظاہرہ کیا۔ یہ دنیا کی پہلی خود کار (آٹومیٹک) مشین گن تھی جسے چھوٹی تپائی پر رکھا جاسکتا تھا۔ میکسم نے اس میں ایسا سسٹم لگا دیا تھا فائر ہونے کے بعد کارتوس مشین گن سے نکل آتا تھا اور اس کی جگہ دوسرا کارتوس لے لیتا۔ اس میں گولیاں بھرنے کی بجائے گولیوں کا پٹا استعمال کیا جاتا تھا۔ جب تک یہ پٹا ختم نہ ہو جائے مشین گن چلتی رہتی تھی۔ اس مشین گن سے ایک منٹ میں 500 راؤنڈ فائر کیے جاسکتے تھے۔ گویا اس میں 100 رائفلوں کے برابر طاقت تھی۔

برطانوی فوج نے ان بندوقوں کے لیے بھاری آرڈر دیا۔ آنے والے برسوں میں آسٹریا، جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور روس نے ایسی بندوقیں خریدیں۔ برطانیہ نے اس مشین گن کو میٹا بیلی میں 1893ء کی جنگ میں استعمال کیا۔ برطانیہ کے پچاس فوجیوں کے سامنے 5000 کی نفری تھی۔ انہوں نے یہ جنگ جیت لی جب کہ اس میں میکسم کی صرف چار مشین گنیں استعمال کی گئی تھیں۔

اس کے بعد یورپ کے سارے ملکوں نے مشین گنوں

میں دل چسپی لی۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے جو مشین گن استعمال کی وہ "وکرز مشین گن" تھی۔ جو نہ صرف یہ کہ آٹو میٹک تھی بلکہ زیادہ گولیاں فائر کرتی تھی۔

1895ء میں ایک اور مشین گن ایجاد ہوئی۔ جسے 1904ء میں مارکیٹ میں لایا گیا۔ اسے ہیوی کاپلیکس مشین گن کہتے تھے۔ اس گن میں نال کا وزن اٹھانے کے لیے ایک چھوٹا سا اسٹینڈ لگایا تھا، تاکہ گن کی نال سطح زمین سے اٹھی رہے۔ نال کو اسٹینڈ پر رکھ کر چاروں طرف گھمانا بھی ممکن تھا۔ اس کا وزن 153 پاؤنڈ تھا۔

1909ء میں ایک اور مشین گن نے اس کی جگہ لے لی، اس لیے کہ پہلے والی مشین گنوں کی نالوں پر پانی ڈال کر انہیں ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ یہ گن جسے بینیٹ مرسی نے ایجاد کیا تھا، صرف 27 پاؤنڈ وزنی تھی۔ مگر فوج نے اسے پسند نہیں کیا اس لیے کہ ان کے خیال میں یہ اب بھی بھاری تھی اور اسے کوئی جوان اٹھا کر فائر نہیں کرسکتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں مشین گنوں کی بہت ضرورت تھی لیکن 1917ء میں امریکی فوج نے ابتدا میں صرف چھ مشین گنیں استعمال کیں۔ اس لیے کہ جنرلوں کو اس کی کارکردگی پر اطمینان نہیں تھا۔ اس کے برعکس جرمنی کے سپاہیوں کو اس پر مکمل بھروسا تھا اس لیے انہوں نے انفنٹری کے سپاہیوں کو مشین دے کر سب سے آگے رکھا۔

اس کے بعد براؤننگ نامی موجد نے ایک اور مشین گن بنائی جو صرف 19 پاؤنڈ کی تھی اور گردوپیش کی ہوا سے ٹھنڈی ہوجاتی تھی۔ فوج کے جنرلوں کو یہ مشین گن پسند آگئی۔ چنانچہ 50 مشین گنوں کا آرڈر دے دیا گیا۔ یہ گن انفنٹری (پیدل) فوج کے لیے کارآمد تصور کی گئی۔ جنگ چونکہ جاری تھی اس لیے اسے فرانس کے محاذ پر استعمال کیا گیا۔ اس کی کارکردگی سے مطمئن ہوکر مزید آرڈر دیے گئے، لہٰذا جب جنگ ختم ہوئی تو امریکی فوج کے ہر ڈویژن کو 260 مشین گنیں دی جاچکی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران مشین گنوں پر انحصار بڑھ گیا (اس لیے کہ اس سے کم وقت میں زیادہ آدمی ہلاک کیے جاسکتے تھے۔) 1943ء میں ہر امریکی انفنٹری کے پاس 157 اور 236 کیلیبر کی براؤننگ مشین گنیں دی گئیں۔ کچھ مشین گنیں طیاروں میں بھی لگائی گئیں اور انہیں اینٹی ایئر کرافٹ گن کی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔ اس مشین کا وزن صرف 23 پاؤنڈ تھا۔

ابتدا میں مشین گنوں سے بطور ہتھیار کام تو لیا گیا، لیکن فوجی جوان اسے استعمال کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے، اس لیے کہ اس کی نال جلد گرم ہوجایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی۔ رفتہ رفتہ انہیں بہتر بنایا گیا اور ان کے وزن میں کمی کی گئی۔ نئی جدت کے تحت بعد میں بننے والی مشین گنوں کی نال سے بارود کا دھواں نہیں نکلتا تھا۔ وزن میں کمی ہوگئی تو انہیں فوجی جوان ہاتھ میں اٹھا کر استعمال کرنے لگے۔ ان خصوصیات کی بنا پر امریکی فوج کا انحصار مشین گن پر بڑھ گیا۔ اسے دوسری جنگ عظیم کے بعد وسیع پیمانے پر جنگوں میں استعمال کیا جانے لگا۔

جدید دور میں مشین گنوں کو تین اقسام میں تقسیم کردیا گیا۔ اول لائٹ مشین گن کہلاتی تھی، جسے اسکواڈ آٹو میٹک بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی نال کو سہارا دینے کے لیے اسٹینڈ لگا ہوتا ہے، لیکن اسے چلانے کا طریقہ چونکہ سہل ہے، اس لیے ایک مشین گن کو صرف ایک جوان استعمال کرتا ہے۔ اس میں ایمونیشن کا بیلٹ فوری طور پر لگایا جاسکتا ہے۔

میڈیم مشین گن کو جنرل مشین گن بھی کہتے ہیں۔ اس میں بھی ایمونیشن کا بیلٹ استعمال کیا جاتا ہے جو بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ اس کی نال کو سہارا دینے کے لیے جو فولادی اسٹینڈ لگا ہوتا ہے اس میں دو کے بجائے تین ڈنڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھرپور طاقت سے اپنے ہدف کی طرف گولیاں پھینکتی ہے۔

تیسری قسم کو ہیوی مشین گن کہا جاتا ہے۔ جسے کئی سپاہی چلاتے ہیں۔ اس کا نام ہیوی مشین اس لیے رکھا گیا کہ اسے اٹھا کر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ایک سپاہی ہنڈل کے پاس لیٹ کر فائرنگ کرتا ہے اور دوسرا اس کا بیلٹ تبدیل کرتا ہے۔ اس مشین گن سے ایک منٹ میں ہزاروں گولیاں فائر کی جاسکتی ہیں لہٰذا ایک برسٹ میں ایک گاؤں ختم کیا جاسکتا ہے۔

مشین گنوں کو طیاروں میں نصب کرنے کے علاوہ ہیلی کوپٹر اور ٹینکوں پر بھی نصب کیا گیا۔ تاکہ محاذ پر ہر طرف سے گولیاں برسائی جاسکیں اور جنگ کے دوران فتح کو یقینی بنایا جاسکے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو کرۂ ارض پر امن و آشتی سے رہنے، احکام خداوندی کی پیروی کے لیے پیدا کیا لیکن انسانوں کو بھٹکانے والا شیطان بھی مسلسل اپنے کام میں لگا رہا۔ مہلک ہتھیار کی تیاری میں شیطان ہی کی مدد رہتی ہے جو خون خرابے کی فضا تیار کراتا ہے۔

فلم نگری

نوآموز تخلیق کار

انور فرہاد

کہا یہ جاتا ہے کہ نو آموز وقت و پیسے کو برباد کرتے ہیں۔ ان سے کامیابی کی توقع عبث ہے لیکن پاکستانی فلم نگری نے اس بات کو غلط ثابت کیا ہے۔ کامیابیوں کی مثالیں رقم کی ہیں۔

فلم نگری سے دو زندہ مثال جس نے بولی ووڈ کو بھی حیران کر دیا

''تمہاری بیٹی تو ابھی کمسن ہے، نادان ہے مگر تم بچے نہیں ہو طیب رضوی! اسے سمجھاؤ روکو، ابھی یہ اس کے بس کی بات نہیں۔''

طیب رضوی نوخیز اداکارہ سنگیتا کے والد محترم تھے۔ سنگیتا جس نے محض چودہ سال کی عمر میں اداکار رحمان کی فلم ''کنگن'' سے اداکاری شروع کی تھی۔ ڈھاکے کی اس فلم کے بعد کراچی کی کچھ فلموں میں بھی کام کیا۔ پھر اپنے والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئی۔ کچھ فلموں میں کام کر کے اپنی

اداکاری سے متاثر کیا اور پھر اپنی نو عمری کے باوجود ایک فلم ”سوسائٹی گرل“ بنا کر ہدایت کاروں کی صف میں شامل ہو گئی۔ اس فلم کو دیکھ کر پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ کسی ناپختہ اور ناتجربہ کار کی ڈائریکشن میں بنائی گئی ہے۔ اس فلم کے بعد اس نے چند فلمیں اور ڈائریکٹ کیں مگر اب اس نے ایک ایسی فلم بنانے کا اعلان کر دیا تھا جس کی کہانی بہت پیچیدہ اور موضوع بہت ٹف تھا۔ اس بات پر فلم انڈسٹری کے لوگ جو اس کے اور اس کے والدین کے خیر خواہ تھے، فکر مند ہو گئے اور انہوں نے اس نوخیز اداکارہ کے والد کو سمجھانا شروع کیا۔

”یار طیب رضوی! مانا کہ وہ تمہاری لاڈلی بیٹی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اگر وہ کھیلن کو چاند مانگے تو تم آسمان پر جا کر چاند توڑ لانے کی جسارت بلکہ حماقت کرو۔“

”ہاں۔“ طیب رضوی کا کوئی اور خیر خواہ کہتا۔ ”تم خود سوچو۔ وہ جو کرنے جا رہی ہے وہ کر بھی سکے گی؟“

ایک اور فلمی دوست نے ٹوکا۔ ”ٹھیک ہے، اسے فلم ڈائریکٹ کرنے کا شوق ہے۔ ”سوسائٹی گرل“ اور ایک دو فلمیں اس نے ڈائریکٹ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں یہ ٹیلنٹ ہے کہ وہ فلم بنا سکتی ہے مگر اس نے ایک دم جس کہانی پر فلم بنانے کا ارادہ کر لیا ہے وہ ہرگز اس کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ تم اس کے باپ ہو۔ اس کے مربی ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ فی الحال ایسے سانپ کے بل میں ہاتھ نہ ڈالے جس کے کاٹے کا منتر نہ جانتی ہو۔“

مہتاب بانو سے بھی مل کر فلم والوں نے سنگیتا کو ایسا خطرناک قدم اٹھانے سے روکنے کی تلقین کی۔ ”مہتاب بانو! آپ تو بڑی سوجھ بوجھ کی حامل خاتون مشہور ہیں، آپ بھی اسے نہیں سمجھاتیں کہ بیٹا! ابھی ایسا کوئی قدم نہ اٹھاؤ جس کا بوجھ ابھی تم نہیں اٹھا سکتی ہو۔“

مہتاب بانو بڑی دبنگ اور اپنے میاں سے بھی زیادہ سیانی سمجھی جاتی تھیں۔ سنگیتا ان کے پہلے شوہر کی اولاد تھی۔ اب تک اس نے جو ترقی کی تھی اس میں اس کی ماں مہتاب بانو کی حکمت عملی کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ سنگیتا نہ صرف حسن و شباب کی ملکہ تھی بلکہ رب العزت نے اسے ایک ذہن رسا بھی عطا کیا تھا۔ نوخیز اداکارہ کے خطاب سے ابھر کر فلمی افق پر نمودار ہوئی اور اپنی خداداد اداکارانہ صلاحیتوں سے فلم سازوں، ہدایت کاروں اور فلم بینوں کو زبردست طریقوں پر متاثر کیا اور جب اس نے ہدایت کاری کے میدان میں قدم رکھنے کی خواہش ظاہر کی تو طیب رضوی اور مہتاب بانو نے اس کی دل شکنی نہیں کی۔ یہ وہ موقع تھا جب کوئی فلم ساز کوئی انویسٹر اس سے اپنی فلم ڈائریکٹ نہیں کروا سکتا تھا اس لیے اس کے ماں باپ نے اس کی کمائی ہوئی دولت کو ہی استعمال کر کے فلم سازی کا بوجھ خود اٹھایا اور اداکارہ بیٹی کی ہدایت کاری کا شوق پورا کیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اس کی اداکاری کی طرح اس کی ہدایت کاری بھی پسند کی گئی۔ اس کی تمام تر ناتجربہ کاری کے باوجود اس کی ہدایت کارانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں اور اس کی پہلی فلم ہی ہٹ ہو گئی۔

مگر اب اس نے ایک ایسی فلم بنانے کا عزم و ارادہ کر لیا تھا۔ جسے کسی طور کامیابی نہ ملتی۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ یہ کہانی ہی نہیں اس کا پیچیدہ موضوع بھی بہت ٹف ہے۔ یہ نوخیز اداکارہ و ہدایت کارہ یہ فلم بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ فلم والے اس کے اور اس کے والدین کے خیر خواہ تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ تیز رفتاری سے ترقی کرنے والی یہ لڑکی ٹھوکر کھا کر گر پڑے اور اس کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ ان دنوں نگار خانوں میں بھی فلم والے اسی موضوع پر بات کرتے۔

”یار! اس لڑکی سنگیتا کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا اس کی عمر تو دیکھو، اس کے محدود تجربے کو تو دیکھو اور پھر اس کے اس ارادے کو دیکھو کہ وہ راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ ”ایک چادر میلی سی“ کو فلمانے کی بات کر رہی ہے۔“

”یا تو اس نے اس ناول کو پڑھا نہیں ہے یا.....“

”ارے یار! پڑھا نہیں ہے تو اس پر فلم بنانے کا ارادہ کیسے کر لیا؟“

”اگر پڑھ بھی لیا ہے تو سمجھیں نہیں ہو گی کہ یہ کتنا ٹف سبجیکٹ ہے۔“

ایک صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی۔ ”اگر یہ ایسا ہی آسان سبجیکٹ ہوتا کہ اس پر سنگیتا جیسی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی بچی فلم بنالے گی تو بمبئی کے فلم والے اس کہانی پر فلم نہیں بنا لیتے؟“

”میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں، اگر بولی ووڈ والے راجندر سنگھ بیدی کی کہانی پر ”گرم کوٹ“ بنا سکتے ہیں۔ عصمت چغتائی کی کہانی پر ”ضدی“ بنا سکتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کی کہانیوں پر فلمیں بنا سکتے ہیں تو ”ایک چادر

میلی سی" پر بھی فلم بنا چکے ہوتے۔"
"ممبئی کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اس کہانی کو بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دیا کہ یہ بڑا پیچیدہ اور گھمبیر سبجیکٹ ہے۔ اس پر فلم بنانا ہمارے بس کی بات نہیں۔"

راجندر سنگھ بیدی اردو ادب کا ایک بہت بڑا لکھاری تھا۔ اس نے اردو ادب کو متعدد شاہکار افسانوں کی دولت سے مالا مال کیا۔ "ایک چادر میلی سی" بھی اس کی ایک خاص موڈ مزاج کی کہانی ہے۔ یہ طویل مختصر کہانی جو بعد میں ناولٹ کے روپ میں شائع کی گئی۔ سکھوں کے ایک خاص طبقے کی کہانی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی خود بھی سکھ مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے ہم عصر بلونت سنگھ کی طرح زیادہ تر کہانیاں سکھوں کے بارے ہی میں لکھا کرتا تھا۔ سکھوں کی تہذیب و تمدن کو اس نے اپنے افسانوں کے ذریعے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"ایک چادر میلی سی" ابتداء سے انتہا تک سکھوں کے ایک مخصوص علاقے کی کہانی ہے۔ ایک خاص گاؤں کے گرد اس کہانی کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔ اس کہانی میں محبت بھی ہے۔ نفرت بھی ہے۔ انتقام بھی ہے۔ انسانی کمزوریاں بھی ہیں۔ قربانی اور ایثار بھی ہے۔ خود غرضی اور عورت پر ظلم و تشدد بھی ہے۔ یہ سب کچھ کہانی کار نے اتنی چابکدستی کے ساتھ اپنی کہانی میں پیش کیا ہے کہ جہاں وہ ایک ناقابلِ فراموش کہانی بن جاتی ہے وہاں تکنیکی اعتبار سے ایسی الجھی ہوئی اور پیچ دار صورت اختیار کر لیتی ہے کہ اسے فلم کے روپ میں ڈھالنے کا خیال ایک ڈراؤنا خواب بن جاتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی کہانی پر "گرم کوٹ" بن کر کامیاب ہوئی تو کئی فلم والوں نے "ایک چادر میلی سی" پر بھی فلم بنانے کا ارادہ کیا مگر جب عملی طور پر جائزہ لیا تو انہیں لگا یہ عام کہانیوں سے بہت مختلف ہے۔ بہت پیچیدہ اور الجھا ہوا سبجیکٹ ہے۔ جس پر وہ ایک کامیاب فلم نہیں بنا سکتے۔

سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام تھا کہ ایک ناپختہ ذہن کی اداکارہ اور ہدایت کارہ سنگیتا نے اس ٹف سبجیکٹ پر مبنی کہانی کو سلولائیڈ پر منتقل کرنے کا دعویٰ کر دیا تھا کہ میں بناؤں گی اس کہانی پر فلم۔

جس پر کہنے والوں نے تو یہ بھی کہا۔ "سنگیتا نے تو کسی ایک سکھ کو قریب سے دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ وہ بھلا سکھوں کے ایک مخصوص گاؤں کی کہانی کیسے فلما لے گی؟"

"اسی کو شاید لڑکی بدمی کہتے ہیں۔ یا لک ہٹ کہتے ہیں۔"

لوگ اپنی اپنی بولیاں بولتے رہے۔ طیب رضوی اور مہتاب بانو کے علاوہ خود سنگیتا سے مل کر بھی اس کو اس ارادے سے باز رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔

ایک دن بی این آر پروڈکشن کے دفتر میں کچھ سیانے فلمی پنڈت طیب رضوی اور مہتاب بانو کو بڑی نیک نیتی سے سمجھا رہے تھے۔ "ہم تم لوگوں کے بھی خواہ ہیں اس لیے نہیں چاہتے کہ بالک ہٹ میں تمہاری بچی تمہاری پروڈکشن کو نقصان پہنچائے اور اپنی جو ساکھ ہے اسے بھی متاثر کرے۔"

طیب رضوی کچھ کہنا چاہتے تھے کہ مہتاب بانو نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ "ہمایوں بادشاہ نے اپنے کمسن شہزادے اکبر کی تربیت کے لیے بہرم خان کو اس کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ ایک دن دربار میں شہزادے کے ہاتھ سے دربار کی کوئی قیمتی چیز گر کر ٹوٹ گئی۔ شہزادے نے ذرا سہم کر استاد مکرم کی طرف دیکھا۔ بہرم خان نے جھٹ بڑی خوش دلی کے ساتھ کہا۔ "شہزادے! تم سے بڑھ کر تو دربار کی کوئی چیز نہیں۔"

"اچھا...... یہ بات ہے۔"

"ہاں تم چاہو تو دو چار چیزیں اور توڑ دو۔"

شہزادے نے اپنے جوش و جذبے کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے دربار کی چند اور قیمتی چیزیں اٹھا کر فرش پر دے ماریں۔

اس وقت تو نہیں۔ بعد میں چند درباریوں نے بہرم خان کو ٹوکا۔ "آپ نے شہزادے کو ان کی غلطی پر تنبیہ کرنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ یہ آپ انہیں کیسی تربیت دے رہے ہیں؟"

بہرم خان نے درباریوں کی بات پر شرمندہ ہونے کی بجائے بڑے اعتماد سے کہا۔ "میں نے جو کچھ کیا ہے۔ شہزادے کی بہتر تربیت کے لیے کیا ہے۔ کل اسے ہندوستان کا شہنشاہ بننا ہے۔ اس کے دل میں کسی بات کا خوف پیدا کر کے میں اس کے بلند حوصلے کو پست نہیں کرنا چاہتا۔"

مہتاب بانو خاموش ہوئیں تو ایک فلمی پنڈت نے کہا۔ "گویا ہم یہ سمجھیں کہ جس طرح بہرم خان نے اکبر کو اکبرِ اعظم بنایا تھا اسی طرح آپ سنگیتا کو دی گریٹ سنگیتا بنانا/

چاہتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ آپ بالکل درست سمجھے۔ میری بیٹی اپنی کوشش میں اگر جیت گئی تو کیا کہنا، ہاری بھی تو بازی مات نہیں۔ محترم! کچھ پانے کے لیے کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ پی این آر پروڈکشن اسی کے کمائے گئے پیسوں سے بنایا گیا ہے۔ اگر اس کی فلم "مٹھی بھر چاول" ناکام بھی ہوگئی تو ہمیں کوئی غم نہیں ہوگا۔" مگر ایسا نہیں ہوا۔ "ایک چادر میلی سی" "مٹھی بھر چاول کے نام سے بنی تھی۔ اس نے تہلکہ مچا دیا۔ لالی ووڈ سے لے کر بالی ووڈ تک اس کی شہرت کی گونج سنائی دی۔ کمسن اور ناپختہ ہدایت کارہ دی گریٹ سنگیتا بن گئی۔

مہتاب بانو نے اپنے بچوں، سنگیتا (اصل نام پروین) کوتا (اصل نام نسرین) اور بیٹے رضا رضوی کے ناموں کے پہلے حروف کو لے کر 1975ء میں پی این آر پروڈکشنز کے نام سے ایک فلمساز ادارہ قائم کیا اور اس کے بینر تلے پہلی فلم "تیرے میرے سپنے" بنائی جس کے ہدایت کار اقبال رضوی تھے۔ پی این آر پروڈکشنز کی پہلی ہی فلم سپرہٹ ہوئی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس ادارے کی دوسری فلم "سوسائٹی گرل" تھی جس سے نوخیز اور خوبرو اداکارہ سنگیتا نے بحیثیت ہدایت کارہ اپنی فنی کیریئر کا آغاز کیا۔ یہ فلم بھی سپرہٹ ثابت ہوئی۔

اب آیئے راجندر سنگھ بیدی کی کہانی "ایک چادر میلی سی" اور سنگیتا کی فلم "مٹھی بھر چاول" کا جائزہ لیتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کی کہانی "ایک چادر میلی سی" کو مختصر طور پر اس طرح پیش کر سکتے ہیں۔ ایک گاؤں میں تانگہ بان ترلوک سنگھ اپنی ماں مائی چنداں اور باپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس گاؤں میں ایک جفاکش لڑکی رانو بھی گھاس فروخت کر کے گزر اوقات کرتی ہے۔ ترلوک سنگھ اپنے گھوڑے کے لیے رانو سے گھاس خریدنے آتا جاتا ہے۔ اس طرح رانو اور ترلوک سنگھ کی ملاقاتیں ہوتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ ترلوک سنگھ کا ایک چھوٹا بھائی منگل سنگھ بھی ہے۔ وقت گزرتا ہے اور پھر ترلوک سنگھ رانو کو اپنی دلہن بنا کر گھر لے آتا ہے۔ رانو ایک جفاکش اور محنتی عورت ہے۔ اس لیے وہ ترلوک سنگھ کی ماں، باپ اور بھائی کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ ساتھ ہی گھر کے تمام کام بھی خوشی خوشی کرتی ہے۔ مائی چنداں ہر وقت رانو کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی ہے کیونکہ وہ غصے کی بہت تیز ہے۔ اس دوران رانو دو بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ یعنی ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو جنم دیتی ہے۔ اب رانو کو معلوم ہوتا ہے کہ ترلوک سنگھ اچھی خصلت کا انسان نہیں۔ کثرت سے شراب پیتا ہے۔ بیوی بچوں کا بالکل خیال نہیں رکھتا۔ شراب نہ ملنے پر رانو کی خوب پٹائی کرتا ہے۔ اسی گاؤں میں ایک ہندو مہاجن بھی رہتا ہے جو شراب فروخت کرتا ہے۔ اکثر ترلوک سنگھ اس سے شراب خریدتا ہے۔ ایک روز شراب کی ایک بوتل کی خاطر ترلوک سنگھ گاؤں کی ایک کمسن لڑکی کو مہاجن کے ہاتھوں فروخت کردیتا ہے۔ مہاجن کمسن لڑکی کی عزت تار تار کردیتا ہے۔ دوسری طرف جب کمسن لڑکی کے بھائی مہابیر سنگھ کو معلوم ہوتا ہے کہ ترلوک سنگھ نے اس کی بہن کی عزت لٹوائی ہے تو وہ غصے میں آگ بگولہ ہو کر ترلوک سنگھ کو قتل کردیتا ہے۔ ترلوک سنگھ کی موت کے بعد رانو کی مشکلات مزید بڑھ جاتی ہیں۔ تاہم گاؤں کے بزرگ گھر والوں کی رضامندی سے رانو کی شادی زبردستی ترلوک سنگھ کے چھوٹے بھائی منگل سنگھ سے کروا دیتے ہیں۔ اگرچہ منگل سنگھ خود بھی یہ شادی نہیں کرنا چاہتا ہے مگر بادل نخواستہ اس شادی کو قبول کرلیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ رانو کی چھوٹی بیٹی بالغ ہوجاتی ہے تو اس کی شادی کا مرحلہ آتا ہے، یہ جان کر سب حیران رہ جاتے ہیں کہ چھوٹی کا ہونے والا شوہر دراصل چھوٹی کے باپ کا قاتل مہابیر سنگھ ہے۔ اس موقع پر رانو اپنے پتی کے قاتل کو اپنا داماد ماننے سے انکار کردیتی ہے۔ تاہم جب مہابیر سنگھ رانو کو ترلوک سنگھ کے قتل کرنے کی وجہ بتاتا ہے تو رانو کا دل صاف ہوجاتا ہے۔ اس طرح چھوٹی کی شادی مہابیر سنگھ کے ساتھ ہوجاتی ہے اور رانو، منگل سنگھ کے ساتھ ایک نئے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ یہاں یہ کہانی ختم ہوجاتی ہے۔

اب سنگیتا کی فلم "مٹھی بھر چاول" کی روداد سنیے کہ اس نے "ایک چادر میلی سی" کو "مٹھی بھر چاول" کے نام سے فلم بنانے کے لیے کیا کیا۔

ایک اچھا اور باصلاحیت ہدایت کار کہانی کے کرداروں کے لیے جتنا اچھا انتخاب اداکاروں اور اداکاراؤں کا کرتا ہے۔ اتنا ہی اس کے حسن انتخاب کی داد دی جاتی ہے۔ سنگیتا نے جو اس وقت آج کی بادام سنگیتا کی طرح تجربوں کی آنچ میں پک کر کندن نہیں بنی تھی۔ اس کے باوجود اس نے کہانی کے کرداروں کے لیے جن آرٹسٹوں کا انتخاب کیا اور ان سے جو کام لیا۔ فلم کی نمائش کے بعد فلمی

ناقدین اور مبصرین کے علاوہ ناظرین نے بھی دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ ترلوک سنگھ کے لیے اس نے غلام محی الدین کو لیا۔ اس کی ماں مائی چنداں کے لیے نجمہ بیگم کا انتخاب کیا۔ ترلوک سنگھ کے باپ کے لیے ساقی کو منتخب کیا۔ رانو جو فلم کی ہیروئن تھی اس کے لیے سنگیتا نے خود اپنے آپ کو چنا۔ ترلوک سنگھ کے چھوٹے بھائی منگل سنگھ کے لیے ندیم کا انتخاب کیا۔ ہندو مہاجن کا کردار کمال ایرانی سے کروایا۔ کمسن لڑکی کے بھائی مہابیر سنگھ کا کردار جس نے ترلوک سنگھ کو قتل کیا۔ راحت کاظمی سے ادا کروایا۔ رانو کی بیٹی چھوٹی کا کردار شہلا گل سے کروایا۔

ہر اداکار اور اداکارہ نے اپنا کردار اس خوبی سے نبھایا کہ جس نے بھی فلم دیکھی اس نے تعریف کی۔ اگرچہ فلم کی کہانی سب کے لیے بالکل نئی تھی۔ انوکھی تھی، کہانی کا ماحول اور فضا نامانوس تھی جب کہ سکھوں کا روایتی لباس، پگڑی، کرتہ اور لاچا کو زیب تن کر کے اداکاری کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس فلم کی نمائش کے بعد صحافیوں نے متذکرہ بالا اداکاروں اور اداکاراؤں سے پوچھا۔

''سکھوں کے گیٹ اپ میں اداکاری کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟''

تو کچھ اس قسم کے جواب ملے۔

''اوہ! کچھ نہ پوچھیے۔ ایک نئے سبجیکٹ کی کہانی کے کردار ادا کرنے کا تجربہ بڑا عجیب تھا۔ بہت مشکل بہت ٹف کام تھا۔''

''ہم آرٹسٹوں کو ہر طرح کے کردار کرنے پڑتے ہیں مگر ''مٹھی بھر چاول'' کا تجربہ جہاں بڑا دلچسپ تھا۔ وہاں ہمارے لیے قدرے مشکل بھی تھا مگر فلم کی ڈائریکٹر نے ہمیں بخشا نہیں۔ اپنی مرضی اور پسند کی پرفارمنس کرواکر رہیں۔''

''سکھوں کی مخصوص پگڑی اور داڑھی نے بڑی مشکل پچویشن پیدا کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود سنگیتا بی بی نے ہم سے من چاہا کام کروایا۔ جب تک مطمئن نہیں ہوتیں بار بار نیا شاٹ لیتی رہتیں۔''

''اس فلم کے بننے سے پہلے ہم نے بھی لوگوں کی زبانی یہ سنا تھا کہ سنگیتا نے تو شاید کسی سکھ کو قریب سے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ مکمل سکھوں کی کہانی کیسے فلمائیں گی؟ مگر اس کی میکنگ کے دوران ہمیں ایسا لگا جیسے سنگیتا جی پیدائشی سکھ ہیں۔ انہوں نے نہ صرف خود ایک سکھ عورت کا

سنگیتا بمقابلہ سید سلیمان

ایس سلیمان اور سنگیتا نے اپنی نوعمری اور نو آموزی کے دور میں یادگار فلمیں بنائیں اور اپنی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان دونوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایس سلیمان کے مقابلے میں سنگیتا زیادہ کامیاب رہیں۔ ایس سلیمان کی فلم ''باجی'' سنگیتا کی ''مٹھی بھر چاول'' کی طرح بہت بڑی اور اہم فلم ثابت نہیں ہوئی اگرچہ اپنی کہانی اور اس کے قدرے مختلف موضوع کی وجہ سے اسے ایک اچھی، معیاری اور نیم کلاسیکی فلم کا درجہ حاصل ہوا۔

لیکن ان دونوں کے مستقبل یا آنے والے زمانے کا اگر تجزیہ کیا جائے تو سنگیتا کے مقابلے میں ایس سلیمان کا کیریئر زیادہ مستحکم اور محفوظ نظر آتا ہے۔ ایس سلیمان نے جو فلمیں بنائیں ان میں زیادہ تر باکس آفس پر کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ معیار کے لحاظ سے بھی قابلِ تعریف ثابت ہوئیں۔ انہوں نے ہر طرح کی فلمیں بنائیں سنجیدہ بھی اور ہنسنے ہنسانے والی بھی۔ ان کی فلموں سے کبھی ان کی ساکھ کو نقصان نہیں پہنچا۔

سنگیتا کے کیریئر پر نظر ڈالی جائے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی خداداد صلاحیتوں کو پھولنے پھلنے کا ویسا موقع نہیں ملا جیسا ایس سلیمان کو ملا۔ سنگیتا کے عروج کے دور میں فلم انڈسٹری کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھوں یرغمال ہوگئی جو نان کمرشل اور نان ٹیکنیکل تھے۔ انہوں نے مار دھاڑ سے بھرپور غنڈوں اور بدمعاشوں کی کہانیوں پر مبنی غیر معیاری اور غیر اخلاقی فلمیں بنانا شروع کیں اور سنگیتا اور ان جیسی اچھی صلاحیتوں کے فلم میکرز کو مجبور کیا کہ وہ ان کے لیے فلمیں بنائیں۔ جب تک ایسے مافیا کا قبضہ فلم انڈسٹری پر رہا سنگیتا کی صلاحیتیں ضائع ہوتی رہیں۔ جب ایسے لوگوں کے قبضے سے فلم انڈسٹری آزاد ہوئی تو سنگیتا کو اچھی فلمیں بنانے کا موقع ملا۔ اس طرح سنگیتا کے کریڈٹ میں بہت سی غیر معیاری اور غیر اخلاقی فلمیں بھی شامل ہوگئیں۔

کرداریوں نبھایا جیسے وہ اسی ماحول کی پروردہ ہیں اور ہمیں بھی بھرپور طور پر سکھ بنا کر پیش کیا۔"

نوعمر اور ناتجربہ کار سنگیتا نے اپنی خداداد فنی صلاحیتوں کا جو مظاہرہ "مٹھی بھر چاول" بنا کر کیا ہے۔ اس کی داد مستند بڑے اور تجربہ کار ہدایت کاروں نے بھی دی، یہاں تک کہ بولی ووڈ کے جید فلم میکرز نے بھی اس فلم کی ہدایت کارہ کی تعریف و توصیف کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

"مٹھی بھر چاول" کی تکمیل میں پسِ پردہ جن لوگوں نے سنگیتا کی معاونت کی۔ ان میں اقبال رضوی کا نمایاں نام ہے۔ انہوں نے "ایک میلی سی چادر" کی کہانی کو "مٹھی بھر چاول" کے اسکرپٹ کی شکل دینے میں اپنی پوری فنی مہارت کا ثبوت دیا۔ اس کے اسکرین پلے اور مکالمے بھی انہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

واضح رہے کہ اقبال رضوی کا سنگیتا اور اس کی فیملی کے ساتھ اس وقت سے تعلق ہے جب طیب رضوی اور مہتاب بانو نے اپنے پروڈکشن ہاؤس کی پہلی فلم "تیرے میرے سپنے" بنائی تھی۔ وہ اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔ "مٹھی بھر چاول" میں انہوں نے بہت محنت کی۔ سنگیتا جی نے ان سے اپنی مرضی کا بھرپور کام لیا۔ کہیں بھی نرمی یا سمجھوتا نہیں کیا۔

"مٹھی بھر چاول" کے موسیقار کمال احمد تھے۔ انہوں نے خواجہ پرویز اور تسلیم فاضلی سے اپنی کمپوز کی گئی دھنوں پر نغمات لکھوا کر مہناز بیگم، شوکت علی، مسعود رانا اور ناہید اختر سے فلم کے چھ نغمات ریکارڈ کروائے۔

فلم کا ماحول اور کہانی سکھ کلچر سے تعلق رکھتی ہے اور سکھ پنجابی بولتے ہیں۔ اس لیے کئی گانوں میں پنجابی الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ گیتوں کے بول کچھ اس طرح کے تھے۔

☆ تینوں پئیں گے نصیباں والے نی شیشے دی اے بند بوتلے (غلام محی الدین اور سنگیتا پر پکچرائز ہوا۔ آواز شوکت علی اور مہناز کی)۔

☆ اے گل نہ بھلا دیں جند میرئے (پکچرائز ندیم پر ہوا۔ آواز شوکت علی)

☆ اک کڑی گلاب دی من موہنی تے من چلی (پکچرائز ندیم۔ آواز مسعود رانا)

☆ ابھاگن کو سجناں سہاگن بنا دے جو سوئے ہیں ارمان۔ (رومانہ اور سہیلیوں پر عکس بند ہوا۔ آواز مہناز اور سہیلیاں)

☆ او دولھے بادشاہ میں صدقے جاواں تیرے (پکچرائز سنگیتا۔ آواز مہناز بیگم)

☆ کرتی تھی تو یہ شادی کے نام سے۔ تو بھی گئی سکھی ری کام سے (کویتا پر فلمبند ہوا۔ آواز ناہید اختر)

فلموں کے لیے جہاں گیت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں وہاں فلم کی اساس اور بنیاد اچھی اور بھرپور ہونے کے علاوہ کہانی اور اسکرپٹ بھی اچھا ہونا ضروری ہے۔ آج سے 38 سال پہلے بننے والی فلم جو 1978ء میں بنائی گئی۔ اگر اس فلم کو اسکرپٹ کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بڑی مہارت کے ساتھ "مٹھی بھر چاول" کا اسکرپٹ لکھا گیا ہے۔ اسکرین پلے جتنا مربوط ہے مکالمے اسی قدر کہانی اور چویشن کے مطابق سیدھے سادے انداز میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اسکرین پلے کو سکھوں کے خاص طرزِ زندگی کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ سکھوں کے رہن سہن، بول چال کو رائٹر نے ماہرانہ انداز میں تحریر کیا ہے اور ہدایت کارہ نے آرٹسٹوں سے بڑی خوبی کے ساتھ ادا کروایا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم دیگر فنی شعبوں کے سلسلے میں بتائیں۔ ضروری امر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنگیتا بی بی کو سکھوں کی کہانی فلمانے کے سلسلے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا بھی کچھ ذکر کر دیا جائے۔

تقسیم ہند سے پہلے سکھ لاہور اور پنجاب کے دیگر شہروں میں بڑی تعداد میں بستے تھے مگر پاکستان بننے کے بعد ہندوؤں کے ساتھ سکھوں نے بھی نقل مکانی کی اور مشرقی پنجاب و بھارت کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے وہ یہاں کے لیے نایاب ہو گئے۔ نئی نسل کو معلوم ہی نہیں تھا کہ سکھ کیسے ہوتے ہیں۔ سنگیتا بھی اسی نسل سے تعلق رکھتی تھیں مگر جب سکھوں کی کہانی پر فلم بنانے کا مرحلہ آیا تو سکھوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ان لوگوں سے رابطہ کر کے سکھ براوری اور ان کے کلچر کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا شروع کر دیں۔ جنہوں نے سکھوں کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ ان کی تہذیب اور تمدن سے واقف تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سکھوں کے بارے میں مطبوعہ لٹریچر سے بھی انتساب کیا۔ یہ کام بہت کٹھن تھا۔ بہت دشوار تھا مگر ضروری بھی تھا کہ بغیر مکمل اور بھرپور معلومات حاصل کیے وہ اپنی فلم کو

معیاری اور اچھی نہیں بنا سکتی تھیں۔
واضح رہے کہ وہ وقت جدید ٹیکنالوجی کا دور نہیں تھا۔ آج کی طرح نہیں تھا کہ انٹرنیٹ کے ایک بٹن پر انگلی رکھی اور مطلوبہ معلومات کا خزانہ آپ کے سامنے آ گیا۔ ان سہولتوں کی عدم موجودگی کے باوجود سکھوں کے بارے میں ساری باتوں سے آگاہی حاصل کرنا، بڑے جان جوکھوں کا کام تھا مگر نیت درست ہو، عزم پختہ ہو، راستے کی رکاوٹوں سے گھبرانے والا نہ ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ سنگیتا بی بی کی جدوجہد نے ان کو ساری مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ جن کی مدد سے انہوں نے ڈریس ڈیزائنر سے سکھوں کے ملبوسات بنوائے۔ سکھوں جیسی پگڑی بندھوانے والا۔ ڈھونڈ نکالا۔ میک اپ آرٹسٹ سے سکھوں جیسی داڑھی بنوائی اور جب فلم بن کر اسکرین کی زینت بنی تو دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں دبا رہے تھے کہ اتنی حقیقی عکاسی یہ سب کچھ اس نو عمر اور ناپختہ ہدایت کارہ نے کیسے کر دیا۔ راجندر سنگھ بیدی کی بے حد پیچیدہ ... اور مشکل کہانی کو اتنی کامیابی کے ساتھ فلم کے قالب میں کیسے ڈھال دیا۔ سچ ہے ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ کم عمری سے کچھ فرق نہیں پڑتا، ناتجربہ کاری بھی رکاوٹ نہیں بنتی اگر اندر ٹیلنٹ ہو، ذہن رسا ہو، محنت اور لگن کا خوگر ہو تو بندہ انہونی کو بھی ہونی کر دیتا ہے۔

سنگیتا جو فلم ڈائریکٹ کر رہی تھیں اس کے کئی آرٹسٹ بہت سینئر اور تجربہ کار تھے۔ ان سے بھی انہوں نے اپنی مرضی سے کام کروایا۔ جب تک مطمئن نہیں ہوتیں، ٹیک پر ٹیک لیتی رہتیں۔ اس فلم کے تین اہم کردار تھے۔ مہا بیر سنگھ جسے راحت کاظمی نے ادا کیا تھا۔ ترلوک سنگھ کا کردار غلام محی الدین نے کیا تھا اور رانو کا کردار جس کی ادائیگی خود سنگیتا نے کی تھی۔

راحت کاظمی کا کردار اگرچہ مختصر ہے اس کے باوجود اس نے ایک غیرت مند اور شریف سکھ مہا بیر سنگھ کے کردار کو بڑی مہارت پر عمدگی کے ساتھ ادا کیا۔ وہ جس منظر میں بھی نمودار ہوا اپنی پرفارمنس کا خوشگوار اثر چھوڑا۔ اس نے فلم دیکھنے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ سب نے اس کی تعریف کی۔

ترلوک سنگھ کا کردار نبھانے والے غلام محی الدین نے ایک لاابالی، شرابی اور بدخصلت سکھ کی کردار نگاری میں بھرپور رنگ بھرا۔ اپنی زبردست فنی صلاحیتوں سے اس کردار کی ادائیگی میں ناظرین کو بہت متاثر کیا۔ مبصرین اور ناقدین کا خیال ہے کہ یہ کردار غلام محی الدین کے فنی کیریئر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

رانو جو فلم کی ہیروئن ہے اس کردار کو سنگیتا نے خود ادا کیا ہے۔ رانو ایک حوصلہ مند، محنتی اور مظلوم دکھی عورت ہے۔ اس کے مختلف مناظر ہیں وہ مختلف حالات و واقعات کی شکار نظر آتی ہے۔ سنگیتا نے اس مشکل ترین کردار کو اس کی ضرورت کے مطابق اپنی بے مثال اور لازوال پرفارمنس سے ادا کر کے اس کردار کو امر کر دیا ہے۔ انہوں نے جس موقع پر جس قدر موثر، متاثر کن اور موزوں فیس ایکسپریشن دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

فلم کے دیگر کرداروں میں ترلوک سنگھ کے چھوٹے بھائی منگل سنگھ کا کردار بھی اہم ہے جسے ندیم نے بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ یہ کردار بھرپور بھی ہے اور جاندار بھی۔ ایک نوجوان سکھ کے گیٹ اپ میں ندیم بڑے خوب صورت لگے ہیں۔ بڑے بھائی کے قتل ہو جانے کے بعد جب زبردستی بڑے بوڑھوں نے ان کی شادی ان کی بھابی سے کروانا چاہی تو اس موقع پر ان کی اداکاری دیدنی ہے مگر حکم حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق جب یہ کڑوا گھونٹ انہیں پینا پڑا، اس وقت کی ان کی پرفارمنس بھی دیکھنے لائق ہے۔

غلام محی الدین اور سنگیتا (ترلوک سنگھ اور رانو) کی بیٹی چھوٹی کا کردار شہلا گل نے بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ اسی طرح ترلوک سنگھ کی ماں اور رانو کی ساس چنداں کا کردار نجمہ بیگم نے بڑی مہارت سے ادا کیا ہے۔ روما نہ نے سنگیتا (رانو) کی کیلی کے کردار میں اچھا تاثر چھوڑا۔ کویتا کا کردار جاندار نہیں پھر بھی وہ جہاں بھی نمودار ہوئی ہے اچھی لگی ہے۔ کمال ایرانی نے ایک خود غرض، بے ایمان اور عیاش مہاجن کے کردار کو اچھی طرح ادا کیا ہے۔ علی احمد ایک جعلی سادھو اور شاہد پنڈت نے ایک سبزی فروش جب کہ ساقی نے غلام محی الدین کے باپ کے کردار کو خوبی سے ادا کیا ہے۔ عرفان کھوسٹ اور ریاض راجا بھی بھلے لگے ہیں۔ دیگر چھوٹے موٹے کرداروں سے بھی اچھا کام لیا گیا ہے۔

فلم کے آرٹسٹوں سے اچھا کام لینا بھی اچھے ہدایت کاروں کی اچھائی ہوتی ہے۔ یہ اچھائی میڈم سنگیتا میں ابتداء ہی سے موجود تھی۔ اپنی پہلی فلم سے ہی ان کا وتیرہ یہ تھا کہ جب تک وہ کسی کے کام سے مطمئن نہیں ہوتیں آگے نہیں بڑھتی تھیں۔

''مٹھی بھر چاول'' ایک مشکل سبجیکٹ تھا جس کو سنگیتا جی نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا۔ اگرچہ وہ اس وقت نو آموز تھیں لیکن وہ ایک باہمت خاتون تھیں اس لیے انہوں نے ناممکن کو

ممکن ثابت کر دکھایا۔ انہوں نے کیریکٹرائزیشن، ماحول سازی اور فلم کے تمام شعبوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ نغمات کی عکس بندی میں بھی مہارت اور عمدگی کا ثبوت دیا۔ تمام فنکاروں سے بے حد عمدہ پرفارمنس کروائی، خاص کر غلام محی الدین، راحت کاظمی اور خود اپنے آپ سے انہوں نے ایسے ایسے سین فلم بند کیے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ''مٹھی بھر چاول'' کا جادو بھی ہر اس شخص پر اثر انداز ہوا جس نے اسے دیکھا۔ سنگیتا کی بے مثال لاجواب اداکاری اور ہدایت کاری سے بھی اسے ایک کلاسک فلم کا درجہ حاصل ہوا۔ جہاں پاکستانی شائقین فلم اس سے متاثر ہوئے وہاں انڈین فلم میکرز بھی حیران رہ گئے کہ ہم نے راجندر سنگھ بیدی کی جس کہانی کو بھاری پتھر سمجھ کر اس پر فلم بنانے کی ہمت نہیں کی تھی وہاں پاکستان میں جو ہم سے فلمسازی کے میدان میں بہت پیچھے ہے۔ اس کی ایک نو آموز ہدایت کارہ نے اتنی کامیاب اور متاثر کن فلم بنا کر نا قابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے بعد ان کی حمیت نے بھی انہیں مہمیز کیا۔ اگر پاکستان میں ''ایک چادر میلی سی'' پر ایک کامیاب فلم بنائی جا سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں بنا سکتے؟ اس کے بعد وہاں راجندر سنگھ کی کہانی ''ایک چادر میلی سی'' پر ہی ایک فلم بنائی گئی جس میں رانو کا کردار بھارتی لیجنڈ اداکارہ ہیما مالنی سے کروایا گیا مگر وہ سنگیتا کی اداکاری کی گرد کو بھی نہ چھو سکی۔ نہ ہی ان کی بنائی ہوئی فلم ''مٹھی بھر چاول'' جیسی تاثر چھوڑ سکی اور اس بات کا اعتراف خود ان لوگوں نے بھی کیا۔

بات سینیارٹی اور وسیع تجربوں کی نہیں۔ نئی سوچ اور نئی فکر کی حامل نوجوان صلاحیتیں بھی بڑے کارنامے انجام دیتی ہیں۔ آج اگر بلال لاشاری ''وار'' جیسی بلاک باسٹر فلم بناتا ہے یا دوسرے نوعمر اور ناتجربہ کار نوجوان کامیاب فلمیں بنا رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آج سے 35 سال پہلے سنگیتا نے بھی ''مٹھی بھر چاول'' جیسی فلم اپنی صغیر سنی اور نو آموزی کے دور میں بنائی تھی اور آج سے 55 سال قبل ایس سلیمان نے بھی اپنی نوعمری میں ''باجی'' جیسی معیاری اور نیم کلاسیکی فلم بنائی تھی۔

بھارت میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ کلکتے کے بنگالی ہدایت کار ستیہ جیت رائے نے بھی جب اپنی پہلی فلم ''پوتھیر پنچالی'' بنائی تھی تو وہ ایک ابھرتے ہوئے نوجوان تھے۔ ان کے پاس فلم کو مکمل کرنے کے وسائل بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایسی فلم بنائی جس نے انہیں عالمی شہرت کا حامل ہدایت کار بنا دیا۔ ممبئی کی فلمی صنعت میں بھی جہاں بہت بڑے بڑے اور فنی اعتبار سے عظیم فلم میکرز کی کمی نہیں۔ وہاں بھی نئی نسل کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی نئی سوچ اور نئی فکر کا مظاہرہ کریں اور فلم انڈسٹری میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں۔ مصنف و نغمہ نگار جاوید اختر کا بیٹا فرحان اختر اور ان کی بیٹی اس کی بہترین مثال ہیں۔ وہاں بہت سے نئے لڑکے اور لڑکیاں فلم میکنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔

آیئے آج سے 55 سال قبل ہمارے ہاں بننے والی فلم ''باجی'' کے بارے میں کچھ باتیں کریں۔ ''باجی'' 1963ء میں ریلیز ہونے والی ایک ایسی فلم تھی جس نے اس دور کے بڑے بڑے اور نامور فلم میکرز کو حیران پریشان کر دیا تھا کہ ایک کم سن نوجوان نے اتنی صاف ستھری، معیاری اور چونکا دینے والی کہانی پر اتنی کامیاب فلم کیسے بنالی؟

اس فلم کے جواں سال ہدایت کار ایس سلیمان نے اس فلم سے پہلے اپنے فنی کیریئر کا آغاز ایک کاسٹیوم فلم ''گلفام'' سے کیا تھا۔ اس نوجوان کے دو بڑے بھائی موسیٰ رضا (سنتوش کمار) اور عشرت عباس (درپن) اس دور کے کامیاب اداکار تھے۔ مگر ان کے چھوٹے بھائی کو اداکاری کا شوق نہیں تھا۔ اس کا رجحان ہدایت کاری کی طرف تھا۔ لہٰذا درپن نے چھوٹے بھائی کے شوق کی تکمیل کے لیے اسے ایک فلم ڈائریکٹ کرنے کی اجازت دے دی۔ اجازت کیا دی اس کے لیے سرمایہ بھی فراہم کر دیا۔ اس پر درپن کے کچھ قریبی دوستوں اور ساتھیوں نے کہا۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو تمہارا بھائی ابھی بہت چھوٹا ہے۔''

''اور......!'' دوسرے نے بات آگے بڑھائی۔ ''بالکل ناتجربہ کار ہے۔''

''اس نے تو شاید فلم میکنگ کی کوئی تربیت بھی حاصل نہیں کی ہے۔''

''ہاں، یہ درست ہے کہ اس نے کوئی باضابطہ تربیت حاصل نہیں کی ہے۔'' درپن نے کہا۔ ''مگر وہ ہم لوگوں کی ذاتی پروڈکشن میں بننے والی فلموں کے یونٹ کے ساتھ رہا ہے اور کچھ کام بھی کیا ہے۔''

''بس! اتنی سی بات پر اسے فلم بنانے کا چانس دے رہے ہو؟''

''ہاں یار! اسے ہم چانس نہیں دیں گے تو اور کون

دے گا۔ آخر اسے بھی فلم انڈسٹری میں اپنا کیریئر بنانا ہے۔ اگر اسے اداکاری کی بجائے ہدایت کاری کا شوق ہے تو اس کے شوق کی تکمیل کے لیے ہمیں ہی بڑے بھائی کا کردار ادا کرنا پڑے گا۔“

”اور اگر...... اس نے اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے تمہارا سرمایہ ڈبو دیا تو......؟“

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ درپن نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم جو فلمیں بناتے ہیں۔ وہ بھی کامیاب ہوتی ہیں اور کبھی ناکام سلیمان اگر پہلی فلم میں ناکام ہوا تو اگلی فلم میں کامیابی حاصل کرلے گا۔“

مگر ایس سلیمان کی پہلی فلم ”گلفام“ ناکام نہیں ہوئی جس سے اس کے اور اس کے بھائیوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔

کچھ دنوں کے بعد ایس سلیمان نے ایک نئی فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی۔

”اس بار میں ”گلفام“ جیسی گھسی پٹی فارمولا فلم نہیں بناؤں گا۔“ اس نے سوچا۔

ذرا سی کوشش کے بعد نئی فلم کے لیے فلم ساز کا بندوبست بھی ہوگیا۔ عزیز اللہ حسن جو پہلے بھی کچھ فلمیں بنا چکے تھے۔ ایس سلیمان کی نئی فلم کے لیے سرمایہ کاری پر رضامند ہوگئے۔ اب ایس سلیمان نے نامور رائٹر انور بٹالوی سے ایک ایسی کہانی لکھنے کو کہا، جو رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ عام ڈگر سے قدرے ہٹ کر ہو۔ کچھ ایسی بات ہو کہ پڑھے لکھے اور باشعور لوگ متاثر ہوں اور اسے ایک یادگار فلم کی حیثیت سے یاد رکھا جائے۔

انور بٹالوی مسکرائے۔ ”آپ نے تو ایک ساتھ بہت سی خصوصیات بتا دی ہیں۔ بہرحال کوشش کروں گا کہ کوئی ایسی کہانی لکھ کردوں جو آپ کے معیار پر پوری اترے۔“

اور انور بٹالوی نے اپنے ساتھی احمد راہی کے ساتھ مل کر ایک کہانی لکھ کر ایس سلیمان کو دی۔ جو کچھ یوں تھی۔

ایک نوجوان لڑکی جس کا باپ اس کے بچپن ہی میں مر جاتا ہے۔ جوان ہونے پر اس کی شادی ہوتی ہے مگر بدقسمتی یہاں بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ رخصتی سے پہلے اس کا شوہر فوت ہوجاتا ہے۔ یہ صدمہ اس کی ماں کے لیے بھی روح فرسا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی بیٹی کو داغ مفارقت دے جاتی ہے۔

یہ لڑکی (نیر سلطانہ) اپنی کوٹھی میں چند ملازموں کے

زرین سلیمان۔ کل اور آج

”سجن لاگی توری لگن من ماں“ یہ گانا سن کر آپ کی آنکھوں میں فلم ”باجی“ کا وہ لازوال رقص گھومنے لگے گا جسے پنا اور ایمی مینوالا نے اپنے اعلیٰ ترین رقص کے زاویوں سے امر بنا دیا جو ہماری فلم انڈسٹری کی رقص کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔

پنا کے بارے میں زیر نظر مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ ”باجی“ کے ہدایت کار ایس سلیمان کی بیگم بن گئیں اور زرین سلیمان کے نام سے یاد کی جانے لگیں۔

زرین سلیمان آج بھی ماشاء اللہ موجود ہیں۔ نانی اور دادی بن گئی ہیں اور ایک طویل عرصے سے ایس سلیمان کی طرح فنی کیریئر کا خاتمہ کر چکی ہیں۔ ان دونوں کی رہائش لاہور میں ہے۔

زرین سلیمان نے پنا کی حیثیت سے کراچی کی فلموں سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور بطور رقاصہ جلد ہی مقبول ہوگئی تھیں۔ کراچی میں دس پندرہ فلموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بعد وہ لاہور چلی گئی تھیں۔ سلیمان کی پہلی فلم ”گلفام“ میں بھی پنا نے ایک گانے میں بھارت ناٹیم رقص پیش کیا تھا۔ احمد بشیر کی کلاسیکی فلم ”نیلا پربت“ میں کیوگرافی بھی کی تھی۔ احمد بشیر نے اپنی اس فلم میں اسے مکمل آزادی دی تھی کہ وہ جس طرح چاہے رقص کے شعبے کو ہینڈل کرے۔ وہ پنا کو گڑی کہتے تھے۔ کہتے تھے ”گل بن گڑیے جو تیرا دل کرے او کر۔“ اس فلم کے لیے پنا نے جو رقص ترتیب دیئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ”نیلا پربت“ میں بھارت ناٹیم کے ساتھ ساتھ کتھک رقص، منی پوری، ہر طرح کے رقص کیے اور دیگر آرٹسٹوں سے کروایا۔

ایک منجھی ہوئی رقاصہ کے طور پر متعدد فلموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ایک وقت تھا جب فردوس اور نغمہ جیسی اداکارائیں ابتدائی دور میں ایکسٹرا ڈانسر کے طور پر پنا کے رقص میں شریک ہوتی تھیں۔

اپنے وقت کی نامور رقاصہ پنا، آج زرین سلیمان کی حیثیت سے ایک گھریلو خاتون کی طرح زندگی بسر کررہی ہیں۔ انہیں اپنی جواں سال پوتی علینہ کی اچانک موت کا بہت دکھ ہے۔ ان کے ایک پوتے سیف کا ایکسیڈنٹ کا حادثہ بھی ان کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ سیف ترکی میں تعلیم حاصل کرنے گیا ہوا تھا کہ خطرناک حادثے کا شکار ہوگیا۔ علاج کے دوران ایک سال تک وہ کومے میں رہا۔ اللہ نے اسے نئی زندگی دی اور صحت یاب ہوکر C.S کی تعلیم حاصل کی۔ آج کل زرین سلیمان ایک نیک بیوی کی طرح اپنے شوہر کی خدمت میں لگی رہتی ہیں جو بے حد ضعیف ہوگئے ہیں۔ کمزور اور ناتواں ہوگئے ہیں۔

ساتھ رہتی ہے۔ پے در پے حادثات اور غموں نے اس کے دل و دماغ میں بسیرا کر لیا ہے اور وہ غم، مایوسی اور اداسی کی تصویر بن گئی ہے۔ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہے۔ ذمہ دار بن گئی ہے۔ وہ دل کی اچھی لڑکی ہے۔ رحم دل اور خدا ترس ہے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتی ہے اس لیے نوکروں کے علاوہ پاس پڑوس والوں میں بھی اس کی بڑی عزت کی جاتی ہے اور چھوٹے بڑے بھی اس کو باجی کہہ کر پکارتے ہیں مگر خود اس کے لیے دنیا کی کسی چیز میں بھی دلکشی یا دلچسپی نہیں رہی ہے۔

اس جمود کے عالم میں ایک روز اس کا بچپن کا ساتھی ناصر (درپن) کافی عرصے کے بعد اس کے گھر آتا ہے۔ وہ شوخ، کھلنڈرا اور زندہ دل نوجوان ہے۔ اس کی وجہ سے باجی کے مکان اور اس کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ ناصر کی بے تکلفی بچپن کی یادوں کو تازہ کر دیتی ہے۔ وہ باجی کو اس کا نام لے کر پکارتا ہے۔ (اس کا نام کافی عرصے سے کسی نے نہیں لیا تھا) ناصر اکثر اپنی باتوں سے اسے ہنسانے کی کوشش کرتا ہے۔ باجی اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس احساس کے بعد اس کے دل مردہ میں زندگی کی حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔

اسی اثناء میں باجی کے پڑوس میں رہنے والی لڑکی (زیبا) پر ناصر کی نظر پڑ جاتی ہے اور پھر دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک روز باجی کے گھر میں ناصر، زیبا کا ہاتھ پکڑ کر بے تکلفی کے ساتھ اظہارِ محبت کر دیتا ہے۔ وہ کہتی ہے۔

"آپ ابا جان سے بات کریں۔"

"میں ان سے کیسے بات کروں گا۔ کیا یہ مناسب ہو گا؟"

"پھر بات کیسے بنے گی؟"

ناصر کچھ سوچ کر کہتا ہے۔ "میں راولپنڈی سے اپنی ماں کو لے آتا ہوں۔ وہ تمہارے ابا سے بات کریں گی۔"

راولپنڈی جانے سے پہلے ناصر، باجی سے کہتا ہے۔

"میں گھر جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟" باجی پوچھتی ہیں۔

"اپنی والدہ کو یہاں لانے کے لیے۔"

باجی اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتی ہیں کہ وہ مجھ سے شادی کی بات پکی کرنے کے لیے اپنی ماں کو لانے جا رہا ہے۔ اس خیال سے وہ سرشار ہو کر ناصر کی ماں کے آنے کا انتظار کرنے لگتی ہیں۔ ناصر ماں کو لے کر آتا ہے تو وہ بھی باجی کے گھر میں قیام کرتی ہیں۔

اگلے روز وہ باجی سے کہتی ہیں۔ "آؤ زیبا کے گھر چلیں۔"

"کیوں؟ وہاں کیوں جائیں گی آپ؟"

"ارے بھئی! زیبا کے ابا سے ناصر کے لیے زیبا کا رشتہ مانگنے کے لیے۔ اسی لیے تو ناصر مجھے یہاں لایا ہے۔"

باجی نے جو سہانا خواب دیکھا تھا، اپنے خیالوں کا جو شیش محل تعمیر کیا تھا وہ ناصر کی امی کی بات سن کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ کرچی کرچی بن کر بکھر جاتا ہے۔ صدمے سے اس کا دل چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس کا دل جو صدمے برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے یہ صدمہ اس کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

باجی اپنے دکھ کا اظہار کسی سے نہیں کرتی۔ زیبا کا باپ بیٹی کا رشتہ ناصر سے کرنے پر رضا مند ہو جاتا ہے اور منگنی کی رسم کی ادائیگی کا پروگرام بھی بنا لیا جاتا ہے۔

اور پھر ایک دن پروگرام کے مطابق زیبا اور ناصر کی منگنی ہو جاتی ہے اور اس کا سارا بندوبست باجی ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ اس بے بسی اور دل شکستگی کے بعد باجی کو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ ہارٹ اٹیک کا خطرہ ہے۔ باجی کے گھر میں رہنے والے سب لوگ پریشان ہیں۔ ناصر خود بھی حیران تھا کہ باجی کو یہ کیا ہو گیا؟ اس پر گھر کی پرانی ملازمہ ناصر کو بتا دیتی ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔

"میری وجہ سے......! مگر میں نے ایسا کیا کیا ہے جو......"

"آپ نے یہ کیا ہے کہ آپ زیبا سے شادی کر رہے ہیں جب کہ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ آپ ان سے شادی کریں گے۔"

ناصر یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے۔ الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ اب کیا کرے؟ باجی کے پاس جاتا ہے، انہیں بے ہوشی کے عالم میں دیکھتا ہے تو نوکرانی کی بات کا یقین آ جاتا ہے کہ یقیناً میری ہی وجہ سے یہ اس حال کو پہنچی ہے۔

کچھ سوچ کر وہ زیبا کے باپ (طالش) کو خط لکھتا ہے کہ وہ ان کی بیٹی سے شادی نہیں کرے گا۔ مجبوراً مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے اس لیے آپ مجھے معاف کر دیں۔

اس خط کو پڑھ کر زیبا کے ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی عزت کا سوال ہے اگر منگنی کے بعد شادی نہیں

ہو گی تو ان کی بیٹی پر ایک داغ لگ جائے گا۔

زیبا کی ماں باجی کے پاس جاتی ہے کہ ان سے اس مسئلے کے حل کے لیے بات کرے۔ زیبا کی ماں باجی کے پاس آتی ہے اور کہتی ہے کہ ناصر نے زیبا سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔

''کیوں، کیوں انکار کیا ہے؟''

''یہ تو اس نے نہیں بتایا ہے۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ کسی مجبوری کے تحت انکار کر رہا ہوں۔ اب آپ ہی بتایئے، اس کے انکار پر ہماری عزت کا جنازہ نکلے گا یا نہیں؟ باجی ہم نے تو محض آپ کی وجہ سے خاندان کے باہر شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

باجی اس نئی صورتِ حال پر حیران و پریشان ہو جاتی ہیں۔ انہیں دراصل رات کے واقعات کا علم نہیں۔ جب ناصر آکر انہیں بے ہوش دیکھتا ہے اور گھر کی نوکرانی بتا دیتی ہے کہ یہ اس حال کو آپ کی وجہ سے پہنچی ہیں۔

زیبا کی ماں کہتی ہے۔ ''ہم تو صرف آپ کے کہنے پر ناصر سے شادی پر رضامند ہوئے تھے۔ اب آپ ہی کی ذمہ داری ہے کہ اس مسئلے کا حل نکالیں۔ ہماری عزت و آبرو کو بچائیں۔''

باجی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر ناصر نے ایسا غیر ذمہ دارانہ قدم کیوں اٹھایا؟ وہ زیبا جس پر وہ اس قدر فدا تھا۔ اس سے منگنی کے بعد شادی سے کیوں انکار کر رہا ہے؟ انہوں نے زیبا کی ماں سے کہا۔ ''آپ گھر جائیں میں ناصر سے مل کر اس کے اس رویے کی وجہ معلوم کرتی ہوں۔''

''ہمارے لیے انکار کی وجہ جاننا ضروری نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ ناصر کو شادی پر رضامند کریں۔''

''ٹھیک ہے ایسا اس سے ملاقات کے بعد ہی ممکن ہو سکے گا۔'' باجی جواب دیتی ہیں بعد میں باجی، ناصر کو بلا کر پوچھتی ہیں۔

''کیا یہ بات درست ہے کہ تم نے زیبا سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے؟''

''ہاں..... صد فیصد درست ہے۔''

''مگر کیوں؟ کل تک تو تم زیبا کے عشق میں پاگل ہو رہے تھے۔ اب جب شادی کا مرحلہ آیا تو انکار کر رہے ہو۔''

''یہ تو تم جانتی ہو کہ ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہارے انکار کی کیا وجہ ہے؟''

''وجہ تم ہو۔''

''کیا مطلب؟'' باجی ایک دم پریشان ہو جاتی ہیں۔

''مطلب یہ ہے کہ مجھے اس بات کی خبر ہو گئی ہے کہ تم میری محبت کی آگ میں جل رہی ہو۔ تمہاری یہ بیماری میری بے وفائی کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے۔ تم نے اپنی محبت کا اظہار نہ کر کے مجھ پر ہی نہیں، اپنے آپ پر بھی بڑا ظلم کیا ہے۔ بے وقوف لڑکی تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔''

''ہاں! میں نے تمہیں چاہا تھا۔ تم سے پیار کیا تھا مگر جب تمہیں زیبا کی طرف مائل دیکھا تو اپنے دل پر صبر کی سل رکھ لی کہ شاید تم میرے نصیب میں نہیں۔''

''مگر اب جب مجھے تمہاری محبت کا علم ہو گیا ہے تو میں کسی اور کو کیسے اپنا سکتا ہوں۔ میں اب تمہیں بے موت مرنے نہیں دوں گا شادی کروں گا تو تم ہی سے کروں گا۔''

''ناصر..... ! کیا تم واقعی یہ چاہتے ہو کہ میں بے موت نہ مروں؟''

''ہاں..... ہاں..... ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔''

''تو پھر زیبا سے ہی شادی کر لو۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہو گی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ شادی ضرور ہو اگر ایسا نہیں ہو گا تو میں سچ مچ بے موت مر جاؤں گی۔ اگر میرے لیے تمہارے دل میں کوئی جگہ ہے۔ کچھ محبت ہے تو میری یہ بات مان جاؤ۔''

باجی نے ناصر کو کسی نہ کسی طرح زیبا سے شادی پر رضامند کر لیا۔ ناصر نے جب یہ دیکھا کہ اس کی خوشی اسی بات پر ہے کہ میں زیبا سے شادی کر لوں۔ تو مجھے اس کی یہ خواہش یہ آرزو ضرور پوری کر لینی چاہیے۔

اس کے بعد ناصر اور زیبا کی شادی ہو جاتی ہے۔

وہ دونوں شادی کے بعد باجی کو سلام کرنے آتے ہیں تو باجی انہیں گھر پر نہیں ملتیں۔ گھر کے ملازمین بتاتے ہیں کہ شاید وہ باغ میں ہوں۔

''باغ میں.....!''

''ہاں۔ وہ تنہائی کا اکثر وقت باغ کے ایک پُرسکون گوشے میں گزارتی ہیں۔''

دولہا دلہن جب باغ میں جا کر باجی کو تلاش کرتے ہیں تو وہ ایک جگہ مردہ حالت میں پڑی ملتی ہیں۔ ناصر جھپٹ کر ان کے پاس پہنچ جاتا ہے اور بڑے رقت آمیز لہجے میں

کہتا ہے۔

"تم تو کہتی تھیں اس شادی سے مجھے خوشی حاصل ہو گی۔کیا خوشی میں انسان مر بھی جاتا ہے؟"

بس یہیں کہانی ختم ہوجاتی ہے۔

ایس سلیمان کو یہ کہانی پسند آتی ہے اور وہ اسے فلم کے روپ میں ڈھالنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ کہانی کے کرداروں کی ادائیگی کے لیے وہ نیر سلطانہ، درپن، زیبا، لہری، ببو، ایمی مینوالا، سلمیٰ ممتاز، ننھا اور طالش کا انتخاب کرتے ہیں۔

کہانی کے مکالمے انور بٹالوی اور احمد راہی نے مل کر لکھے۔ موسیقی کی کمپوزیشن کی ذمہ داری سلیم اقبال کو سونپی۔ عکاسی کے لیے پرویز کی خدمات حاصل کیں۔ حبیب شاہ کو آرٹ کا شعبہ سونپا، گانے احمد راہی اور طفیل ہوشیار پوری سے لکھوائے گئے جن کی دھنیں موسیقاروں کی جوڑی سلیم اور اقبال نے بڑی دلکش اور پُراثر بنائی۔

ایس سلیمان کی یہ ابتدائی دور کی فلم تھی جو اس وقت تو عمر اور نوآموز تھے۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ نیا نویلا ہدایت کار آنے والے دنوں میں پاکستانی فلمی صنعت کا ایک بڑا ڈائریکٹر بنے گا اور اس کے کریڈٹ میں سوشل اور رومانٹک فلموں میں محبت، سبق، تیری صورت میری آنکھیں، بہاریں پھر بھی آئیں گی، انتظار، پھول جب کہ سنجیدہ اور ڈرامائی فلموں میں لوری، آج اور کل، زینت اور تیرے بنا کیا جینا اور کامیڈی فلموں میں آگ، اناڑی، اف یہ بیویاں، جیسے جانتے نہیں اور ابھی تو میں جوان ہوں جیسی کامیاب اور قابلِ ذکر فلمیں شامل ہوں گی۔

ایس سلیمان کی فلم "باجی" ان کی متذکرہ فلموں سے قدرے مختلف تھی۔ یہ فلم انہوں نے نہ عوام کی دلچسپی کے لیے بنائی تھی نہ باکس آفس کی کامیابی کو پیش نظر رکھا تھا۔ یہ فلم انہوں نے اپنی ذاتی تسکین کے لیے بنائی تھی۔ یہ نیم کلاسیکی فلم تھی۔ ایسی ہی ایک فلم "پیا ملن کی آس" انہوں نے اپنے عروج کے دور میں بھی بنائی تھی۔ اپنی ذہنی تسکین کے لیے۔ باکس آفس اور عوامی پسندیدگی کا کوئی خیال نہیں رکھا تھا۔ اسے بھی آرٹ اور لوگوں نے اسی طرح پسند کیا تھا جس طرح "باجی" کو کیا۔ کمرشل کامیابی اور عوامی مقبولیت حاصل نہ ہونے کے باوجود ہمیشہ ان دو فلموں کا ذکر ایس سلیمان کی خاص فلموں میں ہوتا ہے۔

باجی ایک ایسی فلم تھی جس میں نیر سلطانہ نے ایک پروقار، سنجیدہ اور انتہائی پرعزم خاتون کا کردار بے حد کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ ان کی پرفارمنس کو لازوال کہا گیا۔ اس کردار کی وجہ سے وہ عرف عام میں "باجی" کہلائیں۔ اس کردار کا المیہ یہ ہے کہ وہ جس نوجوان (درپن) کو چاہنے لگتی ہیں وہ بھی انہیں محض باجی سی کوئی شے سمجھتا ہے ان کے احساسات اور جذبات کی زبان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور باجی اپنی محبت کو اپنی محرومیوں کے دامن میں سمیٹ کر دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔

انور بٹالوی کی انتہائی خوب صورت کہانی ایس سلیمان نے بڑی آرٹسٹک انداز میں فلم کے پیرائے میں پیش کیا۔ نیر سلطانہ کے فن سے بڑی ہی ذہانت کے ساتھ استفادہ کیا۔ ان سے بے مثال کام لیا۔

فلم کے مکالمے احمد راہی نے ہی کرداروں کی مناسبت سے بہت موزوں اور معقول تحریر کیے تھے۔ جب کہ فلم کے شعبہ موسیقی نے بھی اس فلم کو ایک یادگار حیثیت کی حامل فلم بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ احمد راہی اور طفیل ہوشیار پوری کے گیتوں کو اپنی مسحور کن دھنوں سے موسیقاروں کی جوڑی سلیم اور اقبال نے ایسے نغمات کا روپ دیا کہ یہ ان کے کیریئر کی بیسٹ کارکردگی تسلیم کی گئی۔

☆ چندا توری چاندنی میں جیا جلا جائے رے۔

☆ سجن لاگی توری لگن من ماں۔

☆ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

☆ دل کے افسانے نگاہوں سے زبان تک پہنچے۔

ایسے شاہکار گیت ہیں جو آج 55 سال بعد بھی مقبول ہیں اور شوق سے سنے جاتے ہیں۔ اس فلم کے سارے گیت اس کے تابندہ اور یادگار پہلو ہیں۔

"باجی" کے نغمات کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

☆ نہ کوئی وعدہ کیا نہ کوئی بات (آواز ناہید نیازی۔ زیبا پر عکس بند ہوا)

☆ سجن لاگی توری لگن من ماں (آواز نور جہاں، فریدہ خانم۔ ایمی مینوالا پر پکچرائز ہوا)

☆ سانوریا نے ہائے دیا بڑا دکھ دینو (آواز نسیم بیگم۔ ایمی مینوالا پر صدا بند ہوا)

☆ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں (آواز سلیم رضا۔ درپن پر پکچرائز ہوا)

☆ دل کے افسانے نگاہوں سے زباں تک پہنچے (آواز نور جہاں۔ نیر سلطانہ پر پکچرائز ہوا)

☆چندا توری چاندنی میں جیا جلا جائے رے

(آواز نسیم بیگم۔ ایمی مینوالا پر فلمبند ہوا)

☆اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا (آواز نور جہاں۔ پکچرائز نیر سلطانہ پر ہوا)

فلموں کی کامیابی میں گیتوں اور گانوں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ برصغیر میں فلمساز و ہدایت کار اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کی فلموں کی موسیقی کانوں میں شہد ٹپکائے اور گیت ایسے ہوں کہ سننے والے اس کے جادوئی اثر میں گم ہو جائیں۔ بعض اوقات اچھے گیتوں کی وجہ سے کمزور کہانیوں پر بننے والی فلمیں بھی کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی ہیں۔ ایک انڈین فلم تھی ''رتن'' اس کے فلم ساز نے وحید مراد کے والد نثار مراد کو اپنی یہ فلم چلانے کو کہا تو انہوں نے یہ فلم دیکھی۔ انہیں اچھی نہیں لگی۔ انہوں نے عوامی حلقوں کے ان لوگوں کو جن سے فلم دیکھی اور پسند کی جاتی ہے ایسے کچھ لوگوں کو یہ فلم دکھائی انہوں نے اس فلم ''رتن'' کو یکسر مسترد کر دیا اور کہا۔ ''یہ فلم نہیں۔ دردِ سر ہے۔ اسے دیکھ کر ہمیں درد کی گولیاں کھانی پڑیں۔''

نثار مراد نے اس کے حقوق نمائش حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ ''رتن'' کا فلمساز دوسرے تقسیم کاروں سے بھی ملا۔ سب نے اسے دیکھ کر اس کی تقسیم کاری سے انکار کر دیا۔ فلمساز نے بمبئی واپس لوٹنے سے پہلے سوچا۔

''چلو میں خود ہی سنیما گھر کرائے پر لے کر اسے ریلیز کر دیتا ہوں۔ اس طرح کچھ نہ کچھ تو شاید حاصل ہو جائے گا۔''

اور اس نے ایسا ہی کیا مگر فلم چلی تو اس نے شہر میں دھوم مچا دی۔ اس کی بور اور بکواس کہانی کے باوجود اس کے مدھر گانوں نے فلم دیکھنے والوں کو مست کر دیا۔ اس کے سارے گانے حقیقتاً بہت اچھے، بہت سریلے اور پسند کیے جانے کے قابل تھے۔ شائقین فلم نے محض ان گانوں کی وجہ سے ''رتن'' کو بار بار دیکھا۔ ایک سنیما گھر میں چلی تھی۔ عوامی پسندیدگی کی وجہ سے شہر کے کئی سنیما گھروں میں چلانی پڑی اور ایسی چلی کہ اسے اتارنا مشکل ہو گیا۔ نثار مراد اور دوسرے تقسیم کار حیران و پریشان کہ یہ کیا ہو گیا۔ انہوں نے فلم کی کہانی کی بنیاد پر جس فلم کو ریجیکٹ کر دیا تھا وہ محض اپنے گیتوں کی وجہ سے زبردست کامیابی حاصل کر رہی ہے۔

''باجی'' اگرچہ سچی آرٹ فلم تھی اور روایتی فلموں کے ڈگر سے ہٹ کر بنائی گئی تھی مگر اس کے گیتوں میں ایسی اثر

''سوسائٹی گرل'' سے ''تم ہی تو ہو'' تک

اداکاری سے ہدایت کاری کے میدان میں قدم رکھنے والی سنگیتا نے ''سوسائٹی گرل'' بنائی تو اداکاری سے زیادہ دلچسپی انہیں ہدایت کاری سے ہو گئی۔ ابتداء میں اداکاری کے ساتھ ہدایت کاری کی۔ پھر ساری توجہ ڈائریکشن پر مرکوز کر دی۔ ''سوسائٹی گرل'' کے بعد مجھے گلے لگالو، عشق عشق، لاڈ پیار اور بیٹی، مٹھی بھر چاول، میں چپ رہوں گی، مہندی لگی میرے ہاتھ، تھوڑی سی بے وفائی، نام میرا بدنام، کھلونا، نکاح، ہرجائی اور سلطانہ ڈاکو جیسی فلمیں بنا کر انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ایکشن، سوشل، رومانٹک اور فیملی فلمیں بنانے والی ورسٹائل ہدایت کارہ ہیں۔

طویل عرصے کے بعد انہوں نے دوبارہ فلم بنانے کا ارادہ کیا اور آج کل ''تم ہی تو ہو'' کے نام سے ایک فلم بنا رہی ہیں جس کی شوٹنگ کراچی اور لاہور میں کر رہی ہیں۔

کراچی میں نیا فلمیں بن رہی ہیں جن کے بنانے والے اور ان میں کام کرنے والے زیادہ تر نئے لوگ ہیں۔ ان کی نئی سوچ، نئی فکر اور نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے کروڑوں کا بزنس کر رہی ہیں جس سے فلم انڈسٹری اور سنیما انڈسٹری کو پھولنے پھلنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے مادام سنگیتا کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے بھی نئے ارادے اور نئے عزم کے ساتھ نئی فلم کے آغاز کا پروگرام بنایا۔ انہیں احساس ہے کہ ان کا زمانہ اور تھا اور اب زمانہ اور ہے۔ لہٰذا انہوں نے جو نئی فلم شروع کی ہے وہ موجودہ دور کے موڈ مزاج اور انداز کی ہے۔ آج کے تماشائی جس قسم کی فلمیں پسند کرتے ہیں اسی انداز کا اسکرپٹ تیار کروایا ہے جسے وہ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے عوام کی پسند پر پوری اترنے والی فلم بنائیں گی۔ ''تم ہی تو ہو'' نوجوان نسل کی لو اسٹوری ہے جس کے لیے انہوں نے نئے آرٹسٹوں کا انتخاب کیا ہے۔ کسی بھی پرانے اور مستند اداکار [illegible] کو کاسٹ نہیں کیا ہے۔ سنگیتا کہتی ہیں کہ پرانے لوگوں کے لیے کوئی کردار تھا ہی نہیں۔ ایک دادی کا اہم کردار تھا جو میں خود کر رہی ہوں۔ قرۃ العین (عینی) حمیرا، دانش تیمور، نمرہ شیخ، شیراز، احمد گل اور خالد بٹ اس فلم کے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مادام سنگیتا کا کہنا ہے۔ ''میری موجودہ نئی کاسٹ چونکہ تعلیم یافتہ اور ذہین ہے لہٰذا میری ڈائریکشن کے ہر اشارے کو فوری سمجھ جاتی ہے جب کہ پرانی ہیروئنوں کی اکثریت مجھے غصہ کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ میں نئے لوگوں کے ساتھ بہت اعتماد سے فلم بنا رہی ہوں۔''

جدید ٹیکنالوجی H.D فارمیٹ پر بننے والی فلم ''تم ہی تو ہو'' کے مصنف سوانا بابا ہیں۔ اپنی اس فلم کے بارے میں میڈم سنگیتا بہت پُرامید ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ ''میری یہ فلم جدید ٹیکنالوجی اور اچھے اسکرپٹ کی وجہ سے عوام کو ضرور پسند آئے گی۔''

اس دعوے پر وہ کہاں تک پوری اترتی ہیں یہ تو اس فلم کی نمائش کے بعد ہی پتا چلے گا کیونکہ مادام کی ساری سابقہ فلمیں پرانے اور روایتی فارمیٹ پر بنائی ہوئی ہیں۔

ہونہار بروا کے چکنے پات

''گلفام'' سید سلیمان کی پہلی فلم تھی بطور ہدایت کار کے یہ فلم بھی سنگیتا کی پہلی فلم (بطور ہدایت کارہ) ''سوسائٹی گرل'' کی طرح کامیاب ہوئی اور اس نے گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ سنگیتا کی فلم ایک سوشل فلم تھی جب کہ ایس سلیمان کی فلم ''گلفام'' ایک کاسٹیوم فلم تھی مگر ملبوساتی فلموں کے روایتی خرافات سے پاک تھی۔ اس کے فلم ساز درپن (سید عشرت عباس) تھے۔ یہ فلم درپن پروڈکشنز کے بینر تلے ایورنیو اسٹوڈیو میں مکمل کی گئی تھی۔ رشید عطرے اس فلم کے موسیقار جب کہ تنویر نقوی اور حبیب جالب نغمہ نگار تھے۔ اس فلم کے گیتوں نے بھی اس کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیے تھے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

☆ ''مشکل ہے میری نظر کے تیر سے بچنا''۔ نغمہ نگار: تنویر نقوی۔ گلوکار: ناہید نیازی، نجمہ نیازی۔ پکچرائزیشن: مسرت نذیر۔

☆ ''آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے'' نغمہ نگار: تنویر نقوی۔ گلوکارہ: نسیم بیگم۔ پکچرائزیشن: مسرت نذیر۔

☆ ''یہ ناز یہ انداز یہ جادو یہ ادائیں'' نغمہ نگار: تنویر نقوی۔ گلوکار: سلیم رضا۔ پکچرائزیشن: درپن ہمراہ مسرت نذیر۔

☆ ''میں ہوں جادوگر طوفانی جادو میرا ہے لاثانی'' نغمہ نگار: تنویر نقوی۔ گلوکار: باتش، آئرن پروین۔ پکچرائزیشن: نذر۔

آفرینی تھی کہ اس نے فلم کے معیار اور وقار کو بہت سربلند کیا۔ عام طور پر آرٹ فلموں کے گانے بھی روکھے پھیکے ہوتے ہیں لیکن ''باجی'' میں اس کے برعکس ایسے رسیلے، میٹھے اور مدھر گیت شامل تھے جو کہانی کے حسب حال اور کرداروں پر بہت بھلے لگے۔ اس کا کریڈٹ نغموں کے تخلیق کاروں سلیم اقبال اور احمد راہی اور طفیل ہوشیار پوری کو جاتا ہے۔ موسیقار سلیم اور اقبال نے جہاں اس میں ڈوبی دھنیں تیار کیں وہیں احمد راہی اور طفیل ہوشیار پوری نے ایسے میٹھے بول لکھے جو انمول گیت بن گئے اور جس نے بھی سنا جھوم اٹھا۔

پنا کے رقص نے ''باجی'' کے حسن و دلکشی کو دوچند کیا۔ یہی پنا جن کا اصل نام زرین ہے۔ بعد میں زرین سلیمان بن کر صبیحہ خانم اور نیر سلطانہ کی دیورانی بنیں۔

''باجی'' کی کاسٹ میں جو فنکار تھے ان میں کئی ایس سلیمان سے کہیں زیادہ سینئر اور تجربہ کار تھے مگر اپنی نوآموزی کے باوجود ہدایت کار کے طور پر ایس سلیمان نے تمام آرٹسٹوں نیئر سلطانہ، زرین، زیبا، یاسمین، زینت، ایمی مینوالا، سلمیٰ ممتاز، لہری اور طالش سے اپنی پسند کے مطابق اداکاری کروائی۔ جب تک وہ مطمئن نہیں ہوئے بار بار پرفارم کروایا۔ اس لیے اداکاری کے لحاظ سے بھی ''باجی'' ایک معیاری فلم ثابت ہوئی۔

اس فلم کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں مہمان فنکاروں کی حیثیت سے اس وقت کے بہت سے بڑے اداکاروں اور اداکاراؤں نے بھی کام کیا۔ جن میں وحید مراد، سنتوش کمار، صبیحہ خانم، اعجاز درانی، حبیب، لیلیٰ، نور جہاں، ترانہ، اسد جعفری، جسونت، نزاکت علی خان اور شرافت علی خان شامل ہیں۔

نعیمہ گرج نے فلم میں چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے زیبا کے چھوٹے بھائی کا کردار ادا کیا تھا۔ نعیمہ گرج آج کل اولڈ کیریکٹر کرتی ہیں اور بڑی بوڑھیوں کے روپ میں نظر آتی ہیں۔

''باجی'' کے حوالے سے ایس سلیمان پر کچھ تنقید بھی کی گئی۔ ان کی کچھ کمزوریوں کا ذکر بھی ہوا۔ ایس سلیمان ''باجی'' کی تکمیل کے دوران کوئی پختہ کار ڈائریکٹر نہیں تھے۔ نوآموز تھے اور فلم کے بہت سے شعبوں میں ان کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ مثلاً اسکرین پلے کی سست رفتاری کی شکایت درست ہے جس کی وجہ سے کہانی رینگتی ہوئی سی آگے بڑھتی ہے۔ انفرادی مناظر کا ٹیمپو بھی سست ہے۔ اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی کہ اگر کوئی کردار چلنا شروع کرتا ہے تو کافی دور تک کیمرا اسے چلتا ہوا دکھاتا چلا جاتا ہے۔ اس بات پر بھی اعتراض کیا گیا کہ کہانی کا وہ حصہ بہت اہمیت کا حامل ہے جہاں باجی کو غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ زیبا سے ناصر کی شادی کرا دیتی ہیں لیکن اس اہم حصے پر بھی اسکرین پلے رائٹر نے کم توجہ دی۔

فلم کی کامیڈی کو بھی تھیٹریکل قرار دیا گیا۔ مکالموں کے ضمن میں کہا گیا۔ مکالمے شستہ ہیں لیکن جن مناظر میں فلسفہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں مکالمے پیچیدہ اور

☆ ''حضور دیکھیے ضرور دیکھیے۔ شباب ہے نشے میں چور چور دیکھیے'' نغمہ نگار: تنویر نقوی۔ گلوکارہ: نسیم بیگم۔ پکچرائزیشن: مسرت نذیر۔
☆ ''چھن چھن چھن پائل باجے'' نغمہ نگار: حبیب جالب۔ گلوکارہ: نسیم بیگم۔ پکچرائزیشن: پنا۔
☆ ''اٹھالے آپ ہی خنجر اٹھالے'' نغمہ نگار: حبیب جالب۔ گلوکار: منیر حسین۔ پکچرائزیشن: درپن۔
☆ ''رات ہے باقی جام دے ساقی'' نغمہ نگار: تنویر نقوی۔ گلوکارہ: مالا بیگم۔ پکچرائزیشن: رخشی۔
اس فلم کی کاسٹ میں اس دور کے نمایاں آرٹسٹوں نے کام کیا۔ جن میں مسرت نذیر، درپن، نذر (ڈبل رول)، رجنی، نسرین، ہمالیہ والا، فضل حق، آغا طالش، راجا ملتانی، رخشی، بیلا لڈن، ریحان اور سید سلیمان۔ (سلیمان کے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے فلم ساز بھائی نے ایک مختصر کردار کرنے پر مجبور کردیا) جس کی اداکاری کے بارے میں ناقدین نے یہ رائے دی کہ اگر محنت کرے تو اچھا اداکار بن سکتا ہے۔ جب کہ ان کی ہدایت کاری کے بارے میں کہا گیا۔ فلم دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ہدایت کار نوآموز نہیں بلکہ کوئی کہنہ مشق اور تجربہ کار ڈائریکٹر ہے۔ اس نوعمر ہدایت کار نے یوں تو پوری فلم میں بے حد محنت کی ہے لیکن خاص کر جنگ کے مناظر بڑی خوبی سے فلم بند کیا ہے۔ پنا، مسرت نذیر اور رخشی کے رقص کی فلم بندی بھی قابل دید ہے۔ ''گلفام'' کو دیکھ کر سید سلیمان کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔ ''گلفام'' نمائش کے لیے 29 دسمبر 1961ء کو پیش کی گئی تھی۔

بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔
ہدایت کاری کی تعریف کرنے کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ چونکہ ہدایت کار کم عمر ہے اور زندگی کے نشیب وفراز سے ناآشنا ہے اس لیے کہانی کا اسکرپٹ اچھی طرح ان کی گرفت میں نہ آسکا اگر ہدایت کار جذباتی کشمکش اور ڈرامائی حصے پر مزید توجہ دیتا تو فلم میں زیادہ دلچسپی پیدا ہوسکتی تھی۔
فلم کے پس پردہ بھی کچھ ایسی باتوں کا انکشاف ہوا جن سے ایس سلیمان کی ناتجربہ کاری اور نوآموزی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مثلاً انہوں نے فلم کا ایک گانا کوئی چودہ منٹ دورانیہ کا عکس بند کیا جسے بعد میں کاٹ کر چار منٹ کا کرنا پڑا۔

علاوہ ازیں .... فلم کے کئی مناظر خاصے طویل فلم بند کیے گئے جنہیں مختصر کرنا پڑا یا نکالنا پڑا۔ ان باتوں کی وجہ سے فلم ساز عزیز اللہ حسن کا بے تحاشا سرمایہ ضائع ہوا۔ آج سے 55 سال پہلے بننے والی اس فلم پر چھ لاکھ روپے کی لاگت آئی تھی جو آج کے چھ کروڑ کے برابر تھی۔
جہاں فلم کے کمزور پہلوؤں پر اعتراض کیا گیا وہیں اس کی اچھی باتوں کی تعریف بھی کی گئی۔ ناقدین اور مبصرین نے کہا۔ جواں سال سلیمان نے اس مرتبہ نہایت بولڈ موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ اس موضوع کو اپنی ہدایت کارانہ صلاحیتوں سے قابو میں رکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انہوں نے اس فلم میں اپنی پہلی فلم ''گلفام'' سے زیادہ محنت کی ہے اور پہلی فلم کے مقابلے میں کامیاب رہا ہے۔ ہدایت کار نے

جہاں کہیں توجہ دی ہے وہ منظر قابل دید دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً فلم کے آخری حصے میں جو تاثر پیدا کیا گیا ہے تماشائیوں نے اسے پسند کیا ہے۔ نیر سلطانہ سے کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق جو اداکاری کروائی گئی ہے اس کی تعریف بھی معقول انداز میں کی گئی ہے۔ ایمی مینوالا کے رقص کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کے پوربی انداز کے مکالموں کی ادائیگی کو بھی سراہا گیا ہے۔ نعیمہ گرج جس نے ننھا کے نام سے زیبا کے بھائی کا کردار ادا کیا ہے اس کی اداکاری اور مکالموں کی ادائیگی اور چہرے کے تاثرات کی بھی تعریف کی گئی ہے۔
اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ''باجی'' سنگیتا کی ''مٹھی بھر چاول'' جیسی بھرپور بلند معیار کی اور ہر پہلو سے کامیاب فلم نہیں تھی۔ ''باجی'' میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی تھیں اس کے باوجود اسے یہی آرٹ فلم کی حیثیت سے دیکھا گیا اور پسند کیا گیا، پڑھے لکھے اور باشعور ناظرین نے اس فلم کی پذیرائی کی۔ ''باجی'' کی اعلیٰ فنی خوبیوں کے پیش نظر اسے پانچ نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1963ء میں ریلیز ہونے والی فلموں میں اسے بہترین فلم کا ایوارڈ دیا گیا جب کہ اس کی بہترین کہانی، بہترین گلوکارہ نسیم بیگم، بہترین تدوین کار اور بہترین صدا بند کے ایوارڈز بھی دیے گئے۔
یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ ایک نوآموز ہدایت کار کی فلم کو بیک وقت پانچ ایوارڈز ملے۔ اگرچہ یہ فلم باکس آفس پر اچھے نتائج نہیں حاصل کرسکی اور کاروباری طور پر اسے ایک ناکام فلم قرار دیا گیا لیکن آرٹ فلم کے حوالے سے اسے عزت

اور شہرت ملی اور پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں اسے ایک یادگار فلم کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آنے والے دنوں میں ایس سلیمان نے بہت بڑی بڑی فلمیں بنائیں۔ باکس آفس پر سپرہٹ فلمیں فلمساز کو ڈھیروں پیسے کما کر دینے والی فلمیں بار بار دیکھی جانے والی فلمیں، نہایت سنجیدہ موضوعات کی فلمیں، ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرنے والی فلمیں بنا کر ایس سلیمان نے اپنے آپ کو ایک ور اسٹائل ہدایت کار منوایا۔ فلم سازوں نے انہیں ایک قابل بھروسا ڈائریکٹر تسلیم کیا اور ان سے فلمیں بنوا کر بھرپور فائدہ اٹھایا۔ مگر وہ عزت جو انہیں ''باجی'' کی پذیرائی سے ملی وہ ان کی کامیابیوں کے ماتھے کا جھومر ہے۔ ''باجی'' ان کی نوعمری اور نوآموزی کے دور کی فلم ہے مگر اس کی یادگار حیثیت کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہر دور میں ابھرتی ہوئی صلاحیتوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ ایس سلیمان اور ماوام سنگیتا کا ابتدائی زمانہ آج کی طرح جدید ٹیکنالوجی کا دور نہیں تھا۔ آج کی طرح انہیں جدید سہولتیں حاصل نہیں تھیں اس کے باوجود انہوں نے اپنی نوعمری اور نوآموزی کے ایام میں یادگار فلمیں تخلیق کیں۔

بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ ابھرتی ہوئی نوجوان صلاحیتیں ہر دور میں کارہائے نمایاں انجام دیتی رہی ہیں، ہمارے ہاں اس بات پر توجہ ہی نہیں دی گئی کہ ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کی تربیت کی جائے، ان کو نکھار اور سنوار کر آنے والے دنوں کے لیے ہنرمندوں کی نئی کھیپ تیار کی جائے۔ 69 سال ہونے کے باوجود ہمارے ہاں فلم سازی کی تعلیم و تربیت کا کوئی مستند ادارہ نہیں۔ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر اسمبلیوں میں جانے والے لیڈران کرام اپنے بچوں کو بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں مگر اپنے ملک میں سرکاری سطح پر کوئی فلم اکیڈمی قائم کرنے کی جانب توجہ نہیں دیتے۔ اگرچہ فلموں کی نمائش سے حاصل ہونے والے ٹیکس کی مد میں لاکھوں روپے وصول کیے جاتے ہیں۔

پڑوسی ملک بھارت میں متعدد فلم اکیڈمیز ہیں، سرکاری بھی اور غیر سرکاری بھی جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں فلم سازی کے ہر شعبے کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اب تو انڈیا میں غیر تربیت یافتہ کوئی فرد فلم انڈسٹری سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بولی ووڈ میں نوجوان صلاحیتوں کی نئی کھیپ ہر وقت تیار رہتی ہے۔ وہاں بہت بڑے بڑے اور عالمی شہرت یافتہ فلم میکرز موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں تربیت یافتہ نوجوانوں کو فلم سازی کا بھرپور موقع دیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں کچھ لوگوں نے اکیڈمی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے نجی طور پر فلم سازی کی تربیت گاہیں بنائیں مگر محدود وسائل کی وجہ سے بھرپور فائدہ نہیں پہنچا سکے۔ کچھ صاحب حیثیت لوگ اپنے بچوں کے شوق کی تکمیل کے لیے انہیں یورپی اور امریکی فلم اکیڈمیز میں تعلیم دلواتے ہیں مگر اس طرح کتنے لوگ فیض یاب ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے آٹے میں نمک کے برابر۔ تربیت یافتہ نوجوان واپس آ کر ٹیلی ویژن اور فلم انڈسٹری میں بہترین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر حکمرانوں سے بار بار اپیل کی جاتی ہے کہ فلمی صنعت و تجارت کی دوررس ترقی اور ترویج کے لیے سرکاری سطح پر اندرون ملک بڑی اور مستند فلم اکیڈمیز قائم کی جائیں تاکہ نوجوانوں کی بڑی تعداد ان سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے قومی انڈسٹری کی بھرپور خدمت کر سکیں۔ بڑی تعداد میں اچھی، معیاری اور دلچسپ فلمیں بنائی جا سکیں۔ سنیما گھروں کا کاروبار پھولے پھلے اور ترقی کرے۔ اس مقصد کے لیے غیر ملکی فلموں پر انحصار نہ کرنا پڑے۔

کچھ نوجوان صلاحیتوں نے جب سے جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے اور نت نئے موضوعات پر دلچسپ فلمیں بنانا شروع کی ہیں۔ ہماری فلموں نے بھی کروڑوں میں بزنس کرنا شروع کر دیا ہے۔ غیر ملکی فلموں کی موجودگی میں اپنی کامیابیوں کے ثبوت دیئے ہیں۔

ہماری حکومت اور حکمران یہ کیوں نہیں چاہتے کہ ہمارے زیادہ سے زیادہ نوجوان فلم سازی کی باضابطہ تعلیم و تربیت حاصل کر کے ہماری فلم انڈسٹری کو بالی ووڈ اور ہالی ووڈ کی سطح پر پہنچائیں۔ ہماری فلمیں پوری دنیا میں دیکھی اور دکھائی جائیں اور کروڑوں اربوں ڈالر اور پاؤنڈ کما کر ملک اور قوم کو فائدہ پہنچائیں۔

ایس سلیمان اور سنگیتا کی طرح خود رو پودے کی صورت میں اگ کر اب نئی صلاحیتیں سامنے نہیں آئیں گی۔ اب نئی صلاحیتوں کی کھیپ ہمیں خود تیار کرنی ہوگی۔ اب فلمسازی کا سارا نظام بدل گیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی مدد کے بغیر فلم بنانا ممکن نہیں اور اب وہی ہنرمند فلمیں بنا سکتے ہیں جو فلم سازی کی جدید تعلیم و تربیت یافتہ ہیں۔

جانور بچے

منظر امام

انسانی بستیوں سے دور جنگل بیابان میں خونخوار جانوروں کے درمیان درندوں کے دودھ پر پلنے والے انسانی بچے جب انسانوں کے درمیان آئے ... تو ان پر کیا گزری۔

حیرت انگیز واقعات پر ایک مختصر سی تحریر

پیار ایک طاقتور جذبہ ہے اور یہ صرف انسانوں میں نہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر ماتا کا جذبہ۔

آپ بلی کو دیکھ لیں۔ مرغیوں کو دیکھ لیں۔ وہ کتنے پیار سے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں اور اگر کسی بچے پر کوئی آنچ آنے لگے تو ان کی بے قراری دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

یہ تو خیر ایک ہی جنس سے تعلق رکھنے والی بات ہے۔

"انسان ایک جنس ہے۔ لیکن وہ بلی پالتا ہے۔ کتے پالتا ہے۔ مویشی پالتا ہے اوران سے محبت کرتا ہے۔ ان پر کوئی تکلیف آئے تو خود بھی بے چین ہو جاتا ہے۔

آپ نے اپنے اردگرد ایسے سینکڑوں لوگوں کو دیکھا ہوگا جنہوں نے جانور پال رکھے ہیں جبکہ یہ جانور ان کی جنس سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود پیار کی ڈور دونوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر رکھتی ہے۔

چلیں۔ آپ کو اب کچھ ایسے بچوں کی کہانی سناتے ہیں جنہیں جانوروں نے پالا ہے۔ جنہوں نے جانوروں کے درمیان پرورش پائی اور بعد میں انسانوں کے ہاتھ لگ گئے۔

مثال کے طور پر یوگنڈا کا بچہ بندر۔

اس کا نام ایان سی تھا۔ چار برس کی عمر تک یہ اپنے گھر ہی میں اپنے ماں اور باپ کے درمیان رہا۔

اس کا گاؤں یوگنڈا کے ایک دور دراز علاقے میں تھا۔ اس کے گاؤں سے کچھ فاصلے پر جنگل شروع ہو جاتا تھا جو بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔

اس کے ماں باپ کے درمیان ہر وقت جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ اس کا باپ شراب کے نشے میں دھت گھر واپس آکر اپنی بیوی کو بری طرح مارا کرتا تھا۔

ایان سی کا معصوم ذہن یہ سوچنے کے قابل نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا باپ ہر وقت غصے میں کیوں رہتا ہے۔ وہ سمجھ تو نہیں سکتا تھا۔ لیکن خوف زدہ رہا کرتا اور اس کا خوف اس شام انتہا کو پہنچ گیا جب اس کے باپ نے غصے میں آکر اس کی ماں کا خون کر دیا۔

ماں کی خون میں لت پت لاش اس کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ ایان سی اتنا خوف زدہ ہوا کہ وہ روتا سسکتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ جنگل کی طرف تھا۔

اس کے بعد اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ اسے تلاش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی گئی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایان سی کے ساتھ کیا گزری۔ اس کو کون لے گیا ہے۔ زیادہ تر کا خیال تھا کہ جنگل کے کسی جانور نے اسے پھاڑ کھایا ہے۔

لیکن کہانی کچھ یوں تھی کہ ایان سی کو بندروں کا ایک گروہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اسی گروہ نے اس کی باقاعدہ پرورش کی۔

ایان سی 1991ء میں دوبارہ پایا گیا۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے اسے پہچان لیا کہ وہ ایان سی ہے۔

اس کی دریافت دس سال کے بعد ہوئی تھی۔ یعنی وہ پورے دس برسوں تک جانوروں کے درمیان زندگی گزارتا رہا تھا۔

اسے مہذب دنیا میں واپس لایا گیا۔ لیکن وہ بول نہیں سکتا تھا۔ اگر بولتا بھی تو بندروں کی طرح۔ جس طرح بندر خوخیاتے ہیں اس سے اندازہ ہوا کہ اس کی پرورش بندروں نے کی ہے۔ اس کی حرکات بھی بندروں جیسی تھیں۔ ایان سی آج بھی زندہ ہے۔ بہت بوڑھا ہو چکا ہے لیکن اسے اپنا ماضی یاد نہیں ہے۔

بہت پرانی بات ہے۔

یہ بچہ 1707ء میں جنگل میں پایا گیا تھا۔ اسے مہذب دنیا میں لایا گیا۔ اس وقت اس کی عمر سات یا آٹھ برس کی ہوگی۔

اسے وکٹر آف ایوے ران کا نام دیا گیا ہے۔ وہ بچہ برسوں تک سائنس دانوں اور محقق کی دلچسپی کا محور بنا رہا تھا۔ کیونکہ وہ جو کچھ بولتا تھا وہ بالکل اجنبی زبان تھی۔ وہ زبان نہ تو کسی جانور کی زبان کے مطابق تھی اور نہ ہی دنیا میں پائی جانے والی کسی زبان کے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت بالکل درست تھی۔ وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا؟ اس جنگل میں کہاں سے پہنچ گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی زبان کیا تھی۔ یہ ایک ایسا معما ہے جو آج تک حل نہیں ہو سکا ہے۔

روبینہ۔

یہ ایک خوب صورت بچی ہے۔ جو 2010ء میں انڈونیشیا کے ایک نواحی گاؤں میں پائی گئی تھی چونکہ وہ گاؤں مسلمانوں کا تھا اس لیے اس بچی کا نام روبینہ رکھ دیا گیا۔

وہ کتوں کی طرح بھونکتی تھی اور کتوں ہی کی طرح چاروں ہاتھ پیروں سے چلتی تھی۔ اس کی بہت سی عادتیں بھی ایسی تھیں جیسے اس نے کتوں کے درمیان زندگی گزاری ہو۔

کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی۔ اور کس عمر کی ہوگی جب وہ کتوں کے پاس چلی گئی تھی۔ یا کتے اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم۔

لیکن اتنا ضرور ہے کہ کتوں نے اس کی پرورش میں کوئی کمی نہیں رکھی ہوگی۔ اسی لیے وہ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بالکل تندرست تھی۔ اس کے جسم پر کسی بھی قسم کے کسی زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔

یہ ہے نا حیرت کی بات۔ لیکن نہیں، قدرت جب کسی

کی زندگی کی ضامن بن جائے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔

یہ داستان بھی ایسی ہی ایک بچی کی ہے۔

بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سب سے زیادہ حیرت انگیز کہانی اس لڑکی کی ہے جس کو میکسیکو کے نواح میں دیکھا گیا تھا۔

اس کسان گھرانے نے بھیڑیں اور بکریاں پال رکھی تھیں۔ رات گہری ہو چکی تھی جب گھر والوں نے بھیڑیوں کی آوازیں سنیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس علاقے میں بھیڑیے رات کو گھومتے رہتے تھے۔ لیکن مویشیوں کے باڑھ کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ وہ ان کو پھلانگ کر اندر نہیں آسکتے تھے۔

دیواروں کے علاوہ لکڑی کا جو بڑا سا گیٹ تھا۔ اس کو بھی کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اس رات کی آوازیں غیر معمولی اس لیے تھیں کہ بھیڑیوں کی آوازوں کے ساتھ مویشیوں کے بھی چیخنے چلانے کی کربناک آوازیں آرہی تھیں۔

گھر کے مرد بندوقیں لے کر باہر آگئے۔ اس وقت ہر طرف چاندنی تھی اور اس چاندنی میں انہوں نے جو دیکھا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔

انہوں نے خونخوار بھیڑیوں کے ایک گروہ کو دیکھا اور اس گروہ کی قیادت ایک جوان لڑکی کر رہی تھی۔ جس کے بدن پر برائے نام لباس تھا۔

بندوق بردار حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ وہ لڑکی اور اس کے ساتھی بھیڑیے ان لوگوں کو دیکھ کر برق رفتاری سے باہر نکل گئے۔ اس لڑکی کی رفتار بھی ان بھیڑیوں سے کم نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گروہ جنگلوں میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔

پھر کئی مہینوں کے بعد وہ بچی ایک بکری کا خون پیتی ہوئی دکھائی دی۔ گاؤں والوں نے اسے پکڑنا چاہا لیکن وہ پھر جنگلوں میں غائب ہو گئی اس کے بعد سے آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

روس کا پرندہ بچہ۔

یہ ایک حیرت انگیز داستان ہے۔ یہ بچہ کہیں گم نہیں ہوا تھا بلکہ نگاہوں کے سامنے ہی تھا۔ اس کی بے رحم ماں نے اس کو پرندوں کے ایک بڑے پنجرے میں بند کر دیا تھا جہاں وہ کئی برسوں تک رہا اور جب اس بے چارے کو رہائی دلوائی گئی تو وہ صرف پرندوں کی طرح چہچہانا جانتا تھا وہ انسانوں کی طرح بول ہی نہیں سکتا۔

ماہرین آج کل اسے "انسان" بنانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

امالا اور کمالا۔

یہ دو بچیوں کی داستان ہے۔ ان دونوں کو ہندوستان میں مدناپور کے مقام سے 1920ء میں دریافت کیا گیا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں سے ایک کی عمر آٹھ سال اور دوسری تین برس کی تھی۔ ان کے نام امالا اور کمالا رکھ دیے گئے۔

ان دونوں کو بھیڑیوں کے بھٹ سے دریافت کیا گیا تھا۔

ان کی عادتیں بھیڑیوں جیسی تھیں۔ یعنی ان کی پرورش بھیڑیوں نے کی تھی۔ ان کی دریافت کے بعد کئی سوال سامنے آئے۔

کیا ان دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان یا گھر سے تھا۔ کیا دونوں بہنیں تھیں؟ اگر بہنیں تھیں تو بھیڑیے کیسے اٹھا کر لے آئے؟

بہرحال یہ بھی ایک اسرار ہے۔

1724ء میں جرمنی میں ایک بچہ دریافت ہوا۔ اس کی دریافت جنگل سے ہوئی تھی۔ چاروں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے چلتا ہوا بچہ۔ جس کی پرورش یقیناً جانوروں نے کی تھی۔ اس کا نام پیٹر رکھ دیا تھا۔ اس کی تربیت کے لیے اس کو انگلینڈ بھیج دیا گیا تھا۔

لیکن برسوں کی تربیت کے بعد بھی وہ مکمل طور پر انسانی خصائل نہیں اپنا سکا تھا۔ 1765ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ آج بھی اس کی قبر دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ تو میں نے چند ہی واقعات کا ذکر کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے بچے ہیں۔ جن کی پرورش جانوروں نے کی ہے۔ بہت سے لوگوں کو شاید سابو ابھی تک یاد ہو۔

یہ وہ بچہ تھا جس کی پرورش بھیڑیوں نے کی تھی۔ اس کو انسان جنگل سے اٹھا کر لائے تھے پھر اس کی تربیت ہوئی۔ اس کو انسان بنایا گیا۔ بعد میں سابو نے کئی فلموں میں کام بھی کیا تھا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پیار کا جذبہ ایک زندہ اور متحرک جذبہ ہے۔ یہ جذبہ انسانوں اور حیوانوں دونوں میں پایا جاتا ہے جبکہ اپنے اپنے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔

جنوری کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے پہلے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔ ہماری دعا ہے کہ یہ نیا برس آپ کے لیے خوش بختی لائے۔ ساتھ ہی یہ آرزو بھی ہے کہ 2017 میں پاکستان دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

آج ہم ان ممتاز شخصیات کا تذکرہ کریں گے۔ جنھوں نے ماہ جنوری میں آنکھ کھولی یا سال کے اس مہینے جہان فانی سے کوچ کیا۔ جنوری گریگورین سال کا پہلا مہینا ہے۔ شمالی نصف کرہ میں اس مہینے سردی کا موسم ہوتا ہے، جب کہ جنوبی نصف کرہ میں گرمیوں کا۔ قدیم زمانہ میں یہ سال کا گیارہواں مہینا ہوتا تھا۔ اس کا نام قدیم روم کے راستوں کے دیوتا ''جانوس'' (Janus) کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اگر ہم پاکستانی شخصیات کے تناظر میں اس کا جائزہ لیں، تو اسے سیاست دانوں کا مہینا قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس خطہ کے کئی عظیم سیاست دانوں کا جیون اس ماہ سے وابستہ تھا۔

پہلا نام ہے ذوالفقار علی بھٹو کا، جن کی کرشماتی شخصیت کی ان کے مخالفین بھی قائل تھے۔ وہ ایک ذہین فطین سیاست داں اور ہردل عزیز شخص تھے۔ پھانسی چڑھ کر وہ امر ہوگئے۔ آج بھی جیالوں کے دل میں بھٹو کا نام زندہ ہے۔ ان کے بعد ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو نے پارٹی سنبھالی۔ اس جماعت نے تین بار اقتدار حاصل کیا۔ اس سفر میں بے نظیر بھٹو کو بھی اپنی جان قربان کرنی پڑی۔ بھٹو صاحب 5 جنوری 1928 کو لاڑکانہ، سندھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ 1953 میں وکالت شروع کی۔ وہ ایوب کابینہ میں وزیر رہے۔ وزیر خارجہ کا منصب سنبھالا۔ دسمبر 1967 میں انھوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1970 کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ دسمبر 1971 میں جنرل یحییٰ خان نے اقتدار بھٹو کو سونپ دیا۔ دسمبر 1971 تا اگست 1973 وہ صدر مملکت رہے۔ 14 اگست 1973 کو نئے آئین کے تحت وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔ 1977 کے عام انتخابات میں ان کی حکومت پر دھاندلیوں کا الزام لگا۔ پی این اے کی تحریک شروع ہوئی جس کے نتیجے میں 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا نافذ کردیا۔

18 مارچ 1978 کو لاہور ہائی کورٹ نے انھیں سزائے موت سنادی۔ انھیں تو پھانسی ہوگئی مگر مخالفین کی تمام کوششیں ناکام گئیں، جب 88ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی اس نعرے کے ساتھ ''کل بھی بھٹو زندہ تھا، آج بھی بھٹو زندہ ہے!'' حکومت بنانے میں کامیاب رہی۔

دوسری شخصیت کا تعلق بھی سندھ ہی کی دھرتی سے ہے۔ یہ تذکرہ ہے جی ایم سید کا۔ سندھ میں قوم پرستی کی علامت۔ وہ 17 جنوری 1904 کو سن، ضلع دادو میں پیدا ہوئے۔ فقط سیاست داں نہیں تھے، انہیں ایک اسکالر کے طور پر بھی شناخت کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے 60 کے قریب کتابیں لکھیں۔ موضوعات سیاست، مذہب، صوفی ازم، سندھی قومیت اور ثقافت کے گرد گھومتے ہیں۔ تصوف میں گہری دلچسپی تھی۔ "مذہب اور حقیقت" ان کی اہم ترین تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ البتہ ان کا اصل حوالہ تو سیاست ہی رہا۔ سیاسی سفر کے آغاز میں وہ تحریک پاکستان کے ایک کارکن کے طور پر ابھرے۔ سندھ اسمبلی میں قرارداد پاکستان پیش کی اور اسے بھاری اکثریت سے پاس کروایا۔ بعد میں وہ قوم پرستی کے نعرے کے ساتھ سامنے آئے۔ اس کے نتیجے میں ان پر غداری کے الزامات لگے۔ ان کا اصل نام غلام مرتضی سید تھا۔ سید حیدر شاہ کاظمی کے خانوادے سے ان کا تعلق تھا۔ انہوں نے سندھ ہاری کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ "سندھ عوامی محاذ" کے بانیوں میں بھی شامل تھے۔ پھر نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کا حصہ بن گئے اور قوم پرستی کا نعرہ بلند کیا۔ سقوط ڈھاکا کے بعد جی ایم سید نے "سندھو دیش" کا مطالبہ کر دیا۔ وہ ایک طویل عرصے نظر بند رہے۔ 91 سال کی عمر میں 25 اپریل 1995 کو کراچی میں انتقال ہوا۔

حروں کے روحانی پیشوا پیر پگارا کا تعلق بھی اسی ماہ سے ہے۔ بڑی منفرد شخصیت تھے۔ پیش گوئیوں کے لیے مشہور، گھوڑوں اور سگار کے شوقین۔ میڈیا میں وہ خاصے مقبول رہے۔ ان کے بیانات اخبارات کی سرخیاں بنتے۔ فوج کے وہ قریب تصور کیے جاتے۔ وہ 22 نومبر 1928 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد پیر صبغت اللہ شاہ راشدی انگریزوں سے برسرپیکار تھے۔ انہیں بغاوت کی پاداش میں گرفتار کر کے 1943 میں پھانسی دے دی گئی۔ اُن کے ورثا کو انگریزوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ زمانہ برطانیہ میں گزرا۔ 1952 میں وہ واپس آئے۔ ان کی گدی بحال کر دی گئی۔ پیر جو گوٹھ میں ایک تقریب رکھی گئی جہاں ان کی پیر پگارا کی حیثیت سے تاج پوشی ہوئی۔ دھیرے دھیرے سندھ کی سیاست میں ان کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اور پھر یہ اثر بڑھتا چلا گیا۔ جب مسلم لیگ مختلف دھڑوں میں تقسیم ہوئی تو انہوں نے مسلم لیگ فنکشنل کے نام سے اپنی جماعت بنالی۔ 10 جنوری 2012 کو ان کا انتقال ہوا۔ انہیں آبائی گاؤں پیر جو گوٹھ میں دفنایا گیا۔

شوبز کی کئی ممتاز شخصیات کا تعلق بھی ماہ جنوری ہی سے تھا، جن کا ان صفحات میں تفصیلی ذکر آچکا ہے، جیسے سلطان راہی (1938 تا 9 جنوری 1996)، ثریا (15 جون 1929 تا 31 جنوری 2004)، ضیا سرحدی (1914 تا 27 جنوری 1997) اور سدھیر (25 جنوری 1922 تا 19 جنوری 1997)۔ سابق گورنر سندھ اور ممتاز علمی شخصیت حکیم سعید (9 جنوری 1920 تا 17 اکتوبر 1998) کا تعلق بھی اسی ماہ سے تھا۔

اب توجہ جنوری کی دیگر شخصیات پر مرکوز کرتے ہیں۔

☆ شاہ جہاں

مغلوں نے ہندوستان پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ مغل سلطنت کو منہا کر دیا جائے، تو ہندوستان کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ مغل شہنشاہوں میں سب سے بااثر شخص اکبر تھا، جس سے جڑی کہانیوں نے ہندوستانی ادب اور فلموں کو کئی موضوعات فراہم کیے۔ اکبر سے جڑا ایک اہم قصہ اس کے بیٹے جہانگیر کے سنسنی خیز عشق سے متعلق ہے، جسے

داستانوی ادب میں سلیم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وہی سلیم جس کی کلی کو دیواروں میں چنوا دیا گیا تھا۔ جہاں کچھ مورخین اس قصے پر شک کا اظہار کرتے ہیں، وہیں کچھ ایسے شواہد بھی ملتے ہیں، جو انارکلی اور سلیم کی محبت کو حقیقت قرار دینے پر دلیل ہیں۔

آج جو شخص ہمارا موضوع ہے وہ اسی جہانگیر کا بیٹا ہے، جسے دنیا شاہجہان کے نام سے جانتی ہے۔

مغل بادشاہ شاہجہاں کی زیست میں آپ کو وہ تمام رنگ ملیں گے، جن سے مغلوں کی معروف تصویر ابھرتی ہے۔ شہاب الدین محمد شاہجہاں 5 جنوری 1592 کو جہانگیر کی راجپوت بیوی تاج بلقیس کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس میں ایک عظیم شہنشاہ بننے کے تمام گن تھے۔ 25 جنوری 1628 کو باپ کے انتقال کے بعد اس نے مسند سنبھالی۔ اس کے دور میں علوم و فنون نے ترقی کی۔ فن تعمیرات میں اسے بے پناہ

☆ایک مہینا، دو وزرائے اعظم

وزیراعظم پاکستان کا منصب سنبھالنے والی دو شخصیات کا تعلق ماہ جنوری سے ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ دونوں ابھی حیات ہیں۔ اور حیرت یہیں تمام نہیں ہوتی۔ سنیے جناب، ان میں ایک نے دوسرے کے منصب سے ہٹنے کے بعد عہدہ سنبھالا۔

پہلے تو ہیں چوہدری شجاعت حسین، جو مشرف دور میں ملک کے بااثر ترین افراد میں سے ایک تھے۔ وہ 27 جنوری 1946 کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ ظہور الٰہی کے بیٹے ہیں، جنھیں جاٹ برادری کی سیاست میں کلیدی حیثیت حاصل رہی۔ جنرل ایوب، جنرل ضیاء اور جنرل پرویز مشرف کے زمانوں میں چوہدری خاندان نے گجرات میں خود کو مضبوط کیا۔ چوہدری ظہور الٰہی کے قتل کے بعد شجاعت حسین نے سیاست میں قدم رکھا۔ 1985 کے انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جونیجو کی کابینہ میں وزیر صنعت رہے۔ 1988، 1990 اور 1997 میں بھی رکن قومی اسمبلی بنے۔ میاں نواز شریف کے دور میں چوہدری شجاعت وفاقی وزیر داخلہ رہے۔ کہتے ہیں، ان کے اور میاں صاحب کے درمیان خاصے اختلافات تھے۔ جب پرویز مشرف نے میاں صاحب کی حکومت ختم کی، تو ن لیگ کا ایک بڑا حصہ الگ ہو کر ق لیگ بن گیا۔ پہلے پہل میاں اظہر اس کے صدر تھے، مگر جلد اس کی کمان چوہدری شجاعت نے سنبھال لی۔ اس عمل کے پیچھے بھی تجزیہ کاروں کو ایک سازش دکھائی دیتی ہے۔ ان کے رشتے دار ظہور الٰہی نے وزیر اعلیٰ پنجاب کا منصب سنبھالا۔

دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی اس کے اسرار و رموز کا علم رکھتا تھا۔ کچھ مورخین اس کے عہد کو ہندوستانی وسطی تاریخ کا سنہری دور کہتے ہیں۔ وہ ایک رعایا پرور شخص تھا۔ اس نے آگرہ کے تاج محل کی تعمیر کروائی جس کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا ہے۔ صدیوں گزر گئیں مگر لوگ اس کے طلسم سے باہر نہیں آسکے۔ یہ انوکھی اور دلکش عمارت اس نے اپنی بیوی ممتاز کی یاد میں تعمیر کروائی تھی۔ کہتے ہیں، تعمیر کے بعد بادشاہ نے مزدوروں کے ہاتھ قلم کروادیے تھے۔

آج کچھ حلقوں کو شکوہ ہے کہ اس نے درس گاہیں بنوانے کے بجائے ایک مقبرہ بنانے میں زیادہ دلچسپی لی، صنعت لگانے کے بجائے اپنے لیے تخت طاؤس تیار کرواتا رہا۔ یہ اعتراضات فقط شاہجہاں ہی نہیں، تمام مغل بادشاہوں پر کیے جاتے ہیں۔ کچھ حد تک یہ اعتراضات درست بھی ہیں۔ چند مورخین کا خیال ہے کہ ممتاز سے اس کی بے پناہ محبت کا قصہ بھی گھڑا گیا تھا۔ اس میں حقیقت نہیں۔ اس نے تو کئی شادیاں کی تھیں۔

اس کا عہد جنگوں کا عہد تھا۔ کبھی لودھی سے لڑا، کبھی جگت سنگھ سے۔ پرتگیزی قوم نے بھی اسے بڑا ستایا مگر وہ بغاوتوں کو کچلنے میں کامیاب رہا۔ سلطنت بڑھانے کے لیے اس نے قندھار پر حملہ کیا۔ اس کی جوانی تو شان دار تھی، مگر بڑھاپا عذاب ناک ثابت ہوا۔

خاندان میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کے تخت گیر بیٹے اورنگزیب نے تخت کے لیے اپنے بھائیوں کو قتل کر دیا اور باپ کو قید خانے میں ڈال دیا۔ اسے یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ اسے زہر دے دیا جائے گا۔ اسی خوف سے وہ مسور کی دال کو ترجیح دیتا، جس میں زہر کی آمیزش نسبتاً مشکل تصور کی جاتی ہے۔ قید ہی کے زمانے میں 31 جنوری 1694 کو شاہجہاں کا انتقال ہوا۔

☆احمد حسن دانی

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں، ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

گو پاکستان میں سہولیات کا فقدان ہے، نہ تو درس گاہیں ہیں، نہ کتب خانے، وسائل بھی محدود، اس کے باوجود ہمارے ہاں بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس دان پیدا ہوئے۔ کیسے کیسے ڈاکٹر اور انجینئر گزرے۔ کچھ یہی معاملہ علم آثاریات کا بھی ہے۔ ہمیں احمد حسن دانی جیسے اسکالر ملا، جسے گندھارا تہذیب پر اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ وہ ایک حقیقی مفکر اور مورخ تھا، جو تعصبات سے اوپر اٹھنے کا ہنر جانتا تھا۔ حکومت پاکستان نے انھیں ستارۂ امتیاز اور ہلال امتیاز سے نوازا۔ مغرب بھی ان کا معترف تھا۔ دنیا کی اعلیٰ ترین درس گاہوں نے ان کی خدمات سے استفادہ کیا۔ انھیں تواتر سے

اور ظفر اللہ جمالی پاکستان کے وزیراعظم بن گئے۔
دلچسپ امر یہی ظفر اللہ جمالی وہ دوسری شخصیت ہیں، جن کا ابھی ہم نے تذکرہ کیا۔ جی ہاں، پاکستان کے 13 ویں وزیراعظم بننے والے یہ صاحب یکم جنوری 1944 کو ضلع نصیر آباد کے علاقے روجھان جمالی میں پیدا ہوئے تھے۔ سیاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کے تایا جعفر خان جمالی قائداعظم کے قریبی ساتھی تھے۔ جب محترمہ فاطمہ جناح ایوب خان کے خلاف اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں اُن کے علاقے میں آئیں، تو نوجوان ظفر اللہ جمالی محافظ کے طور پر ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی سے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ 1977 میں بلا مقابلہ منتخب ہوئے اور صوبائی وزیر مقرر ہوئے۔ 1982 میں وہ وزیر مملکت برائے خوراک و زراعت ہوئے۔ محمد خان جونیجو کی کابینہ میں وزیر رہے۔ 1988 میں وہ بلوچستان کے نگران وزیراعلیٰ مقرر ہوئے۔ پھر سینیٹر رہے۔
میاں صاحب کی جلاوطنی کے بعد ن لیگ ٹوٹی تو وہ نئی جماعت ق لیگ کے جنرل سیکریٹری ہوئے۔ 2002 کے انتخابات کے بعد وزیراعظم بن گئے، مگر کرسی انہیں راس نہیں آئی۔ چوہدری خاندان اور ان کے درمیان اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ معاملات نے سنگین شکل اختیار کر لی۔ جون 2004 میں انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔
ان کے جانے کے بعد دو ماہ چوہدری شجاعت حسین اس عہدے پر فائز رہے تھے۔ پھر شوکت عزیز نے عہدہ سنبھالا۔

لیکچرز کے لیے مدعو کیا۔ کئی اعزازات ان کے حصے میں آئے۔
پروفیسر احمد حسن دانی کشمیری تھے۔ وہ 20 جون 1920 کو چھتیس گڑھ میں پیدا ہوئے۔ بنارس یونیورسٹی سے انہوں نے ایم اے کیا۔ اگلے برس محکمۂ آثاریات میں ملازمت اختیار کر لی۔ ٹیکسلا اور موئن جو دڑو میں ہونے والی کھدائی میں حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد ادھر آ گئے۔ ڈھاکا میں کچھ وقت گزارا۔ 1950 میں وریندر میوزیم راج شاہی کی انہوں نے بنیاد رکھی۔ بنگال کی مسلم تاریخ کی بازیافت ان کا اہم کارنامہ تھا۔ 70 کی دہائی میں انہیں انگلستان اور امریکا کے طویل مطالعاتی دوروں کا موقع ملا۔
1971 میں وہ اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ قائداعظم یونیورسٹی میں علوم عمرانی کا شعبہ قائم کیا۔ 1980 میں وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ بعد کے برسوں میں پتھروں پر کندہ قدیم تحریروں پر کام کرتے رہے۔ اس ضمن میں گلگت، بلتستان، چترال اور کالاش کے علاقوں میں جرمن ماہرین کے ساتھ قدیم حجری کتبوں پر تحقیق کی۔ گندھارا تہذیب میں دلچسپی کی وجہ سے زیادہ وقت ان کا پشاور یونیورسٹی میں گزرتا تھا۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ 26 جنوری 2009 کو اس اسکالر نے جہان فانی سے کوچ کیا۔
ان کی رخصتی سے ایک باب بند ہوا۔ ایک ایسا خلا پیدا ہوا، جسے پُر کرنا ممکن نہیں۔ گو ان کے کئی شاگرد تھے مگر آج منظر میں ایسا کوئی ماہر آثاریات نہیں جو ان کی جگہ لے سکے۔ یہ ایک المیہ ہے۔

☆ واصف علی واصف

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ

الفاظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جاتے، وہ ان میں روحانیت کی روح پھونکتے۔ الفاظ موتیوں کی مالا بن جاتے، جب قاری تک پہنچتے تو وہ اسے گلے میں ڈال کر مست ہو جاتے۔ عشق کی راہ پر ہو لیتے، ان کا چہرہ پرنور ہوتا۔ زبان پر اپنے رب کا نام ہوتا۔ نہ تو وہ بھٹکتے، نہ ہی بہکاوے میں آتے کہ واصف علی واصف کے الفاظ اس کی رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں۔
عجیب شخص تھا۔ دانا، درویش، ایک اسکالر یا ایک سچا عاشق۔ واقعہ مشہور ہے۔ بیماری کے دن تھے، کمر بستر سے لگ

☆ جنوری اور دو عظیم فکشن نگار

اردو کے دو عہد ساز فکشن نگاروں کی زندگیاں بھی ماہ جنوری سے جڑی ہیں۔ ان میں سے ایک نے افسانہ کو اوج بخشا، دوسرے نے ناول جیسی مشکل صنف میں کارہائے نامہ انجام دیے۔ پہلا نام ہے سعادت حسن منٹو کا، جنہیں اردو کا محسن کہا جاسکتا ہے۔ تقسیم کے تناظر میں لکھے ان کے افسانے ''کھول دو'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کو شاہ کار کا درجہ حاصل ہے۔ وہ 11 مئی 1912 کو ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ایک شرمیلے بچے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ اسکول میں داخل ہونے کے متعدد بار فیل ہوئے۔ 1931 میں بمشکل میٹرک کیا۔ افسانہ نویسی میں انہوں نے جنس کو موضوع بنایا۔ انسانی نفسیات کی پرتیں کھولنے کی کوشش کی۔ زبان سادہ، مگر منظر کشی پر پیچ، بیانیہ کاٹ دار ہوتا۔ آغاز میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان کی بے باکی نے ناقدین بھی پیدا کیے، مگر دھیرے دھیرے انہیں تسلیم کیا جانے لگا۔ منٹو کے قلم سے کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ، دھواں، سیاہ حاشیے اور موذیل جیسے افسانے نکلے۔ انہیں افسانہ نگاری کا معاوضہ ملا کرتا تھا۔ اسی باعث کبھی کبھار ایک ہی نشست میں افسانہ لکھ ڈالتے۔ زود نویسی کی وجہ سے ان کے یکسانیت در آئی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ادھر آگئے مگر یہاں حالات زیادہ سازگار نہیں تھے۔ ان

چکی تھی۔ ایسے میں کچھ مقامی لوگ ملنے کے لیے آئے۔ صحت پوچھی۔ پھر دعا کی درخواست کی۔ اس نے کہا، حضور میں نے فلاں قبرستان کے پاس دکان لی ہے مگر وہاں تو کاروبار ہی نہیں۔ سناٹا رہتا ہے۔

درویش نے مسکرا کر کہا۔ ''بے فکر رہو، جلد تمھارا کاروبار چل نکلے گا۔''

پھر یوں ہوا کہ درویش کا انتقال ہوگیا، اسی قبرستان میں تدفین ہوئی۔ فیض کا سلسلہ انتقال کے بعد بھی جاری رہا۔ معتقدین ادھر آنے لگے۔ اور یوں وہ سوالی، جو دم آخر دعا کے لیے آیا تھا، اس کا کاروبار چل نکلا۔ وہ اس واقعے کو یاد کر کے آنسو بہاتا۔ آنے جانے والوں سے تذکرہ کرتا۔

واصف علی واصف بیسویں صدی کے صوفی تھے۔ وہ 15 جنوری 1929 کو خوشاب میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق اعوان قبیلے سے تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ پھر اپنے نانا کے پاس جھنگ چلے آئے۔ باقی تعلیم جھنگ سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔

سول سروس کا امتحان تو پاس کرلیا تھا مگر طبیعت ادھر نہیں جاتی تھی۔ اچھا خاصا عہدہ چھوڑا اور تدریس کی سمت آگئے۔ پرانی انارکلی میں ''لاہور انگلش کالج'' کے نام سے اپنا ادارہ قائم کیا۔ شعر کہنے کا سلسلہ تو اوائل عمری میں شروع ہوگیا تھا مگر اب اس میں گہرائی در آئی۔ ایک نئی جہت دکھائی دیتی۔ ایک نیا

راستہ۔ ان کا کلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ لوک گیتوں کی صورت سامعین کے دلوں میں اتر گیا۔ اسی زمانے میں لاہور کے ادیب اور شعرا سے تعلق قائم ہوا، جو آخر تک قائم رہا۔ ''شب چراغ'' ان کے پہلے مجموعے کا عنوان تھا، جس کی روشنی دور دور تک پھیلی۔

کالج کیا تھا، درویش کا ڈیرا تھا۔ لوگ شہرت سن کر فیض یاب ہونے کے لیے دور دور سے آنے لگے۔

عقیدت مندوں میں بااثر بیوروکریٹ، وکلا اور سیاسی شخصیات بھی شامل ہوا کرتیں۔ وہ استحکام پاکستان کے آرزو مند تھے۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب آنکھوں میں تھا۔ چاہنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ شاعری اور لیکچرز کے بعد کالم نویسی کے ذریعے بھی اُن کے افکار کی رسائی بڑھنے لگی۔ ان کے ہفتے وار کالم بہت مقبول ہوئے۔ کتابی صورت میں ان کی اشاعت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

18 جنوری 1993 کو واصف علی واصف کا انتقال ہوا۔ ان کے افکار آج بھی معتقدین کی رہنمائی کررہے ہیں۔

پر فحاشی کے الزام لگے، مقدمے بنے۔ بیماری اور کثرت شراب نوشی نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ 18 جنوری 1955ء میں ان کا انتقال ہوا۔

دوسرا نام ہے، اردو ناول کی بے تاج ملکہ قرۃ العین حیدر کا۔ جو شہرت ان کے حصے میں آئی، باقی فکشن نگار اس کا فقط خواب دیکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں نے آج بھی قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ یوں تو ان کی ہر کتاب اپنی مثال آپ ہے، مگر ''آگ کا دریا'' کی شہرت اور اثر پذیرائی سے موازنہ ممکن نہیں۔ اس عظیم ناول کی کہانی ڈھائی ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے اور بیسویں صدی کے نصف پر آ کر رکتی ہے۔

قرۃ العین حیدر 20 جنوری 1927 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلی آئیں، مگر یہاں کے حالات سے نبھا مشکل تھا۔ ہندوستان لوٹنا پڑا۔ 1989 میں انہیں ہندوستان کے سب سے باوقار ادبی اعزاز ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ 1985 میں پدم شری اور 2005 میں پدم بھوشن جیسے ایوارڈز ان کے حصے میں آئے۔ وہ غصے کی تیز تھیں۔ زندگی کے آخری حصے میں انہیں معاشی مسائل بھی درپیش رہے۔ 21 اگست 2007 کو دہلی میں طویل علالت میں ان کا انتقال ہوا۔

آتا ہے جو طوفاں آنے دو کشتی کا خدا خود حافظ ہے
ممکن تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آ جائے

☆عبدالستار ایدھی

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہ ہوں شاید، مگر ایسے بھی ہیں

فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات اکثر شکایت کرتی ہیں کہ ہمارے ہاں قدر دانی کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے پاکستانی ہیروز پیدا نہیں کر سکے، یعنی ہمارے ہاں باصلاحیت اور محنتی افراد کی کمی نہیں، مگر نہ تو انہیں شناخت کیا جاتا ہے نہ عزت دی گئی لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو ستائش اور قدردانی کے محتاج نہیں ہوتے۔ بے لوث خدمت کرتے ہیں۔ کسی صلے کی توقع نہیں رکھتے، اپنا سب کچھ انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے۔ عبدالستار ایدھی بھی ایسے ہی انسان تھے۔ وہ پاکستان کا اصل چہرہ تھے۔ انہوں نے دنیا کو امن اور محبت کا پیغام دیا۔ بین الاقوامی شہرت ان کے حصے میں آئی۔ عالمی محبت ملی۔ مگر ان کے طرزِ زندگی میں تبدیلی نہیں آئی۔ ان کی تنظیم ایدھی فاؤنڈیشن کو کروڑوں روپے فنڈ ملتا تھا مگر انہوں نے اپنی ذات پر ایک روپیا خرچ نہیں کیا۔ دو کمرے کے مکان میں زندگی گزار دی۔

یہ عظیم شخص 1928 میں بھارتی ریاست گجرات میں پیدا ہوا۔ والد کپڑے کے تاجر تھے۔ سماجی خدمت کی سمت مائل کرنے میں ان کی والدہ نے اہم کردار ادا کیا، جو درد دل رکھنے والی ایک نرم خو، غریب پرور خاتون تھیں اور اپنے مستحق رشتے داروں، محلے داروں کا خاص خیال رکھتی تھیں۔ واقعہ مشہور ہے کہ والدہ انہیں اسکول جاتے وقت دو پیسے دیتی تھیں، وہ ایک پیسا خرچ کرتے، ایک کسی ضرورت مند کو دے دیتے۔ والدہ بیمار پڑیں تو ان کی دیکھ ریکھ کے لیے خود... کو وقف کر دیا۔ کم عمری میں انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھ دیا تھا۔ ایک کپڑے کی دکان پر کام کرتے رہے۔ پڑھائی میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔

1947 میں تقسیم کے بعد ان کا خاندان کراچی آ گیا۔ چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ گھر والوں کا ہاتھ بٹایا۔ ایک فلاحی تنظیم سے بھی منسلک رہے مگر وہاں اقربا پروری دیکھی، تو احتجاج کیا۔ حق گوئی کی پاداش میں انہیں تنظیم سے باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ جمع پونجی سے ایک چھوٹی سی دکان خرید کر اسے ڈسپنسری کی شکل دے دی۔ اب وہ گھر کم ہی جاتے۔ رات بنچ پر سو جاتے، تاکہ بہ وقت ضرورت فوری طور پر مریض کی مدد کو پہنچ سکیں۔ 1957 میں کراچی میں فلو کی وبا پھیلی تو انہوں نے ڈسپنسری سے باہر نکل کر پہلی بار بڑے پیمانے پر کام کیا۔ ملیر کے علاقے میں خیمے لگائے۔ ادویہ تقسیم کیں۔ اس عمل سے انہیں خاصی شہرت ملی۔ مخیر حضرات مدد کو آگے آئے۔ اب انہوں نے دکان کی اوپر والی منزل خرید لی اور ایک زچگی سینٹر اور نرسوں کا تربیتی اسکول

☆باپ بیٹا اور جنوری

پشتون سیاست کی نمایاں ترین شخصیت کی برسی بھی اس ماہ منائی جاتی ہے۔ یہ خان عبدالغفار خان کا ذکر ہے، جو 6 فروری 1890 کو چارسدہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آج انہیں باچا خان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ کچھ حلقے انہیں سرحد کا گاندھی بھی کہتے ہیں۔ وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ اس وجہ سے انہیں ایک متنازع شخص کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اوائل میں انہوں نے برطانوی راج کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پھر پختون قبائل میں اصلاحات کے لیے خدائی خدمت گار تحریک شروع ہوئی۔ 1920 میں کانگریس کا حصہ بن گئے۔ البتہ جب خطے کے مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ جا کھڑے ہوئے، تب بھی وہ کانگریس ہی کے مؤقف کی تائید کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ وہ حکومت کے ناقد تھے اور ان کے نظریات سماج کے لیے ہضم کرنا دشوار تھا۔ طویل عرصے نظر بند رہے۔ 1987 میں انہیں ہندوستان کا سب سے بڑا سول اعزاز "بھارت رتن ایوارڈ" دیا گیا۔ وہ یہ اعزاز پانے والے پہلے غیر ہندوستانی تھے۔ 20 جنوری 1988 کو یہ عظیم پختون لیڈر انتقال کر گیا۔ وصیت کے مطابق جلال آباد، افغانستان میں ان

شروع کیا۔ جلد ایک ایمبولینس خرید لی، جسے وہ غریب آدمی کی ایمبولینس کہا کرتے تھے۔ بھٹو دور میں جب صدر کے علاقے میں ایک کثیر المنزلہ عمارت گری، تو ملک میں کھلبلی مچ گئی۔ بھٹو صاحب بھی جائے حادثے پر آئے۔ ایدھی صاحب کی خصوصی درخواست پر وزیراعظم نے متاثرین کی دادرسی کی۔

بلقیس ایدھی، جو مستقبل میں ان کی شریک حیات بننے والی تھیں، وہ بطور نرس ان کے سینٹر سے وابستہ تھیں۔ جلد دونوں قریب آگئے اور رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ آنے والے برسوں میں بلقیس ایدھی نے ہر مشکل محاذ پر ان کا ساتھ دیا۔ پنجاب کے سفر کے دوران جب ایک حادثے میں ایدھی شدید زخمی ہوئے، تب بلقیس ان کے ساتھ تھیں۔ اس وقت یہ خبر پھیل گئی تھی کہ ایدھی کا انتقال ہوگیا۔ ایسا بھی ہوا کہ اندرون سندھ کے سفر میں ڈاکوؤں نے روک لیا مگر جب انہیں خبر ہوئی کہ ایمبولینس ایدھی چلا رہے ہیں، تو جانے کی اجازت دے دی۔ اسی طرح کراچی میں جب سیکیورٹی فورسز اور دہشت گردوں کے مقابلے کے دوران ایدھی ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا تو فائرنگ رک گئی۔ جب تک ایدھی نے لاشیں نہ اٹھا لیں، دونوں فریق خاموش رہے۔

بچے بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سماجی خدمت کے میدان میں آئے۔ آج فیصل ایدھی ہی تنظیم کی ذمے داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ عبدالستار ایدھی نے ایدھی جھولے کا تصور متعارف کروایا اور اپیل کی کہ جن بچوں کو ماں باپ مجبوری یا بدنامی کے خوف سے پالنا نہیں چاہتے، انہیں کچرا کنڈی میں پھینکنے کے بجائے اس جھولے میں ڈال دیا جائے۔ اس پر ان پر کچھ طبقات کی جانب سے شدید تنقید ہوئی۔ فتوے جاری ہوئے مگر وہ سر جھکائے کام میں مگن رہے۔ انہیں سیاسی جماعتوں کی جانب سے بھی خاصا ستایا گیا۔ ایک بار تو وہ اپنا علاقہ کھارادر چھوڑ کر سہراب گوٹھ منتقل ہوگئے تھے۔ اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ایسا وقت بھی آیا، جب جان بچانے کے لیے انہیں لندن جانا پڑا۔

الغرض اس سفر میں کئی مشکلات پیش آئیں۔ کتنے ہی عذاب برداشت کیے، مگر ہمت نہیں ہاری۔ اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ ایدھی فاؤنڈیشن کی ایمبولینسوں کی تعداد 600 تک پہنچ گئی۔ اسپتالوں کے علاوہ ایدھی فاؤنڈیشن نے کلینک، زچگی سینٹر، پاگل خانے، معذوروں کے لیے گھر، بلڈ بینک، یتیم خانے، لاوارث بچوں کو گود لینے کے مراکز، پناہ گاہیں اور اسکول بھی کھولے۔ اس تنظیم نے افغانستان، عراق، چیچنیا، بوسنیا، سوڈان، ایتھوپیا میں اپنے مراکز قائم کیے۔ 16 اگست

کی تدفین ہوئی تھی۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ باچا خان کے بیٹے ولی خان کا تذکرہ بھی ماہ جنوری ہی میں آتا ہے۔ جی ہاں، اپنے باپ کے مانند ترقی پسندی اور قوم پرستی کا علم بلند کرنے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے اس سیاست دان نے 11 جنوری 1917 کو اتمان زئی، چارسدہ میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کی سیاسی جماعت نیپ پر ایک مرتبہ یحییٰ خان اور دوسری مرتبہ ذوالفقار علی بھٹو نے پابندی لگائی۔ صدارتی انتخابات میں انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کا بھرپور ساتھ دیا۔ بھارت سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ شملہ معاہدہ اور بھارت سے 90 ہزار مسلمان قیدیوں کی واپسی میں ان کا کردار اہم سمجھا جاتا ہے۔ بھٹو دور میں انہیں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، جیل میں رہے، مگر جب مارشل لگایا گیا، تو انہوں نے ضیا حکومت کی بھرپور مخالفت کی۔ ایم آر ڈی کی تحریک شروع ہوئی، تو پی پی کا ساتھ دیا۔ انہیں ہر حکمراں نے خریدنے کی کوشش کی، مگر وہ جدوجہد سے دستبردار نہیں ہوئے۔ 1990 کے انتخابات میں جب قومی اسمبلی کی نشست پر ان کا مدمقابل کامیاب ہوا، تو انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کرلیا۔ 26 جنوری 2006 کو ولی خان کا انتقال ہوا۔

2006 کو ایدھی انٹرنیشنل ایمبولینس فاؤنڈیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا، جس کے تحت دنیا کے مختلف ممالک میں کام کرنے والے فلاحی اداروں کو ایمبولینس بہ طور عطیہ دی جاتی ہے۔

ان خدمات کے نتیجہ میں ایدھی ایک بین الاقوامی شخصیت بن گئے۔ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق ایدھی فاؤنڈیشن کی ایمبولینس سروس دنیا کی سب سے بڑی فلاحی ایمبولینس سروس ہے۔ ایدھی چھٹی کیے بغیر طویل ترین عرصہ تک کام کرنے والے سماجی کارکن کہلائے۔ بیس ہزار لاوارث بچوں کی سرکاری دستاویزات میں عبدالستار ایدھی کا نام باپ کی حیثیت سے درج ہے۔ 9 جولائی 2016 کو اس عظیم شخص کا انتقال ہوا۔

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

☆احمد فراز

کہتے ہیں، ایک صدی میر کی، دوسری غالب کی، پھر اقبال آئے اور پھر فیض۔ عام خیال ہے کہ فیض کے بعد حقیقی معنوں میں بڑے شعرا پیدا نہیں ہوئے۔ کسی شاعر کے ہاں وہ گہرائی اور اثر پذیری نظر نہیں آئی۔ شاید یہ خیال اتنا درست نہ ہو کہ ایک شاعر ایسا بھی گزرا، جس نے فیض اور راشد کے زمانے ہی میں اپنا سکہ جمالیا تھا، جس کی شہرت نہ صرف پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں پھیل گئی، جس نے حقیقی معنوں میں اپنی نسل کو متاثر کیا، جس کی رومانویت کے بھی لوگ دل دادہ تھے، جس کے احتجاج کو بھی سامعین نے اپنے دل کی پکار جانا۔

یہ احمد فراز کا تذکرہ ہے، جو اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ جو ان کا کلام سنتا، وہ گرویدہ ہو جاتا۔ وہ ایک عہد ساز انسان تھے۔ انہوں نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی، مگر یہ غزل تھی جو ان کی پہچان بنی۔ وہ بھی اپنے عہد کی غزل کی شناخت ٹھہرے۔ وہ اپنے عصر کے بہترین غزل گو شعرا تصور کیے جاتے تھے۔ احمد فراز 12 جنوری 1931 کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ کوہاٹ ان کا آبائی وطن تھا۔ ان کا اصل نام سید احمد شاہ علی تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ریڈیو کے لیے فیچر نگاری کرتے رہے۔ شاعری کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ جلد مشاعروں میں ان کا ڈنکا بجنے لگا۔

کچھ ناقدین کو اُن کے ہاں فیض کا اثر دکھائی دیتا ہے، جس کا وہ برملا اعتراف کیا کرتے۔ وہ فیض صاحب کے بے حد قریب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھے۔ البتہ ان کی شاعری کو "فیض کے زیر اثر کی جانے والی شاعری" کہنا زیادتی ہے۔ ان کے ہاں بہت وسعت تھی۔ فراز نے زندگی میں تین مارشل لا دیکھے۔ اس زمانے میں ترقی پسند سوچ کا غلبہ تھا، آمریت کے خلاف آواز اٹھانا رسم تھی۔ حق گوئی اور بے باکی ادب کی علامت تھی۔ شاعری میں فیض احتجاجی وانقلابی شاعری کا سب سے قابل احترام نام تھے... ایسے میں جو بھی نئے شاعر اس سمت آتے، ان پر فیض کی چھاپ تو لگنی تھی مگر فراز کا کمال یہی تھا کہ انہوں نے اپنی الگ، مستحکم شناخت بنائی اور ایک نسل کو گرویدہ بنایا۔

جب پہلا شعری مجموعہ "تنہا تنہا" شائع ہوا، وہ بی اے کے طالب علم تھے۔ بعد میں انہوں نے اردو اور فارسی میں ایم اے کیا اور تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اسی زمانے میں دوسرا مجموعہ "دردِ آشوب" چھپا، جو پاکستان رائٹرز گلڈز کی جانب سے "آدم جی ادبی ایوارڈ" کا حق دار ٹھہرا۔ بعد وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سربراہ رہے۔ اُن کی کتابیں نایافت، جاناں جاناں، شب خون، مرے خواب ریزہ ریزہ، بے آواز گلی کوچوں میں، غزل بہانہ کروں، خواب گل پریشان ہے کے زیر عنوان شائع ہوئیں، جنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کلیات شہرِ سخن آراستہ ہے کا شمار مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔

وہ پاکستان نیشنل سینٹر، پشاور کے ڈائریکٹر رہے۔ 1976 میں اکادمی ادبیات پاکستان کا انہیں سربراہ بنایا گیا، تاہم جب مارشل لا لگا تو انہوں نے آمریت کے خلاف آواز اٹھائی۔ عہدے سے الگ ہونا پڑا، جس کا انہیں غم نہیں تھا۔ دوران مشاعرہ انہیں گرفتار کیا گیا۔ جھکنے کو تیار نہیں تھے، سو جلا وطنی اختیار کر لی۔ "محاصرہ" اسی زمانے کی نظم ہے، جسے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ یہ اس وقت لکھی گئی، جب ضیا دور میں انہیں حکومتی سطح پر ہونے والے ایک ادبی سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔

شکوۂ ظلمت شب سے کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

فقط حکومت پاکستان ہی نہیں، بھارت کی جانب سے بھی انہیں "فراق گورکھ پوری ایوارڈ" اور "ٹاٹا ایوارڈ" پیش کیے گئے۔ اکیڈمی آف اردو لٹریچر، کینیڈا نے بھی نشان سپاس سے نوازا۔ انہیں پرویز مشرف کے دور میں ہلالِ امتیاز پیش کیا گیا تھا، لیکن دو برس بعد انہوں نے یہ ایوارڈ واپس لوٹا دیا۔ آخری برسوں میں ان کی آواز جمہوریت کے لیے بلند ہونے والی توانا ترین آوازوں میں شامل تھی۔ ان کے کلام کو کئی گلوکاروں نے گایا۔ یوں اس کی رسائی کئی گنا بڑھ گئی۔ ان کا کلام جامعات کے نصاب میں شامل ہوا۔ اس کا انگریزی، جرمن، روسی، فرانسیسی، ہندی، یوگوسلاوی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ان پر پی ایچ ڈی تھیسس لکھے گئے۔ 25 اگست 2008 کو اس رجحان ساز شاعر کا انتقال ہوا۔

اب نہ وہ میں، نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں

☆ اصغر خان

پاکستان کی سیاست اُن کے تذکرہ کے بنا ادھوری ہے، یا یوں کہا جائے کہ ان کی سیاسی زندگی پاکستان کی سیاسی تاریخ ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ کئی فوجی افسران نے سیاست میں قدم رکھا، مگر چند ہی ایسی شخصیات ہوں گی، جو اس پرپیچ اور ہمہ وقت بدلتی دنیا سے خود کو ہم آہنگ کر سکیں اور حقیقی معنوں میں کوئی کردار ادا کرنے میں کامیاب رہیں۔ اصغر خان ان میں سے ایک ہیں، جن کے سینے میں جانے کتنے راز دفن ہیں۔ پاکستانی تاریخ کے اہم ترین ادوار کے وہ نہ صرف شاہد بنے، بلکہ ان کی صورت گری میں بھی حصہ ڈالا۔ خود فوجی تھے مگر سیاست میں فوج کی مداخلت کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ یہ اقدام اصغر خان کیس کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ سینئر سیاست دان 17 جنوری 1921 کو جموں میں پیدا ہوئے۔ رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دون میں وہ زیر تعلیم رہے۔ گریجویشن کے بعد کمیشنڈ آفسر مقرر ہوئے۔ پھر انڈین ایئر فورس کا حصہ بن گئے۔ انبالہ اور سکندر آباد میں تعینات رہے۔ پشاور میں وقت گزرا۔ برما میں بھی ذمے داریاں نبھائیں۔

فوج میں ان کا کیریر قابلِ ستائش رہا۔ ائر فورس کی سمت آنے والوں کو ان کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ 1945 وہ میں اسکواڈرن لیڈر ہو گئے۔ انہوں نے برطانیہ میں جیٹ طیارے اڑانے کی تربیت حاصل کی۔ فلائنگ ٹریننگ اسکول انبالہ میں

چیف فلائنگ انسٹرکٹر کی حیثیت سے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ قیام پاکستان کے بعد رسالپور نوشہرہ کے ایئر فورس کالج کو منظم کرنا ان کا اہم کارنامہ تھا۔ دو برس بعد گروپ کیپٹن ہوگئے۔ پھر آپریشنل پاکستان ایئر فورس کی کمان سنبھالی۔ 1957 میں فقط 36 سال کی عمر میں ایئر وائس مارشل بنائے گئے، اگلے برس وہ ایئر مارشل ہوگئے۔ اتنی کم عمر میں ایسی کامیابی کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد محکمۂ ہوابازی کے ناظم اعلیٰ اور پی آئی اے کے صدر نشین رہے۔

اپنے وقت کے اس بہترین فوجی افسر کے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ تھا، جس کے لیے انہوں نے سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ 1969 میں انہوں نے جسٹس پارٹی قائم کی۔ اگلے برس اس کا نام بدل کر تحریک استقلال کر دیا۔ ایوب مخالف تحریک میں وہ بھٹو کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کی توانا آواز، ان کی باوقار شخصیت اور بے داغ کیریر نے تحریک کو اعتماد بخشا۔ گو 1970 کے انتخابات میں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی سیاسی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ بھٹو دور میں وہ حزب اختلاف رہے۔ 1977 کے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف پی این اے کی جو احتجاجی تحریک شروع ہوئی، اس وہ پیش پیش تھے، مگر اس تحریک کے نتیجے میں ملک میں مارشل لا لگ گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ مارشل لا لگنے والا ہے۔ ایک ذمے دار سیاست دان کی حیثیت سے انہیں بہتر فیصلے لینے چاہیے تھے۔ شاید یہ اعتراض درست ہو، مگر اگلے مرحلے میں جب مارشل لا کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو انہوں نے جمہوری قوتوں کا ساتھ دیا۔ نظر بند بھی رہے۔ 1981 میں پی این اے سے الگ ہوکر ایم آر ڈی سے وابستہ ہوگئے۔ 1988 کے انتخابات میں بھی ان کی جماعت بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکی۔ صدر پرویز مشرف کے دور میں ان کے صاحب زادے عمر اصغر خان کو کابینہ میں شامل کیا گیا۔ عمر اصغر خان کی موت بڑے پُراسرار حالات میں ہوئی۔

اصغر خان کو ہلال قائداعظم اور ہلال پاکستان جیسے اعزازات سے نوازا گیا تھا، لیکن انہوں نے یہ اعزازات لوٹا دیے۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے، کوئی ہم سا ہوگا

☆☆☆

ایاز

ایاز راھی

وہ بازار میں بکتا ہوا بالآخر محمود غزنوی کے دربار تک پہنچ گیا۔ ہیرے کی قدر جوہری ہی کرتا ہے۔ اس کی جوہر شناس نگاہوں نے غلام کی مخفی صلاحیتوں کو پہچان لیا۔ وہی غلام جو بازاروں میں بک رہا تھا اس کا صحیح نائب ثابت ہوا۔

تاریخ کے اوراق سے ایک نادر تحفہ

وقت غم واندوہ سے گنگ۔ درد کی تصویر بنا، دنیائے دوں کی کمینگی دیکھ رہا تھا۔ اک ایسا تماشا کہ جس سے ذہن و دل تو کیا روح تک لہولہان ہو رہی تھی۔ منڈی لگی ہوئی تھی اور اشرف المخلوقات کوڑیوں کے بھاؤ بک رہا تھا۔ میں بھرپور احساس لیے سوچا بے بس تماش بین تھا۔ آہ، مالک ارض و سماء کے ہوتے خلیفۃ الارض چوپایوں کی مانند خریدا اور بیچا جا رہا تھا، وہ بھی اپنے ہی جیسے ہم جنسوں کے ہاتھوں۔ وہی خریدار، وہی بکاؤ مال۔ ہاں، وہی اشرف المخلوقات جس

کے بارے میں والتین ۔ والزیتون ۔ مقدس وادی سینا کے
کوہ طور اور شہر امین (مکہ) کی قسم کھائی گئی کہ تمام مخلوق میں
سے اسے بہترین سانچے میں ڈھالا گیا۔ ہاں، وہی شہر امین
مکہ، جو تین اعلیٰ اور ثقہ امانت داروں (اللہ عزوجل۔ جبریلؑ۔
محمد ﷺ) کا مرکز نگاہ ہے۔ ام القریٰ ہے۔ کہاں مدلل
قسموں سے بھرپور دعوائے یزداں اور کہاں یہ سماں؟
افغانستان کے اس خطے میں غلاموں کی تجارت عروج پہ تھی۔
ہر قسم کا غلام خوب ٹھونک بجا کے خریدا جا رہا تھا۔ بکاؤ غلاموں
کی خصوصیات زور و شور سے بیان کی جارہی تھیں۔ وفادار۔
خدمت گزار۔ نیک شعار بلکہ خود سے دست بردار، ہر قسم ہر
حجم کے بکاؤ غلام جنہیں اپنے نام و نسب، خاندان، برادری
اور ماں باپ تک کا کوئی علم نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیوں کہ ایک
چوپائے اور غلام میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ ہر دو
جانداروں کا مقصد آقا کے اشاروں پہ چلنا ہی ہوتا ہے۔
فرشتے اپنے مسجود، ابن آدم کی پستی پہ انگشت بہ دنداں تھے
اور ابلیس طنزیہ مسکراہٹ لیے تذلیل آدم کا نظارہ کررہا تھا۔
اپنے انکار سجدہ کے نتیجے میں تقنطو (مایوسی) کے اس جواز
سے لطف اندوز ہورہا تھا کہ کیا یہ وہی احسن التقویم آدم ہے
جو عروس کائنات ہے اور جو اس وقت جانوروں سے بھی کم
قیمت پہ مال کاسد کی طرح دستیاب ہے؟ ہاہاہاہا۔
میں پھٹی آنکھوں سے منظر اور یہ مکروہ دھندا دیکھ رہا تھا۔
سر جھکائے خاموش غلاموں کی ظاہری ساخت ان کے مول
تول کی بنیاد تھی۔ سبھی غلام بے حس کھڑے سانس بھی آہستہ
لے رہے تھے تاکہ مالک کی پیشانی پہ کوئی بل نہ آنے پائے
اور وہ اپنے گاہک اپنے خریدار کے مزاج و معیار پہ بھی
پورے اتریں مگر ایک غلام کہ بے چینی اس کی آنکھوں سے
مترشح تھی، ماتھے پہ شکنیں ڈوب ابھر رہی تھیں بے قراری
سے اِدھر اُدھر، دائیں بائیں دیکھتا اور ہر طرف سے مایوس
ہوکے بالآخر گردن ڈال دیتا۔ کبھی کبھار آسمان پہ بھی نگاہ
پڑتی تو اک آہ بھر کے رہ جاتا۔ سمندر کی مانند بہ ظاہر خاموش
لیکن اندر طوفاں لیے خود سے برسرپیکار تھا۔ اس کے ذہن
میں روشن سوچ کا دیا اس کی رگ رگ میں چنگاریاں بکھیر رہا
تھا۔ ہڈیاں انگاروں کی مانند چٹخ، چمک رہی تھیں۔ سموچا وہی
کیفیت کہ

اے روشنی طبع۔ تو برمن بلا شدی

اس کی حیثیت اس کے لب پہ ہوئے تھی جس پہ بے بسی کی
مہر کا معروضی ٹھپہ اندر کی روشنی کو رد کیے ہوئے تھا کہ وہ بہ
حال اک غلام تھا۔ بکاؤ مال تھا حالات کے جبر کا؟ اپنے ہم
جنسوں کا؟ یا قسمت کے لکھے کا؟ یوں غلام کی کوئی مرضی کوئی
خواہش نہیں ہوتی نہ ہی کوئی ارادہ اور جادہ کہ غلامی میں نہ کام
آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں۔
چنانچہ جگہ جگہ منڈی لگتی رہی اور وہ در بہ در بکتا رہا۔ یہ الگ
بات کہ اس تیرہ و تاریک جیون میں بھی وہ ''غلامی سے بتر
ہے بے یقینی'' جیسی صورتِ حال سے بچا ہوا تھا۔ شاید
قدرت اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی تھی لیکن فی الحال
مردہ بہ دست زندہ۔ جیسے شب و روز تھے اس کے۔ ایسے میں
ماں باپ۔ خاندان برادری اور حسب نسب کا کیا سوال؟ مگر
اس کی فطرت میں دبی سوچ کی چنگاری مسلسل سلگ رہی تھی۔
میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ جانا کہاں ہے مجھے؟
وہ دوگونہ عذاب میں مبتلا غلام تھا کہ اندر کی آگ اور باہر کا
صبر، چکی کے دو پاٹوں کی مانند اسے پیس رہا تھا۔ من کی
جوت ان حالات میں ظالمانہ مذاق بنی ہوئی تھی۔ نام بھی
جانے کس نے ایاز رکھ دیا تھا کہ ترکی زبان میں ایاز بہ معنی
غلام، لڑکا، پیارا، معشوق، سپاہی وغیرہ۔ بے شمار غلام تھے جو
اس کی طرح مول تول سے دوچار تھے مگر وہ سب مطمئن ہی
نظر آتے تھے کہ وہ سب تقدیر کا لکھا ہی جان کے خاموش تھے۔
ان کے اندر کوئی خواہش، کوئی چنگاری نہیں تھی۔ وہ اپنے
جیسے بندوں کو ہی اپنا خدا سمجھے بیٹھے تھے۔ اس سے آگے ان
کی کوئی سوچ، کوئی سمجھ نہیں تھی۔ جب وہ مرد اس غلامانہ
تجارت کے معمول اور خوگر تھے تو عورتوں اور لونڈیوں کی کیا
حیثیت؟ کیسا ذکر؟ کہ معاشرہ تو تھا ہی مردوں کا۔ مرد ہی
عامل اور مرد ہی معمول۔ آقا بھی غلام بھی۔ سو۔ شعور کی
روشنی ابھی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں ہی تھی۔ کہیں کہیں
اس کا وجود اجالے کا نقیب تھا جیسا کہ وہ غلام (ایاز) شعور کا
گہر، بند سیپ میں لیے جی رہا تھا اس آس میں کہ شاید اس کا
یہ گوہر نایاب کسی جوہر شناس کی نظر میں آجائے اور یہ موتی
ضائع ہونے سے بچ جائے۔ آدمیوں کے اس جنگل میں
اسے کسی انسان کی تلاش تھی۔ اس کی عقل مسعود کسی مقام محمود
کی خواہاں تھی۔ بہ ظاہر جس کا دور دور تک امکاں نظر نہیں آتا
تھا لیکن من مندر میں آشا کے دیپ بجھتے بجھتے بھی پھر سے
لو دے اٹھتے اور ان کی جوت پہلے سے بھی بڑھ جاتی۔ نہ
جانے کیوں؟ اس کی طرح کے نہ جانے کتنے تھے کہ جو
تاریک راہوں میں مارے گئے تھے۔ بے نام و نشاں، رزق
خاک ہوگئے تھے۔ مجھ سے اس نوخیز و نوعمر غلام کا درد و الم

مزید نہ دیکھا گیا۔ کوئی کب تک دیدہ و دل کا عذاب سہے؟ میں نے گھبرا کے آنکھیں موند لیں۔ برسوں بیت گئے۔ صدیوں کے جادو میں گم، چشم تصور کے در، دوبارہ وا ہوئے تو منظر یکسر کچھ اور تھا۔ میں ایک بار پھر حیرت میں ڈوب گیا۔ قدرت کی دست گیری اور وقت کی مہربانی عجب بہاری جاہ و جلال کے رنگ دکھلا رہی تھی۔ فتح و کامرانی کی اک دھنک سی فضا میں بکھری ہوئی تھی۔ اک جشن کا سماں تھا۔ کائنات دلہن بنی مسکرا رہی تھی۔ غزنی (افغانستان) کا سلطان محمود غزنوی (971عیسوی تا 1030عیسوی) ہندوستان پر سولہویں کامیاب حملے کی تکمیل کر چکا تھا اور اپنے لشکر جرار سمیت پورے کرّ و فر کے ساتھ واپس غزنی میں داخل ہو رہا تھا۔

کل کا وہی بے بس و لاچار غلام ایاز سلطان کا دست راست بن چکا تھا۔ اندر کی روشنی اس کے ارد گرد بھرپور اجالا کیے ہوئے تھی جس سے کہ سلطان کی آنکھیں بھی پوری طرح روشن تھیں۔ سلطان محمود غزنوی کہ جس کی آنکھیں ہوا میں معلق بھگوان (سومنات) کو دیکھ کے حیرت سے چندھیا جاتی ہیں تو ایسے میں غلام ایاز مسکرا کے آگے بڑھتا ہے اور بالآخر اس کے شعور کی اجلی روشنی ہوا میں معلق جھوٹے خدا کو زمین کی خاک چٹا دیتی ہے۔ سلطان جوش میں آ کے بت اور بت خانے کی دیواروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے اور ایاز کو اپنے گلے سے لگا لیتا ہے۔ یوں ایک بت شکن (محمود) ہمیشہ کے لیے ایک صنم (ایاز) کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ معلق بت کے ٹکڑے غزنی جامع مسجد کی دہلیز پہ لگا دیے جاتے ہیں اور ایاز سلطان کے من مندر کا دیوتا قرار پاتا ہے لیکن کل کا غلام ایاز اپنے دل خراش ماضی کو کبھی بھی نہیں بھول پاتا۔ عقل سلیم کی روشنی اسے راہ راست پہ رکھتی ہے۔ اسی روشنی میں وہ اکثر اپنا پرانا صندوق کھول کر پھٹا پرانا چیتھڑا لباس پہنتا اور ماضی کو یاد کرتا ہے۔ یہی نہیں ایاز کی عقل سلیم انتہائی قیمتی موتی توڑ کے اپنے آقا (محمود) کے حکم کو اوّلیت کی سند عطا کرتی ہے اور پھر دربار غزنوی سے اسے ابوالنجم کا خطاب ملتا ہے۔ کل کا کمزور اور ناتواں غلام اپنے وقت کے باجبروت بادشاہ کے شانہ بہ شانہ کھڑا تھا۔ رزم میں بھی اور بزم میں بھی۔

ایاز کا مزار رنگ محل چوراہا (لاہور) کے ساتھ ہے وہیں۔ مسجد ایاز بھی ہے۔

ایاز نے بائیس برس تک لاہور پہ حکمرانی کی اور اڑتالیس سال کی عمر میں۔ ربیع الاول 449 ہجری بہ مطابق مارچ 1057عیسوی وفات پائی۔ دوران حکمرانی اسے ملک (حکمران) کا لقب بھی ملا۔ ابوالنجم احمد ایاز ملک نے لاہور کو مزید آباد کیا اور خود بھی رزق خاک لاہور ہوا:

بانی او ایاز محمود است
زین بنا حسن و عشق مقصود است

مقام حیرت ہے کہ ایاز نے اپنے حالات زندگی پر کوئی کتاب لکھی نہ لکھوائی۔

العجب ثم العجب ثم العجب

اور پھر صدیوں بعد شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ (09.09.1877 تا 21.04.1938 عیسوی) نے تذکرہ ایاز کو اپنے اشعار میں پھر سے زندہ کیا۔ انہوں نے اپنے اردو کلام میں گیارہ مرتبہ اور فارسی کلام میں چار بار ایاز کا ذکر مختلف رنگ اور حوالوں سے کیا ہے جس کی تفصیل نذر قارئین ہے۔ پہلے اردو مجموعہ بانگ درا حصہ دوم کی اکیسویں نظم ''پیام عشق'' کا پہلا شعر:

سن اے طلب گار درد پہلو، میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومنات دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا

بانگ درا، حصہ سوئم کی تیرہویں نظم شکوہ:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بانگ درا، حصہ سوئم کی اٹھارہویں نظم ''نصیحت'' کا پانچواں شعر:

در حکام بھی ہے تجھ کو مقام محمود
پالسی بھی تیری پیچیدہ تر از زلف ایاز

بانگ درا، حصہ سوئم کی انہترویں نظم ''خضر راہ'':

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز دل بری

بانگ درا، حصہ سوئم آخری چھٹی غزل کا چھٹا شعر:

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

بال جبریل، حصہ رباعیات کی آٹھویں رباعی:

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ انداز افرنگ
طبیعت غزنوی قسمت ایازی

بال جبریل، ساقی نامہ کا چھیاسی واں شعر:

فروفال محمود سے درگزر

خودی کو نگہ رکھ، ایازی نہ کر

بال جبریل کی چھبیسویں نظم "محبت" کا دوسرا شعر:

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی

مجموعہ ضرب کلیم، حصہ تعلیم و تربیت کی اٹھائیسویں (آخری) نظم "جاوید" کے تیسرے حصے کا ساتواں شعر:

حاصل اس کا شکوہ محمود
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی

ضرب کلیم حصہ ادبیات (فنون لطیفہ) کی آٹھویں نظم "مسجد قوت الاسلام" کا دوسرا شعر:

چشم فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو
کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقام محمود

اسی حصے کی انیسویں نظم۔ سرود حلال۔ کا تیسرا شعر:

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقام محمود

فارسی مجموعہ، پیام مشرق کی نظم "کومٹ و مرد مزدور" کا تیسرا شعر:

یکے کار فرما یکے کار ساز
نیاید ز محمود کار ایاز

(کوئی حکم دینے والا ہے، تو کوئی کام کرنے والا۔ محمود، ایاز کا کام نہیں کرسکتا)

مجموعہ زبور عجم حصہ دوم کی بارہویں نظم کا دوسرا شعر:

من بہ سیمائے غلاماں فر سلطاں دیدہ ام
شعلہ محمود از خاک ایاز آید بروں

(میں غلاموں کے چہرے پر سلطانوں کی شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔ خاک ایاز سے شعلہ محمود اٹھ رہا ہے)

زبور عجم۔ حصہ دوم کی ہی سینتیسویں نظم کا تیسرا شعر:

کسے ایں معنی ء نازک نہ داند جز ایاز ایں جا
کہ مہر غزنوی افزوں کند درد ایازی را

(ایاز کے بغیر کوئی یہ نازک نکتہ نہیں جانتا کہ حاکم کی مہربانی دردِ غلامی کو اور بڑھا دیتی ہے)

زبور عجم۔ حصہ دوم کی ہی پچاس ویں نظم کا دوسرا شعر:

چہ گوئمت کہ چہ بودی؟ چہ کردہ؟ چہ شدی؟
کہ خوں کند جگرم را ایازی ء محمود

(میں کیا کہوں کہ تو کیا تھا؟ تو نے کیا کیا؟ اور اب کیا ہوگا؟ اس بات نے میرے جگر کو خون کردیا ہے کہ محمود نے ایاز کا شیوہ اختیار کرلیا ہے)

آتش فارسی زبان کا لفظ ہے جس کو عربی میں نار، ترکی میں اوت، سنسکرت میں اگنی، ہندی اور اردو میں آگ کہتے ہیں۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ لفظ "آگ" عام طور پر چیزوں کے احتراق (Combustion) یا جلنے کے نظر آنے والے اثرات کو ظاہر کرتا ہے (آگ کا لفظ وسیع معنوں میں کسی بھی دہکتی ہوئی تپش کے مظاہرے کا احاطہ کرتا ہے) احتراق یا جلنے کے عمل میں جلنے والی چیز کے ایک یا ایک سے زائد جزو کے آکسیجن کے ساتھ کیمیائی ملاپ کے نتیجے میں یہ اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ عام فہم زبان میں جب ہوا کی آکسیجن (O2) کسی کاربنی میٹیریل سے کیمیائی ملاپ کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں حرارت، شعلہ اور روشنی پیدا ہوتی ہے چنانچہ اسی شعلے کو آتش یا آگ کہتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس
تلاش: شاہینہ احمد، ڈیرہ غازی خان

دیگر شعرا نے بہت کم ایاز کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اس وقت ساغر صدیقی مرحوم (1928 عیسوی تا 19 جولائی 1974 عیسوی) کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

لکھو یہ عظمت ہستی کے باب میں ساغر
کہ غزنوی کی جلالت غم ایازی ہے

فارسی زبان اور ادب کو ایاز بڑا جاندار اور مستقل محاورہ دیتا ہے کہ۔

ایاز۔ قدر خود بہ شناس۔ (ایاز۔ اپنی حیثیت پہچانو)

1960 عیسوی میں "ایاز" پر فلم بھی بنی تھی جس کی فلم ساز بیگم شریف ملک، ہدایت کار لقمان، موسیقار خواجہ خورشید انور، شاعر قتیل شفائی، تنویر نقوی اور کہانی مرزا ادیب نے لکھی تھی مرکزی کردار حبیب، کمال، صبیحہ خانم اور اداکارہ نیلو نے نبھائے تھے۔ فلم کی نعت "صلو علیہ و آلہ" بہت مشہور ہے اور ایک نغمہ:

رقص میں ہے سارا جہاں
آئے گا وہ شہ خوباں

سراب

راوی : شہباز ملک

آخری قسط

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو ،مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو تکی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو تکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو تکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر ... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چھپ...." مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آ کر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا جیتو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی مار دی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آ گئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شا کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم چلے جا رہے تھے کہ پاسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے پاسو کی رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیر لب کہا "اعلان جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔

ایک روز معائنے کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کرسکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آگئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سوسرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا ابھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقے زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کردیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آگئے۔ سامیرا نے ربیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ایک ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کردیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہوگیا۔ آرگون کی فوج نے آکر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہوگیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کردیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کردیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور رینات کے محل پر قابض ہوگئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ رینات اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آگیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بچھا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کردی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کرکے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہوگئے تھے کیونکہ ایرٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آرہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پیپرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کرلیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہوگیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شاہین اندر آگیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آگئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شاہین نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کردیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شاہین مرچکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آجائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آچکی ہے۔ ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور رینات کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زینی نمودار ہوگئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس وقت سفیر امداد غیبی بن کر آگیا۔ اس کے ساتھی نے زینی کو نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے ہم نکلے اور سامیرا کی مدد کرنے میدان جنگ میں پہنچے۔ جنگ شروع ہوئی اور میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر رینات کو شکست دے دی۔ اور برف والے سے استدعا کی کہ ہمیں واپس ہماری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ راجا عمر دراز اسی دنیا میں رہ گئے۔ ہم سب برف والے کے غار میں جا کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو طغستان کے غار میں تھے۔ اس غار سے باہر نکل کر دیکھا۔ حدِ نظر تک برف ہی برف تھی۔ سفیر، عبداللہ اور وسیم کو غار میں چھوڑ کر میں راستہ تلاش کرتے باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے قید کرلیا۔ قید کرنے والے ریاست خان کو کسی سے ملنا تھا۔ ہم نے پہچان لیا کہ وہ انڈین جندھ ہے۔ ریاست خان کو حقیقت کا پتا چلا کہ وہ نادانستگی میں انڈین کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ محبِ وطن تھا اس نے میرا ساتھ دیا اور اس بندے کی خوب دھنائی کی اور اسے انڈیا میں دھکیل دیا۔ پھر ہم سب پیدل کسی آبادی کی تلاش میں نکلے۔ ایک چھوٹی سی آبادی نظر آگئی۔ وہ لوگ مہمان نواز تھے۔ انہوں نے ایک گاڑی جو نگر جا رہی تھی اس میں میرے ساتھیوں کو بھیج دیا کہ وہ جا کر نگر سے گاڑی لے آئیں۔ میں اسی آبادی میں تھا کہ امداد شاہ نامی بندے سے ملاقات ہوگئی جو گاڑی لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔ ہم ریاست خان اور اس کے دستوں کے ساتھ چل پڑے۔ امداد شاہ نے دھوکے سے مجھے اور ریاست خان کو قید کرلیا اور تشدد کرنے لگا۔ مگر میں نے پہلے خود کو آزاد کیا اور پھر ان سب پر قابو پا لیا۔ امداد شاہ کو لے کر ہم آگے بڑھے۔ ریاست خان کو اسپتال میں داخل کرایا اور نئے سفر پر نکل پڑے۔ راستے میں کئی بار مرشد کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا مگر میں اس کے گھیرے سے نکلتا رہا۔ میں جلد سے جلد راولپنڈی پہنچنا چاہتا تھا راستے میں ایک ہوٹل میں رکا وہاں ایک آدمی کو سر پکڑے روتے دیکھا تو اس کے ساتھ اس کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہاں اس کی بیٹی کو ایک لالچی دولہا سے بچایا اور راولپنڈی کے لیے چل پڑا۔ سفیر وغیرہ سے مل کر خانقاہ پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ حفاظتی انتظامات اتنے سخت تھے کہ میں خانقاہ کے ایک ہال میں پھنس گیا، مرتجس مارا گیا۔ سفیر سر کی چوٹ سے بے ہوش ہوگیا، تبھی باہر دھماکا ہوا۔

(اب آگے پڑھیں)

ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ پوری عمارت کانپ کر رہ گئی۔ میں خود بھی چونک گیا تھا۔ پھر تو دھماکوں کا ایک سلسلہ سا شروع ہو گیا تھا۔ ''یہ دھماکے گرنیڈ کے ہوں گے'' میرے دماغ نے کہا کیونکہ دھماکے تیز تھے اور ان کی گونج کافی دیر تک قائم رہتی تھی لہٰذا آواز بھی دور تک پھیل رہی ہو گی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں بجنے لگی تھیں۔

میں دوڑتا ہوا کھڑکی پر پہنچا۔ باہر کا منظر دیکھتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گیٹ کے باہر چار فور وہیل ڈرائیو بیز کھڑی تھیں۔ ان کی کھڑکیوں سے جھانکتی نالیں گولیاں برسا رہی تھیں۔ گرنیڈ بھی پھینکے جا رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ میرے ہمدرد ہیں۔ عبداللہ جسے میں باہر چھوڑ آیا تھا اسی نے اپنے ساتھیوں کو خبر دی ہو گی۔ میں گاڑی میں بیٹھے آدمیوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر مجھے ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ جوابی گولیاں بھی چل رہی تھیں اسی لیے وہ لوگ باہر نہیں نکل رہے تھے۔ گاڑیوں کی باڈی چھلنی ہوتی جا رہی تھی۔ تبھی میگا فون پر پکارا گیا ''سفیر۔ مرجس۔ شہباز۔''

میں نے آواز پہچان لی، یہ ریاست خان کی آواز تھی۔

''یہ ریاست خان ہیں نا'' مرشد کی آواز سنائی دی۔

''ہاں یہ وہی ہے۔ تمہارا خونی جال ٹوٹ چکا ہے۔ تمہارے احتساب کا وقت قریب ہے۔ یہ تمہارے خون سے ہولی کھیلنے آ پہنچے ہیں۔''

''بچوں کی شرارتوں کا میں برا نہیں مانتا۔ انہیں شوق ہے تو شوق پورے کر لینے دو۔ یہ قیامت تک مجھے نہیں ڈھونڈ سکتے۔''

''میں خود تمہیں گردن سے پکڑ کر باہر نکالوں گا۔''

''اتنی دیر سے تو کوشش کر رہے ہو لیکن پھر بھی دل نہیں بھرا۔''

''سانپ بل میں داخل ہو جائے تو اسے نکالنا آسان نہیں۔ میں پھر بھی کوشش کروں گا۔ مجھے یقین ہے میں تمہیں تمہاری بل سے کھینچ ہی لوں گا۔''

''بچوں کی طرح بھڑک نہ مارو، مجھے ڈھونڈنا آسان نہیں ہے، تم سمجھ رہے ہو کہ میں خانقاہ میں ہوں، غور سے سنو، اس وقت میں خانقاہ سے بہت دور بیٹھا ہوں، پھر بھی تمہاری ایک ایک حرکت دیکھ رہا ہوں۔''

''یہ ایسی عجیب بات نہیں ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کے کونے میں بیٹھا آدمی بھی سامنے نظر آتا ہے ویسے یہ بات بتا کر تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب تمہیں میں خانقاہ کے باہر تلاش کروں گا۔''

''یہاں سے نکلو گے کیسے؟ تمہارے راستے بند ہو چکے ہیں اگر یقین نہ ہو تو باہر نکل کر دیکھو گلیارا تمہیں نظر ہی نہیں آئے گا' صرف دیواریں ہی دیواریں ملیں گی۔''

''کیا تم نے جادو سے گلیارا غائب کیا ہے؟''

''اسے جادو ہی سمجھو... جس آرکیٹیکچر نے ڈیزائن کیا ہے، وہ اپنے کام کا ماہر ہے۔ دنیا بھر کی عمارتوں میں اس کے ڈیزائن کردہ گھر عجوبہ کہلاتے ہیں۔ تم نے سنا ہو گا۔ پیرس میں ایک بلڈنگ ایسی ہے۔ جو دن میں تین بار تین الگ الگ انداز کی نظر آتی ہے۔ اسی طرح کا یہ ماڈل ہے۔ اُس بلڈنگ میں صرف باہر کے شیشے زاویہ بدلتے ہیں جس سے عمارت کا نقشہ بدل جاتا ہے لیکن اس عمارت کا پورا اسٹرکچر بٹن دباتے ہی بدل جاتا ہے۔''

''مجھے اس کا اسٹرکچر نہیں دیکھنا ہے۔ مجھے تو صرف باہر نکلنا ہے۔''

''تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔ تم تیسری منزل پر کھڑے تھے اور تمہیں احساس بھی نہیں ہوا اور تم پہلی منزل پر آ گئے۔ کھڑکی سے باہر دیکھو خود سمجھ میں آ جائے گا کہ تم نیچے آ چکے ہو۔''

''واہ... تم نے خود باہر نکلنے کا راستہ دکھا دیا۔ اب یہ کھڑکی کام آئے گی؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

میں جس مقصد سے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا لیکن مرجس کی موت اور سفیر کی بے ہوشی نے مجھے اکسا دیا تھا کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ سفیر کو کچھ ہو نہ جائے اسی ڈر سے میں نے فرار کی راہ اپنائی تھی۔

''پائپ کے سہارے اترو گے پائپ میں کرنٹ دوڑ رہا ہے۔'' مرشد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اچھا'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اس چادر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' کہہ کر میں نے دو چادروں کے کونے آپس میں باندھے پھر اس کا ایک کونا بیڈ میں باندھا اور سفیر کو کندھے پر لادا پھر پھرتی سے چادر کو پکڑ کر باہر کود گیا۔ تقریباً تین حصہ فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ اب زمین زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے چادر چھوڑ کر جمناسٹک کا مظاہرہ کیا اور نیچے آ گیا۔

کندھے پر وزن ہو تو کودنے پر پیر پر یکایک بہت زیادہ وزن آ جاتا ہے۔ اگر میں ہوا میں خود کو اچھالنے کی

کوشش نہ کرتا تو وزن یقیناً پیر پر ہی پڑتا لیکن یہاں جمناسٹک کام آئی تھی اور اوپر کا فورس اچھال بھرنے کی کوشش کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ اب ایک نیا ''گریوٹی فورس'' پیدا ہوا جس کی وجہ سے گرنے کی رفتار بدلی اور پیروں پر وزن کم پڑا۔

میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ پیر کی ہڈی ٹوٹ بھی سکتی تھی۔ اس کے علاوہ گولیوں سے تو محفوظ رہتا مگر گرنیڈ سے کیسے بچتا؟ گرنیڈ اپنے پرائے کی پہچان نہیں رکھتے۔ ریاست خان کا پھینکا ہوا کوئی گرنیڈ میرے چیتھڑے اڑا سکتا تھا۔

ابھی میرے پیر فرش سے ٹکرائے ہی تھے کہ کوئی چیز میرے سینے سے آ کر لگی۔ پتا نہیں کہاں سے ایک گارڈ آ گیا تھا یہ اسی کے پستول کی گولی تھی۔ میں نے بلا توقف کلاشن کا ٹریگر دبا دیا گارڈ کا بھیجا اڑ گیا۔ میں سرعت سے گیٹ کی طرف دوڑا پیچھے سے گولیوں کی باڑھ آئی۔ اگر میرے جسم پر بلٹ پروف نہ ہوتا تو میں چھلنی بن چکا ہوتا۔ گولیاں ٹکرا ٹکرا کر نیچے گر رہی تھیں۔ ریاست خان نے کور فائر شروع کر دیا تھا۔ میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ اگر گارڈ تھوڑی سے ہمت دکھاتے تو مجھے پھندا پھینک کر پھنسا لیتے۔ مگر وہ دور دور سے ہی فائر کر رہے تھے۔ میں نے فائرنگ کی پروا کیے بغیر دوڑ لگا دی تھی۔ مجھے فکر تھی تو بس سفیر کی کیونکہ اس کا فائر پروف لباس کہیں سے بھی ہٹ سکتا تھا اور تب اس کے جسم میں گولی کا اترنا ضروری تھا۔ دوڑتے ہوئے میں کسی نہ کسی طرح گیٹ تک پہنچ ہی گیا اور باہر آتے ہی پہلی وین میں گھس گیا۔

☆......☆

وین آندھی طوفان کی طرح مرکزی دروازے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ گیٹ ابھی کافی دور تھا۔ پھر بھی نے دیکھ لیا تھا کہ گیٹ کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ تینوں گیٹ آئی ڈی فیکسر تھے۔ میں جب آ رہا تھا تو تینوں گیٹ پر آئی ڈی چیک کرائی تھی۔ آئی ڈی چیک کرانے کا طریقہ عام سا تھا جواب ہر جگہ، ہر اہم دفتر میں رائج ہوتا جا رہا ہے۔ سفیر نے خانقاہ میں کام کرنے والے ایک بندے سے اس کا کارڈ حاصل کر لیا تھا۔ اس کارڈ کو گیٹ پر لگے آئی ڈی چیکر سے لگانا پڑتا تھا تبھی گیٹ کا لاک کھلتا تھا۔ لیکن اس وقت گیٹ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔ تینوں گیٹ کا ایک ہی حشر تھا۔ گو یہ خانقاہ شہر سے کافی فاصلے پر تھی۔ مگر اتنی دور بھی نہیں کہ یہاں کی خبر شہر تک نہ پہنچے۔ پہلے بھی ایک بار یہاں خونی مقابلہ ہو چکا تھا۔ اس لیے پولیس دیر میں سہی لیکن آئے گی ضرور۔

ڈرائیونگ سیٹ پر ریاست خان تھا۔ اس کے برابر اس کے دو ساتھی تھے۔ پیچھے والی گاڑیوں میں کتنے بندے تھے اس کا پتا نہ تھا۔ میں نے ریاست خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم کیسے آ گئے؟''

''میرے پاس جو نمبر تھا وہ وسیم صاحب کا تھا۔ پنڈی پہنچتے ہی میں نے کال کی۔ ان سے پتا چلا کہ آپ خانقاہ گئے ہیں۔ میں نے آنے کی اجازت طلب کی تو وہ بولے کہ اگر آنا ہے تو فوراً آ جاؤ اس لیے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے نکلنا ہے۔ میں آندھی طوفان کی طرح ان کے پاس پہنچا۔ تب پتا چلا کہ عبداللہ صاحب خانقاہ کے احاطے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ اور سفیر صاحب بھی اندر ہیں۔ میں اتنا اندر بھی نہیں آیا۔ وسیم صاحب کے ہمت دلانے پر میں بھی اسی گاڑی میں بیٹھ گیا جس پر وہ دونوں تھے۔ میری گاڑی کو میرے دوست سنبھال رہے تھے۔ اندر آنے سے پہلے عبداللہ صاحب سے ایک گھنٹے کی میٹنگ کر لی تھی.... دراصل وہ خانقاہ سے باہر نکل آئے تھے اور انہوں نے وسیم کو بتا دیا تھا کہ آپ اندر پھنس گئے ہیں۔ وسیم اور عبداللہ صاحب نے مانی کی مدد سے یہاں کے کمپیوٹرائز سسٹم کو ہیک کر لیا''

ریاست خان نے عادت کے مطابق ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''راستے بھر وہ آئی ایم او پر رابطے میں رہے، اور عبداللہ صاحب لیپ ٹاپ پر اس کے ٹپس کو آزماتے رہے۔ سڑک اور اس گیٹ کے تمام چیکنگ پوائنٹس کے کمپیوٹر کو ہیک کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے معاملہ نمٹا لیا۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ مانی سے رابطہ ہو گیا۔ اندر کے حالات دیکھ آیا ہوں۔ اس موقعہ پر مانی کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ گھر پہنچ کر میں بھی اس سے بات کروں گا۔''

باتوں کے درمیان راستہ کٹ گیا اور ہم اس بنگلے تک پہنچ گئے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

☆......☆

بنگلے میں ہم تین افراد بیٹھے تھے وسیم کا چہرہ غم و درد کی تصویر بنا ہوا تھا۔ میں نے مرشد کی سربیت کا مکمل احوال بتا دیا تھا۔ اپنے دوست پر ہونے والے مظالم کی روداد اس نے آنسو پیتے ہوئے سنی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا ''میں اپنے دوست کی شہادت پر آنسو نہیں بہاؤں گا۔ شہید مرا نہیں کرتے میرا دوست بھی زندہ ہے۔ اس کے ادھورے خواب کو میں پورا کروں گا۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں غداری کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے مرشد جیسے غداروں کو سزا دینی ہوگی۔ ہمارے ملک کو انتشار کے گرداب میں دھکیلنے والے صیہونیت و بھارتین کے علمبرداروں کو واصل جہنم کرنا ہی اب میرا مقصد حیات ہے۔ اب مجھ پر واجب ہے کہ مرشد جیسے غداروں کا گلا کاٹوں۔'' وسیم نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''مجھے ریاست خان کے ساتھی نے جو کچھ بتایا ہے وہ بھی اس کا گلا کاٹنے کے لیے کافی ہے۔ مرشد دولت کی خاطر ماں کا سودا کر رہا ہے۔ وطن ہماری ماں ہے۔ اس کی حرمت پر ہم آنچ نہیں آنے دیں گے۔''

''ارے میں تو بھول ہی گیا۔ ریاست خان کو بلاؤ۔ اس سے کچھ اور باتیں معلوم کرنا ہے۔'' میرا جملہ ختم ہوتے ہی سفیر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ دروازے سے باہر جاتے ہوئے بولا:

''ریاست خان باہر کہیں جانے کی بات کر رہا تھا کہیں وہ چلا نہ گیا ہو۔''

سفیر کے باہر جاتے ہی وسیم نے کہا ''جب آپ خانقاہ جا رہے تھے تو میں نے کچھ کہا نہیں تھا لیکن اب میں کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کا وہ فیصلہ غلط تھا۔ اکیلے کچھار میں کود جانا عقل مندی نہیں ہے۔ اگر ہم سب ساتھ ہوتے تو معاملہ کچھ اور رخ اختیار کیے ہوتا۔''

''سب سے پہلی بات کہ میں وہاں مقابلہ کرنے نہیں گیا تھا۔ ایک بھرپور حملے کی پیش بندی تھی وہ۔ میں وہاں کی سیکیورٹی چیک کرنے گیا تھا۔ ورنہ میں تمھیں اور عبداللہ کو چھوڑ جاتا؟ لیکن اب اس ناہنجار کو اس کے انجام تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔''

''خیر جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن اب آپ مجھے چھوڑ کر کوئی مشن انجام نہیں دیں گے۔''

''مرشد کو میں نے چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دیا ہے۔ میں پھر اس موت کے کنویں میں جاؤں گا۔ اس کی خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجاؤں گا۔ خواہ اس بار میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔''

''آپ نے جو کچھ بتایا ہے ان باتوں کو مدِ نظر رکھ کر سوچیں تو وہاں اسے تلاش کرنا بھی مشکل ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''اب تک ہم چھاپہ مار انداز میں لڑتے رہے ہیں مگر اب ہم کھل کر سامنے آئیں گے۔ اخبارات کو شہ سرخیاں فراہم کریں گے۔ اس طرح سامنے آئیں گے کہ ہر طرف ہلچل مچ جائے۔ کیونکہ ملک کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ رونما ہوگا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ریاست خان اور سفیر داخل ہوئے۔ میں نے ریاست کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا جب کہ سفیر سامنے بچھے صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے ریاست خان سے کہا ''اب تم بھی ہمارے اہم ساتھیوں میں سے ایک ہو اسی لیے میں نے تمھیں اس میٹنگ میں شریک کر لیا ہے۔''

''اس اعزاز پر میں فخر کرتا رہوں گا۔'' ریاست خان بولا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ اس خانقاہ کی نئی تعمیر شدہ عمارت کو تو ہم نے دیکھ لیا پھر بھی یہی کہوں گا کہ میری معلومات ادھوری ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی ایسا شخص بھی ہے جو اندر کا نقشہ صحیح صحیح بتا سکے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ ایسے کئی بندے ہیں جو میری وجہ سے مرشد کا اصل چہرہ دیکھ چکے ہیں۔ اور اب اس کے نام پر تھوک رہے ہیں۔ ایسے کئی لوگوں کو میں جانتا ہوں جو ایک دو دن پہلے تک مرشد کے ساتھ تھے۔''

''ایسے کسی آدمی کو بلا لو تا کہ اندر کی تفصیل مکمل مجھ تک پہنچ جائے۔ وہ میرے سامنے اندر کا پورا نقشہ کھینچ دے۔''

''ابھی بلا کر لاتا ہوں۔'' کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

ریاست خان کے باہر جاتے ہی سفیر نے کہا ''میرے علم میں ایک اہم بات آئی ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسا کرتا ہوں میں اس بندے کو بلا لاتا ہوں جس نے مجھے یہ بات بتائی ہے لیکن ریاست خان کے سامنے اس سے کوئی پوچھ گچھ نہ کریں۔''

''اس کمرے کے برابر میں بھی تو ایک کمرا ہے اور اس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا ہے تم اسے لے کر باہر والے دروازے سے اندر آؤ۔ میں وہیں اس سے سوال جواب کر لوں گا۔''

''ہاں یہ صحیح ہے۔ آپ اس کمرے میں جا کر بیٹھیں۔ وسیم اسی کمرے میں رہے گا۔ ریاست خان آیا تو وہ اسے یہیں بٹھا لے گا۔''

''گڈ اچھا آئیڈیا ہے۔'' کہہ کر میں بیڈ سے اتر گیا اور سفیر باہر نکل گیا۔ دراصل میں ہی نہیں ہمارے تمام دوست آنکھ بند کر کے کسی پر بھروسا نہیں کرتے۔ اسی لیے اس نے ریاست خان کے سامنے کچھ کہنے سے منع کیا تھا۔

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرِ پیکار رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

بہت جلد

ماہنامہ **سرگزشت** کے صفحات پر ملاحظہ کریں

میں اس برابر والے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے کی سیٹنگ کچھ اس قسم کی تھی کہ ایک نظر میں ہی وہ ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم نظر آ رہا تھا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کمرے میں آئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پچھلا دروازہ کھلا اور سفیر داخل ہوا اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ اس نے نئے انداز میں بال ترشوائے ہوئے تھے۔ اس نے بلیو جینز پر ریڈ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''اشفاق نام ہے میرا۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''تم مرشد کے ساتھ کب سے ہو؟''

''یہی کوئی تین مہینا پہلے اس کی نوکری میں آیا ہوں۔''

''تمہارے ذمے کیا کام تھا؟''

''مرشد نے ایک اسپیشل فورس بنا رکھی ہے جو اس کے حکم پر دیا گیا ٹاسک پورا کرتی ہے۔ جسے اس دنیا سے ہٹانا ہے اس کا کام تمام ہم کرتے ہیں۔ اس ٹاسک فورس میں کل گیارہ بندے ہیں۔''

''ان سے تمہارا رابطہ ہے؟''

''صرف ایک بندے سے جو میرا رشتے دار بھی ہے۔ اس کی پوسٹ بھی میرے جتنی ہے یعنی ٹارگٹ کرنا۔''

''وہ گیارہ کے گیارہ اسی کام کے لیے ہیں؟''

''جی نہیں۔ ان میں سے دو بندے ثمینہ کے باڈی گارڈ ہیں۔''

''یہ ثمینہ ہے کون؟''

''ثمینہ کون ہے یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنی خبر ضرور ہے کہ وہ مرشد کو بھی جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ وہی مرشد کے لیے ٹاسک تیار کرتی ہے اور پھر اسے منظوری دینا مرشد کا کام ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم مرشد نے دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کام ثمینہ کا ہوتا ہے۔''

''ثمینہ دیکھنے میں کیسی ہے۔''

''خوبصورتی اس کے انگ انگ سے پھوٹتی ہے لیکن وہ لڑائی کا فن بھی جانتی ہے۔ میں نے خود اسے کراٹے کی پریکٹس کرتے دیکھا ہے۔''

''رہتی کہاں ہے؟''

''مرشد کا متروک بنگلا اس کے استعمال میں ہے۔'' باڈی گارڈ میرا کزن ہے۔ اسی نے بتایا کہ وہ کبھی بھی بینک نہیں گئی لیکن جب بھی مرشد کا پیغام آتا ہے ثمینہ کے بندے نوٹوں سے بھرے بریف کیس لے کر پہنچا آتے ہیں۔''

''یعنی وہی اسپانسر کر رہی ہے؟''

''ہم سب کو شک ہے کہ مرشد کو رقم وہی دے رہی ہے ورنہ مرشد تو ایک مرا ہوا گھوڑا ہے۔ اس پر داؤ کون لگائے گا؟ خانقاہ کی جو آمدنی ہے وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ خرچ بھی بہت زیادہ ہے۔ احاطے میں تعمیرات کا ایک جال سا پھیلا لیا ہے اس نے۔ آپ جس بلڈنگ میں گئے تھے وہ خاص طور سے بنائی جا رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس حصے کی تعمیر میں مقامی مزدوروں سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ تمام انجینئر گورے ہیں۔ جن مزدوروں سے کام لیا گیا تھا۔ وہ بھی باہر سے لائے گئے تھے۔ اور کام ختم ہوتے ہیں وہ کہاں چلے گئے کسی کو پتا نہیں۔''

''ایسا کرتے ہیں کہ پہلے ثمینہ کو چیک کر لیتے ہیں۔'' سفیر نے فرنچ میں کہا۔

''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے بھی فرنچ میں جواب دیا۔

''بچپن میں پڑھا تھا کہ آج کا کام کل پر نہ ڈال اس لیے دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔'' سفیر نے تجویز دی۔

میں نے اس بندے سے کہا کہ ابھی آپ دو تین دن آرام کریں۔ پھر میں آپ کو بلا لوں گا۔

اسے بھیج کر میں نے سفیر سے کہا ''تم اپنے دو نشانچی لے لو۔ آج ہی ثمینہ کو چیک کرنا ہے۔ شام اب گہری ہو رہی ہے۔ رات میں دبش ڈالیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اور کون کون جائے گا؟''

''تین گروپ میں ہم نکلیں گے۔ ایک گروپ میں وسیم اور عبداللہ ہوں گے ان کے ساتھ ان کے آدمی بھی رہیں گے۔ دوسرے کی کمانڈ سفیر کرے گا۔ اس گروپ میں بھی سفیر اور عبداللہ کے آدمی رہیں گے۔ تیسرے میں، میں اور ریاست خان ہوں گے۔ ہماری مدد کے لیے ریاست خان کے دو آدمی اور وسیم کے بندے ہوں گے۔''

''گویا بھرپور حملہ کرنا ہے؟'' وسیم نے کہا۔

''ثمینہ کے بارے میں جتنی باتیں علم میں آئی ہیں وہ اسے نہایت اہم کردار ثابت کر رہی ہیں۔ اس لیے اسے گھیرنے کے لیے پوری تیاری کرنی ہوگی۔ اسے معمولی لڑکی نہ سمجھا جائے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ وہ را کی تیار کردہ ایجنٹ ہے۔ کسی خاص کام سے یہاں آئی ہے کسی اہم مشن پر۔ اس لیے اسے گھیرنے کے لیے ہمیں ہوشیاری کے ساتھ

بھرپور طاقت کا استعمال کرنا پڑے گا۔"

میری بات پر سفیر نے کہا "ان جنیوں کے پاس عورت نامی ہتھیار بہت ہے۔ انہیں شرم بھی نہیں آتی کہ وہ عورت کو ڈھال بنا کر اپنا کام نکالتے ہیں۔"

"جن گاڑیوں پر جانا ہے انہیں چیک کر لو۔ ہائی وے پر جا کر آزما لو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی گاڑی دھوکا دے جائے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"او کے چیک کر لیتے ہیں۔" کہہ کر عبداللہ اور سفیر باہر نکل گئے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ جب میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اسی وقت وسیم نے اپنا کمال دکھا دیا تھا۔ جب وہ اسلحہ خریدنے گیا تھا تو ساتھ میں بگس کا سامان بھی لے آیا۔ مٹر کے دانے کے برابر مائکروفون اس نے چاروں گاڑیوں میں لگا بھی دیا تھا۔ بگس (Bugs) اتنا چھوٹا سا تھا کہ اسے ڈھونڈنا بھی آسان نہ تھا۔ وسیم کا کہنا تھا کہ یہ دس میل تک کام کرتا ہے۔ میں بھی اسے آزمانا چاہ رہا تھا۔ سفیر وغیرہ کو ابھی تک اس کے مطلق کچھ بھی بتایا نہیں تھا۔ ان کے لاعلمی میں اسے استعمال کرنا چاہ رہا تھا۔

سفیر کے جاتے ہی میں نے لیپ ٹاپ کھول لیا جو وسیم نے لا کر دیا تھا۔ اس میں ایسے سوفٹ ویئر تھے جو ہیوی ٹرانسمیشن میں کام آتے ہیں۔ گاڑیوں میں لگائے گئے بگس اتنے حساس تھے کہ وہ سرگوشی کو بھی پکڑ لیتے تھے۔ گاڑی میں ہونے والی ایک ایک بات کو وہ کیچ کر کے اس ریسیور تک پہنچا دیتے۔ اسی بات کو جانچنے کے لیے میں نے انہیں بھیجا تھا۔

میں نے ریسیونگ سیٹ کو آن کر دیا تھا۔ کبھی سفیر کی گاڑی میں ہو رہی باتوں کو سنتا اور کبھی فریکوینسی تبدیل کر کے عبداللہ کی۔ تینوں گاڑیوں کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

یہ قدرت کی دین ہے کہ میرا اندازہ بہت کم غلط ہوتا ہے۔ میں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ جیسے ہی عبداللہ کی گاڑی میں چھپے بگس کی فریکوینسی سیٹ کی تو میں چونک اٹھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے کسی بندے نے پوچھا تھا "یہ کیسی آواز تھی۔ ہمیں کس نے ویل کم کہا؟"

عبداللہ سے پہلے کسی نے کہا تھا "ویل کم... میں شہباز کے ساتھیوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

"کون ہو تم۔" عبداللہ نے پوچھا تھا پھر اس کی سرگوشی سنائی دی "اندازہ لگاؤ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟"

وہی آواز پھر سنائی دی "پنڈی میں داخل ہوتے ہی تم لوگ میری نظروں میں آ گئے تھے لیکن پھر میں نے تم لوگوں کو کھو دیا۔ یہ غلطی جس سے ہوئی تھی اسے سزا دینے کے بعد میں نے تم لوگوں کی تلاش میں ایک پوری ٹیم لگا دی۔ میرے آدمی ایک ایک جگہ تم لوگوں کو تلاش کر رہے تھے کہ اتفاقاً نظر آ گئے۔ اگر تم لوگ وہاں نہ رکتے تو ہم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں کھاتے رہتے۔ یہ تو میرے فرشتوں کو بھی پتا نہ تھا کہ جسے ہم ڈھونڈ رہے ہیں وہ خود چل کر ہمارے پیٹرول پمپ پر آ جائے گا۔"

"پیٹرول پمپ؟ او اچھا ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ایک پیٹرول پمپ پر رکے تو تھے۔" عبداللہ کی آواز آئی۔

"جیسے ہی آپ لوگ آئے میرے کارندوں نے مجھے خبر دے دی کہ جو تصویریں بھیجی ہیں ان میں سے ایک پیٹرول پمپ پر آیا ہوا ہے... بس میں نے اشارہ دے دیا اور پمپ پر کھڑے میرے آدمیوں نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔ بیس منٹ کا کام ہے کہہ کر کار کو سروس کے لیے روک لی اور یہ مائکروفون لگا دیا۔ جس کی وجہ سے اس وقت میں آپ لوگوں سے مخاطب ہوں۔"

"یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ بگس کرنا تو اب بچوں کا کھیل ہے۔"

"گاڑی بگ کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہم آپ کو صحیح راستہ بتائیں۔ آپ لوگ جس طرح لانگ ڈرائیو کر رہے ہیں، اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ نئی راہ ہم بتاتے ہیں۔" کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر وہی آواز سنائی دی "ارے یہ گاڑی کیوں روک لی۔ چلاتے رہیں۔ راستہ میں بتاتا ہوں۔"

"کون ہو تم؟ اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"اشارہ تو دے ہی دیا ہے۔ شہباز کے ساتھی ایسے کند ذہن ہوں گے یہ پتا ہی نہیں تھا۔ اگر دوبارہ سننا چاہتے ہیں تو سن لیں۔ میں مرشد سائیں کا معمولی غلام ہوں۔ اکبر کہتے ہیں مجھے۔ اکبر یعنی بڑا۔ میں اپنے گروپ میں سب سے بڑا ہوں۔ موسٹ پاورفل بندہ۔"

"تم نے ہماری کار میں ٹرانسمیٹر کیوں لگایا ہے؟"

"صرف ٹرانس میٹر ہی نہیں، کیمرا بھی لگایا ہے۔"

اسی وقت عبداللہ کی آواز آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا "ٹرانس میٹر اور کیمرا ڈھونڈو۔"

"آپ لوگ فضول میں وقت برباد کریں گے۔ میں خود بتائے دیتا ہوں۔ اپنے سر کے اوپر دیکھیں بیک ویو مرر

جہاں لگا ہے اسی کی سیدھ میں اوپر کی طرف نظر اٹھائیں۔وہاں ایک چھوٹا سا مٹر کے دانے برابر ایک ابھرا ہوا اسپاٹ نظر آرہا ہوگا۔وہی کیمرا ہے۔نہایت طاقتور کیمرا۔جدید ترین کیمرا۔فیفٹی میگا پکسل کا کیمرا ہے۔ایک ایک حرکت کو واضح دکھاتا ہے۔اسی کے ساتھ مائکروفون بھی بلٹن ہے۔''

شاید عبداللہ نے ادھر ہاتھ بڑھایا تھا کہ آواز سنائی دی''نہ نہ ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔اس وقت وہ صرف کیمرا ہے لیکن اسے چھیڑا گیا تو یہ کسی بم کی طرح پھٹ جائے گا اور تب آپ لوگوں کے لوتھڑے بھی گنے نہ جا سکیں گے.... دراصل اسے میں ری موٹ کنٹرولر سے کنٹرول کر رہا ہوں۔جیسے ہی انگوٹھے کا دباؤ بڑھاؤں گا یہ ایٹمک پاور کی طرح تباہی پھیلا دے گا پھر آپ لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔نہ گاڑی رہے گی اور نہ گاڑی میں سوار انسان۔لیکن میں ایسی حرکت کرنا نہیں چاہتا۔کیونکہ میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ہوں۔ہوں نا خیر خواہ؟ ارے آپ لوگوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا۔بتایئے نا'ہوں نا خیر خواہ؟ اگر نہ ہوتا تو آپ کو روکنے کی کوشش کیوں کرتا۔اور آپ لوگ نادانستگی میں موت کی گود میں جا سوتے۔انا للہ ہو چکے ہوتے۔''

''کمینے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''ایک نئی آواز سنائی دی۔شاید یہ عبداللہ کے ساتھی کی آواز تھی جو غصے میں پھنکار اٹھا تھا۔

''ضرور ضرور'اگر ایسا موقع آجائے تو ایسا ہی کرنا کیونکہ چوٹ کھائے سانپ کو کبھی زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔''طنزیہ انداز میں کہا گیا۔

''تم.....تم ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔''وہی آواز سنائی دی۔شاید وہ غصے کو دبا نہیں پا رہا تھا۔

''بالکل سہی'میں تم لوگوں کا کچھ بگاڑنا بھی نہیں چاہتا۔ہاں اگر مجبور کیا گیا تو اور بات ہے۔''

گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔میں سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں کیسے انہیں بچاؤں۔وہ اس وقت ہیں کہاں۔کس علاقے میں ہیں یہ بھی پتا نہیں تھا۔کچھ اور وقت گزر گیا لیکن میری قوت سماعت گوش بر آواز تھی۔تبھی وہ منحوس آواز پھر سنائی دی۔جیسے وہ ان کی بے بسی کو انجوائے کر رہا ہو۔''نہ نہ عبداللہ صاحب'ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔ادھر تم نے دروازہ کھولا ادھر میں نے بٹن پر دباؤ بڑھا دیا۔پھر کیا ہوگا اس کا اندازہ آپ کو خوب ہوگا۔یہ گاڑی کسی بھری ہوئی ماچس کی ڈبیا کی طرح بھک سے اجل جائے گی۔''

''تم...تم آخر چاہتے کیا ہو؟''عبداللہ کی آواز سنائی دی۔اس کی آواز میں ایسا کوئی عنصر نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا کہ وہ پریشان ہے۔خوفزدہ ہے۔اس کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

''میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ زندگی کو انجوائے کرو۔یہ زندگی خدا کی دین ہے۔جتنی زندگی قسمت میں لکھ دی گئی ہے اسے انجوائے کرو۔ویسے بھی تم لوگوں کی اب بہت تھوڑی زندگی رہ گئی ہے۔''

''سنو مسٹر غائب!اگر تم اس وقت میرے سامنے حاضر ہوتے تو میں بتاتا کہ کس کی زندگی تھوڑی ہے۔''عبداللہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''مسٹر عبداللہ!آپ کتنے بہادر ہیں یہ ابھی پتا لگ جائے گا۔فی الحال تو ڈرائیونگ دوبارہ شروع کر دیں۔میں راستہ بتاتا رہوں گا آپ کو اسی رستے پر بڑھتے رہنا ہے۔تاکہ جلد سے جلد آپ ہمارے سامنے حاضر ہو سکیں۔''

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز گونجی پھر وہی آواز سنائی دی''ہاں بالکل سیدھ میں بڑھتے رہو۔''

کافی دیر تک ٹریفک کا شور سنائی دیتا رہا۔پھر وہی مکروہ آواز گونجی''اب داہنی جانب والی سڑک پر مڑ جاؤ۔بازار میں پہنچ کر اکلوتی مٹھائی کی دکان ہے۔اس سے تین فرلانگ آگے جانا ہے پھر داہنی جانب والی سڑک پر مڑ جانا۔جب اس سڑک پر پہنچو گے تو میں آگے کا راستہ بتاؤں گا۔''

مجھے رہ رہ کر عبداللہ پر غصہ آرہا تھا کہ وہ سڑک کا نام یا کوئی نشانی کیوں نہیں بتا رہا۔اپنی گفتگو میں اگر نام لے لیتا تو میں وہاں پہنچ جاتا۔اب مجھ سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔اس لیپ ٹاپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کام کو انجام دینا بھی ناممکن لگنے لگا تھا اس لیے کہ اس ریسیونگ سیٹ کی وجہ سے میں ان لوگوں کی نقل و حرکت سے آگاہ ہو رہا تھا۔سفیر وغیرہ بھی نہیں تھے کہ ان میں سے کسی کو وہاں بٹھا دیتا۔تبھی وسیم چائے کا کپ اٹھائے اندر آیا۔اسے دیکھتے ہی میں نے کہا''عبداللہ خطرے میں ہے لیکن ہے کہاں اس کا پتا نہیں لگ پا رہا۔وہ بے وقوف بھی علاقے کا نام نہیں بتا رہا کہ اس کی مدد کو ہم پہنچ سکیں۔''

''یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ہم بڑی آسانی سے لوکیشن دیکھ سکتے ہیں۔''کہہ کر وہ اس لیپ ٹاپ کے سامنے

بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا پھر بولا ”کیجئے پتا لگالیا کہ وہ ہے کہاں؟“

لیپ ٹاپ کی اسکرین پر گوگل ارتھ کے ذریعہ شہر کے نقشے پر گول سرکل نظر آیا، اس نشان کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا ”یہی وہ جگہ ہے جہاں اس وقت عبداللہ کی گاڑی کھڑی ہے۔“

”تو پھر دیر کرنا مناسب نہیں۔ فوراً نکلو۔ ہمیں عبداللہ کی مدد کرنی ہے۔“ کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔ جلد بازی میں ریوالور لیا اور کچھ اضافی گولیاں لیں۔ ایک پستول بھی لے لیا جس کی نال پر سیلنسر لگا ہوا تھا۔ یہ اسلحہ وسیم نے خریدا تھا۔

باہر بلیک کلر منی پجیرو کھڑی تھی اسی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ وسیم نے سنبھال لی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ بھی لے لیا تھا کہ راستے میں ان کی باتیں سنتا جاؤں۔

گاڑی چلی تو میں نے لیپ ٹاپ کو دوبارہ سے آن کر لیا۔ مگر دوسری طرف خاموشی تھی۔ صرف ٹریفک کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دور گئے ہوں گے کہ دوسری جانب کی آواز سنائی دی۔ ”اب تم داہنی جانب مڑ جاؤ۔ چھٹے بنگلے کے بلیک گیٹ پر رک کر ہارن بجاؤ۔ دروازہ کھل جائے گا۔ اس میں داخل ہو جانا۔“

میں نے چھٹا بنگلا اور بلیک گیٹ کو ذہن میں رکھ لیا۔ تبھی وسیم نے کہا ”آپ کو یاد ہے۔ صبح میں نے ایک ایک چپ سفیر اور عبداللہ کو دی تھی کہ اسے پرس میں رکھ لو۔ آپ کو بھی دی تھی۔“

”ہاں وہ چپ میرے پرس میں محفوظ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ بھی بگ ہے۔ اس کی فریکوینسی سیٹ کریں۔“

میں نے وسیم کے بتائے ہوئے نمبر کو ایڈ کیا تو دل خوش ہوا تھا اس لیے کہ وہ کام کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا ”کام کر رہا ہے۔“

”اب اگر عبداللہ گاڑی سے اتر بھی جائے گا تو ہمارے رابطے میں رہے گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”یہ چپ ڈیٹیکٹر کا کام کرے گی۔“

عبداللہ کی کار کی باتیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ میں اسکرین پر اس تھرکتے ہوئے نقطے کو دیکھ رہا تھا۔ جو آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ وسیم کی اس عقلمندی نے کام دکھا دیا تھا۔ اب وہ کہیں بھی چلا جاتا ہم اسے ڈھونڈ لیتے۔ ہم اسی نقطے کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ بلیک گیٹ اب تک ذہن میں محفوظ تھا اس لیے زیادہ فکر کی بات نہیں تھی۔ اسی پہچان سے ہم اس بنگلے کو تلاش کر لیتے جس میں اسے لے جایا گیا ہے۔

اس جانب سے بے فکر ہو کر اب میں پوری طرح اسکرین کی طرف متوجہ تھا لیکن ادھر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عبداللہ بھی خاموش تھا۔ صرف آگے بڑھتا نقطہ نظر آ رہا تھا جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ابھی سفر میں ہے۔ تبھی وہی گونجدار آواز سنائی دی:

”بس اسی گیٹ کے سامنے گاڑی روک لو۔“

گاڑی روکنے کا حکم دے کر بولنے والا پھر خاموش ہو گیا۔ عبداللہ کی کار میں خاموشی چھائی رہی۔ گاڑی کے چلنے کی آواز آتی رہی پھر گاڑی رکی تھی شاید۔ اس لیے کہ نقطہ ٹھہر گیا تھا۔ اسی وقت پھر آواز گونجی ”نہیں نہیں، یہاں رکنا نہیں ہے۔ داہنی جانب مڑ جاؤ... آگے گیراج ہے اس کے اندر گاڑی پارک کر دو۔ ہم اپنے معزز مہمانوں کو شایان شان عزت و توقیر دیتے ہیں۔“

گاڑی بڑھنے پھر رکنے کی آواز اور پھر شٹر اٹھنے اور گرنے کی آواز آئی۔ میں جان گیا کہ وہ لوگ گیراج کے اندر پہنچ چکے ہیں اور دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ہماری گاڑی بھی اسی سمت بڑھ رہی تھی جس سمت کا اشارہ اسکرین پر مل رہا تھا۔ تبھی اس سے وہی مکروہ آواز آئی ”مسٹر عبداللہ یہ جو سامنے کلاشن کوف تھامے کھڑے ہیں یہ پانچوں کے پانچوں گونگے اور بہرے ہیں۔ انتہا درجے کے شقی القلب ہیں۔ ہمارے سب سے بہترین اور قابلِ بھروسا لڑاکا ہیں یہ۔ انہیں ایک ہی شوق ہے، انسانوں کو ایذا دینا۔ اگر تم لوگوں نے چالاکی دکھائی تو ان کے کلاشن سے گولی پہلے نکلے گی اور انتباہ بعد میں سنائی دے گا۔ وہ گولی جسم کے ان حصوں میں دھنسے گی جہاں گولی جا کر موت دینے کی بجائے ایذا پہنچاتی ہے۔ انہیں لوگوں کو تڑپانے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ یہ آپ لوگوں کو مہمان خانے میں لے جائیں گے۔“

”یہ مہمان خانہ ہے کہاں؟ کیا اسی بلڈنگ میں ہے یا کہیں اور؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”یہ بلڈنگ دیکھنے میں پانچ مرلہ پر ہے لیکن ایسا ہے نہیں، اسے خصوصی طور پر بنایا گیا ہے جس کی وجہ ہے یہ اب دس مرلہ پر ہے۔ ایسا کیسے ہوا یہ بعد میں بتاؤں گا فی الحال آپ لوگ ان کے ساتھ گیسٹ روم میں جائیں۔ ایک بات اور بتا دوں، آپ کو ٹھہرانے کے لیے گرین گیسٹ ہاؤس کا انتخاب کیا گیا ہے اس گیسٹ روم کی ہر چیز سبز ہے۔ اسی

بنگلے میں ایک پورشن کو بلیک گیسٹ روم کا نام دیا گیا ہے۔وہاں کی ہر چیز سیاہ ہے۔سیاہی موت کی علامت ہے۔اس کمرے میں صرف ان لوگوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔جن کا مقدر موت ہے۔ویسے اطمینان رکھیں ابھی آپ لوگوں کو وہاں نہیں بھیجا جائے گا۔کیونکہ ہمیں شہباز کی تلاش ہے۔جیسے ہی وہ آئے گا آپ لوگوں کو اس گیسٹ روم میں بھیج دیا جائے گا۔''

''لیکن شہباز کو ڈھونڈو گے کیسے۔وہ شہباز ہے اونچے آسمانوں پر ہی اس کا بسیرا ہے۔''عبداللہ نے کہا۔

''دیکھتے رہو۔اگر وہ تحت الثرا میں بھی چھپ جائے پھر بھی ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔فی الحال تم آرام کرو ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالو کیونکہ کھیل کا اگلا راؤنڈ بھی جلدی شروع ہوگا۔''

''آرام وہ کرتے ہیں جنہیں اُمید نہیں ہوتی۔مجھے تو سو فیصد امید ہے کہ تم جلد داصل جہنم ہو گے اور تمہیں جہنم کا ٹکٹ شہباز دے گا۔وہ اب تب میں پہنچنے ہی والا ہوگا۔''

''یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔تمہیں یہ سوچ کر لایا گیا ہے کہ انگلی پکڑنے سے ہی پونچی یعنی کلائی ہاتھ آتا ہے۔ہمیں خود بھی یقین ہے کہ شہباز تمہیں چھڑانے آئے گا۔بس وہ لمحہ ہی اس کے لیے آخری ہوگا۔''

''ایسی خواہش بہت لوگوں نے کی تھی۔اور ایسی خواہش کرنے والے خواہش کے ساتھ قبر میں جا سوئے۔''کہہ کر عبداللہ نے قہقہہ لگایا۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا....جلد تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ شہباز کا انجام کیسا بھیانک ہوا۔''

''ضرور ضرور...ہم بھی دیکھیں گے کہ کون سچا اور کون شیخی خور ہے۔''

''اب تک شہباز کا مقابلہ جن لوگوں سے تھا وہ سب سڑک چھاپ تھے لیکن میرا تعلق جس قوت کے ساتھ ہے وہ جس مشن پر کسی کو بھیجتی ہے اسے پہلے ٹریننگ کرتی ہے۔مجھے بھی ٹریننگ کے بعد بھیجا گیا ہے....اب بہت باتیں ہو گئیں۔وہ لوگ تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے کھڑے ہیں۔ان سے تعاون کرو جا کر کمرے میں آرام کرو۔''

شاید عبداللہ اس گیراج سے چلا گیا تھا کیونکہ اب کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔کار میں لگایا گیا بگس کام نہیں کر رہا تھا۔اگر وہ گاڑی کے نزدیک ہوتے تو شاید ان کی آواز سنائی دیتی رہتی لیکن بریف کیس نما لیپ ٹاپ پر عبداللہ کی جیب والے چپس کا اشارہ موصول ہو رہا تھا۔اسکرین پر نظر آنے والا نقطہ آگے بڑھ رہا تھا۔شاید عبداللہ نزدیک کے کسی کمرے کی جانب جا رہا تھا۔

ہماری کار اسی جانب بڑھتی جا رہی تھی جدھر کا اشارہ مل رہا تھا۔اب وہ مقام نزدیک آتا جا رہا تھا۔وسیم نے پوچھا''ان کی باتوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کافی سارے لوگ ہیں۔اور ہم دو ہیں۔کیوں نا دوسروں کو بھی بلا لیا جائے۔''

''یہی بہتر ہے۔تم کال کر کے سفیر کو بھی بلا لو۔اس کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ مدد کے لیے کافی ہوں گے۔''

وسیم نے موبائل فون پر سفیر سے رابطہ کیا اور اشارے میں بتا دیا کہ ایک بڑی پریشانی کا سامنا ہے۔اسے تیار ہو کر آنا ہے۔

اب ہم اس سڑک پر پہنچ چکے تھے جس کے بارے میں عبداللہ کو اس آواز نے بتایا تھا۔وہ کس کی آواز تھی'کون ہے اس کا پتا نہیں تھا بس اتنا اندازہ تھا کہ وہ جو بھی ہے۔مرشد کے بہت نزدیک کا آدمی ہے۔اس مخصوص سڑک پر پہنچ کر وسیم نے گاڑی روک لی تھی جس کا اشارہ ہمیں عبداللہ سے ہونے والی گفتگو سے ملا تھا۔اب ہمیں انتظار تھا کہ سفیر آجائے تو ہم اس عمارت میں داخل ہوں۔

انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔کچھ ہی دیر میں سفیر کی کار آتی نظر آگئی۔ہماری کار کے برابر میں اس نے اپنی کار روکی اور اتر کر ہماری کار میں آگیا۔ساری باتیں سننے کے بعد بولا''وقت گنوانا بے کار ہے۔''

''میں کچھ اور سوچ رہا ہوں؟''میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وقت برباد نہ کر کے ہمیں ایکشن میں آجانا چاہیے؟''سفیر بولا۔

''میرا خیال ہے کہ رات ہو رہی ہے۔اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں۔''وسیم نے بھی سفیر کی تائید کر دی۔

''تو پھر ایسا کرو کہ اپنے بندوں کو بلا لو۔''میں نے رضامندی ظاہر کی۔اس نے موبائل پر اپنے بندوں کو بلانا شروع کر دیا۔میں اس عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔باہر کی دیوار خاصی اونچی تھی پھر اس پر خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے۔

ابھی میں اس عمارت کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مرکزی دروازے سے ایک بندہ باہر نکلا۔اس نے گیٹ بند نہیں کیا تھا۔شاید اسے کہیں نزدیک ہی جانا اور پھر لوٹنا تھا۔یہ موقعہ اچھا تھا۔میں نے سفیر سے کہا''تم اس بندے کو

قابو کرو۔''

سفیر آہستہ چال چلتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے ہوا خوری کے لیے نکلا ہو۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے کچھ کہا تھا جو دوری کی وجہ سے ہم سن نہ سکیں صرف اتنا دیکھا کہ اس بندے نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے کچھ بتایا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھتے ہی سفیر ایکشن میں آیا اور اس نے اس بندے کی گردن میں آرم لاک لگا دی پھر ایسا دھوبی پچھاڑ لگایا کہ وہ منہ سے آواز بھی نہ نکال سکا۔

اسے بے ہوش کر کے سفیر نے جھاڑی میں ڈالا پھر واپس آنے لگا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ میں نے رکنے کا اشارہ دیا اور پچھلی سیٹ پر پڑے الیکٹریکل وائر کو اٹھالیا۔ یہ وائر میں نے آج ہی منگوایا تھا تاکہ ایکسٹنشن بنا سکوں... ایکسٹنشن تو بن نہ سکا مگر اب کام آرہا تھا۔ سفیر کے قریب پہنچ کر میں نے کہا ''اگر اسے ایسے ہی چھوڑ دو گے تو یہ ہوش میں آتے ہی اندر کی جانب دوڑ لگا دے گا۔'' پھر میں نے اس کے ہاتھ پیروں کو باندھنا شروع کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سفیر کو مخاطب کیا۔ ''اس کے منہ میں بھی کچھ ٹھونس دو تاکہ یہ مدد کے لیے کسی کو بلا نہ سکے۔''

سفیر کار کی جانب مڑ گیا اور جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں اجرک تھا۔ اجرک کے ایک حصے کو گولا سا بنایا پھر اسے اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا ''اب ہمیں اندر داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بند ہونے سے پہلے ہمیں اندر داخل ہو جانا چاہیے۔''

''کوشش کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے لیکن میں پہلے اپنے آدمیوں کو آنے کا کہہ دوں۔''

وہ موبائل فون نکال ہی رہا تھا کہ سامنے سے آتی گاڑی کے ہیڈ لائیٹ کو دیکھ کر رک گیا۔ ''شاید میرے بندے آگئے۔''

میں بھی اسی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گاڑی ہماری کار کے پاس آکر رک گئی۔ وسیم کار کے پاس کھڑا تھا۔ اس گاڑی سے اترنے والے نے اس سے مصافحہ کیا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ وسیم کو جانتا ہے۔ سفیر اور ہم واپس اپنی کار کے پاس آگئے۔ نوارد نے سفیر سے کہا ''ہم تینوں الگ الگ مقام پر تھے اس لیے آنے میں کچھ دیر ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں... اب سنو کرنا کیا ہے۔'' کہہ کر سفیر نے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔

''ہمیں اس بنگلے کے اندر داخل ہونا ہے۔ اندر سخت پہرہ ہے۔ وہ لوگ مقابلے کے لیے تیار ہوں گے۔ گارڈ سے نمٹ کر ہمیں اندر اپنے ایک ساتھی تک پہنچنا ہے۔ اسے چھڑانا ہے۔''

''گیٹ تو کھلا ہوا ہے۔'' نوارد نے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔ شاید شمشاد ہے نا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی سر میرا نام شمشاد ہے اور اس کا اشرف، اس کا ندیم۔''

''ہم دو طرف سے اندر داخل ہوں گے۔ سفیر میرے ساتھ ہوگا۔ ہم دیوار پھاند کر اندر جائیں گے۔ لیکن تم اور وسیم گیٹ سے داخل ہو گے۔ باقی لوگ باہر رہیں گے۔ تمہارے ان دو ساتھیوں سے ہمارا رابطہ موبائل پر رہے گا۔ جب باہر والوں کو بلانا ہوگا تو بلا لیا جائے گا۔''

''جی بہتر ہے۔'' اس نے کہا۔

''یاد رکھنا سی سی ٹی وی کیمرے بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہمارے اندر جاتے ہی انہیں خبر ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ہم دو الگ الگ گروپ میں اندر جارہے ہیں کہ ایک گروپ نظروں میں آبھی جائے تو دوسرا مدد کے لیے تیار رہے۔ ہاں مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس بنگلے کا کوئی اور راستہ بھی ہے کیونکہ ایک شخص نے ہمارے ساتھی سے کہا تھا کہ یہ دس مرلے پر پھیلا ہوا ہے جب کہ اس بنگلے کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ یہ دس مرلے کا ہے اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ برابر والے یا پیچھے والے بنگلے سے اسے ملایا گیا ہے جو سامنے سے محسوس نہیں ہو رہا ہے۔''

''ایسا ہو سکتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اب تیار ہو جاؤ۔ میں اس طرف جا رہا ہوں۔ سفیر میرے ساتھ ہوگا۔ وہیں سے ہمیں دیوار پھاندنا ہے۔ جب میں موبائل آن کروں تو اس چمک سے سمجھ جانا کہ تمہیں دروازے کی طرف بڑھنا ہے۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا اور اس طرف بڑھنے لگا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اس بنگلے میں کتا نہیں ہے کیونکہ ابھی تک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ بس مجھے کیمرے سے بچنا تھا۔ ایک کیمرا تو میں نے گیٹ کے اوپر لگا دیکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کہیں کوئی کیمرا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس دیوار کو اس لیے پسند کیا تھا کہ وہاں ایک

پیڑ تھا جس کی شاخیں دیوار تک پہنچ رہی تھیں۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے سفیر کو اشارہ کیا اور وہ بندر کی سی پھرتی سے پیڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے میں بھی اوپر چڑھ آیا پھر میں نے سفیر کو اشارہ کیا کہ وہ دیوار پر چڑھے۔ وہ دیوار کی طرف جانے والی شاخ پر بڑھا تھا کہ میں نے موبائل کو آن کر کے بند کیا۔ اندھیرے میں موبائل اسکرین کی روشنی دور تک نظر آئی ہوگی۔ شمشاد نے بھی دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ میں جب اس ڈال پر پہنچا تو سفیر دیوار تک پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں مجھے وہ جیکٹ بہت یاد آئی تھی جسے پہن کر ہم لوگ کل خانقاہ میں داخل ہوئے تھے۔ اس جیکٹ کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ گولیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ ساتھ نہیں تھی تو سوچ کر ہلکان ہونے سے فائدہ نہیں تھا۔ ذہن کو جھٹک کر میں نے اندر نظر ڈالی۔ گیٹ کے پاس کسی بندے کو گرا کر ایک بندہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ احاطے میں روشنی تھی۔ میں نے پہچان لیا کہ گلا دبانے والا شمشاد ہے اور نیچے گرا ہوا بندہ چوکیدار کے قبیل کا کوئی ہے۔ اس طرف سے نظریں ہٹا کر میں نے سفیر کو دیکھا جو دیوار سے نیچے اتر چکا تھا۔ میں بھی دیوار پر ہاتھ جما کر نیچے کی طرف لٹک گیا۔ نیچے اترتے ہی میں نے برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ پہرے داری کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ دو گارڈ پر بھروسا کر کے بنگلے والے مطمئن ہو گئے تھے۔ جب کہ عبداللہ کو اغوا کرنے والے نے جس انداز میں عبداللہ کو بریف کیا تھا اس سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی خاص انتظام ہے۔

برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ لائٹ بجھ گئی۔ یہ کام سفیر نے کیا تھا اس نے آتے وقت مین سوئچ آف کر دیا تھا تا کہ اس بنگلے کا خود کار نظام بند ہو جائے۔ میں دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے کمرا نہیں، کھلا پیچ تھا۔ سامنے ہی اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ تبھی میں نے عقب میں آہٹ محسوس کی، چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وسیم اور شمشاد آ رہے تھے۔ میں نے وسیم کے نزدیک پہنچتے ہی کہا ''اب ہمیں مزید ہوشیار رہنا ہوگا کیونکہ اندر والے ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے آنے کی کسی کو خبر نہیں ہوئی ہوگی۔ باہر سی سی ٹی وی کیمرا لگا ہوا ہے۔ مانیٹر پر جو بھی ہوگا اس نے ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔''

''ہاں یہ خطرہ موجود ہے۔'' وسیم نے جواب میں کہا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک ساتھ پانچ آدمی باہر نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا باقی روایتی ہتھیار بدست تھے۔ تبھی عقب میں پھر پیروں کی چاپ گونجی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو دو بندے تھے۔ ایک نے گن تھام رکھی تھی دوسرا خالی ہاتھ تھا۔ وہ باہر سے اندر آ رہے تھے۔ گویا ہم دونوں طرف سے گھر کر اس گلیارے میں محصور ہو چکے تھے۔

''اب کیا کیا جائے؟'' وسیم نے پوچھا۔

''جیسے ہی اشارہ کروں تم دونوں پستول والے کو سنبھال لینا باقی کو دیکھ لیا جائے گا۔'' میں نے کہا۔

نو واردوں نے گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہم بھی اپنے دفاع کے لیے تیار تھے اور پوزیشن لے چکے تھے۔ تبھی میں نے اشارہ دیا اور دونوں پیروں کو جوڑ کر اچھال بھری۔ فلائنگ کک بروقت مگر شدت کے ساتھ پستول والے کے برابر میں کھڑے شخص کے سینے پر پڑی۔ کک ایسی تھی کہ زندہ کو بھی مردے میں بدل دے۔ اتنی زور دار کہ دیوار پر پڑتی تو وہ بھی چیخ جاتی۔ مقابل پیٹھ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے گرتے گرتے کمال پھرتی سے اپنا داہنا ہاتھ پستول والے کے ہاتھ پر مارا تھا نتیجتاً اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ چکنے فرش پر پستول گرا تو پھسلتا ہوا کافی دور چلا گیا۔ میرے ساتھ ہی سفیر نے بھی بوٹ کی بھرپور کک اپنے مقابل کے ہاتھ پر ماری تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اپنے ہولسٹر سے پستول نکال رہا تھا۔ بروقت کک لگی تھی اور اس کے ہاتھ سے بھی پستول نکل کر دور جا گرا تھا تبھی مجھے کھٹ کی آواز سنائی دی یہ آواز سفیر کے سر سے ابھری تھی۔ ڈنڈا اٹھائے شخص نے ڈنڈا چلا دیا تھا۔ سفیر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا تبھی وسیم نے اس شخص کی کنپٹی پر گھونسا رسید کیا جو اپنے ہاتھ میں کھلا خنجر لیے کھڑا تھا۔ وہ شخص کسی لڑاکا مرغ کی طرح بازو پھیلائے آگے بڑھ رہا تھا مگر گھونسا پڑتے ہی سلو موشن میں زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔ وسیم نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور مقابل کے سینے پر فلائنگ کک ماری تھی۔ کک مارنے کے چکر میں وہ پیٹھ کے بل گرا تھا مگر برق رفتاری سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ٹرینڈ لڑاکا تھا اس کے ہاتھ اور پیر دونوں چل رہے تھے۔ اس کا نپا تلا گھونسا کسی کے سینے پر پڑتا تو کسی کے چہرے پر لات پڑتی۔ اس کے اس جارحانہ موڈ کو دیکھ کر پانچوں نے ایک ساتھ حملہ کیا۔ اس کی مدد کے لیے شمشاد اور میں آگے بڑھ آئے پھر ہم سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا

ہو گئے۔

اب عالم یہ تھا کہ کس کی لات کسے لگی اور کس کا گھونسا کہاں پڑا خود مارنے والے کو بھی پتا نہ تھا۔ بس ہم سب بھڑے ہوئے تھے۔ ہتھیار کب کے کہاں پھینک چکے تھے کسی کو خبر نہ تھی۔ ایسی اندھی لڑائی کا نتیجہ توقع کے برعکس ہی نکلتا ہے اس لیے میں نے آہستہ آہستہ پیچھے کھسکنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ ہمارے دونوں مقابل بھی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یہ بات سفیر سے چھپی نہ رہ سکی اس نے بھی میری تقلید کی اور وہ بھی پیچھے ہٹنے لگا۔ کچھ پیچھے ہٹتے ہی یکایک اس نے خود کو زمین پر گرایا اور تیزی سے پھسلتا ہوا اپنے مقابل کی ٹانگوں سے جا ٹکرایا وہ دونوں اس اچانک آئی افتاد پر سنبھل نہ سکے اور پیچھے کی طرف گرتے چلے گئے۔ خود بھی گرے اور سنبھلنے کی کوشش میں اپنے دو ساتھیوں کو بھی لے گرے۔

گرے ہوئے دشمن پر وار کرنا بزدلی ہے مگر جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ سفیر اور وسیم نے ان تینوں پر ٹھوکریں برسانا شروع کر دیں ساتھ ہی ساتھ وہ دونوں باقی تینوں جو کھڑے تھے ان کے حملوں سے بھی خود کو بچا رہے تھے۔ اس وقت سفیر کا چہرہ کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ دیکھنے والا خوفزدہ ہو جاتا۔ ڈنڈے کے ضرب نے سر پر زخم بنا دیا تھا جس سے نکلنے والا خون چہرے پر لکیریں بنا گیا تھا۔ لیکن سفیر کو خون بہنے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اسی دم خم سے مقابلے میں ڈٹا ہوا تھا۔ ہم بھی پوری طرح مصروف تھے۔

اب مجھے اور وسیم کو سہ طرفہ وار کرنا پڑ رہے تھے۔ کبھی ہم پیروں کا استعمال کرتے تو کبھی گھونسوں کا۔ ہم تھک چکے تھے اور مقابل کے گھونسوں اور لاتوں کی چوٹ کا اثر بھی محسوس کر رہے تھے۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا مگر یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ ذرا سی بھی سستی دکھاتے تو مقابل موت کی نیند سلا دیتے اسی لیے ہم تینوں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کر رہے تھے تبھی میں نے دیکھا کہ ایک شخص نے سفیر کو زمین پر گرا دیا ہے اور اس کا گلا دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی سر پر پڑنے والی ضرب سے زخمی تھا اس لیے کچھ کمزور پڑ رہا تھا۔

یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں تماشائی بنا رہتا۔ میں جانتا تھا کہ سفیر ذہنی طور پر بہت قوی ہے، بڑے سے بڑے گنجلک مسئلے کو منٹوں میں حل کر لیتا ہے مگر زخمی حالت میں ہاتھ پیر چلانے میں، قوت کا مظاہرہ کرنے میں اس وقت ذرا پیچھے ہے۔ جذبات میں آ کر وہ دشمنوں سے ٹکرا تو گیا ہے

''مافوق الفطرت'' سے مراد ایسی قوت ہے جو فطرت (Nature) سے ماورا ہو، طبعی قوانین سے بالاتر ہو یا وہ چیزیں جو انسان کی عقل و ادراک سے بالاتر ہوں مافوق الفطرت کہلاتی ہیں، انگریزی میں انہیں سپر نیچرل (Supernatural) کہتے ہیں۔

لغت میں شیطان کے معنی ہیں سرکش، شریر۔ قرآن حکیم میں شیطان کے لیے ''ابلیس'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ شیطان شطن سے بنا ہے، جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اس لیے اسے شیطان کہتے ہیں یہ لفظ شیطان شط سے بنا ہے جس کے معنی جلنے کے ہیں چونکہ وہ آگ سے بنا ہے اور آگ میں ہی داخل ہوگا اس لیے اسے شیطان کہا گیا۔ آگ چونکہ اس کا مادۂ تخلیق ہے اس لیے اس میں قوت غضبیہ اور فخر مذموم زیادہ ہے۔ یہی اوصاف حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے روکنے والے تھے۔ سرکش، جس میں انسان اور حیوان بھی شامل ہیں کو شیطان کہتے ہیں۔ شریر جن کو شیطان کہتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں ہے (اور ایسے ہی ہم نے شریر ''جنوں'' اور ''انسانوں'' کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''حسد شیطان ہے اور غصہ شیطان ہے۔''

انتخاب: نبیلہ اظہر، کراچی

مگر اس حالت میں وہ کمزور ہی ثابت ہوگا۔ جس طرح سے دشمن اس کا گلا دبا رہا تھا وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اسے بچانے کے لیے میں اپنی جگہ سے اچھلا اور سیدھا اس دشمن پر جا پڑا جو اس کے سینے پر سوار تھا۔

میری کھڑی لات کھا کر وہ دور جا گرا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے سامنے سے ایک اور لات ماری تھی۔ میری لات اس کی پیٹھ پر پڑی تھی۔ لات ایسی زبردست تھی کہ وہ کھڑا نہ رہ سکا اور چیختے ہوئے بیٹھتا چلا گیا۔ اس کی چیخ میں کرب تھا اور اب وہ بن پانی کی مچھلی بن چکا تھا۔ میں نے لات ہی پر اکتفا نہیں کیا پے در پے کئی گھونسے بھی مارے تھے۔ اس کا نتیجہ بھی جلد سامنے آ گیا۔ وہ بے ہوش ہو کر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا۔ اب ہم تینوں کے مقابلے میں پانچ آدمی تھے۔

''کھیل لمبا ہو رہا ہے۔'' میں نے مقابل پر گھونسے

برساتے ہوئے کہا۔ تبھی میری نظر سفیر پر پڑی۔ وہ پھر دو آدمیوں میں گھر چکا تھا۔ دشمنوں نے تاڑ لیا تھا کہ سفیر زخمی ہے۔ ان کا مقابلہ نہیں کر پا رہا ہے۔ اسی لیے لگاتار پٹ رہا ہے۔

میں نے اپنے مقابل کی ناک پر ایک زوردار گھونسا مارا اور لمبی چھلانگ لگا کر سفیر کے قریب پہنچ گیا پھر داہنے پیر پر وزن ڈال کر بائیں پیر کو سیدھا کر دیا تھا اور پھرکی کی طرح گھوم گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس کے بدن پر لات پڑی تھی وہ اچھل کر وسیم کے مقابل پر جا گرا تھا۔ وسیم نے لگے ہاتھوں اسے بھی سمیٹ لیا تھا ایک ساتھ دو لاتیں رسید کر دی تھیں۔ سفیر جو زمین پر گر چکا تھا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تبھی اس کی نظر وہیں پڑے پستول پر پڑی اور اس نے پھرتی سے اسے اٹھا لیا۔ وہ پستول اٹھا کر کھڑا ہونا چاہتا تھا اور ابھی پچھتر ڈگری کا زاویہ بنا رہا تھا کہ اسی وقت اس کی کمر پر ایک قوی ہیکل شخص کی گرز جیسی لات پڑی اور وہ پھر سے زمین بوس ہو گیا۔ اسے پٹتے دیکھ کر شمشاد کو تاؤ آ گیا اور اس نے دوبارہ اچھال بھری اور اس شخص پر جا پڑا جس نے سفیر پر حملہ کیا تھا۔ اس نے ساتھ ہی ساتھ اس شخص کے جبڑے پر پوری طاقت سے گھونسا مارا تھا۔ گھونسا اتنا شدید تھا کہ وہ لڑکھڑا کر سفیر پر جا گرا تھا۔ سفیر نے سنبھلنے کے نام پر صرف اتنا کیا کہ ہاتھ اٹھا دیا اور گولی داغ دی۔ فائر اتنے نزدیک سے ہوا تھا نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلا اس شخص کی کھوپڑی پرخچے میں بدل گئی تھی اور اس کا دماغ دور دور تک بکھر گیا تھا۔

گولی کے ساعت شکن شور نے سب کو چونکا دیا تھا۔ لڑائی رک گئی تھی کہ سفیر نے ایک دوسرے شخص کا نشانہ لیا اس نے پستول کی نال اپنی طرف آتے دیکھ عجیب حرکت کی۔ وہ پھرتی سے زمین پر گرا اور پھر پھسلنے کے انداز میں زمین پر لوٹ لگاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ سفیر اگر چاہتا تو اسے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا اور وہ بند کمرے سے بہ آسانی باہر نکل گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے باہر بھاگنے کا چانس خود سفیر نے دیا ہے۔ اب وہاں صرف تین آدمی بچے تھے جو سکتے کے عالم میں کھڑے تھے کہ سفیر نے ان کو نشانہ بنانے کے لیے پستول سیدھا کیا۔ پستول کی نال اپنی طرف اٹھتے ہی وہ تیزی سے گلیارے میں دوڑ گئے۔ کمرا بالکل خالی ہو گیا تھا۔

''خس کم جہاں پاک۔'' وسیم نے کہا ''مگر اصل مجرم تو ہاتھ ہی نہیں آیا۔ اب کیا کیا جائے؟''

''کرنا کیا ہے عبداللہ کو تلاش کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ بھی خیال رہے کہ فرار ہونے والے نئی کمک لے کر آ سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بھاگنے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ اس لیے کہ ان کے لڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سب سڑک چھاپ ہیں۔ ایسے لوگ خواہ مخواہ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالتے۔ جنھوں نے ان کو بلایا ہوگا یہ ان سے کوئی بہانا کر کے اپنی رقم کھری کر لیں گے۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم سب سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے رک کر سفیر نے کہا ''وہ جو بے ہوش پڑے ہیں انہیں کیا یونہی چھوڑ دیا جائے؟''

''پھر کیا ان کا اچار ڈالا جائے گا' بے وقوف آدمی وہ کرائے کے ٹٹو ہیں، ہم عبداللہ کی تلاش میں آئے ہیں اسے تلاش کرو۔ باہر ہمارے آدمی پہلے سے موجود ہیں۔ جو لوگ افراتفری میں نکلے ہوں گے وہ ان کی نظروں سے بچ نہیں پائے ہوں گے۔ انہیں ان لوگوں نے سنبھال لیا ہوگا۔''

''شہباز صحیح کہہ رہے ہیں۔'' وسیم بولا ''ہم عبداللہ کو بازیاب کرانے آئے ہیں۔ اسے ڈھونڈیں گے نا کہ غور و فکر کی کتاب کھول کر بیٹھ جائیں۔ چلو ایک ایک کر کے تمام کمروں کی تلاشی لیتے ہیں۔''

''وسیم نے بالکل صحیح کہا ہے۔ جس شخص نے عبداللہ کو اغوا کیا ہے وہ بھی کوئی اہم بندہ ہے اور اسے تلاش کرنا ضروری ہے۔ اس عورت کو بھی تلاش کرنا ہے جس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مرشد کو دوبارہ سے مستحکم کرنے میں وہ اہم کردار ادا کر رہی ہے۔'' میں نے رائے دی۔

''وہ عورت یہاں ہوگی؟ اس کے گھر کا پتا تو کچھ اور بتایا گیا ہے۔'' وسیم بولا۔

''اس کے بعد اسے ڈھونڈنا ہے۔ وہ جب تک نہیں ملے گی اصل بات کھل کر سامنے نہیں آئے گی کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کیوں مرشد کا ساتھ دے رہے ہیں؟''

''خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں عبداللہ تک پہنچ کر بھی سوچا جا سکتا ہے۔'' سفیر نے کہا۔

''چلو!'' کہہ کر میں نے پھر سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ایک کے بعد ایک کمروں میں جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کیونکہ اس دن ہم سب بنگلے کی تلاشی اس طرح سے لے رہے تھے جیسے سوئی کھو گئی ہو۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ کہیں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آ رہا

تھا۔ جب کہ دو آدمی میرے سامنے اندر کی طرف بھاگے تھے۔ عبداللہ کو بھی اسی بنگلے میں لایا گیا تھا۔ اتنے سارے لوگ اندر آئے لیکن اب کوئی بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ سب گئے کہاں؟ ایسی کون سی خفیہ جگہ ہے جہاں وہ لوگ چھپ کر بیٹھ گئے ہیں؟ میں اسی نکتے پر غور کر رہا تھا کہ لیپ ٹاپ کا خیال آگیا۔ میں نے وسیم کو مخاطب کیا "کسی کو باہر بھیج کر لیپ ٹاپ منگوالو۔"

"یہی مشورہ میں دینے والا تھا۔" وسیم نے کہا اور پھر ایک بندے کی طرف مڑ کر بولا "ہری اپ... سن لیا نا کہ کیا منگوایا گیا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے باہر والے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اب کمرے میں ہم چار ہی آدمی بچ گئے تھے۔ سفیر، وسیم، شمشاد کا ایک ساتھی اور میں۔ تبھی سفیر بولا "کیا ہم اسی طرح یہاں کھڑے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہیں گے؟"

"نہیں ابھی ٹھمری گائیں گے۔" وسیم بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں نہیں راگ ملہار گانا، تاکہ بارش ہو اور اگر نیچے کوئی تہ خانہ ہو تو اس میں پانی بھر جائے اور اندر والے پانی سے خوفزدہ ہو کر باہر نکل آئیں۔" سفیر نے سنجیدہ لہجے میں چوٹ کی۔

وسیم کچھ کہتا کہ باہر جانے والا لیپ ٹاپ اٹھائے آگیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے لیپ ٹاپ لیا اور اسے آن کر دیا۔ ونڈو کھلی تھی کہ میں نے وسیم کا بتایا ہوا نمبر انٹر کیا۔ اسکرین پر نقشہ ابھر آیا۔ نقشے میں سرخ دائرہ نظر آگیا۔ عبداللہ والی چپ فائنڈ ہوگئی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے اس سے چالیس میٹر دور عبداللہ تھا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں سفیر کو دیکھتے ہوئے کہا "بنگلے کی دیوار پندرہ سولہ میٹر کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن عبداللہ کی دوری چالیس میٹر بتا رہی ہے۔ کیا اس دیوار سے اندر جانے کا کوئی راستہ بھی ہے؟"

"مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔" وسیم نے جھک کر اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یاد آرہا ہے کہ عبداللہ سے اس آواز نے کہا تھا کہ یہ بنگلا جتنا بڑا نظر آرہا ہے اس سے بڑا ہے۔ گویا عقب والی عمارت بھی اس سے جڑی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر انتظار کیسا۔ ہم اس خفیہ دروازے کو ڈھونڈتے ہیں۔" وسیم بولا۔

ہم سب دیواروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈھونڈنے لگے کہ شاید کوئی کلیو مل جائے۔ نیچے کے تمام کمروں کو چیک کر لیا۔ ایک ایک دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا مگر ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس بنگلے میں کوئی رہتا ہی نہیں۔ تمام کے تمام خالی کمرے ہمارا منہ چڑھا رہے تھے۔

"یہی کمرے آخری سرے پر ہیں اور عبداللہ بھی نزدیک ہے۔ لیکن اس تک پہنچا کیسے جائے۔" سفیر نے کہا۔

ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کہ شاید کوئی حل بتا دے لیکن سب خاموش تھے۔ تبھی وسیم بولا "عام طور پر لوگ جب بلڈنگ بناتے ہیں تو دوسری عمارت کی دیوار سے کچھ ہٹ کر دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ ایک بار لان میں نکل کر دیکھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عمارت کے پیچھے کچھ جگہ چھوڑی ہوئی ہو اور دروازہ باہر کی دیوار میں بنایا گیا ہو۔"

"واقعی اس کی بات کو جانچنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس کا اندازہ صحیح ہو۔" سفیر نے کہا۔

وسیم کی بات مجھے بھی پسند آئی۔ میں نے باہر والے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ دروازے کے بیچوں بیچ ایک آدمی آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشن کوف تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھاٹے سے چھپا رکھا تھا۔ اس نے للکارنے کے انداز میں کہا "تم سب چاروں طرف سے گھر گئے ہو۔ اپنے اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ منہ دیوار کی طرف ہونا چاہیے۔"

یہ آواز نہیں بم کا دھماکا تھا۔ کمرے میں موجود تمام افراد چونک گئے تھے۔ اب تک ہم کامیابی کے نشے میں چور تھے۔ تبھی تو ہم ہر جانب سے غافل ہو چکے تھے، دشمن کے گھر میں کھڑے ہو کر ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ عقلمندی کا تقاضہ تھا کہ ہر طرف نظر رکھتے لیکن سب کے سب بے پروا ہو گئے تھے۔ جس کا نتیجہ بھی سامنے آگیا تھا۔ اب پچھتانا بیکار تھا۔

اس نے پھر وارننگ دی "سر اٹھا کر روشندان کی طرف دیکھو۔ ہر طرف سے تم لوگوں کو نشانے پر لے لیا ہے۔"

میں نے اوپر نظر ڈالی تو سکتے میں رہ گیا۔ کمرے میں چار روشندان تھے اور ہر روشندان سے نال باہر جھانک رہی تھی۔ اس سے پہلے درجنوں مہم سر کر چکا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک ہی دن اتنے لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بنگلا صرف لڑائی کے لیے مختص

ہو۔ ایک کے بعد ایک پارٹی الجھنے آ جا رہی ہے۔ جب کہ ایک لاش اب بھی ڈرائینگ روم میں پڑی ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نقاب پوش نے کہا:

”اب تو تسلی ہو گئی ہو گی اگر ابھی بھی نہیں ہوئی ہے تو فائر کر کے یقین دلاؤں مگر اس میں تمہارا ایک آدھ آدمی جان سے جائے گا۔“

”اگر ہاتھ سر پر نہ رکھ کر کمر پر رکھوں تو کیا پھر بھی تم گولی مارو گے؟“ اس حالت میں بھی وسیم کی بزلہ سنجی کم نہیں ہوئی تھی۔

”یہ آخری وارننگ ہے۔ کسی نے کوئی غلط حرکت کی اور اوپر سے گولیاں برسیں۔ اس لیے تعاون کرو۔ میں خود اندر آ رہا ہوں تاکہ تلاشی لے سکوں۔ اس سے پہلے جس کے پاس جو اسلحہ ہے وہ نکال کر زمین پر رکھ دے۔“

مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی انہیں معلوم ہو گا کہ میں ہی شہباز ہوں یہ سیدھے مجھے گولی مار دیں گے۔ شیر جب شکاری کے جال میں پھنستا ہے تو چوہا بن جاتا ہے۔ میں بھی اس وقت چوہا بنا ہوا تھا۔ تبھی وہ اندر آیا۔ ڈھاٹے سے صرف دو آنکھیں نظر آ رہی تھیں جن میں نفرت ہی نفرت تھی۔ وہ آگ برساتی نگاہوں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ اس نے چہرہ چھپا کر سمجھا تھا کہ میں اسے پہچان نہیں سکوں گا۔ حالانکہ اس کے نزدیک آتے ہی میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ کیسے آ گیا۔ اس نے مجھے سڑک چھاپ غنڈہ سمجھا تھا تبھی تو رعب جمانے آ گیا تھا۔ اسے شاید علم نہیں تھا کہ میں اپنے شکار کو کبھی بھولتا نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ جس آدمی کے جسم پر پڑتے ہیں‘ جہاں پڑتے ہیں وہاں کا گداز پن‘ نشیب و فراز میرے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ شمشاد نے اس گارڈ کو جب بے ہوش کیا تھا تو میں ایک نظر اسے دیکھنے نزدیک گیا اور اس کی تلاشی لی تھی۔ تبھی تو میں نے اس کے جسم کی بناوٹ سے اسے پہچان لیا تھا اور حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ شاید شمشاد کا ہاتھ ہلکا پڑا تھا یا وہ کچھ زیادہ ہی سخت جان تھا۔ اسی لیے دوبارہ آ گیا تھا اور اسلحے کے زور پر اکڑ رہا تھا‘ تیزی دکھا رہا تھا مگر اس سے بھی تیز میرے ساتھی تھے۔ جیسے ہی وہ سفیر کے نزدیک پہنچا سفیر نے اچھل کر اس کے ہاتھ پر کک ماری۔ کلاشن کوف چھوٹ کر دور جا گرا۔ یہ بہت بڑی بے وقوفی تھی۔ روشن دان سے انگارے برس سکتے تھے مگر اب سوچنے فکر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وسیم نے بھی سفیر کی تقلید کی اور لڑکھڑاتے اس بھگوڑے کی کمر پر لات ماری۔ اسی کے ساتھ شمشاد نے بھی وزنی گھونسا آزمایا۔

اس کی چیخ گونجی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا شمشاد کے ساتھی کی طرف گیا تھا کہ اس نے بھی کک چلا دی۔ وہ دوبارہ سے میری طرف آ گیا۔ میں نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیا۔ کھڑی لات اس کے کمر پر ماری۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر سنبھل نہ سکا اور پھر سے سفیر کی طرف چلا گیا۔ سفیر پہلے سے ہی مستعد تھا، اس نے گھٹنے کی قوت آزمائی، سفیر نے اس کے پیٹ پر وار کیا تھا۔ وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سفیر کے گھٹنے کی ضرب سہہ لینا معمولی بات نہیں تھی۔ اسی وقت شمشاد نے آگے بڑھ کر اسے پروفیشنل ریسلر کی طرح دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور سر سے بلند کر کے کچھ توقف کیا اور پھر پوری قوت سے اسے زمین پر دے مارا۔ وہ مری ہوئی چھپکلی کی طرح زمین پر بکھر گیا تھا۔ اس معرکہ کے دوران میں بھی میری توجہ روشندان کی طرف تھی۔ اس سے جھانکتی ہوئی نالوں کی طرف تھی۔ میں منتظر تھا کہ ادھر سے کب فائر آتا ہے مگر حیرت کی بات تھی کہ بیرل میں ذرا بھی ارتعاش پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہلکی سی بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے فٹ کر کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس کا بندہ اس بری طرح پٹ رہا ہے پھر بھی وہ فائر نہیں کر رہے۔ یہ کیسے نشانچی ہیں جو اپنے ساتھی کی بھی مدد نہیں کر رہے ہیں۔ سفیر اور وسیم کی پوری توجہ اس بے ہوش بندے پر تھی اس لیے میں نے سوچا کہ باہر جا کر روشندان پر بیٹھے بندوں کو دیکھ آؤں۔

باہر آ کر گربہ پا چلتا ہوا میں بنگلے کے عقب میں پہنچا۔ روشندان اسی طرف کھل رہے تھے۔ عقب میں پہنچتے ہی میری ہنسی چھوٹ گئی۔ اندر بے ہوش پڑے شخص پر مجھے ہنسی آنے لگی۔ اس نے غضب کی چالاکی دکھائی تھی۔ اس نے چاروں روشندان میں رائفلیں لگا کر یہ پوز دیا تھا کہ باہر بہت سارے لوگ ہیں۔ جب کہ باہر ایک بھی شخص نہیں تھا۔ اندر واپس آ کر میں نے کہا ”اس بے ہوش شخص کو باندھ کر ایک طرف ڈال دو اور چلو عقب میں ایک گلی نظر آئی ہے اس میں دیکھتے ہیں کہ وہ کہاں ختم ہو رہی ہے۔“

وسیم نے فوراً ایک بیڈ کی چادر اتاری اور اسے درمیان سے پھاڑ کر رسے جیسی شکل دی اور اس سے اس بندے کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگا۔ اس کام سے فرصت پا کر ہم سب باہر آ گئے۔

”اتنی سی دیر میں ہم نے خوب مقابلہ کیا ہے۔ شاید یہ زندگی کا ایسا مشن ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ کی پناہ۔ اتنے

لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔'' وسیم نے کہا۔
''کیوں، وادی میں جب سامیرا کی مدد کے لیے ہم جنگ میں کودے تھے اس دن ایسا موقع کئی بار نہیں آیا تھا۔'' سفیر نے جواب دیا۔
''وہ جنگ تھی۔ دو بڑی قوتوں کے درمیان ایک جنگی منظر تھا۔ اس کی بات دیگر ہے۔'' وسیم اپنی بات پر اڑا رہا۔
''تم لوگ ایسے مطمئن ہو جیسے گھر میں بیٹھے ہو۔ یہ نہ بھولو کہ یہ دشمنوں کا گھر ہے۔ کئی لوگ میدان چھوڑ کر بھاگے بھی ہیں۔ وہ جتھا بنا کر پھر سے مقابلے پر آسکتے ہیں۔'' میں نے ٹوکا۔
''آپ کہتے ہیں تو میں ان باتوں کو بھلا دیتا ہوں اور سنجیدگی سے عبداللہ کو تلاش کرنے میں عقل سرف کرتا ہوں۔ اب تو خوش؟'' وسیم نے ہنس کر کہا۔
اتنی دیر میں ہم بنگلے کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ دو عمارتوں کے درمیان ایک گلی سی موجود تھی لیکن دیوار میں کوئی در نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر وسیم پھر بولا۔ ''اب ایسا کرتے ہیں کہ دیوار کو گرا کر دیکھتے ہیں کہ اس کے پیچھے تو کوئی دروازہ نہیں ہے۔''
میں نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ''ادھر دیکھو عبداللہ کی جیب میں جو چپ ہے اس کے سگنل دیوار کے پیچھے سے آرہے ہیں۔ یعنی وہ ادھر موجود ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ دیوار کی دوسری جانب جو بنگلا ہے اس کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہے۔''
سفیر نے اسکرین کو دیکھ کر کہا ''بات تو صحیح ہے۔ وہ داخل اس بنگلے میں ہوا اور اب سگنل ادھر سے آرہے ہیں تو اسے کسی خفیہ دروازے سے ادھر پہنچایا گیا ہے۔''
''اس لیے ہمیں نئے سرے سے اس دروازے کو ڈھونڈنا پڑے گا۔''
''ہر کمرے کی دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا۔ کسی دیوار میں ایسا کچھ نظر نہیں آیا جسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کوئی دروازہ ہے۔'' وسیم نے جواب میں کہا۔
''میرا خیال ہے کہ ہم غلط رخ پر سوچ رہے ہیں۔ دیواروں میں تلاش کر رہے ہیں۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ راستہ سرنگ میں ہو؟'' میں نے اپنا خیال پیش کیا۔
''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ چلو اب کمرے کی زمین کو بھی ٹھونک بجائیں۔ اس لیے کہ عبداللہ کو کمرے میں لایا گیا۔ پھر اسے آگے لے جایا گیا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ سرنگ اگر ہے تو کسی تہ خانے سے ہے۔'' وسیم نے کہا اور مڑ گیا۔

ہم سب لوٹ کر پھر ڈرائنگ روم میں آگئے اور کارپیٹ الٹ کر ڈرائنگ روم کے فرش کا معائنہ کرنے لگے۔ اس فرش میں ایسا کچھ نہیں ملا۔ اس کے بعد دوسرے اور پھر تیسرے کمرے کے فرش کو دیکھا لیکن ناکامی مقدر رہی۔ پھر ہم سب سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سیڑھیاں اوپر والی منزل کو جارہی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کے حصے کو دیوار اٹھا کر چھوٹے کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ عام طور پر ایسی جگہ پانی چڑھانے کی موٹر کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ پہلے میں نے بھی یہی سمجھا تھا اس لیے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس بار میں نے سیدھے جا کر اس کے چھوٹے سے دروازے کو کھولنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ کھلتا چلا گیا۔ اندر جھانکتے ہی وسیم نے نعرہ لگایا۔ ''اسے کہتے ہیں، بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔''
اس کمرے کے درمیان فرش سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اندر جھانکتے ہی سیڑھیاں نظر آگئیں۔ لگتا ہے کہ بعد میں جو دو آدمی میدان چھوڑ کر بھاگے تھے انہوں نے جلد بازی میں فرش میں بنا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ نیچے سیڑھیاں ہی جارہی تھیں۔
''اب کیا کرنا ہے؟'' شمشاد نے سرگوشی میں پوچھا۔
''نیچے اترنا ہے لیکن احتیاط سے۔ پہلے میں اترتا ہوں۔ نیچے جا کر میں سفیر کے موبائل پر مس کال دوں گا تب ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر آپ سب نیچے اتریں گے۔''
انہیں ہدایت دے کر میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا۔ میری نظریں اس دروازے پر لگی ہوئی تھیں جو نیچے سیڑھیوں کے اختتام پر تھا۔ اس دروازے سے روشنی اندر تک آرہی تھی۔ یقیناً اس کے بعد دوسری طرف والا بنگلا تھا۔ آدھی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد میں نے مس کال دی تاکہ مجھے کور اپ کرنے والا نیچے اترنا شروع کر دے۔
سامنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس سے باہر آنے والی روشنی اندر تک آرہی تھی۔ میں اسی روشنی کو دیکھ رہا تھا کیونکہ اگر کوئی آتا تو اس کا سایہ نظر آجاتا۔ آہستہ آہستہ میں نیچے اتر آیا۔ اس دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ سفیر اور اس کے پیچھے وسیم نیچے آرہے تھے۔ میں نے گربا پا چلتے ہوئے ادھر دیکھا۔ وہ کمرا بالکل خالی تھا۔ پھر بھی میں اندر داخل نہیں ہوا۔ مجھے سفیر کے آنے کا انتظار تھا۔ ابھی میں اندر جھانک ہی رہا تھا کہ آواز آئی ''خبردار ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔''
میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ گارڈ کی وردی میں

تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

میں نے مڑ کر سفیر کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت اندر سے پھر آواز آئی "سنا نہیں ہے۔ میں نے ہاتھ اٹھانے کا کہا ہے؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے۔ اسے مطلق دکھائی نہیں دیا ہے کہ میں کس طرف کھڑا ہوں۔ میں دیوار سے چپک کر کھڑا تھا اور اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دبے قدموں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اسٹین گن کو اس طرح سنبھال رکھا تھا جیسے ابھی فائر کر دے گا۔ اس کے بڑھتے قدم بتا رہے تھے کہ وہ اندازے سے آگے آ رہا ہے۔ یعنی کہ اسے ابھی تک یقین نہیں ہے کہ اس جگہ کوئی چھپا ہوا ہے۔ شاید اسے حکم دیا گیا ہوگا کہ اندر آنے والے کو روکے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں بھی خفیہ کیمرا لگا ہوا ہے۔ جس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ اس خیال نے مجھے مزید ہوشیار کر دیا اور میں دیوار سے بالکل چپک کر کھڑا ہو گیا۔ سفیر بھی ہوشیار ہو گیا تھا۔ نووارد آگے بڑھتے بڑھتے بالکل نزدیک آ گیا۔ میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا میں نے اس کی اسٹین گن پر ہاتھ ڈال دیا اور ایسا جھٹکا دیا کہ وہ منہ کے بل گرا۔ اسٹین گن اب میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ وہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ سفیر نے اسے چھاپ لیا۔ وہ اس کی جکڑ سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اتنی دیر میں وسیم بھی نزدیک آ چکا تھا۔ اس نے گارڈ کی گردن پر پیر رکھ کر دبایا۔ گارڈ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شاید اس کی سانس رکنے لگی تھی۔ سفیر نے اس کے دونوں ہاتھ کو پشت پر لگا کر کہا "اب ہاتھ پیر چلایا تو گردن دب جائے گی۔ اگر مرنا نہیں چاہتے تو خاموش ہو جاؤ۔"

اس نے حالات کی نزاکت سمجھ لی تھی اس لیے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ سفیر نے وہیں پڑے الیکٹریک تار کے ٹوکرے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا "وہ تار اٹھانا۔"

میں نے آگے بڑھ کر تار کو اٹھا لیا۔ اس تار سے سفیر نے اس کی مشکیں کسیں پھر سیدھا ہو کر بولا "اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔"

"چلو۔" کہہ کر میں نے دوسرے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ وسیم نے اس کی شرٹ کو جھٹکے سے کھینچا۔ شرٹ پھٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے ایک اور جھٹکا دیا۔ پھٹنے والا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس ٹکڑے کو گول کر کے گارڈ کے منہ میں ٹھونس دیا۔ "اب یہ یہیں آرام کرے گا۔"

ہم اسے وہیں بندھی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھے۔ دروازے کو پار کیا تو سامنے ہی ایک اور دروازہ نظر آیا۔ میں نے اس دروازے کو پار کیا۔ ادھر بھی گلیارا نظر آیا۔ اس کمرے کا جائزہ لینے کے لیے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ گلیارا بالکل سونا پڑا تھا۔ سامنے ہی ایک کیمرا نظر آیا۔ میں نے اسٹین گن کو سیدھا کیا اور کیمرے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی کی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ کیمرا بند ہونے سے ہم انہیں نظر نہیں آ رہے ہوں گے لیکن وہ اندازہ لگا چکے ہوں کہ ہم گلیارے میں پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے میں نے اگلا قدم نہایت احتیاط سے اٹھایا اور بلی کی چال چلتے ہوئے گلیارے میں داخل ہوا۔ گلیارے کے آخری سرے پر ایک اور دروازہ تھا اسے پار کرتے ہی میں نے خود کو ایک بڑے ہال نما کمرے میں پایا۔ اس کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ سفیر نے کمر میں اڑسے ہوئے اس ریوالور کو نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جس سے اس نے کمرے میں ایک کا بھیجا اڑایا تھا۔ وسیم بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم تینوں آگے بڑھ رہے تھے کہ کمرے میں ایک آواز گونجی "ویل کم ... مجھے پوری اُمید تھی کہ شہباز اپنے ساتھی کو چھڑانے ضرور آئے گا۔"

"جب میرے آنے کی امید تھی تو تم چھپ کر کیوں بیٹھے ہو سامنے آؤ تا کہ میں دیکھ سکوں کہ ہو کیسے۔" میں نے جواب میں کہا۔

"ضرور ضرور میں سامنے آؤں گا۔ لیکن کیا کروں کہ میری ایک عادت ہے کہ میں فوراً کسی سے نہیں ملتا۔ کیوں کہ سانپ کو ہاتھ میں اٹھانے سے پہلے میں اس کے زہریلے دانت کو توڑ ضرور دیتا ہوں۔" کسی خفیہ جگہ پر لگے اسپیکر سے آواز آئی۔

"تو پھر دیر کیسی، سامنے آ جاؤ تا کہ میں بھی دیکھ لوں کہ تم میں کتنا زہر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بس ایک قدم آگے بڑھو۔ سامنے والے دروازے سے داخل ہوتے ہی میرے سامنے پہنچ جاؤ گے۔ شاباش آگے بڑھو۔"

میں نے خود آگے بڑھنے سے پہلے سفیر کو آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھا۔ اس پر کسی نے ڈنڈا چلایا۔ سفیر پہلے سے ہوشیار تھا اس لیے ڈنڈا چلانے والے نے منہ کی کھائی۔ سفیر پھرتی سے آگے بڑھ گیا تھا اس لیے ڈنڈا ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔ وہ دوسرا وار کرتا کہ میں نے ہاتھ

سالِ نو کا تحفہ..... خوشیاں بکھیرتا جنوری 2017ء پاکیزہ کا خوب صورت شمارہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
شیریں حیدر کے نئے سلسلے وار ناول اَمرت کی پہلی تعارفی قسط
سحر ساجد کی دل گداز تحریر..... من جانبازم
سیما رضا ردا کے منی ناول ہم کو عبث بدنام کیا کا اگلا باب
رفعت سراج اور انجم انصار
کے ناول تیزی سے تکمیل کے مراحل طے
کرتے ہوئے
نئے سال کا بھرپور تحفہ..... نگہت سیما، بنتِ سحر اور رضوانہ پرنس کی
خوشگوار تحریریں..... دلچسپ اور معلومات افزا..... منفرد مضامین آپ کی خوش ذوقی کا سامان
اس کے علاوہ
نامور رائٹرز کی تحریریں جن میں بشریٰ سیال، سفینہ یاسمین،
نفیسہ سعید، اُمِ ایمان، ہاجرہ ریحان و دیگر شامل ہیں۔
دل فریب تحریروں سے سجا خوب صورت پاکیزہ آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر.....

بڑھا کر ڈنڈے والے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وسیم نے اسے مزید آگے کھینچ کر زمین پر گرا دیا اور اس کے سر پر بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ وہ تلملا گیا۔ وسیم نے اسے موقع نہیں دیا اور تابڑ توڑ ٹھوکریں مارنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے وسیم کے پاس چھوڑا اور خود اندر داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں صرف ایک آدمی تھا جس نے اپنے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا مائیک سنبھال رکھا تھا۔ اور اس وقت بالکل خاموش تھا۔ شاید اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ اس کے پیچھے زمین پر عبداللہ بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ میں نے ایک نظر میں کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔

''ہاں بھئی تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے لو میں آ گیا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آ تو گئے ہو لیکن جا نہیں پاؤ گے۔'' مائیک والے نے کہا۔

''مجھے روکے گا کون، تم؟''

''ہاں میں تمہیں روکوں گا۔ آج مرشد بھی خوشی سے پھولے نہیں سمائے گا۔'' ابھی اس نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اچھل کر آگے آ گرا۔ ایسا ہوا کیسے میں بھی حیران کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر ہی میں نے سمجھ لیا کہ عبداللہ نے ہاتھ دکھا دیا ہے۔ اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہی پوری قوت سے اسے دھکا دیا تھا۔ گرنے والا ابھی اٹھنے ہی والا تھا کہ اندر داخل ہوتے سفیر نے اس کے سر پر ٹھوکر ماری۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر گر پڑا۔ گرتے ہوئے اس نے کہا ''اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ تم مجھ پر قابو پالو گے۔''

''خوش فہمی میں رہنا تمہاری عادت ہو گی۔ ہم تو خود مواقع تیار کرتے ہیں۔ اب اپنی خیر مناؤ۔'' کہتے ہوئے میں نے اس کے گلے پر اپنا پیر رکھ دیا۔

ابھی میں نے پورا زور بھی ڈالا نہیں تھا کہ میری پنڈلی میں سوئی سی چبھی۔ یہ وار ایسا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اچھل سا گیا اور اسے اٹھنے کا موقع مل گیا۔ وہ جمپ لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوئے جیسی کوئی چیز تھی جس سے اس نے میری پنڈلی کو زخمی کیا تھا۔ میں اپنی پنڈلی کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھڑے ہونے میں ایسی تیزی دکھائی تھی جس نے خاموش زبان سے کہہ دیا تھا کہ یہ بندہ ٹرینڈ ہے۔ کھڑے ہوتے ہی اس نے پھر اچھال بھری تھی اور دیوار کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ وسیم جو اس کے سب سے قریب تھا اس نے اسے لپیٹ میں لے کر پھر اچھال بھری تھی۔ اس نے جس انداز میں وسیم کو پکڑا تھا وہ نہایت خطرناک انداز تھا۔ اپنے داہنے بازو کو اس نے وسیم کے گلے میں پھنسا دیا تھا۔ وسیم بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ اگر زور لگاتا تو اس کا گلا دبنے لگتا۔ سفیر کے ہاتھ میں پستول تھا لیکن وہ فائر نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ گولی وسیم کو لگ سکتی تھی۔ میں بھی جس پوزیشن میں تھا وہاں سے بھی میں اسے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اس شخص کی ایک ایک حرکت بتا رہی تھی کہ وہ لڑائی بھڑائی کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔ اس طرح کی اپنی پوزیشن رکھی تھی کہ سفیر اور میں پستول رکھتے ہوئے بھی لاچار تھے۔ اس نے میری بے چارگی کو محسوس کر لیا تھا اسی لیے وہ اٹھلاتے ہوئے بولا ''چلاؤ گولی... خاموش کیوں کھڑے ہو۔''

''موقع کی تلاش ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس کی نظریں ہم دونوں پر تکی ہوئی تھیں۔ سامنے وسیم تھا اس لیے میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے داہنے پیر کو آگے بڑھا کر وسیم کے پستول کو قریب کرنا چاہا تھا۔ اس کوشش میں ایک ذرا سا وہ جھکا تھا کہ میں نے ترچھے ہو کر فائر کرنا چاہا اسی وقت کھٹ کی آواز ابھری اور اس کی چیخ کمرے میں گونج اٹھی۔ یہ کام کر دکھایا تھا شمشاد نے۔ پتا نہیں کب وہ اندر آیا تھا اور ہاتھ میں پکڑے راڈ کو اس کے سر پر بجا دیا تھا۔ اسی پر اس نے بس نہیں کیا تھا۔ دوبارہ ایک اور وار کر بیٹھا تھا۔ وسیم کو موقع مل گیا تھا اس نے جھٹکا دے کر خود کو چھڑا لیا تھا اور غصے میں اس پر ٹھڈوں کی بارش کر دی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ حد درجہ خوفناک ہو گیا تھا۔ سر سے بہنے والے خون سے چہرہ تر بتر ہو رہا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وسیم کے ٹھڈے اور شمشاد کے ڈنڈے نے اسے مجبور بنا دیا تھا۔ لگاتار پڑنے والی ضربوں نے اسے زمین پر گرا دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

''اِدھر اُدھر تلاش کرو۔ کوئی رسی کوئی تار ملے تو لے آؤ۔ اسے باندھنا ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

سفیر اور وسیم دونوں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ اس لیے کہ عام طور پر کاٹھ کباڑ سیڑھیوں کے نیچے ہی رکھا جاتا ہے۔

عبداللہ جو اب تک زمین پر سر پکڑے بیٹھا تھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا ''پتا نہیں اس کمبخت نے کون سی دوا انجکٹ کی تھی جس نے جسم کی قوت تک سلب کر لی ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ میں ابھی مونا کو فون کرتا ہوں وہ بات کرا

دے گی۔ اس کی آواز سنتے ہی تمہارے جسم میں نئی قوت آجائے گی۔'' سفیر نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں موٹا الیکٹریکل وائر تھا۔ تار میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔'' یہ چھوٹا ہے لیکن کام چل جائے گا۔ ہاتھ پشت پہ کر کے باندھ دیں۔''

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیئے تاکہ وہ ہوش میں آنے کے بعد کوئی پھڈا کھڑا نہ کر دے۔

''یہاں کل کتنے آدمی تھے؟'' میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

''اس کے علاوہ صرف دو آدمیوں کو دیکھا۔ جب کہ پہلے والے کمرے میں چار پانچ بندے تھے جو وہیں رک گئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے زیادہ بندے یہاں نہیں تھے۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔

''دو بندوں کو تو ہم نے باہر والے کمرے میں اناشفیل کر دیا ہے۔'' وسیم بولا۔

''اندر آتے ہوئے میں نے ایک ہی بندے کو اس کمرے میں بے ہوش پڑے دیکھا ہے۔'' شمشاد نے بتایا۔

''دوسرا اس کمرے میں پڑا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''دیکھو کہیں سے پانی مل سکتا ہے یا نہیں۔ اسے ہوش میں لانا بہت ضروری ہے۔'' میں نے اس بے ہوش پڑے شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔

عبداللہ نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا'' اس طرف کچن ہے۔ میرے پانی مانگنے پر اسی کمرے سے گارڈ نے پانی لا کر دیا تھا۔

وسیم اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں جگ تھا۔ میں نے جگ لے کر اس سے چلو میں پانی اٹھایا اور اسے اس بندے کے چہرے پر چھینٹا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وسیم نے کہا'' بھائی میاں' کافی دیر ہو چکی ہے' ہمیں واپس بھی جانا ہے۔''

جواب میں اس نے غصیلی نظروں سے وسیم کو دیکھا۔

''ایسے تو نہ دیکھو۔ میں کمزور دل ہوں' کہیں بے ہوش ہو کر گر نہ جاؤں۔'' وسیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تم کون ہو' مجھے صرف اتنا معلوم کرنا ہے۔'' میں نے پوچھا۔'' اس لیے کہ تمہارے بازو پر میں نے سواستک کا نشان گدا ہوا دیکھا ہے۔ ایسے ٹیٹو مسلمان نہیں بنواتے۔''

''تم خود پتا کر لو کہ میں کون ہوں۔'' اس نے اس حالت میں بھی مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

''عجب ڈھیٹ ہڈی ہے۔'' وسیم بولا'' ابھی اس کا پیٹ بھرا نہیں ہے۔ میں نے اس کمرے میں ایک پلاس دیکھا تھا۔ وہ لے کر آتا ہوں۔ بغیر سبق پڑھے یہ کچھ بتائے گا نہیں۔''

''اس پوری عمارت میں ایک چمٹا تک نہیں ہے۔ تم نے پلاس کہاں سے دیکھ لیا۔'' وہ اس طرح بولا جیسے ہم دوستانہ ماحول میں بیٹھے گپ لگا رہے ہیں۔

''تم کون ہو۔ تمہاری حقیقت کیا ہے۔ یہ بعد میں بھی معلوم کر لوں گا۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ مرشد کہاں ہے؟'' میں نے اس کی ہٹ دھرمی کو نظر انداز کر کے کہا۔ ٹیٹو دیکھنے کے بعد میرے اندر ایک عجیب سا غصہ ابھر آیا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ کوئی بڑا کھیل کھیلنے کے لیے وطن عزیز میں داخل ہوا ہے۔ ایسے کسی شخص پر میں رحم کر ہی نہیں سکتا جو میرے وطن کے خلاف سازش کر رہا ہو پھر بھی میں خود کو سنبھالے رہا۔

''اگر میں نہ بتاؤں تو؟'' وہ گویا اپنی بات پر جم گیا تھا۔'' تم نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے کہ اتنی بڑی گوٹ میرے پاس ہے اس کے بارے میں بتا دوں گا تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گے نہیں' کبھی نہیں وہ کہاں ہے اس کے بارے میں صرف میں جانتا ہوں مجھے مار دو گے تو اسے کیسے حاصل کرو گے؟ میں تو نہیں بتاؤں گا۔'' اس شخص نے ہٹ دھرمی دکھائی۔

''بتائے گا تو تیرا باپ۔'' وسیم نے اس کی پیٹھ پر دھپ جماتے ہوئے کہا۔ اسی وقت سفیر نے اچھل کر اس کے پیر کی انگلیوں پر جوتے رکھ کر مسل دیا تھا۔

''میں کوئی سڑک چھاپ غنڈا نہیں جو ایک دو طمانچے پڑتے ہی فرفر بولنے لگے۔'' وہ داہنے پیر کو پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس اذیت کو بھی برداشت نہ کر پاتا۔

''تمہارے بازو پر سواستک کا نشان دیکھنے کے بعد میرے دل میں تمہارے لیے ذرا بھی ہمدردی بچی نہیں ہے۔''

''تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے ہمدردی کرو۔''

''اسے میں اپنے طور پر سمجھاتا ہوں۔'' کہہ کر سفیر نے پستول نکال لیا۔

''لاؤ پستول مجھے دو۔'' میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''یہ لو۔'' سفیر نے جلدی سے پستول آگے بڑھا دیا۔

میں نے پستول تھام لیا۔
''ہاں اب بولو۔'' میں نے اس کے پیر پر فائر کر کے کہا۔ اس کے پیر سے خون کا فوارہ نکل رہا تھا مگر اکڑ کم نہیں ہوئی تھی۔ ''نہیں بتاؤں گا۔'' وہ ڈھیٹ بن کر بولا۔
''اس بار میں تمہارے بازو پر فائر کروں گا جلدی بولو۔''
''نہیں بتاؤں گا۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخا۔
''لو اپنے ہاتھ سے بھی محروم ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کے دائیں بازو پر فائر کیا۔ مجھے اس پر ذرا رحم نہیں آرہا تھا۔
''بول دے بھئی کیوں اپنی جان کا دشمن بن رہا ہے۔'' سفیر نے کہا۔ ''اسے صرف مرشد سے مطلب ہے۔ اس کی تجھ سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے پھر کیوں اپنی جان کا دشمن بن رہا ہے۔''
''لے تیرا دوسرا ہاتھ بھی گیا۔'' کہہ کر میں نے اس کے بائیں بازو پر گولی چلادی واقعی وہ فولادی اعصاب کا انسان تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا۔ اس کے جسم سے جس قدر خون گر چکا تھا وہ کسی بھی انسان کو ڈھیر کرنے کے لیے کافی تھا لیکن وہ اب بھی بیٹھا تھا۔ کرب اس کے چہرے سے عیاں تھا مگر زبان خاموش تھی۔
''بول اب بھی وقت ہے ورنہ اس بار میں تیری پسلی میں گولی ماروں گا۔''
''بتاتا ہوں۔'' اس نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ ''وہ اب خانقاہ میں نہیں ہے۔''
''کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''شہر والے بنگلے میں۔'' اس نے کہا۔
شہر والا بنگلا کہاں ہے یہ مجھے معلوم تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔ ''اگر میں چاہوں تو تجھے ختم کر دوں مگر میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔ تو سسک سسک کر مرے گا۔ یہی تیرا انعام ہے'' کہہ کر میں نے اس کے پیر کے قریب گولی چلادی۔ اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔
وحشت کی علامت کہلانے والا کیچوے کی طرح... تڑپ رہا تھا لیکن اس کی آہ و زاری سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا میں نے سفیر سے کہا ''اب باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔ ہم نے کافی وقت برباد کرلیا ہے۔''
''ہمارے بندے تو اس گیٹ پر ہوں گے اگر ہم اس بنگلے کے گیٹ سے نکلے تو کافی لمبا چکر لگا کر ادھر جانا ہوگا۔'' وسیم بولا۔
''ادھر والے بنگلے سے باہر نکلے تو کوئی پریشانی گلے پڑ سکتی ہے۔ اس لیے کہ ہم کافی دیر سے اندر ہیں۔ باہر کی کوئی خبر نہیں۔ اندر اتنی گولیاں چلی ہیں۔ دھماکے کی آواز باہر تک گئی ہوگی۔ اس لیے رسک لینا مناسب نہیں ہے۔ اسی بنگلے کی گیٹ سے باہر نکلو۔'' میں نے کہا۔
''اور اندر جو دو بے ہوش بندے پڑے ہیں، ان کا کیا کرنا ہے؟'' شمشاد نے پوچھا۔
''وہ دونوں کرائے کے ٹٹو ہیں۔ اسی طرح خالی گھر میں پڑے رہیں۔ جب اس بندے کی لاش سڑے گی تو بدبو پھیلے گی۔ کوئی نہ کوئی پولیس کو خبر دے گا۔ پولیس آئے گی تو انہیں بھی رہائی مل جائے گی۔ ان کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ بندھے پڑے رہیں۔ بھوک پیاس کی اذیت برداشت کریں۔'' میں نے کہا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جو باہر کھلتا تھا۔
اس دروازے کو کھولتے ہی سامنے بڑا سا لان نظر آیا۔ اسے پار کر کے ہم گیٹ پر پہنچے۔ گیٹ مقفل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہو کہ یہ بنگلا خالی پڑا ہے۔ پہلے دیوار پھلانگ کر میں باہر نکلا۔ پوری گلی سنسان پڑی تھی۔ میں نے باقی لوگوں کو بھی باہر آجانے کو کہا۔ ایک کے بعد ایک سب باہر نکل آئے۔
باہر آکر ہم سب ٹہلنے کے انداز میں گلی کے موڑ کی طرف چلنے لگے۔ اس گلی میں چھ بنگلے تھے اور کسی بھی بنگلے کا گیٹ کھلا ہوا نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پورے علاقے میں کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔ اگر مکانوں میں روشنی نہ ہو رہی ہوتی تو ہم بھی یہی سمجھتے کہ علاقہ ویران ہے۔
گھوم کر جب ہم اپنی گاڑیوں تک پہنچے تو پہرے پر مستعد افراد اپنی جگہ موجود تھے۔ ان کے قریب پہنچ کر میں نے پوچھا ''کوئی ہلچل، کوئی نئی بات؟''
''جی نہیں۔ اتنی دیر میں صرف ایک بنگلے میں ایک کار آئی ہے۔ کوئی بنگلے سے باہر تک نہیں نکلا ہے۔ عجیب لوگ ہیں یہاں کے۔''
ہم لوگ بھی اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت بھی میرے دل میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت امنڈ رہی تھی جسے ہم اذیت دے کر مرتے ہوئے چھوڑ آئے تھے۔ سواستک کا نشان بتا چکا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ نشان کٹر ہندو ہی اپنے جسم پر گدواتے ہیں۔ مسلمان تو اسے ناپاک نشان سمجھتے ہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی برے کام کا انجام انتہائی برا ہوتا ہے یہ دیکھنے کے

لیے بھی ہم نہ رکے۔ وہاں سے سیدھے اپنے بنگلے پر آ گئے۔
ہمارے اندازے سے پہلے ہی پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔ اگلے دن کے اخبارات نے شہ سرخیاں لگائی تھیں سب کا خیال تھا کہ اتنی بڑی واردات کسی خاص مقصد کے لیے کی گئی ہے۔ قیاس آرائیاں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ سفیر نے اخبار پڑھتے پڑھتے رک کر کہا ''شہباز اب تمہارے گرد خطرات کا گھیرا مزید تنگ ہو گیا ہے اب تک تو صرف مرشد سے مقابلہ تھا مگر اب تمہیں دو طرفہ خطرہ ہے۔''
''دو طرفہ خطرہ؟ میں سمجھا نہیں۔'' میں نے کہا۔
''تم کیا سمجھتے ہو کہ خفیہ محکمے کے پاس تمہاری فائل نہیں ہو گی؟ جسے زخمی کر آئے ہو وہ سفارتی اہل کار ہے۔ یعنی یہ بہت بڑی واردات ہے۔ اتنی بڑی واردات کے بعد پورا محکمہ ہل کر رہ جائے گا نتیجتاً محکمے والے تم تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کریں گے۔''
''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے بس مجھے مرشد مل جائے میں یہی چاہتا ہوں۔''
ابھی ہم باتوں میں مشغول تھے کہ باہر کسی کے چیخنے کی آواز آئی ہم چونک گئے سفیر اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ ابھی ہم صدر دروازے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور میں نے خود کو پھرتی سے نیچے گرا لیا تب مجھے احساس ہوا کہ گولیاں اندر نہیں باہر چل رہی ہیں۔ سفیر دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک گیا تھا۔ میں نے وہیں سے پوچھا ''کیا ہوا سفیر؟''
''یلغار، لگتا ہے کسی پارٹی نے ہلہ بول دیا ہے۔''
باہر سے کئی قسم کے ہتھیاروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے گھمسان کا رن پڑا ہو۔ میں سفیر کے پاس پہنچ گیا۔ باہر سفیر کے خاص بندے پہرے پر موجود تھے لگتا تھا مقابلہ انہی سے ہو رہا ہے۔ وسیم نہ جانے کب اندر سے آ کر ہمارے پاس کھڑا ہو گیا تھا اس نے لائٹ مشین گن لٹکا رکھی تھی۔
''میں باہر جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''اتنی جلدی باہر جانا ٹھیک نہیں ہے پہلے معاملے کو سمجھنے دو۔'' میں نے اسے جھڑکا ''یہیں مستعد رہو۔''
''اسے تو رکھ لیں۔'' کہہ کر اس نے ایک ریوالور میری طرف بڑھایا۔
''میرے پاس اسلحہ ہے۔ میں کبھی نہتا نہیں رہتا۔ نہتا شخص خالی بندوق کی طرح ہے جو کسی کام کی نہیں ہوتی۔''
''یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟'' وسیم نے سفیر سے پوچھا۔
''میں ابھی پتا کرتا ہوں۔'' کہہ کر سفیر اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔
''ہم نے انہیں مار بھگایا۔'' اس نے کہا ''وہ تعداد میں چار تھے۔ سفید شیراڈ میں آئے تھے۔ دو زخمی ہوئے اور ایک جہنم واصل ... جاتے وقت وہ لاش کو بھی لے گئے ہیں۔''
''آؤ کمرے میں چل کر باتیں کریں۔'' کہہ کر سفیر مڑا میں بھی پیچھے پیچھے بیڈ روم میں آ گیا۔ ابھی میں نے صوفے سے پیٹھ ٹکائی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سفیر نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سے کی گئی باتوں کو وہ کچھ دیر تک سنتا رہا پھر ریسیور رکھ کر مڑا اس کے چہرے پر تفکرات کے پرتو تھے۔
''کیا بات ہوئی؟ کوئی خاص خبر تھی کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''فون کرنے والا شاید مرشد تھا۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ اس تباہی کا انتقام ہم سے لے گا۔''
''انسان جب مرنے پر آمادہ ہو تو پھر موت اس سے پہلو بچاتی ہے اور وہ خود موت بانٹتا ہے۔ میں تو خود ان کے لیے تباہی بنا ہوا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''مگر دشمن کو کمزور سمجھنا عقلمندی نہیں ہے۔'' سفیر بولا۔
''ہاں تمہاری سوچ صحیح ہے۔ یہاں فون آنا بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا ہے کہ دشمن کی نظروں میں یہ بنگلا آ چکا ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔
''اس بنگلے میں ہم ہیں اس کا پتا لگانا کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں ہے۔ یاد نہیں کہ ایک بندہ آپ کی ریکی کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔'' وسیم بولا۔
''اس کے لیے ہمیں سوچنا ہو گا۔''
''کیا سوچیں گے؟ اس جگہ کو چھوڑ دیں؟ کہیے تو کوئی اور جگہ دیکھ لیتے ہیں۔''
''ہمیں فوراً بنگلے سے دور ہو جانا چاہیے۔'' میں نے کہا ''یوں بھی فائرنگ ہوئی ہے۔ پولیس پہنچتی ہی ہو گی۔''
''پھر کہاں رہیں گے؟'' سفیر نے سوال کیا۔
''ایسا کرتے ہیں کہ پھر سے ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''یہ مت بھولیں کہ پورے شہر کی پولیس ہماری بو سونگھتی پھر رہی ہو گی۔'' سفیر نے کہا۔

"کوئی نئی بات کرو۔ یہ پولیس والے تو ہمیشہ سے ہمارے پیچھے رہے ہیں۔" وسیم نے جواب دیا۔
"یہ بھی ٹھیک کہا مگر اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے۔"
"ہم الگ الگ رہیں گے تو دشمن کسی ایک کو پھر اغوا کرلے گا جیسے عبداللہ کو کیا تھا۔" سفیر نے گفتگو میں حصہ لیا۔
"ایک کام کرتے ہیں میرے اور عبداللہ کے ہاتھ میں جو گھڑی دیکھ رہے ہو یہ معمولی گھڑی نہیں ہے وائرلیس ہے۔ اس سے ہم ایک دوسرے سے رابطہ میں رہیں گے۔" وسیم نے کہا۔
"ٹھہریں گے کسی ہوٹل میں ہی۔ وہ بھی صرف آج کی رات۔ اس لیے کہ صبح تک مرشد کی خبر مل جائے گی اور تب تک ہمیں دشمنوں سے بچ کر رہنا ہے۔" عبداللہ نے اپنا خیال پیش کیا۔
"تو کیا میرے لیے تیسری گھڑی کا انتظام کرو گے؟" میں نے ہنس کر کہا۔
"نہیں، میرا خیال ہے کہ آپ میری گھڑی لے جائیں۔ آگے آگے ہم رہیں گے جس ہوٹل میں ٹھہریں گے اسی ہوٹل میں آپ بھی آجانا مگر اجنبیوں کی طرح الگ الگ کمرے میں ٹھہرنا۔ اگر ضرورت پڑی تو گھڑی کے ذریعہ رابطہ کرلیں گے۔" وسیم بولا۔
"تو پھر اٹھ جاؤ۔ ہم ابھی یہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔" کہتے ہوئے میں کھڑا ہوگیا۔
ہم سب بڑی آسانی سے اس عمارت سے باہر آگئے۔ باہر ایسے کوئی آثار نہ تھے کہ جس سے پتا چلتا کہ اندر گولیاں چلی ہیں۔ سڑک پر پہنچتے ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی اور ہم تینوں اس میں سوار ہوکر چل پڑے۔
یہ سفر بالکل خاموشی سے کٹا اور ہم لوگ بازار پہنچ گئے۔ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے باہر ہم نے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئے کچھ وقت وہاں گزار کر باہر آئے اور الگ الگ سمت میں چلنے لگے کچھ دور جا کر سفیر نے ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا تاکہ باتوں کے دوران وسیم کو موقع مل جائے اور وہ بھی ٹیکسی لے لے۔ میں خاموش کھڑا سفیر کو باتیں کرتا ہوا دیکھتا رہا۔
وسیم کے ٹیکسی لیتے ہی سفیر نے ٹیکسی والے کو کسی بڑے ہوٹل میں چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی چل پڑی ڈرائیور نے ٹیکسی ایک معروف ہوٹل کی روش پر روکی۔ سفیر نے نیچے اتر کر بل ادا کیا اور چند لمحوں بعد وہ میرے ساتھ ہوٹل کے گیٹ سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔
وہ اسٹار فیسلیٹی ہوٹل تھا۔ میں نے سفیر کو باہر رکنے کا اشارہ دیا اور خود کمپاؤنڈ سے گزر کر ہال میں داخل ہوگیا۔ ہال میں بیشتر میزیں آباد تھیں اور لوگ لوازمات سے دل بہلا رہے تھے۔ بائیں جانب کاؤنٹر تھا۔ کاؤنٹر پر ایک آدمی کھڑا کلرک سے باتیں کررہا تھا۔ شام ہونے کے باوجود اس نے آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔
میں نے ہال کا جائزہ لیا۔ ہلکی سی طائرانہ نظر ڈالی پھر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچنے سے پہلے ہی تاریک شیشوں کی عینک والا وہاں سے ہٹا اور ہال کے آخری سرے پر واقع زینوں کی طرف بڑھ گیا۔
"حکم سر!" کلرک رجسٹر بند کرکے میری طرف متوجہ ہوا۔
"مجھے ڈبل بیڈ کا ایک کمرا چاہیے مل جائے گا؟" میں نے پوچھا۔
"کیوں نہیں۔" کلرک نے سر گھما کر عقب میں لگے کی بورڈ کی طرف دیکھا پھر بولا "آپ کس فلور پر قیام کرنا پسند کریں گے۔"
"کسی بھی فلور پر۔ فرسٹ فلور پر ہو تو کیا بات ہے۔"
"سیکنڈ فلور روم نمبر ٹو تھرٹی ٹو۔" کلرک نے رجسٹر کھول کر کہا "پلیز نام و پتا بتائیں...... شناختی کارڈ دکھائیں۔"
"شناختی کارڈ...... وہ تو میں بریف کیس میں بھول آیا ایک ڈیڑھ گھنٹے میں میرا دوست آجائے گا اسی کی گاڑی میں ہے۔"
"کوئی بات نہیں نام و پتا بتادیں۔ شناختی کارڈ کا نمبر بعد میں لکھوا دیجیے گا۔"
میں نے اپنا فرضی نام بتا کر کراچی کا پتا لکھوا دیا۔ آمد کے خانے میں کلرک نے کراچی لکھا اور ایڈوانس کرایہ جمع کرکے چابی دے دی پھر اس نے بٹن دبا کر ویٹر کو بلا کر کہا "صاحب کو روم نمبر ٹو تھرٹی ٹو میں پہنچا دو۔"
ویٹر نے سر ہلایا اور مجھے ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سیکنڈ فلور پر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا تالا کھولا۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ وہی چشمے والا شخص ایک کمرے سے نکلا اور نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔
اندر پہنچ کر ویٹر نے خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے کہا "سر،

کچھ چاہیے؟"

"تو...... تھوڑی دیر بعد فون پر آرڈر دوں گا۔"

میں نے پرس سے ٹپ کے پیسے نکال کر دیے۔ وہ سلام کر کے چلا گیا۔ اب مجھے نیچے جا کر گیٹ کے باہر کھڑے سفیر کو اشارہ کرنا تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے کمرے تک آ جائے۔ اسی خیال سے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ خود ہی رک گیا۔ مجھے خیال آ گیا تھا کہ سفیر کو واچ ٹرانسمیٹر پر کال کر کے اپنے کمرے کا نمبر بتا دینا چاہیے۔ اب تک وہ بھی باہر کھڑا انتظار کر رہا ہوگا یا پھر کمرا حاصل کر کے آرام کر رہا ہوگا۔ اس خیال سے میں نے باتھ روم کی طرف قدم بڑھا دیے۔ باتھ روم میں جا کر میں نے گھڑی کی چابی کو باہر کھینچا جو ائریل کی طرح لمبا ہو گیا تھا پھر میں نے کال کرنے کی کوشش کی مگر اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے چابی کو پھر سے اندر کیا اور باہر نکل آیا۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

"کون؟" میں نے پوچھا

"سر ایک منٹ کے لیے دروازہ کھولیں۔" باہر سے آواز آئی۔

ویٹر ہوگا' سوچ کر میں نے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔

باہر وہی عینک والا شخص کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "تکلیف کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ آپ کے ساتھی آئے نہیں؟"

"جی نہیں۔"

"بس میں دو منٹ لوں گا۔" کہہ کر وہ زبردستی اندر آ گیا پھر بولا "جناب آپ اپنا شناختی کارڈ دکھائیں گے؟"

"شناختی کارڈ گاڑی میں رہ گیا ہے۔ میرا ساتھی آتا ہی ہوگا میرا نام پتا آپ نے رجسٹر میں دیکھ لیا ہوگا۔"

"وہ پتا غلط ہے آپ نے جو بلاک نمبر لکھا ہے۔ وہ اس علاقے میں ہے ہی نہیں۔ کراچی میں ہر جگہ بلاک نمبر نہیں کہیں سیکٹر تو کہیں صرف نمبر چلتا ہے جس علاقے کا نام لکھا ہے وہاں سیکٹر نمبر ہے۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا پھر بھی خود کو مضبوط قوت ارادی والا ظاہر کرنے کے لیے کہا "نہیں جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مگر آپ ہیں کون؟"

"میرا تعلق محکمہ خفیہ سے ہے۔" اس نے کہا۔

"مگر آپ مجھ پر کس قسم کا شک کر رہے ہیں۔"

"شک نہیں یقین ہے۔ تم شہباز کے ساتھیوں میں سے ہو جلدی بتا دو وہ کہاں ہے؟"

"کس شہباز کی بات کر رہے ہیں، میں کسی شہباز کو نہیں جانتا؟"

"ابھی جان جاؤ گے سیدھے کھڑے رہو۔" کہہ کر اس نے جھٹکے سے ریوالور نکال لیا۔ اب میں بے بس ہو چکا تھا۔

"دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے دوسرا حکم دیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیے تھے مگر نظریں نووارد پر جمی ہوئی تھیں۔ میں کسی اچھے موقع کی تلاش میں تھا۔ نووارد نے بائیں ہاتھ سے ریسیور اٹھا کر ٹیبل پر رکھا اور اسی ہاتھ سے نمبر ملانے لگا۔ نمبر ملا کر اس نے بائیں ہاتھ سے ہی ریسیور اٹھا لیا اور ماؤتھ پیس میں بولا "سر میں امجد بول رہا ہوں، ہوٹل میں ایک مشکوک آدمی نظر آیا ہے۔ اس کے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں ہے۔ جی ہاں مگر وہ اکیلا ہے۔ شاید ساتھی کسی دوسرے ہوٹل میں چلا گیا ہوگا...... نہیں ابھی تک اس نے کچھ نہیں اگلا ہے۔ ٹھیک ہے میں شمیم کا انتظار کر لوں گا۔" پھر اس نے رابطہ منقطع کر کے مجھ سے کہا "دیکھو مسٹر شرافت سے سیدھی طرح بتا دو شہباز کہاں ہے؟"

"میں نے کہا ناں کہ میں کسی شہباز کو نہیں جانتا۔"

"میرا ساتھی آ جائے پھر میں ہیڈ کوارٹر لے جا کر پوچھوں گا۔" اس نے رعونت سے کہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس ہوٹل میں اس طرح غنڈہ گردی ہوتی ہے تو میں یہاں کبھی نہ آتا۔"

"تم کسی بھی ہوٹل میں جاتے میرے آدمی تلاش کر لیتے۔ یہاں ہر ہوٹل میں ہمارے آدمی کھڑے ہیں ایک ایک مسافر کو چیک کر رہے ہیں۔"

"تم میری بات پر یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں ایک سیدھا سادا بزنس مین ہوں۔"

"اپنا شناختی کارڈ دکھا دو تو میں یقین کر لوں گا۔"

"کیا ڈرائیونگ لائسنس سے کام نہیں چلے گا۔"

"ہاں وہی دکھا دو۔"

"میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہے کہو تو دکھا دوں۔"

"خبردار" وہ غرایا "کوٹ میں ہاتھ مت ڈالنا۔"

وہ ریوالور اٹھائے آگے بڑھا پھر اس نے میرے کوٹ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ میں نے ہاتھ دکھا دیا۔

میرے مقابل کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ریوالور کی نال سینے پر لگی رہنے کے باوجود میں رسک لے لوں گا جیسے ہی اس نے میرے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا میں نے گھٹنا چلادیا تھا۔ نپا تلا وار اس کے پیٹ کے نچلے حصے پر پڑا تھا اس نازک حصے پر چوٹ لگتے ہی وہ درد سے کراہتا ہوا بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کے ریوالور پر ہاتھ مارا۔ ریولوار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ میں نے پوری قوت سے اس کے سر پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیخ کر گر پڑا تھا۔ میں نے موقع ضائع نہیں کیا اور ریوالور پر جھپٹا تھا۔ میں ریوالور اٹھا کر پلٹا ہی تھا کہ اس شخص نے سنبھل کر مجھ پر چھلانگ لگادی تھی۔ میرے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا تھا۔ اس شخص نے مجھے دبوچنے کی بھرپور کوشش کی مگر میں نے اس کے جبڑے پر مکا رسید کردیا تھا۔ وہ کراہتا ہوا دو قدم پیچھے ہٹا تو میں نے اچھل کر اس کے پیٹ پر ٹھوکر رسید کردی۔ وہ شخص درد سے ڈکراتا ہوا دونوں ہاتھ سے پیٹ دبائے جھکا ہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ایک اور گھونسا دے مارا۔ وہ سیدھا ہوا اور پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا جا گرا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر مجھ پر چھلانگ لگادی۔

میں نے پھرتی سے دونوں بازو دراز کر کے اسے ہاتھوں پر روکا اور دوسرے ہی لمحے اس کی ناک پر مکا رسید کردیا وہ شخص درد سے بلبلا اٹھا اور پیچھے ہٹتے ہوئے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر پھر چھلانگ لگادی۔ ٹھیک اسی لمحے دروازہ کھلا اور دوڑنے کے انداز میں ایک اسکائی بلیو سوٹ والا شخص اندر آیا۔ اس نے اندر کا منظر دیکھتے ہی فوراً اپنی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔

میں نے اپنے مقابل کو دبوچا اور اسے گھما کر اس کی گردن کے گرد اپنا بازو لپیٹ دیا پھر اس کی پشت اپنے سینے سے لگادی۔

''خبردار اسے چھوڑ دو۔'' اسکائی بلیو سوٹ والا غرایا۔

''میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ''اس کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً ریوالور پھینک دو۔''

ساتھ ہی میں نے اپنے مد مقابل کی گردن پر بازو کا دباؤ بڑھادیا۔ اس کی سانسیں رکنے لگی تھیں یہ دیکھ کر اسکائی سوٹ والے نے پستول پھینک دیا۔

''تم بچ کر نہیں جاسکو گے مسٹر'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ٹھیک اسی لمحے عینک والے نے تڑپ کر اپنی کہنی سے میرے پیٹ پر وار کیا میرے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور مقابل کی گردن پر میری گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس نے تیزی سے اپنی گردن آزاد کراتے ہوئے میرے جبڑے پر مکا رسید کردیا۔ میں کراہتا ہوا پیچھے ہٹا ہی تھا کہ اسکائی سوٹ والے نے مجھ پر چھلانگ لگادی اور ہم دونوں گتھم گتھا ہو کر فرش پر آرہے۔ اسی لمحے باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ مجھ سے پٹنے والے نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا پھر اپنے ریوالور کی طرف لپکا۔ میں نے فرش پر گرتے ہی کروٹ بدل لی تھی اور اسکائی سوٹ والے کو لات ماری نتیجتاً وہ فرش پر لڑھک گیا۔ میں تیزی سے اس پر سوار ہو کر اس کے جبڑے پر مکے رسید کرنے لگا۔ پہلا شخص جو ریوالور اٹھا چکا تھا۔ اس نے ریوالور مجھ پر تان لیا۔

''ہٹ جاؤ ورنہ بھیجا اڑا دوں گا۔''

میں نے دھمکی سنتے ہی اس کی جانب مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ ریوالور والے کے حلق سے سسکاری نکلی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر دور جاگرا۔ میں نے بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔

عبداللہ ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جو پستول تھا اس کی نال کافی لمبی تھی جسے دیکھ کر ہی اندازہ ہورہا تھا کہ نال پر سائلنسر لگا ہوا ہے اسی لیے اس کے پستول نے شور نہیں مچایا تھا۔ اسکائی کلر کے سوٹ والا بھی اب اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور حیرت سے عبداللہ کو دیکھ رہا تھا جس کے پستول کا رخ اس زخمی ہاتھوں والے کی طرف تھا۔

زخمی ہاتھوں والا اپنے زخمی ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے خونخوار نظروں سے عبداللہ کو دیکھ رہا تھا۔

عبداللہ نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً ہی دو گولیاں چلائیں۔ پہلی گولی نے زخمی ہاتھ والے کے پیروں میں کھڑکی کھول دی جس کے بعد وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ کراہتے ہوئے زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔

اس کی چیخ سن کر اسکائی بلیو کلر کے سوٹ والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا کہ اس کی ٹانگ سے بھی خون کا فوارہ ابل پڑا اور وہ بھی زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔

''بروقت آئے ہو!'' میں نے کہا۔

''یہ تعریفیں کرنے کا موقع نہیں جتنی جلد ممکن ہو یہاں

سے باہر نکلیں۔ جس تیزی سے آپ کو گھیرا گیا ہے یہ بتا رہا ہے کہ مرشد نے گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔'' کہہ کر وہ مڑ گیا۔

میں نے جلدی جلدی ان دونوں کی تلاشی لی۔ میں ان کا کارڈ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس ایجنسی کے لوگ ہیں۔

''پلیز جلدی کریں۔'' عبداللہ بولا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر نکلے اور دروازے کو کھینچ کر بند کرتے گئے۔ دروازہ خود کار نظام کے تحت لاک ہو چکا تھا۔ اب ہم سر جھکائے ٹہلنے کے انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے تھے۔

باہر لان میں سفیر ٹہلتا ہوا نظر آ گیا۔ ہم اسے ساتھ لے کر سڑک پر آ گئے۔

''ہم تینوں کا ایک ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''مگر تم یہاں کیا کرنے آ گئے۔ تمہیں تو وسیم کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔''

''وسیم وہ رہا۔'' کہہ کر اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہم اسی طرف بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے میں نے سفیر سے پوچھا ''تم کاؤنٹر کی طرف کیوں نہیں گئے۔ باہر ہی کھڑے رہے؟''

''آپ کا کافی دیر تک مجھ سے رابطہ نہ کرنا مجھے شک میں مبتلا کر چکا تھا کہ میں نے عبداللہ کو دیکھا وہ جس عجلت میں اندر داخل ہوا تھا اسے دیکھ کر میں نے سمجھ لیا تھا کہ آپ خطرے میں ہیں اور اس نے ٹرانسمیٹر پر آپ سے رابطہ کیا ہے۔ یہ مدد کے لیے اندر گیا ہے۔ کچھ دیر اور تم لگا دیتے تو میں اندر جا کر ضرور کچھ کرتا عبداللہ تم بتاؤ اندر کیا ہوا تھا؟''

عبداللہ نے قدم بڑھا کر کہا۔ ''میں کچھ خاص نہیں جانتا بس اتنا علم ہے کہ انہوں نے مجھے اندر بلایا میں اندر پہنچا تو یہ ایک دشمن سے بھڑے ہوئے تھے میں نے اپنا رول ادا کیا اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارا اور انہیں باہر لے آیا۔''

''مگر تم دوسرے ہوٹل نہ جا کر یہاں کیوں آ گئے؟'' میں نے پوچھا۔

عبداللہ نے بتایا کہ میں نے جس ٹیکسی کو پکڑا تھا وہ کچھ دور جا کر ہی بند ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا مگر جب زیادہ دیر ہونے لگی تو میں نے اکتا کر دوسری ٹیکسی لے لی تھی۔ ابھی میں اس ٹیکسی میں بیٹھا ہی تھا کہ واچ ٹرانسمیٹر پر دوبارہ کال آ گئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک بار جب میں ٹیکسی والے کو کام کرتے دیکھ رہا تھا تو سگنل ملا تھا لیکن فوراً ہی سگنل بند ہو گیا تھا۔ اس بار سگنل ملا تو میں نے ڈرائیور کی نظریں بچا کر ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔

ٹرانسمیٹر آن ہوتے ہی میں گویا اچھل پڑا۔ مجھے کسی سے باتیں کرتے ہوئے آپ کی آواز سنائی دی۔ سوال جواب سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ خطرے میں گھر چکے ہیں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا ''ہری اپ جلدی چلو مجھے فوراً ہوٹل ایکسی لینسی لے چلو۔''

''اگر آپ پہلے بتا دیتے تو میں دوسری طرف سے آپ کو وہیں پہنچا دیتا۔'' ڈرائیور نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

اگلے سگنل سے ٹیکسی سیدھے ہاتھ پر مڑ گئی۔ دس منٹ بعد ٹیکسی ہوٹل کے گیٹ پر رکی اور میں جھٹکے سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میں نے ٹیکسی والے کے ہاتھ پر سو کا نوٹ رکھا اور بقایا لیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ ہال میں پہنچا اور نارمل انداز میں چلتا ہوا ہال کے دوسری جانب واقع زینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسی لمحے میرے عقب سے اسکائی کلر کے سوٹ میں ایک آدمی آیا اور برابر سے گزرتا ہوا بہت تیزی کے ساتھ زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کی تیزی پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ جب میں زینوں کے پاس پہنچا تو وہ اسکائی بلیو سوٹ والا زینے پر چڑھ چکا تھا۔

میں نے بھی اپنی رفتار بڑھا دی۔ میں فرسٹ فلور پر پہنچا تو مجھے وہ شخص نظر نہ آیا میں مزید اوپر چڑھتا چلا گیا کیونکہ اوپر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔

میں نے رسیونگ واچ پر کمرے کا نمبر سن لیا تھا فلور بھی معلوم ہو چکا تھا اسی لیے میں سیکنڈ فلور پر آیا تھا۔

جب میں سیکنڈ فلور پر پہنچا تو وہ گلیارا خالی پڑا تھا۔ ابھی میں اس گلیارے میں بڑھ ہی رہا تھا کہ مجھے ہلکی دبی دبی سی چیخ سنائی دی۔ اور میں نے اس دروازے کو تھوڑا سا کھول کر اندر دیکھا۔ سامنے ہی آپ نظر آئے اور میں نے کھیل کو ختم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ یہ تھی میری پوری سرگزشت۔ اب آپ بتائیں کہ آپ ان کے چنگل میں کیسے پھنس گئے؟

''وہ مجھ سے خفیہ ایجنسی کا بندہ بن کر ملا تھا مگر میں نے جب تلاشی لی تو اس کے پاس سے کوئی کارڈ وغیرہ نہیں ملا۔ مزیدار بات یہ ہے کہ اس کی گردن میں ایک تعویذ تھا میں نے اسے اس لیے کھول لیا تھا کہ اگر وہ کسی ایجنسی کا ہوگا تو

اس میں کوئی خاص چیز ہو سکتی ہے مگر وہ تعویذ سنسکرت میں تھا جس کے معنی ہیں کہ وہ ہندو تھا اور اپنے مذہب پر اندھا اعتماد کرنے والا۔''

''یعنی دشمن نے ہر طرف جال پھیلا رکھا ہے۔ بار بار ہم سے ہندو ہی ٹکرا رہے ہیں۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اس عورت تک جلد سے جلد پہنچ کر اپنا ٹاسک پورا کیا جائے۔ وہ کس لالچ میں مرشد کو خرید رہی ہے۔ مرشد سے وہ کیا کام لینا چاہ رہی ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے۔''

''مگر وہ عورت ملے گی کہاں؟'' عبداللہ نے تجسس آمیز سوال کیا۔

''بہت آسان سوال ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا'' ہم نے ایک مہرے کو ابھی تک چھیڑا نہیں ہے اسی سے معلوم ہوگا۔''

''کون سا مہرہ؟'' عبداللہ نے سوال کیا۔

''سفارت خانے کا افسر وسیم کے بندے کے جس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ثمینہ نامی لڑکی سے ملنے جاتا رہا ہے۔ جس کی ریکی سفیر کر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔'' وہ ہر روز صبح صبح جاگنگ کرنے پارک میں آتا ہے۔ وہیں اسے گھیر لیں گے۔''

''صبح تو ہو رہی ہے اور یہی وقت ہوتا ہے جب لوگ جاگنگ کرنے نکلتے ہیں۔''

''تو پھر دیر کیسی، نکل چلتے ہیں۔''

''چلو۔'' کہہ کر میں نے ایک اونگھتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم لوگ سفارت خانے کے سامنے والے پارک میں پہنچ گئے۔

اتفاق کی بات ہے جس وقت ہم تینوں اس اوپن پارک میں داخل ہوئے وہ افسر ایک بینچ پر بیٹھا نظر آ گیا۔ سفیر نے دھیمی آواز میں کہا'' وہ بیٹھا ہے۔''

میں نے اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی پھر بولا'' وقت زیادہ نہ ہو جائے اس لیے جلد اپنا کام دکھانا ہے۔ تم ایسا کرو کسی گاڑی کا انتظام کرو ہم اسے کسی ویرانے میں لے چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اتنی دیر میں افسر اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے پھر سے دوڑ لگانی شروع کر دی تھی۔ میں اور عبداللہ بھی آہستہ آہستہ جاگنگ کے انداز میں دوڑ رہے تھے۔ تبھی ہمیں سفیر نظر آیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کامیاب لوٹا ہے۔ اس لیے میں نے سرگوشی میں عبداللہ سے کہا۔'' قتل موذی قبل ایذا۔''

عبداللہ نے اشارہ سمجھ لیا اور کہا۔'' اب میرا کمال دیکھیں آپ اپنی رفتار سست رکھنا۔'' پھر اس نے کمال کی اداکاری دکھائی۔ اور جاگنگ کرتے کرتے اس افسر پر گرا تو وہ '' اوہ سوری'' کہہ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ عبداللہ اپنا سینہ مسلتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ افسر نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتنی دیر میں ان تک پہنچ گیا تھا۔ میں بھی رک کر دیکھنے لگا۔

''بینک مین ذرا سا سہارا دو لگتا ہے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' افسر نے کہا۔

''ادھر میری گاڑی کھڑی ہے۔ آپ آئیں میں انہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں میرے پاس وقت کم ہے، مجھے جانا ضروری ہے تم ہی پہنچادو۔'' وہ بولا۔

''کوئی بات نہیں گاڑی تک پہنچانے کے لیے تو آپ سہارا دے دیں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' کہہ کر اس نے سفیر کے بائیں بازو کو اپنے سر سے گزار کر کندھے پر رکھ لیا۔ دوسری طرف میں نے وزن سنبھالا اور ہم دونوں اسے اٹھائے ہوئے پارک کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

سفیر نے دور سے دیکھا۔ افسر کو ساتھ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی وہ سمجھ گیا کہ میں نے بڑی خوبصورتی سے اسے گھیرا ہے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس گاڑی کی طرف بڑھنے لگا جس کی پچھلی سیٹ پر اس نے اس کار کے مالک کو بے ہوش کر کے اس طرح بٹھا دیا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔ کار کے پاس پہنچ کر وہ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ افسر اور میں عبداللہ کو سہارا دے کر باہر لائے۔

میں نے سفیر کو دیکھ لیا تھا۔ ہم اسی طرف بڑھنے لگے۔ کار کے نزدیک پہنچنے تک میں نے بائیں ہاتھ سے عبداللہ کو تھام رکھا تھا۔ داہنے ہاتھ سے میں نے دروازہ کھولا۔ افسر اسے لٹانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ سفیر نے آگے بڑھ کر اس کی کمر پر ریوالور کی نال رکھ دی اور غراتی آواز میں بولا'' چپ چاپ اندر بیٹھ جاؤ۔''

افسر نے جھٹکے سے کھڑا ہونا چاہا تھا مگر سفیر نے اتنی مضبوطی سے اس کے گلے کو پکڑا تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکا۔ عبداللہ نے بھی دیر نہیں کی اور دوسری طرف سے اس کی کمر میں اپنا پستول لگا دیا تھا۔

"پیارے دوست خاموشی سے اندر بیٹھ جاؤ ورنہ انجام موت ہے۔" سفیر نے دھیمی آواز میں کہا۔

وہ مجبور ہو چکا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اندر بیٹھ گیا۔ سفیر نے بھی سائلنسر لگا ریوالور نکال لیا تھا۔ افسر ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ پچھلی سیٹ پر ہم تینوں گویا ٹھوکس دیے گئے تھے کیونکہ پہلے سے بھی ایک شخص وہاں بیٹھا ہوا تھا یعنی کار کا مالک۔

ڈرائیونگ سیٹ پر عبداللہ تھا۔ اسے ایک ایک راستہ معلوم تھا اس لیے وہ بغیر کچھ پوچھے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہم لوگ شہر سے باہر آئے۔ اب ویران علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ پتھریلے راستے پر اچھلتی کودتی کار آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔ پھر نیچے اتر کر بولا "مسٹر سید ھے سادے جو کچھ پوچھا جائے بتا دو ورنہ تمہاری لاش کو بھی سفارت خانے والے ترس جائیں گے۔"

"کک، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

"صرف اتنا بتا دو کہ اس مشن کے لیے کتنے افراد یہاں آئے ہیں اور مشن ہے کیا؟"

اس نے چونک کر عبداللہ کو دیکھا پھر لرزتی آواز میں پوچھا "تم...... تم لوگ کون ہو؟"

"ہم خدائی فوجدار ہیں جو پوچھا جا رہا ہے وہ بتاؤ۔"

"میں...... میں کسی مشن سے واقف نہیں ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو ورنہ انجام اتنا برا ہوگا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم دشمن کو مارنے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ مرنے والا کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ ہم اذیت دے دے کر جوابات وصول کرتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس طرح جواب دینا پسند کرو گے۔ ابھی نہایت آسانی سے یا ایذا سہہ کر" عبداللہ نے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر کہا اس کے لہجے سے سفاکی مترشح تھی۔

"میں نے کہا نا میں کسی مشن وشن سے واقف نہیں ہوں۔"

"اچھا تمہاری مرضی مت بتلاؤ...... بھائی سفیر ذرا انہیں اپنی سوئی کا کمال تو دکھاؤ۔"

عبداللہ کا جملہ ختم ہونے سے پہلے سفیر نے انجکشن جیب سے نکالا اور نیڈل کو پھرتی سے اس کے بازو پر مار کر نکال لیا۔ وہ "سی" کر کے رہ گیا۔

"یہ نمونہ ہے...... یہ سوئی چبھونے کا ماسٹر ہے۔ ایک سیکنڈ میں تین بار سوئی چبھوتا ہے۔ یہ پیروں سے شروع کرتا ہے اور پیشانی تک لے جاتا ہے۔ اس راہ میں آنکھیں بھی آتی ہیں۔" عبداللہ نے نہایت سفاک لہجے میں کہا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو، تم مجھے مارنا چاہتے ہو مار دو مگر یاد رکھنا میں سفارتی اہلکار ہوں۔ میری حکومت تمہارے وزیراعظم سے جواب طلب کرے گی۔"

"ہم نے پہلے ہی کہا ناں ہم جان سے نہیں مارتے سکا سسکا کر زندہ رکھتے ہیں انسان خود اپنی موت مانگنے لگتا ہے۔" عبداللہ نے جواب دیا پھر سفیر کی طرف مڑ کر بولا۔ "ایسا کرو نیچے سے شروع کرو، آنکھ پر آ کر رک جانا۔ پھر سے شروع ہو جاؤ۔"

سفیر نے نیڈل اٹھایا اور اس کا ہاتھ بلند ہوا اور سلائی مشین کی طرح چلنے لگا ایک منٹ میں تیس سے پینتیس بار اس نے سوئی چبھوئی کہ افسر چیخا۔

"میں...... میں بتاتا ہوں۔"

سفیر کا ہاتھ رک گیا۔

"کل چار افراد آئے تھے تین مرد اور ایک عورت۔ سوائے عورت کے سب مارے گئے۔"

"اس عورت کا نام کیا ہے؟"

"گیتا بھاردواج لیکن وہ کسی مسلمان خاتون کے نام پر زندگی گزار رہی ہے ثمینہ کے نام سے مشہور ہے۔"

"کہاں ملے گی؟"

"وہ اسلام آباد میں ہوگی۔"

"اسلام آباد میں کس طرف؟" اس نے سوال کیا

"ٹرائینگل پارک کے پاس ایک دو منزلہ بنگلا ہے۔ وہ بنگلا ایک بہت بڑے تاجر کا ہے مگر خود اسے پتا نہیں ہے کہ اس بنگلے میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے مرشد نے کرائے پر لے کر ہمیں دے رکھا ہے اور ہم اسے بطور ہیڈ کوارٹر استعمال کرتے ہیں اور اسے ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ایک خفیہ تہہ خانہ بھی ہے اور اس تہہ خانے کو ہم بطور اسپیشل گیسٹ روم استعمال کرتے ہیں ہمارے مرکزی عہدیدار جب بھی آتے ہیں اسی میں ٹھہرتے ہیں گیتا بھی اس میں ٹھہری ہوئی ہے۔"

"لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ وہ کتنے دنوں سے وہاں ٹھہری ہوئی ہے؟"

"تقریباً ایک سال ہو چکا ہے مگر زیادہ تر وہ دورے پر رہتی ہے کیونکہ پورا نیٹ ورک اس کی ذمہ داری ہے وہی اس مشن کی انچارج ہے۔"

"معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اب

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

ایسا کرو کہ تم سو جاؤ موت کی نیند میں کھو جاؤ۔'' کہہ کر عبداللہ نے اس کی کنپٹی پر نال رکھ کر دبا دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز ہوئی اور سائلنسر لگے ریوالور کی گولی اس کے دماغ میں اترتی چلی گئی۔ خون کا فوارہ سا اچھل کر نکلا اور خود عبداللہ کے چہرے کو بھگو گیا۔

عبداللہ نے اس کی لاش کو کھینچ کر کار سے باہر نکالا اور پہاڑیوں کے درمیان پھینک آیا۔ کیونکہ اگر ہم اسے زندہ چھوڑ دیتے تو اس کی حکومت واویلا مچاتی۔ اب اگر لاش ملی بھی تو ہماری حکومت خود پوچھے گی کہ وہ اس ویرانے میں کیا کرنے گیا تھا۔

''بھائی ان صاحب کو بھی یہیں کہیں آرام کرنے کی اجازت دے دو۔'' میں نے گاڑی کے مالک کی طرف اشارہ کیا جو بے ہوشی کے عالم میں گاڑی میں پڑا ہوا تھا۔

''کیا ہمیشہ کے لیے؟'' عبداللہ نے پستول کو پھر باہر نکال لیا۔

''نہیں صرف کچھ دیر کے لیے۔''

عبداللہ نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اسے بھی باہر نکال لیا اور وہیں ایک بڑے سے پتھر پر لٹا کر اس کی کنپٹی پر ریوالور کے دستے سے ایک اور وار کر دیا تا کہ وہ مزید کچھ دیر بے ہوش رہ سکے پھر ہم شہر کی طرف لوٹ چلے۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد عبداللہ نے پوچھا ''اب ہمیں کہاں جانا ہے؟''

''ایسا کرتے ہیں سیدھے اسی بنگلے پر چلتے ہیں۔'' میں نے کہا

''لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ وہاں سیکیورٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ کنٹونمنٹ ایریا جیسے انتظامات ہیں کل پچاس ساٹھ بنگلے ہوں گے۔ اس کے گرد چار دیواری ہے۔ گیٹ پر چیک پوسٹ ہے جس میں مسلح پہریدار ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اندر جانے والوں کو چیک پوسٹ پر رک اپنی شناخت کرانی ہوتی ہے۔ گارڈ بتائے گئے بنگلے پر فون سے کنفرم کرتا ہے کنفرم ہو جانے کے بعد وہ وزیٹر کو پاس اشو کرتا ہے جب تک تصدیق نہ ہو اندر جانے نہیں دیا جاتا رات کے وقت چار دیواری کے ساتھ ساتھ جیپ پر راؤنڈ لگایا جاتا ہے تا کہ کوئی چھلانگ لگا کر اندر نہ گھسے اور دیوار پھاندنے کی کوشش نہ کر سکے۔''

''یاد رکھو کتنی بھی ٹائٹ سیکیورٹی کیوں نہ ہو اس میں کہیں نہ کہیں کوئی شگاف ضرور ہوتا ہے۔''

''اچھی بات ہے میں شگاف تلاش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر عبداللہ نے کار کا رخ منزل کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا۔ تقریباً تیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس نے کار روک دی اور کار سے نیچے اتر گیا پھر آگے بڑھنے لگا۔ بطور دم چھلا میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ گیٹ پر پہنچا پھر رک کر خود ہی بولا۔ ''کار کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا اتنی مشکل سے اسے گیراج پہنچا کر آ رہا ہوں۔'' وہ اس طرح سے بول رہا تھا جیسے گارڈ سے اس کی بڑی اچھی دوستی ہے۔

''ارے تم چپ کیوں ہو، صوفی صاحب دکھائی نہیں دے رہے۔ کہیں گئے ہیں کیا؟'' اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ واچ مینوں میں ایسے بہت سے ہوتے ہیں جن کی داڑھیاں ہوتی ہیں ان میں بھی ایک نہ ایک شخص کی داڑھی ضرور ہوگی۔

''آج ان کا آف ہے۔'' گارڈ نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا! ہاں ایک اچھی فلم لایا ہوں۔ دیکھنا ہو تو میرے بنگلے پر آ جانا۔ اچھا چلتا ہوں۔'' کہہ کر وہ مجھے کھینچتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ واچ مین اب بھی ہمیں دیکھ رہا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں تیرتے استعجاب کو میں نے بھی محسوس کر لیا تھا وہ شاید اس مخمصے میں تھا کہ یہ صاحب کس بنگلے میں رہتے ہیں۔ اگر باہر کا کوئی ہوتا تو پاس مانگتا۔

عبداللہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک بنگلا نظر آیا۔ اس بنگلے کا لان خشک پتوں سے اٹا ہوا تھا۔ یقیناً یہ بنگلا خالی ہے۔ میں نے سوچا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ سوچتا ہوا کہ اگر کہیں اور شیلٹر نہ ملا تو یہ بنگلا چھپنے کے لیے بہت بہتر رہے گا۔

کچھ اور آگے بڑھنے کے بعد مجھے ٹرائینگل پارک نظر آ گیا وہ تین کونے کا پارک تھا شاید اسی لیے ٹرائینگل پارک کہتے تھے۔ اس پارک کے ارد گرد کے بنگلوں کا میں نے جائزہ لیا۔ سامنے ہی وہ دو منزلہ بنگلا نظر آ گیا۔ اس بنگلے کی جانب بڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس میں کیسے داخل ہوا جا سکتا ہے کیونکہ باہر بیٹھا چوکیدار نظر آ رہا تھا۔ تبھی میری نظر اس کے برابر والے بنگلے پر پڑی اس بنگلے کی حالت زار اچھی نہ تھی۔ عبداللہ اسی بنگلے کی طرف بڑھتا چلا گیا پھر دروازے پر پہنچ کر اس نے بیل بجائی اندر کہیں دور گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ پرانے انداز کی ہے کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑی بی نظر آئیں۔ میں نے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پڑھ لی تھی جس پر میجر اکرام اللہ بنگش لکھا تھا اسی مناسبت سے عبداللہ نے بڑی بی کو سلام کر کے کہا ''کرنل

فرخ کا بیٹا ہوں کراچی والے فرخ۔ انہوں نے مجھے میجر اکرام سے ملنے کو کہا تھا۔''

''مگر بیٹا میجر اکرام کا تو چھ ماہ پہلے انتقال ہوگیا میں ان کی بیوہ ہوں۔ آؤ اندر آجاؤ۔''

ہم اندر آگئے۔ ڈرائنگ روم کے صوفے بھی انتہائی پرانے ڈیزائن کے تھے ایسے صوفے اب شاید ہی نظر آتے ہوں ہم اس جہازی سائز کے صوفے پر بیٹھ گئے۔ بڑی بی بھی بیٹھ چکی تھیں۔ ہم بھی خاموش تھے تبھی بڑی بی بولیں

''تمہارا کیا خیال ہے چائے پی جائے۔''

''اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو..... بلکہ رہنے دیں۔ میں ہوٹل سے نکلتے وقت پی کر نکلا تھا۔''

''لیکن بیٹا کرنل فرخ کس رجمنٹ کے تھے مجھے ان کے دوستوں میں ایسا ایک نام بھی نہیں معلوم۔''

عبداللہ اندر ہی اندر گھبرا اٹھا جس کا عکس اس کے چہرے سے جھلک اٹھا تھا کیونکہ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خود بنگش کس رجمنٹ کے تھے۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا ''میرے ابو جب لاہور چھاؤنی میں تھے تو......''

''سنو بیٹے۔'' بڑی بی جملہ کاٹ کر بولیں۔ ''ٹھہرو میں چائے بنالیتی ہوں۔ دراصل نوکرانی بڑی کام چور تھی۔ میں نے اسے نکال باہر کیا ہے۔ نئی ملنے تک مجھے خود ہی اپنے ہاتھوں سے کام کرنا ہے۔'' کہہ کر وہ صوفے کے ہینڈل کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئیں۔

''رہنے دیں آنٹی دراصل میرے انکل بھی میرے ساتھ آئے ہیں کچھ دیر بعد وہ مجھے لینے آجائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں میں دوبارہ بنالوں گی۔'' کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔ وہ ادھر گئیں اور عبداللہ اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اس نے واش بیسن کا نل کھول دیا پھر اس نے واچ ٹرانسمیٹر پر رابطہ کیا۔ دوسری جانب سے فوراً کال ریسیو کرلی گئی ''ہیلو میں برابر والے بنگلے میں ہوں۔ میجر بنگش کے بنگلے میں۔ میں نے بڑی بی کو بتادیا ہے کہ میرے چچا احمد طاہر آرہے ہیں۔''

''جی اچھا ہم آرہے ہیں.....'' کہہ کر اس نے ٹرانسمیٹر بند کردیا۔

''باتھ روم سے نکل کر اس نے صوفے پر خود کو گرالیا تبھی بڑی بی چائے کا کپ لیے ہوئے داخل ہوئیں۔

''لو بیٹا چائے پیو۔''

چائے کا میں نے پہلا سپ لیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ بڑی بی فون کی طرف بڑھیں تو عبداللہ نے کہا ''شاید میرے انکل ہوں۔'' پھر اس نے ریسیور اٹھالیا دوسری جانب سیکیورٹی گارڈ تھا۔ اس نے کہا ''آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

''ہاں ہاں احمد طاہر نام کے ایک صاحب آنے والے ہیں۔'' عبداللہ بولا۔

''لیکن جناب ان کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں میں ضمانت لے رہا ہوں۔''

بڑی بی بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھیں جلدی سے ریسیور لے کر ماؤتھ پیس میں بولیں ''ہاں احمد طاہر کو بھیج دو۔''

کچھ دیر بعد وسیم اور سفیر اندر آگئے۔ ان دونوں کو بھی بڑی بی نے چائے لا کر دی پھر بولیں۔ ''آپ لوگ کھانا کھا کر جانا، میں بنارہی ہوں۔''

''جب آپ ضد کررہی ہیں تو یہی سہی۔''

بڑی بی ہمیں بٹھا کر کچن کی طرف جارہی تھیں کہ عبداللہ نے کہا ''آنٹی اگر آپ اجازت دیں تو ہم گھوم پھر کر خود ہی عمارت کو دیکھ لیں۔''

''کیوں عمارت میں ایسی کیا خوبی نظر آگئی؟''

''ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بوریت ہوگی'' یہی سوچ کر میں نے کہا۔''

''ٹھیک ہے جاؤ۔''

اجازت ملتے ہی ہم تینوں چھت پر پہنچے اور ٹہلتے ہوئے کن انکھیوں سے برابر والی بلڈنگ کا جائزہ لینے لگے بلڈنگ کی دیوار خاصی نیچی تھی اسے با آسانی پار کیا جاسکتا تھا۔

''یہاں سے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''ہاں یہی مناسب ہے کچھ اور اندھیرا پھیلنے دو۔'' کہہ کر ہم واپسی کے لیے مڑ گئے۔

ہم لوگ نیچے آئے تو بڑی بی کچن کے بجائے بیڈ پر لیٹی تھیں۔

''کیا ہوا آنٹی؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''سر چکرانے لگا تھا۔ بھئی بڑھاپے سے زیادہ بڑی اور بیماری کون سی ہوگی؟'' بڑی بی نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''میرے پاس دوا ہے کہیں تو میں دے دوں؟'' سفیر نے کہا ابھی آپ توانائی محسوس کریں گی۔ میں خود بھی استعمال کرتا ہوں۔'' کہہ کر سفیر نے جیب سے پرس نکالا اور

پرس میں رکھی دو گولیاں بڑھا دیں۔
بڑی بی نے گولیاں لے لیں۔
''اب آپ کچھ دیر کے لیے لیٹ جائیں۔''
عبداللہ نے کہا اور باہر نکل آیا دوسرے کمرے میں پہنچ کر بولا ''بڑی بی کو تو میں نیند کی گولیاں دے آیا ہوں۔ ان کی طرف سے تو اب کوئی خطرہ نہیں ہے آؤ باہر چلتے ہیں۔''

ہم سب باہر لان میں آئے۔ شام رات میں بدل چکی تھی۔ اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ لان میں ایک ٹمٹماتا سا بلب جل رہا تھا۔ ہم نے برابر والی عمارت کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی سناٹے کا راج تھا۔ عبداللہ نے لان میں پڑی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی لا کر دیوار کے سہارے کھڑی کی پھر اس پر چڑھ کر اس نے دیوار کی منڈیر پکڑ لی اور دونوں ہاتھوں پر وزن ڈال کر اٹھتا چلا گیا اور پھرتی سے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گیا اس کے پیچھے سفیر میں اور وسیم بھی اندر کود گئے۔

ہم چاروں ایک کے بعد ایک کودے تھے۔ جہاں پیر زمین سے مس ہوئے تھے بس وہیں کے ہو رہے۔ سینوں کو زمین سے چپکائے سینے کے بل لیٹے رہے اور گھڑی کی سوئی کھسکتی رہی پھر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ گیٹ پر بیٹھا چوکیدار اپنی جگہ اونگھ رہا ہے یا اتنا غافل ہو چکا ہے یوں بھی بنگلوں کے گرد جیسا سخت انتظام تھا جتنی کڑی سیکیورٹی تھی ایسے میں تو پرندے کو بھی پر مارتے خوف آتا ہوگا۔
اب ہم تینوں نے سانپ کی نقل شروع کر دی سینے کے بل زمین پر رینگنے لگے۔ رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پھولوں کی کیاریوں کے درمیان سے ہو کر اس مقام پر پہنچے جہاں سے برآمدہ شروع ہو جاتا تھا۔ برآمدہ کچھ اونچا تھا سب سے پہلے عبداللہ اچھل کر اوپر چڑھا پھر ہم تینوں۔
ہم برآمدے کے پکے فرش پر بھی رینگنے لگے۔ رینگتے ہوئے دروازے پر پہنچے پھر اسے کھول کر اندر داخل ہوئے۔
وہ کمرا ہال نما تھا۔ اس میں صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے اس کمرے کو پار کیا اور ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔ اس کمرے میں ایک بیڈ بچھا تھا اس پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ لیٹی ہوئی ہستی پر نظر پڑتے ہی ہم تینوں بری طرح چونک گئے۔ چونکنے کی بات ہی تھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سے یوں دشمنوں کے کچھار میں ملاقات ہوگی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ہمیں اس دن بس میں ملی تھی اور اس کے ساتھی کے پاس سے ڈرگ برآمد ہوا تھا اس نے بھی ہم تینوں کو دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر حیرت ابھر آئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے حیرت بھری آواز میں کہا تھا ''تم...... تم لوگ یہاں تک کیسے پہنچے؟''
''اپنے پیروں سے چل کر'' وسیم نے کہا۔
''آ تو گئے ہو مگر اب زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔'' اس نے ہم تینوں کو مخاطب کر کے کہا۔
''اب میں سمجھا تم ہی ثمینہ ہو۔'' سفیر بولا۔
''جو بھی سمجھ لو۔'' وہ مسکرا کر بولی ساتھ ہی ساتھ اس نے تکیے کے نیچے سے چھوٹا سا ریوالور نکال لیا۔ اب تک وہ صرف انگریزی میں باتیں کر رہی تھی اور کسی اہل زبان کی طرح انگریزی بول رہی تھی۔
''اس کھلونے کو نیچے رکھ دو۔'' میں نے سمجھانا چاہا۔
''تا کہ تم لوگ مجھے زیر کر لو۔''
''زیر تو تم ہو چکی ہو۔'' عبداللہ نے کہا ''تمہارا چوکیدار مارا جا چکا ہے اور پوری عمارت ہمارے آدمیوں کے نرغے میں ہے۔''
''بالکل غلط اس عمارت کے تمام دروازے خودکار ہیں ہر دروازے پر کیمرا نصب ہے تم لوگوں کی پوری فلم بن چکی ہے۔''
''اچھی بات ہے پورے پاکستان میں نمائش کے لیے پیش کر دینا۔'' عبداللہ نے کہا اس نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسے باتوں میں لگا کر اس نے چھلانگ لگائی تھی چھلانگ اس طرح کی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکی۔ وہ اس کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہوا دوسری جانب کود گیا تھا۔
پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا بے عقلی ہوتی۔ وسیم نے موقع ضائع نہ کیا اور آگے بڑھ کر اس کے بوائے کٹ بالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ بیڈ پر کافی آگے تک کھسک آئی۔ وسیم نے اس کی قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا وہ لمحے بھر میں سنبھل گئی تھی۔ اس نے خود کو گیند کی طرح اچھالا تھا اور حیرت انگیز کمال کے ساتھ وہ بیڈ سے نیچے اتر گئی تھی پھر اس نے جسم کو موڑ کر ایک زبردست قسم کی اچھال بھری تھی۔ اس جمپ کے ساتھ وہ وسیم کے پیچھے آ گئی تھی۔ پیچھے آتے ہی اس نے وسیم کے گلے میں ہاتھ ڈال کر آرم لاک لگا دیا تھا یہ سب کچھ لمحے بھر میں ہو گیا تھا پھر وہ غراتی ہوئی آواز میں بولی ''خبردار اب اگر کسی نے مجھ پر حملہ کیا تو میں اس کی گردن توڑ دوں گی۔''
اس کا لاک اتنا سخت تھا کہ وسیم کی آنکھیں حلقوں

سے ابھرنے لگی تھیں سانس رکنے لگی تھی اور چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وسیم نے گلا چھڑانے کے لیے اپنے انداز سے کوشش کی۔ اپنا ہاتھ اوپر لے جا کر اس کے ہاتھ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ بہک گیا۔

کچھ بھی ہو وہ عورت تھی نادانستگی میں وسیم نے ہاتھ چلایا تھا کہ اس کا ہاتھ اس کے جسم پر دباؤ کا باعث بن گیا نتیجتاً روبی کا ذہن منتشر ہوگیا۔ بس یہی ایک لمحہ وسیم کے کام آگیا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے بھی وہی حرکت کی۔ ساتھ ہی ساتھ جسم کو جھٹکا دیا تو وہ جھٹک کر دور جا گری۔ وہ دوبارہ اس پر جھپٹی مگر راستے ہی میں، میں نے اسے روک لیا۔ روکنے کے لیے میں نے صرف اپنا پیر بڑھایا تھا کہ وہ پیروں سے الجھ کر گر گئی۔ اس کے گرتے ہی عبداللہ نے اسے فٹ بال بنادیا۔ ایک کے بعد ایک کئی کک جمادیے۔ ایسی زبردست کک کہ سیمنٹ کی دیوار پر پڑتی تو وہ چیخ جاتی۔ وہ تو پھر ایک عورت تھی اپنی چیخوں کو نہ روک سکی۔ سر پھٹ گیا تھا اور اس سے خون رسنے لگا تھا۔

عبداللہ نے اسی پر بس نہ کیا کسی ریسلر کی طرح پھرتی سے اسے اٹھایا اور ہوا میں اچھال کر تختا کھڑا کر کے خود بیٹھ گیا۔ وہ سیدھی اس کے تختے پر گری' اس کی تیز چیخ گونجی اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ عبداللہ نے وقت ضائع کیے بغیر پیڈسٹل فین کے تار کو جھٹکا مار کر توڑا اسی الیکٹرک وائر سے اسے باندھ دیا پھر اسے سفیر کی مدد سے پنکھے سے لٹکا دیا۔ یہ سب کچھ بمشکل دس منٹ میں اس نے کر دکھایا تھا۔

ہم اب اسے ہوش میں لانے کی ترکیب کر رہے تھے تاکہ ضروری معلومات حاصل کی جاسکیں۔

''میں ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں ویسے مجھے توی اُمید ہے کہ یہ بنگلا پوری طرح خالی ہے پھر بھی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' کہہ کر عبداللہ باہر نکل گیا۔

اس کے باہر جاتے ہی میں نے جگ میں بھرے پانی کو اس کے چہرے پر انڈیل دیا پانی کے پڑتے ہی وہ ہوش میں آگئی اور آنکھیں جھپکا کر بولی ''یہ..... تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''ہم نے برا کب کیا ہے۔ ہم جو کرتے ہیں اچھا ہی کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں بی بی' اب ذرا ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنا شروع ہو جاؤ۔ تم کون ہو کیا کرنا چاہتی تھیں' مرشد سے کیا کام لے رہی تھیں۔''

''اگر مجھ سے کچھ اگلوا سکتے ہو تو اگلوا لو۔'' اس نے چیلنج کیا۔

''دیکھو بی بی میں عورتوں کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں۔ لیکن میرا یہ دوست.....'' میرا اشارہ وسیم کی طرف تھا ''عورتوں سے نمٹنا خوب جانتا ہے۔ تم نے اسے جتنی سزا دی ہے یہ اس کا بدلہ سود سمیت لے گا۔''

''میں اذیت سہنے میں ثانی نہیں رکھتی۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر لو مگر میری زبان نہیں کھلوا پاؤ گے۔'' اس نے ہمیں کھلا چیلنج دے دیا تھا۔

عبداللہ کو جو ابھی ابھی لوٹا تھا اسے میں نے اشارہ کیا۔ وہ الیکٹرک وائر کو بل دے کر دوہرا کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچا اور نہایت سرعت سے اس نے تار کا ایک سرا اس کے پیروں سے لپیٹا اور پھر دوسرے سرے کو چھت میں لٹکتے پنکھے پر پھینک کر اسے کھینچنے لگا۔ وسیم بھی اس کی مدد کو بڑھ آیا۔ چند منٹ میں وہ پنکھے سے الٹی لٹکی ہوئی تھی۔ الٹا لٹکنا آسان نہیں لیکن اس کے چہرے پر ذرا بھی کرب نظر نہیں آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے الٹا لٹکنا اس کے لیے ایک عام سی بات ہے۔

''وسیم تمہارے پاس سرنج ہے نا۔ اسے نکال کر آزماؤ..... تبھی یہ کھلے گی۔'' میں نے وسیم کو اشارہ دیا کہ وہ پرانا حربہ آزمائے۔

وسیم جیب سے سرنج نکال ہی رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی ''یہ بے چاری کچھ بھی بتا نہیں پائے گی۔ مجھ سے پوچھ لو جو پوچھنا ہے۔''

میں نے پھرتی سے مڑتے ہوئے کہا ''اچھا تم بھی اس کھیل میں شامل ہو۔''

مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ یہ وہی بڑی بی تھی جو کچھ دیر قبل کس طرح کمر تھامے کراہ رہی تھی اور اب اس طرح سینہ تانے کھڑی تھی کہ جیسے بینا مردانی ہو جو کشتی میں مردوں کو بھی ہرا دیتی تھی۔

''تم نے یہی سمجھا ہوگا کہ ایک بڑھیا عورت کو بے وقوف بنا دو گے۔ میری کامیابی کی وجہ بھی یہی ہے کہ مجھے بڑھیا دیکھ کر کوئی مجھ پر شک نہیں کرتا۔ اپنے اسی بڑھاپے کا سہارا لے کر میں نے بنگش کو دھوکا دیا اور اس کے گھر پر قبضہ کیے بیٹھی ہوں۔ اگر اپنی اصل صورت اور عمر کے ساتھ سامنے آتی تو وہ اپنے گھر میں گھسنے بھی نہیں دیتا۔ اس لیے اس کے بیچ کے ایک کرنل کی ماں بن کر اس سے ملی کہ اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ وقت پر پنشن ملتی نہیں ہے۔ فاقے کی نوبت آگئی ہے' مجھے سہارا دے دو۔ اس سیدھے سادھے شخص نے مجھے گھر میں ٹھہرا لیا۔ آس پاس کے دو ایک گھر

میں جا کر میں نے خود کو بنگش کی بہن بتایا اور پھر بنگش کو دنیا سے چلتا کر دیا۔ پاس پڑوس والے بھی شک نہ کر سکے۔''
''یہ مجھے کیوں بتا رہی ہو؟''
''اس لیے کہ تم سمجھ سکو کہ میں معمولی بڑھیا نہیں ہوں۔ اور یہ بھی سن لو میں ہی گیتا ہوں اور میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن مغالطہ میں تھی کہ اس وقت تم بالکل خاموش تھے جب کہ یہ لڑکا بول رہا تھا۔'' اس کا اشارہ عبداللہ کی طرف تھا۔ ''تمہارے رہتے یہ کیوں گائیڈ کر رہا ہے۔ اسی سوال نے مجھے الجھا دیا تھا۔ ورنہ میں اسی وقت تمہیں گھیر لیتی۔''
''اب تو یقین آ گیا نا۔''
''بالکل' اس لیے اب تم تینوں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے پستول کو لہراتے ہوئے کہا۔ اور روبی کی طرف بڑھی' شاید وہ اسے آزاد کرانا چاہتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اگر میں اس پر جمپ لگاتا بھی تو اس تک پہنچ نہیں پاتا۔ وہ فوراً فائر کر دیتی۔ میں کیا کروں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وسیم نے داؤ چلا دیا۔ جیسے ہی اس کی پیٹھ وسیم کی طرف ہوئی اس نے فلائنگ کک چلا دی۔ وہ اڑتی ہوئی روبی پر گری۔ وسیم نے ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔ اپنی جگہ سے اچھلا اور اس پر جا گرا۔ مگر رکا نہیں۔ اس کے پستول پر ہاتھ مارتا ہوا دور چلا گیا۔ ایسے وقت میں میرے تمام ساتھی الرٹ رہتے ہیں اس کا ثبوت بھی فوراً مل گیا۔ عبداللہ نے ساتھ ہی ساتھ چھلانگ لگائی تھی اور اس پر جا گرا تھا۔ اس نے اس کی گردن میں آرم لاک لگا دیا تھا۔
''وسیم' تار کا دوسرا ٹکڑا بھی اٹھا لاؤ۔'' وہ چیخ کر بولا۔ مگر اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ پتا نہیں اس نے ایسا کون سا داؤ آزمایا تھا کہ عبداللہ اڑتا ہوا اس سے دو تین ہاتھ کی دوری پر جا گرا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ وسیم نے اسے سر سے ٹکر ماری اور وہ عبداللہ کے قریب جا گری۔ عبداللہ شاید اسی انتظار میں تھا کہ اس نے اس کے سر پر پوری طاقت سے بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ وہ پھسلتی ہوئی میری طرف آئی۔ میں نے بھی دیر نہیں کی۔ اس کے سر پر ایک اور ٹھوکر لگا دی۔ اگر وہ کھڑی حالت میں ہوتی تو میں کنپٹی پر مارتا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ اس کے سر اٹھانے کا انتظار کرتا۔ وہ دوبارہ سے پھسلتی ہوئی وسیم کی طرف گئی۔ وسیم نے بھی دیر نہیں کی اور اس کے سر پر ایک اور ٹھوکر ماری۔ اس عورت میں پتا نہیں کتنی قوتِ برداشت تھی کہ وہ

اتنے زبردست ٹھوکروں کو سر پر جھیل گئی تھی اور ہوش میں بھی تھی۔ اس کی جگہ کوئی عام عورت ہوتی تو ایک ہی ٹھوکر میں بے ہوش ہو چکی ہوتی۔
اس بار جب وہ میرے قریب پھسلتی ہوئی آئی تو میں نے دیر نہیں کی اور اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دینے کی کوشش کی مگر یہ کوشش ناکام گئی کیوں کہ اس کا پورا چونڈا میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ یعنی کہ اس نے وگ لگا رکھا تھا۔ اسے موقع مل گیا تھا اور وہ جمپ لگا کر کھڑی ہو گئی تھی کہ وسیم نے وہیں سے چھلانگ لگائی اور اسے گرا دیا۔
وہ کچھ اس طرح گری تھی کہ اس کا چہرہ فرش سے ٹکرایا تھا۔ ادھر وہ گری تھی کہ عبداللہ نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ ایک قد آور مرد کسی عورت کی کمر پر گرے یہ اس عورت کے برداشت سے باہر کی بات ہے۔ اس کی چیخ نکل گئی۔
اتنی دیر سے وہ تین تین مردوں سے مقابلہ کر رہی تھی۔ اب تک اس کے منہ سے آہ تک نہیں نکلی تھی لیکن عبداللہ کے وزن نے اس کی چیخ نکال دی۔ کچھ بھی ہو وہ عورت تھی۔ اس نے کتنی ہی ٹریننگ لے کر اپنے جسم کو کتنا ہی سخت کیوں نہ بنا لیا ہو لیکن عورت پھر عورت ہوتی ہے۔ کتنی ہی قوی کیوں نہ بن جائے مگر جسم کی ساخت میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں کر سکتی۔ اس کا جسم نازکی لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس وقت بھی شاید کسی نازک حصے پر چوٹ لگی تھی کہ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ لیکن عبداللہ نے اس پر بھی بس نہیں کیا۔ ایک بار اور اچھال بھری اور اس کے جسم پر پھر سے کودا۔ یہ چوٹ بھی وہ برداشت نہ کر سکی اور اس کی چیخ پھر نکل گئی۔ وسیم جو تار کا ٹکڑا اٹھا لایا تھا اسے اس نے پھرتی سے اس کے گلے میں ڈال دیا۔ وہ اسے کھینچتا کہ گیتا نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس کے گلے میں ایک لاکٹ لٹک رہا تھا جسے اس نے داہنے ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور منہ میں رکھ کر چبا گئی۔
اس نے یہ حرکت اتنی سرعت سے کی تھی کہ میں بھی سمجھ نہ سکا۔ میری آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں اسی لیے میں نے چہرے پر آیا تغیر فوراً دیکھ لیا۔ ایک لمحے میں اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ آنے لگا تھا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس لاکٹ میں سائنائیڈ ہو گا۔ ٹامل ٹائیگر نامی دہشت گرد تنظیم کے ممبر اپنے گلے میں تعویذ کی طرح سائنائیڈ کیپسول پہنے رہتے ہیں اور جب پکڑے جاتے ہیں تو اسے منہ میں رکھ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔
وسیم اور عبداللہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ میں نے کہا ''خس کم جہاں پاک۔ واقعی یہ کوئی بڑی چیز تھی۔ ہم'

اس سے کچھ اگلوا نہ لیں اس ڈر سے اس نے جان دے دی۔''

''وہ مرگئی تو کیا ہوا' یہ تو ابھی زندہ ہے۔'' کہہ کر وسیم روبی کی طرف بڑھا۔

روبی اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر بولی ''جو پوچھنا ہے پوچھو میں جواب دوں گی۔''

شاید وہ گیتا کی موت سے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ یہی ہماری کامیابی تھی۔ کسی عورت پر تشدد کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ اگر گیتا خطرناک ثابت نہ ہوتی تو ایک دو تھپڑ مار کر اسے باندھ دیتا لیکن وہ تو ہمارے موت کا سامان کرنے لگی تھی۔ اس کا تیور بتا گیا تھا کہ وہ ہماری جان کے در پے ہے اگر ہم نے اس پر قابو نہ پایا تو وہ ہمیں قتل کر دے گی۔ اسی لیے وسیم اور عبداللہ بھی جذبہ رحم سے عاری بن گئے تھے۔

روبی نے خود ہی تعاون کی پیش کش کی تو میں نے وسیم کو اشارے سے روکا اور روبی سے کہا ''اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کس کے لیے کام کر رہی ہو۔''

''میرا نام روبی نہیں جوز فائین ہے اور میں امریکن ہوں۔ ہمارا تعلق ''شی'' سے ہے۔ یہ مافیا سے بھی بڑی تنظیم ہے۔ مافیا والے غنڈہ گردی اور منشیات فروشی کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ہم ان سے بھی اونچا کام کرتے ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے ملکوں کی حکومت گراتے اور بناتے ہیں۔ انہیں بلیک میل کرتے ہیں۔ لڑاتے ہیں۔ بڑی حکومتیں ہماری خدمات حاصل کرتی ہیں اور ہم ان کے مفاد کی جنگ بھی لڑتے ہیں۔'' وہ بول رہی تھی۔ اور میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اس لیے کہ مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں شی گھس آئی ہے۔ شی کے بارے میں' میں نے کئی آرٹیکل مختلف میگزین میں پڑھ چکا تھا۔ ان کے کام کے بارے میں بھی معلوم تھا۔ واقعی وہ ایک ٹرینڈ ایجنٹ تھی۔ دیکھنے میں دھان پان' مگر اندر سے اتنی مضبوط کہ اتنی دیر شکنجے سے بندھی لٹکی تھی مگر اس کی پیشانی پر شکن نہ تھی۔ وہ رک رک کر بتا رہی تھی ''دراصل اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر ملک میں سپر پاورز کا عمل دخل رہتا ہے اس وقت دنیا کے نقشے پر دو ہی ملک ایسے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ واحد سپر پاور بن کر رہیں۔ اس سلسلے میں سازشوں کا جال تیار ہوتا رہتا ہے۔ دونوں ممالک کے سپر برین اس سلسلے میں سازشیں بنتے رہتے ہیں جن پر عمل کرانے کی ذمہ داری ان کے ایجنٹوں کی ہوتی ہے۔ یہ ایجنٹ ہر ملک کی اہم ہستیوں کے گرد گھیرا ڈالے رہتے ہیں۔ اس ملک میں بھی

یمن کی مختصر تاریخ

یمن جسے جنوبی عرب بھی کہا جاتا ہے کچھ بہت قدیم اور مختلف سلطنتوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے جو کبھی ایک دوسرے کے حلیف اور کبھی حریف رہی ہیں، اس میں میناٸی (معین) قحطان، حضر موت، اوسان، سبا (Sheba) اور حمیری تہذیبیں شامل ہیں۔ میناٸی دور میں میناٸی (Minale) زبان بولی جاتی تھی جو 100 قبل مسیح میں مردہ ہوگئی۔ سلطنت قحطان کا دارالحکومت تمیاء تھا اور یہ آل ''عم'' کہلاتے تھے کیونکہ یہ ''عم'' خدا کی پرستش کرتے تھے، اسلام یہاں 630 میں آیا پھر یہ اسلامی تہذیب کا حصہ بن گیا۔ سبا کی مشہور سلطنت کا ذکر قرآن کی سورہ سبا اور نمل میں ہے یہ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ سبا موجودہ صنعاء کے قریب عظیم شہر اور سلطنت کا نام بھی سبا تھا۔ ملکہ سبا بلقیس اس پر حکمران تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان لاٸی تھی۔ یمن کٸی انبیاء کی قبور کا امین ہے جن میں نوح، ایوب، ہود، صالح اور شعیب علیہما السلام شامل ہیں۔

موجودہ یمن: 1990ء سے قبل یمن دو حصوں میں منقسم تھا، شمالی یمن میں امامت قائم تھی جو 1897ء میں زیدی شیعہ کے امام یحییٰ الی الحق نے قائم کی تھی جس کا تختہ 26 ستمبر 1962ء کے انقلاب نے الٹ دیا اور یہ یمن عرب ری پبلک بن گیا۔ جنوبی یمن پر برطانیہ قابض تھا۔ اس نے 1967ء میں برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کر لی اور یہ پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک آف یمن کہلایا (PDRY) 1990ء میں دونوں یمن اکٹھے ہوگئے اور یہ جمہوریہ یمن کہلاتا ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر سید خالد محمود ترمذی

ہیں۔ جس طرح یہ دونوں سپر پاورز تمام ترقی پذیر ممالک میں اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنا چاہتی ہیں یہاں بھی یہی چاہ رہی ہیں۔'' وہ نہایت نپے تلے انداز میں بول رہی تھی ''دونوں بڑی طاقتوں کے سیاسی نظریات میں زمین آسمان کا فرق ہے یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یوں کہ ہر ملک میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو برسراقتدار ہوں یا اقتدار سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو کسی نہ کسی نظریے سے اثر ضرور قبول کرتے ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسرے کو بھی اپنا ہم خیال بنالے یا بہ الفاظ دیگر اس کی فکر کا رخ اپنے نظریے کی طرف موڑ دے۔ ملک کی خارجہ پالیسی اسی ایک سوال کے گرد گھومتی ہے ہم لوگ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں جس قوت نے ہماری خدمات حاصل کرلیں ہم اسی ملک کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''شی کو یہاں آنے کا ٹاسک کس ملک نے دیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈیوڈ شا نے ہمیں بلایا تھا لیکن وہ پتا نہیں کہاں غائب ہوگیا۔ ہم واپسی کے لیے تیاری کر رہے تھے کہ گیتا سے ہمارا رابطہ ہوگیا۔ ہمارے ممبر ضرورت پڑنے پر اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اکیلے بھی کوئی کام کوئی مہم سر کر لیتے ہیں۔ لیکن تب جب اوپر والے اجازت دے دیں۔ میں نے اوپر والوں سے اجازت لے لی تھی اس لیے باقی لوگوں کو تو بھیج دیا لیکن خود رک گئی اور گیتا کے ساتھ مل کر اس کے لیے کام کرنے لگی۔'' وہ عام انداز میں بول رہی تھی۔

''وسیم اسے اتار دو۔'' میں نے اس پر ترس کھا کر کہا۔

وسیم اور عبداللہ نے اسے نیچے اتار دیا مگر ہاتھ پیروں کے بندھن نہیں کھولے۔ وہ بندھی ہی رہی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا ''ہماری راہ میں کیوں آئی تھیں؟''

''گیتا سے ہمیں یہ ٹاسک ملا تھا کہ آپ کو تلاش کیا جائے۔ اور ہم نے آپ کو ڈھونڈ لیا۔ بس میں بھی گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر آپ گرفتار ہوجاتے تو میں رقم دے کر آپ کو چھڑا لیتی اور اپنے ساتھ لاتی لیکن وہ ڈراما کامیاب نہ ہوسکا۔ گیتا کے مشورے سے ہم نے بیک وقت تین محاذ کھولے تھے۔ اس میں دوسرا محاذ آپ کو یہاں سے آؤٹ کرا کے بھارت بھیجنے کا تھا تاکہ آپ کو وہاں مروا دیا جائے آپ کی لاش ملتی تو پوری دنیا کی میڈیا گڑے مردے اکھاڑنے لگتی۔ ہندوستانی خوب واویلا مچاتے اور پورا الزام پاکستانی حکومت پر ڈال کر بدنام کیا جاتا کہ اس دہشت گرد کو پاکستان نے بھیجا ہے۔ اس طرح پاکستانی حکومت کو بلیک میل کیا جاتا۔''

''یہ بھارتیوں کی فطرت کا حصہ ہے۔ سانپ ڈسنا بھول سکتا ہے۔''

''بی بی اب یہ بھی بتادو کہ مرشد اور گیتا کے درمیان کس قسم کا معاہدہ تھا؟''

''پوری بات کا مجھے علم نہیں، میں تو صرف تمہیں پھانسنے کے لیے رکی ہوئی تھی۔ مرشد کو جب بھی رقم کی ضرورت ہوتی تو میں اسے پہنچاتی اس لیے کہ گیتا الگ رہ کر کام کررہی تھی۔ تمہارے ہاں کی ایجنسیوں کو الجھانے کے لیے ہی اس نے مجھے رکھا تھا کہ اس کے ملک پر الزام نہ آئے۔''

''وہ مرشد سے کیا کام لے رہی تھی؟''

''مرشد کو اس ملک کی سب سے بڑی روحانی ہستی بنا کر پیش کرتی پھر اس کے مریدوں کی تعداد اتنی بڑھا دیتی کہ اس کے اشارے پر اس ملک کا نظام چلتا۔''

''وہ خود کہاں چھپا بیٹھا ہے؟''

''مجھ سے آخری ملاقات......'' ابھی وہ کچھ اور کہتی کہ کمرے میں گولی چلی وسیم و سفیر بھی باہر کی طرف لپکے۔

وہ کون، یہ راز ہی رہ گیا۔ ہم نے بنگلے کا کونا کونا چھان لیا مگر فائر کرنے والا نہیں ملا اور ہم سب تھک ہار کر کمرے میں لوٹ آئے۔

اس کی لاش کو دیکھتے ہوئے عبداللہ بولا۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟''

''یہاں سے نکل چلو۔ مرشد کو ڈھونڈنے کے لیے پھر سے جال پھیلانا پڑے گا۔ اس لیے کہ یہ مہرہ تو ضائع ہو گیا۔ مجھے اس کی باتوں پر بھی یقین نہیں۔ یہ غیر ملکی ضرور تھی لیکن ہندوستانی عملداری میں گوا، ڈیمن ڈیو وغیرہ بھی ہے۔ وہاں پرتگالی بڑی تعداد میں بسے ہوئے ہیں۔ ان کے چہرے مہرے بھی انگریزوں جیسے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ہوسکتی ہے۔ ہمیں غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس نے شی والی کہانی سنا دی کیونکہ ٹرینڈ تھی۔ ایسے لوگ مرتے مرتے بھی کام دکھا جاتے ہیں تاکہ دشمن غلط سمت میں چلنے لگے!''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ کمرے میں موبائل ٹون کی آواز گونج اٹھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر آواز کا مخرج سمجھ میں آگیا۔ وہ آواز بیڈ کے سرہانے سے آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر تکیہ ہٹایا تو نیچے سے موبائل

نکل آیا۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ مرشد کا نام چمک رہا تھا۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر کال ریسیو کرنے کے لیے انگلی سے دباؤ ڈالا۔ دوسری جانب مرشد ہی تھا۔ وہ اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔ ''تم ابھی اور اسی وقت 'شہر والے بنگلے پر پہنچو میں وہیں ہوں۔''

قسمت نے ایک بار پھر ساتھ دے دیا تھا۔ گویا مرشد کی بدقسمتی نے اس کی زبانی پتا کھلوا دیا تھا۔

میں نے جواب دیے بغیر کال کاٹ دی۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اس لیے میں نے بھی اسی وقت چھاپا مارنے کی ٹھان لی۔ شہر والا بنگلا وہی تھا جو بھی اس کے بھائی کے تصرف میں تھا۔ اس کا اس بنگلے پر ہونا یہی ثابت کر رہا تھا کہ اس نے بھائی کے بچوں کو وہاں سے چلتا کر دیا ہے۔ یوں بھی وہاں ہوگا اس بات پر کسی کو یقین نہ آتا اس لیے کہ اس نے اپنی بیٹی اور بھائی کے بیٹے کے ساتھ جو کچھ کیا تھا یہ ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کے کھلے دشمن بن چکے تھے۔ اس لیے اس کا وہاں جانا ناممکن بات تھی۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''فوراً چلو۔ مرشد کا پتا لگ گیا ہے۔'' کہہ کر میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

مجھے دروازے کی جانب بڑھتے دیکھ کر وسیم نے کہا ''آؤ بھائی پہلے منہ ہاتھ دھولیں۔ بال اس طرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے بالوں میں بم پھٹا ہو۔''

میں نے اس کا کہا پورا کیا۔ وسیم اور عبداللہ نے بھی منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کر لی تھی۔ اب ہم ہر طرح سے ایک شریف شہری نظر آرہے تھے۔ ٹہلتے ہوئے اس بنگلے سے نکلے اور مرکزی دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

گیٹ پر وہی چوکیدار مستعد بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ ہم آرام سے باہر آگئے۔

ہماری گاڑی زیادہ دور نہیں تھی۔ ٹہلتے ہوئے اس میں جا بیٹھے اور واپس بنگلے کی طرف چل پڑے۔ راستے میں میں نے وسیم سے کہا ''تم اپنے بندوں کو بلا لو۔ لوکیشن یاد ہے نا؟ مرشد کے بھائی کا بنگلا۔ وہ وہیں چھپا ہوا ہے؟''

''ہاں مجھے لوکیشن یاد ہے۔'' کہہ کر وہ اپنے بندوں کو بلانے کے لیے کال کرنے لگا۔

''بنگلے میں پہنچ کر سفیر سے مل کر سوچیں گے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ اس لیے کہ آج نہیں تو کبھی نہیں۔'' میں نے کہا تھا کہ عبداللہ نے بریک دبا دیا۔ یکا یک بریک دبنے سے میں آگے کی جانب جھک گیا۔ اگر ہاتھ آگے نہ بڑھا کر سہارا لیتا تو میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا جاتا۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا کیونکہ عبداللہ کی ہنسی جو سنائی دے گئی تھی۔

''آپ سفیر سے ملنے کی سوچ رہے ہیں اور وہ آپ کے پیچھے بڑے آرام سے چل رہا ہے۔''

عبداللہ کے کہنے پر میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ واقعی اس کی کار میرے پیچھے ہی تھی۔ پتا نہیں کب سے وہ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا ''بڑے بڑے ہوٹلوں میں تو اکثر چائے پیتے ہو ایسا کرو پارک کے پاس جو چائے والے کا ٹھیلا ہے اس پر روک لینا۔ آج ہم سڑک چھاپ چائے کا مزہ لیں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کچھ آگے جاتے ہی اس نے کار روک دی۔ سامنے ایک چائے کا ٹھیلا لگا ہوا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر پارک کے منڈیروں پر بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ میں نے کار سے سر باہر نکال کر کہا ''لالا چار چائے بناؤ۔ اسپیشل دودھ پتی۔ ایسا کہ دل خوش ہو جائے۔''

اتنی دیر میں سفیر بھی کار سے اتر کر میرے پاس چلا آیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کہا۔ ''یہ تعاقب کا بھوت کب سے سوار ہو گیا؟''

''تعاقب... نہیں تو۔ میں یوں ہی گزر رہا تھا کہ آپ کی کار نظر آگئی اور میں پیچھے پیچھے چلنے لگا کہ جہاں آپ رکیں گے وہاں میں بھی رک کر اگلے پروگرام کے بارے میں پوچھ لوں گا۔'' سفیر نے کہا۔

''آج ہم یہ سوچ کر نکلے ہیں کہ یا ہم نہیں یا مرشد نہیں۔ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے یہ میں نے جان لیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''شہر والے بنگلے میں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ارے واہ... لگتا ہے دونوں خاندان میں مصالحت ہو گئی ہے۔''

''مصالحت ہونا قرین قیاس بھی نہیں۔ اس لیے کہ مرشد کس قماش کا ہے۔ یہ تم سب جانتے ہو۔ اس نے انہیں بزور قوت بھگا دیا ہوگا اور اب اس بنگلے پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔'' چائے کا سپ لے کر میں نے کہا۔

''یہاں بیٹھنے کی سمجھ نہیں آئی؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''ہمارے لوگ جمع ہو جائیں تب ہی ہم اس بنگلے کا

رخ کریں گے۔"
"کیا سب یہاں آئیں گے؟"
"نہیں سب اسی بنگلے کا رخ کریں گے۔ ان کو وقت دینے کے لیے میں یہاں رکا ہوں۔ ایک اہم بات اور ہے۔ سفیر کا ایک بندہ اپنے بنگلے پر گیا ہوا ہے۔ وہ وہاں سے وہ جیکٹ لا رہا ہے جس پر گولیاں اثر نہیں کرتیں۔ وہ یہیں آئے گا اسی لیے رکا ہوں۔" میں نے ہنس کر اسے مطمئن کرنا چاہا۔

میری بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ سفیر کے موبائل پر کال آگئی۔ اس نے ادھر کی آواز سن کر کہا "اسی سڑک پر آگے ایک چائے کی دکان ہے۔ وہیں آجاؤ۔ ہم پارک کے باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

سفیر نے موبائل بند کر کے مجھ سے کہا۔ "وہ بس پہنچنے ہی والا ہے۔"

"تو پھر چائے ختم کر کے ہم بھی چل دیں گے۔" میں نے کہا ہی تھا کہ ایک کار آکر رکی۔ اس میں سے سفیر کے تین بندے باہر آئے۔ تینوں نے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پیکٹ اٹھا رکھے تھے۔ میں نے سمجھ لیا کہ ان پیکٹوں میں جیکٹ ہے۔ اسے ہم یہاں کھڑے پہن نہیں سکتے تھے اس لیے میں نے کہا "انہیں واپس کار میں ہی رکھ دو۔"

وہ تینوں کار کی طرف مڑ گئے۔ ہم سب بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ کار کی طرف چلتے ہوئے میں نے عبداللہ سے کہا "تم نے غور کیا' مرشد کو ایسے لوگوں کا سہارا مل گیا ہے جو الیکٹرونک آلات کا صحیح استعمال کرنا جانتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس نے خانقاہ میں جس قسم کا نظام لگا رکھا ہے وہ عقل حیران کرنے والا تھا۔ اب جہاں اس نے شلٹر لے رکھا ہے۔ وہاں بھی ایسا ہی نظام بنا رکھا ہوگا۔ اس لیے ہمیں ہر طرح سے ہوشیار ہو کر اسے للکارنا ہے۔"

"جی ہاں اس کا اندازہ مجھے ہے۔"

"تم مانی کو کال کرو۔ اس سے کہو کہ وہ آن لائن رہے۔ ہوسکتا ہے کہ انٹرنیٹ کا کوئی مسئلہ ہو تو اس سے حل کرا سکوں۔ خانقاہ کی طرح وہاں بھی کوئی الیکٹرونک گھڑاک پھیلا ہوا ہو۔"

عبداللہ نے موبائل پر کسی کا نمبر ملایا۔ شاید وہ مانی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب سے نظریں ہٹا کر دیگر لوگوں کو دیکھا۔ وہ سب اپنی اپنی کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم چاروں کے علاوہ سفیر اور وسیم و عبداللہ کے لوگ بھی تھے۔ ایک چھوٹی سی پارٹی بن چکی تھی۔ میں نے کار میں داخل ہوتے ہوئے سیٹ پر رکھے ہتھیار پر نظر ڈالی اچھی خاصی تعداد میں اسلحہ رکھا تھا۔ میں نے۔۔۔ ہنستے ہوئے کہا۔ "بھائی میاں' یہ اتنا کچھ لے آئے ہو کیا کسی ملک پر چڑھائی کرنا ہے؟"

وسیم نے اپنی کار کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر کہا "اتنا ہی میری گاڑی میں بھی ہے۔"

"اور اگر راستے میں چیک پوائنٹ آگیا پھر کیا کرو گے؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آج کل پولیس والے اسنیپ چیکنگ پر زور دے رہے ہیں۔"

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔ احتیاطاً لے لیا ہے۔ بدشگونی نہ کریں۔ ہم بخیر و عافیت مرشد تک پہنچ جائیں گے اور اس وقت اس کی ضرورت پڑے گی۔" وہ بھی ہنستے ہوئے بولا اور کار آگے بڑھا لے گیا۔ ہم سب تین گاڑیوں میں سوار تھے۔ ایک ہماری' ہم سے آگے وسیم کی کار تھی اور میرے پیچھے سفیر اور عبداللہ والی۔ یہ چھوٹا سا قافلہ مرشد کے بنگلے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

ہم ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ یکایک میری کار میں ایک آواز گونجی "خوش آمدید میرے پیارے دشمن خوش آمدید۔"

اس آواز کو سنتے ہی میں ہی نہیں۔ کار میں سوار سب کے سب ہوشیار ہو گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ہر ایک کی متلاشی نظروں میں ایک ہی سوال تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی۔ تبھی وہ آواز پھر سنائی دی "شہباز تم غلط سمت میں بڑھ رہے ہو۔ میں بھائی کے بنگلے میں نہیں ہوں۔ وہ فون میں نے خود کیا تھا' صرف مغالطہ پھیلانے کے لیے۔ تم کیا مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ میں کال کر کے بغیر جانے کہ کون ہے دوسری طرف' اپنے بارے میں بتانا شروع کر دوں۔۔۔ نہیں میرے پیارے دشمن' وہ میرا ڈراما تھا۔ میں نے تم پر نظر۔۔۔ رکھی تھی۔ اگر میں چاہتا تو تمہیں گیتا کے گھر میں ہی گھیر لیتا۔ تمہاری کار بھی بگڈ ہے۔ اس شہر میں جہاں بھی جاؤ گے میری نظروں میں رہو گے' سگنل مجھے ملتا رہے گا۔ میں خود گیتا سے تنگ آگیا تھا اسی لیے ڈھیل دی کہ تم اسے ختم کر دو اور وہی ہوا۔ اس گھر میں جو کچھ ہوا وہ میں نے ہی سی ٹی کیمرے سے دیکھا۔ اب میں نے تمہاری عقل سے بھی اوپر کی ترقی کر لی ہے۔ اس لیے یہی کہوں گا کہ تم پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ایک نئی طاقت بن کر سامنے آرہا ہوں۔ مجھے سہارا دینے والے ایک نہیں کئی بڑی طاقتیں

ہیں اگر تم میرے ساتھ شامل ہو گئے تو سمجھ لو دنیا کے طاقتور ترین آدمی کہلاؤ گے۔"

"میں نے یہی دیکھا اور پڑھا ہے کہ اچھائی کے ساتھ ایک اور طاقت ہے جو برائی کی طاقت کہلاتی ہے اور وہ شیطان کی غلام کہلاتی ہے۔ کیا تم شیطان ہو؟"

"شیطان ہاہاہا.... جب میں خانقاہ میں بیٹھتا تھا اور سب کے سامنے اللہ اللہ کرتا تھا اس وقت بھی میں شیطان کی پرستش کرتا تھا لیکن اب میں اس سے بھی آگے بڑھ چکا ہوں۔ بولو میرا ساتھ دو گے یا میں اسی وقت اس کار کو یہیں سے بیٹھے بیٹھے تباہ کردوں؟"

اس کی یہ دھمکی مجھے الجھا گئی۔ اگر یہ کار بگڈ ہے۔ اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو وہ دیکھ رہا ہے تو اس کے لیے اس کار کو دھماکے سے اڑا دینا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ اس نے کار میں کیمرا وغیرہ لگاتے ہوئے دھماکا خیز مواد بھی رکھ دیا ہوگا، اب میں کیا کروں۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے پھر کہا "مجھے جواب ابھی چاہیے۔ جلد بولو؟"

میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا اور ٹوٹے بکھرے لہجے میں کہا "پہلے میں بالمشافہ تم سے ملوں گا۔ میری کچھ شرائط ہیں انہیں تم نے مان لیا تو میں تمہارا ساتھ دینے پر غور کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں راستہ بتا رہا ہوں۔ اس پر چلنا شروع کردو۔ مجھ تک پہنچ جاؤ گے۔"

"نہیں میں اس گاڑی کو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ تم اپنی گاڑی بھیجو۔ میں اپنے دوستوں کو واپس بھیج رہا ہوں۔"

"ہاں یہ بہتر ہے۔ میں کنونس بھیج رہا ہوں۔ اسی جگہ ٹھہرے رہو۔"

آواز آنا بند ہوئی تو میں کار سے اتر گیا۔ جیسے ہی مرشد کی آواز سنائی دی تھی ڈرائیور نے کار سائیڈ پر لگا دی تھی۔ مجھے رکتے دیکھ سب رک گئے تھے۔ میں نے نیچے اترتے ہی اشارے سے سب کو قریب آنے کا کہا اور خود اس کار سے دور ہٹتا چلا گیا۔ سڑک سے نیچے اتر کر میں کھڑا ہو گیا تھا۔ سفیر، وسیم، عبداللہ سبھی نزدیک آ گئے تب میں نے انہیں صورتِ حال بتائی اور کہا "اس وقت تم سب دور ہٹ جاؤ جیسے میں اکیلا ہوں لیکن فاصلہ رکھ کر کوئی ایک تعاقب کرے گا۔ باقی سب رابطے میں رہیں گے مگر پیچھے نہیں آئیں گے۔ ہوسکتا ہے ہماری تمام گاڑیاں بگڈ ہوں۔ اب تم سب بکھر جاؤ۔"

انہیں سمجھا کر میں واپس اپنی کار میں جا بیٹھا۔ وہ

سب اپنی اپنی کار میں بیٹھ کر آگے بڑھ گئے۔ میرے ساتھ جو لوگ تھے میں نے انہیں بھی بھیج دیا۔ اب میں اس کار میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ بمشکل دس منٹ گزرے تھے کہ ایک سیاہ رنگ کی وین آکر رکی اور اس سے دو بندے اترے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ ان میں سے ایک نے آکر کہا۔ ''ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔''

میں نے کار سے اترتے ہوئے کہا ''میں تو کب سے تمہارا منتظر تھا' چلو کہاں چلنا ہے؟''

''اس وین میں بیٹھ جائیں۔'' اس نے جواب میں کہا۔

میں نے ایک نظر اس وین پر ڈالی۔ اس سیاہ وین کے شیشے بھی کالے تھے۔ ابھی اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا دروازہ کھل گیا اور میں خود ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بعد میں دو لوگ اور آکر بیٹھ گئے اور وین چل پڑی۔ کس راستے پر ہم بڑھ رہے ہیں اس کا کچھ پتا نہ تھا۔ میں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھیوں میں سے کوئی نہ کوئی تعاقب میں ہوگا۔ اس وجہ سے بھی میں مطمئن تھا کہ عقب سے میری گدی پر کسی نے پستول کا دستہ مارا اور میں چکرا کر الٹ گیا پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟

جب ہوش آیا تو میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ مجھے ایک موٹی زنجیر سے باندھا گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے برابر میں عبداللہ' وسیم اور سفیر بھی کھڑے تھے لیکن اس حالت میں کہ تمام کے تمام زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ بالکل کسی ملبوساتی فلم کا منظر تھا۔ سب کے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے کیونکہ زنجیر کا سرا چھت میں لگے کنڈے سے منسلک تھا۔ اس ہال نما کمرے کا ماحول بھی عجیب سا تھا۔ اس کمرے کی ہر چیز سیاہ تھی۔ در و دیوار سیاہ' فرنیچر و پردے سیاہ' چھت اور فرش بھی سیاہ۔ بالکل سامنے زمین سے دو ڈھائی فٹ اونچا چبوترا نما اسٹیج تھا جس پر نصف دائرے میں آٹھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیانی کرسی جو نسبتاً اونچی تھی۔ صرف وہی خالی تھی۔ باقی سب پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب نئے چہرے تھے۔ اس سے پہلے میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ کمرے میں چبھتا ہوا سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا کہ سوئی بھی گرے تو آواز گونج جائے۔ میرے تمام ساتھی خاموش تھے مگر چہرے پر خوف کی علامت نہیں تھی۔ وہ سب ہوش میں تھے اور سب کی نگاہیں اسٹیج کی طرف تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا

کہ وہاں کوئی ڈراما شروع ہونے والا ہو یا کوئی فلم دکھائی جائے گی' جس کے وہ سب منتظر ہیں۔ اور واقعی اسٹیج کے عقبی دیوار پر روشنی پڑی اور وہ دیوار چمکنے لگی۔ اس دیوار پر ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ مرشد کی تصویر۔ چمکتی دیوار پر تصویر اور بھی چمکنے لگی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ساز بجنے کی آواز گونجنے لگی۔ ایسی مدھور آواز تھی کہ آنکھوں میں نیند اتر آئے۔ ایسی میٹھی دھن میں نے پہلی بار سنی تھی۔ پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں کہ ایک چھناکا سا ہوا۔ جاز پر رول کی چوٹ پڑی تھی۔ اسٹیج پر بیٹھے تمام لوگ کھڑے ہوگئے۔ ادب سے سب نے ہاتھ باندھ لیے تھے۔ تبھی دیوار درمیان سے شق ہوئی اور ایک ہیولہ سا باہر آیا۔ اس کے پیچھے تیز روشنی تھی۔ اس لیے چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ روشن دیوار اور عقب میں سرچ لائٹ۔ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ باہر آنے والا نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

عقب کی دیوار برابر ہوگئی تھی۔ سرچ لائٹ کی روشنی آنا بند ہوئی تو اس شخص کا چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے پر پھیلی خباثت دکھائی دینے لگی۔ وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ تن بدن میں آگ لگا رہی تھی۔

اس نے سفید سوٹ پہن رکھا تھا۔ میچ کرتی ٹائی بھی باندھ رکھی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے جتنی بار دیکھا تھا تو وہ اسلامی پوشاک میں نظر آیا تھا۔ لمبی عبا۔ سر پر جناح کیپ یا پگڑی۔ مٹھی بھر داڑھی۔ لیکن اس وقت اس کے چہرے پر داڑھی بھی نہیں تھی۔ وہ کلین شیو تھا۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ بولا ''کیا آنکھوں سے نگلنے کا ارادہ ہے؟''

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگ کس طرح ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں۔''

''یہی تو عقلمندی کی نشانی ہے۔ ہمارے جیسے لوگ دوہری زندگی نہ جئیں تو گولیوں کا نشانہ بن جائیں۔ میرے جو مرید ہیں وہ مجھے کسی بھی لباس میں دیکھیں ان کا اعتقاد برقرار رہے گا۔ وہ مجھے اسی طرح تعظیم دیں گے اس لیے کہ انہیں اور کسی چیز سے مطلب نہیں ہے۔ میں ان کے لیے جو حکم جاری کروں گا وہ اسے پورا ضرور کریں گے۔''

''میں ٹھہرا سیدھا سادہ آدمی' ایسی چالاکی کہاں سے حاصل کروں۔'' میں نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ایسا شخص جو پنج وقتہ نمازیں پڑھتا ہو شرعی انداز میں زندگی گزارتا ہو' ڈھیروں مریدوں کا پیر ہو وہ ایک لمحے میں اپنی داڑھی تک منڈا دے گا۔ اسی لیے میں حیرت میں ہوں۔''

"ابھی تم نے دیکھا کیا ہے۔ اب میں وہ نہیں رہا جسے یہ فکر ہو کہ کہیں مجھ سے کوئی گدی نہ چھین لے۔ اب مجھے گدی کی بھی پرواہ نہیں۔ اس لیے کہ اب میں پورے ملک کا مالک بننے والا ہوں۔" اس نے سانس لی پھر بولا "میرے ساتھ مل جاؤ گے تو زندگی سنور جائے گی۔" وہ کچھ اور کہتا کہ رک گیا۔ اس نے کلائی اٹھا کر اپنی گھڑی کو دیکھا۔ گھڑی دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک تناؤ سا آگیا۔ پھر اس نے اپنی داہنی جانب بیٹھے شخص کی طرف دیکھا۔ اس تیز روشنی میں اس کے چہرے پہ چھائی غصے کی جھلک چھپ نہ سکی اس نے تند لہجے میں ایک شخص سے کہا۔ "تم نے ان لوگوں کی تلاشی لی؟"

"یس سر۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"پھر سے تلاشی لو۔" مرشد کا لہجہ تپا ہوا تھا۔ "ان میں سے کسی کے پاس الیکٹرونک ڈیوائس ہے جو رک رک کر سگنل نشر کر رہا ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہمارے قریب آکر بولا۔ "شہباز کی بھی تلاشی لینی ہے؟"

"نہیں ایسا نہ کرنا کیونکہ......" وسیم جو اتنی دیر سے خاموش تھا بول اٹھا لیکن اس کا جملہ مرشد کی ڈانٹ نے پورا ہونے نہیں دیا۔ وہ چیخ کر بولا تھا۔

"وسیم میں تمہاری فطرت سے واقف ہوں۔ بالکل خاموش رہو۔ تم بول کر ذہن بٹانا چاہتے ہو۔"

"لو جی میں خاموش ہو جاتا ہوں۔" وسیم نے کہا۔

وہ شخص ہر ایک کی تلاشی لینے لگا۔ نہایت باریک بینی سے وہ تلاشی لے رہا تھا۔ ایک ایک کی تلاشی لینے کے بعد بولا "ایسی کوئی چیز نظر نہیں آرہی ہے۔" وہ پریشان کن نظروں سے مرشد کی طرف دیکھ رہا تھا اور مرشد اپنی گھڑی کی طرف۔

"ابھی بھی سگنل نشر ہو رہے ہیں۔" مرشد نے کڑے لہجے میں کہا۔

"تم خواہ مخواہ اس بے چارے کو پریشان کر رہے ہو۔ میں خود بتائے دیتا ہوں کہ وہ ڈیوائس کس کے پاس ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن شرط ہے کہ سب کے ہاتھ کھول دو۔ یہ بھی انسان ہیں۔ خون کی روانی رک رہی ہوگی۔"

"ان کے ہاتھ پیر کھول دو لیکن کڑی نظر رکھو۔" مرشد نے کہا۔ ابھی اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم سب کے بندھے ہوئے ہاتھ پیر آزاد ہو گئے۔ شاید ان زنجیروں کو آپریٹ کہیں اور سے کیا جا رہا تھا اور لاک کرنے کا سسٹم بھی کہیں اور سے تھا۔

زنجیر کا لاک کھلتے ہی سب اپنی اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اور ہاتھ پیر ہلا کر خون کی روانی درست کرنے لگے۔

میں نے مرشد کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ ساری زندگی اس ڈیوائس کو ڈھونڈ نہیں پائے گا۔ مجھ سے سنو۔"

وہاں بیٹھے تمام لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے کوٹ کا اوپر والا بٹن، بٹن نہیں ٹرانس میٹر ہے۔ اس کمرے میں جتنی باتیں ہوئی ہیں وہ سب میرے دوست دور بیٹھے سن رہے ہیں۔"

میرا جملہ ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ شخص لپکا اور میرے بٹن کو کھینچ کر توڑ لیا۔ پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"اِدھر لاؤ۔" مرشد نے ہتھیلی پھیلا دی۔

اس شخص نے وہ بٹن اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر ہاتھ جیب کی طرف لے گیا۔ جیب کی طرف جاتے اس کے ہاتھ کو سب نے دیکھا لیکن جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔ اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔ میں مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ گولی میرے سینے میں اتارے گا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں لیکن جب دھماکا ہوا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری تلاشی لینے والا شخص سینہ پکڑے ٹوٹی ہوئی عمارت کی طرح سلوموشن میں گر رہا تھا۔ مرشد نے دوبارہ ٹریگر دبایا دوسرا دھماکا ہوا۔ وہ گولی بھی اسی کے سینے میں دھنسی۔ مرشد نے پستول کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا "میں غلطی کو معاف کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ ایک چھوٹی سی غلطی بنیاد ہلا دیتی ہے۔ میرے نزدیک بے پروائی سب سے بڑی غلطی ہے بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ تمہارے پاس ٹرانسمیٹر رہ گیا۔ اب کوئی دوسرا ایسی غلطی نہیں کرے۔ یہی پیغام دینے کے لیے میں نے اسے شوٹ کیا ہے۔"

وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ رک کر اس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ جس طرح دھیرے دھیرے سرچ لائیٹ گھومتی ہے اسی طرح اس کا سر گھوم رہا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کرسیوں پر بیٹھے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر میری طرف مڑ کر بولا "جانتے ہو میں نے یہ میٹنگ کال کیوں کی ہے؟"

"جب تم خود بولنے پر آمادہ ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بولتے رہو۔"

''اس کی واحد وجہ تم خود ہو۔ تمہارے جیسا بہادر بندہ جب شہید ہونے لگے تو آس پاس بڑے آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ تم نے آدھی زندگی مجھ سے لڑتے ہوئے گزار دی اور اب بھی میرے ساتھ شامل ہونے پر تیار نہیں ہو اس لیے تمہاری موت بھی شاندار ہونا چاہیے۔ میں یہاں تمہاری شاندار موت کا نظارہ کرنے آیا ہوں۔''

''موت۔ تم مجھے موت دو گے؟ تم سے بڑا بے وقوف میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر تمہارے پاس عقل ہے تو سوچو کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے پاس کیوں آ گیا جب کہ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔ کیا مجھ جیسا آدمی اتنی آسانی سے موت کے پھندے میں خود پیر رکھ سکتا ہے۔ تم اپنے جال میں خود پھنس چکے ہو۔'' ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دھماکا سا ہوا۔ دھماکا ہوتے ہی مرشد نے اسٹیج کے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ دیوار پھر سے شق ہوئی اور وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اور دیوار پھر سے برابر ہو گئی۔

دھائیں! دھائیں! یکے بعد دیگر کئی دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے اتنے شدید تھے کہ دور و نزدیک کی عمارتیں لرز اٹھیں۔ خود مجھے بھی قدموں تلے لرزہ محسوس ہوا تھا۔ دھماکے باہر ہوئے تھے اور بھگدڑ اندر مچی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے لوگ دروازوں کی طرف دوڑے تھے۔ میرے ساتھی بھی ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے کہ میں نے کہا۔ ''کوئی باہر نکل نہ پائے۔''

میری آواز کی گونج ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ سفیر، وسیم، عبداللہ فرار ہونے کی کوشش کرنے والوں پر پل پڑے تھے۔ ایک ایک نے دو دو تین تین سنبھال لیا تھا لیکن ان میں سے صرف ایک ایسا تھا جو ٹرینڈ لڑاکا نظر آیا، باقی سب ریت کی دیوار ثابت ہوئے ایک کے بعد ایک گرتے چلے گئے۔ ان سے نمٹ کر وسیم نے کہا۔

''لگتا ہے کہ شمشاد نے کام دکھا دیا۔ مجھ پر حملہ ہونے سے چند منٹ پہلے شمشاد قریب تھا۔ اس نے کار سے دور ہوتے ہوئے کہا تھا۔ میں ایک ضروری کام سے الگ ہو رہا ہوں۔''

ہال نما کمرے میں یہاں سے وہاں تک وہ سب پڑے تھے لیکن مرشد ان میں شامل نہیں تھا جب کہ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ اب یہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ میں نے سفیر سے کہا۔ ''اب ہمیں باہر نکلنا چاہیے۔''

''کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر ہمیں بھی دشمن سمجھ لیں۔''

''اسٹیج کی عقبی دیوار کو توڑ دو۔''

اتنا کہتے ہی سفیر اور وسیم نے کرسیوں سے اس دیوار ... پر ہلہ بول دیا۔

''میرے بھائی دیوار نما دروازہ کھولنے کے لیے دیوار میں ادھر بھی کوئی بٹن وغیرہ ہوگا۔''

میری بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ دیوار کا جائزہ لینے لگے۔ بلاآخر ایک کڑی انہیں مل گئی جسے کھینچتے ہی دیوار شق ہوئی اور ہم دوسرے طرف پہنچ گئے۔

ہم افراتفری میں باہر آئے۔ اور دوسری سڑک کی طرف بڑھے اس لیے کہ سامنے والی سڑک پر دو جیپ کھڑی تھیں۔ اس میں بیٹھے ہوئے افراد دستی بم پھینک رہے تھے۔ وہ عمارت جو چند لمحے پہلے اپنی مثال آپ تھی مٹی کے گھروندے کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ ملبے میں دب کر کتنے لوگ مرے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ فائر بریگیڈ اور پولیس کی گاڑیاں پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ دونوں جیپ انہیں آتا دیکھ کر وہاں سے چل دیں۔

تماش بینوں نے بھیڑ لگا دی تھی انھی کے درمیان میں ہم بھی کھڑے تھے۔ میرے برابر میں وسیم اور سفیر تھے۔ ہم سب کی نظریں ملبے پر جمی ہوئی تھیں۔

ہم سب ایک ٹک ادھر ہی دیکھ رہے تھے کہ سفیر نے میرے ہاتھ کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''جلدی ہری اپ وہ بھاگ رہا ہے۔''

''کہاں؟ کس طرف۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بیٹھیں۔'' اس نے وہاں کھڑی ایک کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کہا۔ ''یہ کار عبداللہ کی ہے۔''

میں پھرتی سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''وسیم سے کہو کہ وہ عبداللہ کے آدمیوں کو لے کر گھر چلا جائے۔'' کہہ کر اس نے ایک سفید کار کے پیچھے اپنی کار لگا دی۔ اس کار میں کون ہے میں دیکھ نہیں پایا تھا۔ جو بھی تھا وہ اکیلا تھا اسے کار ڈرائیو کرتے میں نے دیکھ لیا تھا۔''

''اس کار میں کون ہے؟''

''آپ نے غور نہیں کیا، وہ مرشد ہے۔'' سفید کار اب نسبتاً ویران علاقے میں پہنچ چکی تھی تبھی میری نظر بیک ویو مرر پر پڑی ہمارے پیچھے ایک پولیس وین تھی۔ ''سفیر ہمارے پیچھے پولیس وین لگی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اب اگر وزیر اعظم بھی آ جائیں تو بھی میں اسے

زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سانپ نظر آجائے تو اسے مار دینا ہی عقلمندی ہے۔ پولیس وین کو میں نے بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔“

سفیر نے جواب دے کر رفتار مزید بڑھا دی۔ کار ہوا میں اڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سڑکیں ہمواری میں بے مثال تھیں اگر اوبڑ کھابڑ سڑکیں ہوتیں تو یقیناً اب تک حادثہ ہو چکا ہوتا۔

”کار کی رفتار تیز ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں میں بھی دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے غور کیا۔ کرسی پر جتنے لوگ بیٹھے تھے ان میں کوئی ایک بھی نہیں بچا۔“

”ہاں میں نے بھی دیکھا ہے۔ وہ سب گرنیڈ سے نہیں مرے۔ کوئی ان کو چن چن کر گولیاں مار رہا تھا۔ وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ پستول بردار نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ صرف ایک بار ایک پولیس انسپکٹر کو گولی چلاتے دیکھا تھا۔“ میں نے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھا پولیس وین کے پائیدان پر انسپکٹر کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے پھر فائر کیا اور سفید کار کا وہیل دھماکے سے پھٹ گیا۔ کار لہرائی اور پھر رک گئی کیونکہ ساتھ ہی ساتھ ایک اور دھماکا ہوا تھا۔

انسپکٹر نے موبائل وین روک دی تھی اور اتر کر مرشد کی گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ ”تمہارا یہ وائٹ سوٹ جتنا سفید ہے کردار اتنا ہی کالا ہے ایسے آدمی کو زندہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔“ انسپکٹر نے کار میں بیٹھے مرشد سے کہا۔

”بے وقوف انسپکٹر میں تمہیں سسپنڈ کرادوں گا تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔“ اندر بیٹھے مرشد نے کہا۔

”تم مجھے قانون کی دھمکی دے رہے ہو لو میں نے قانون کی وردی اتار دی۔“ کہہ کر اس نے شرٹ اتار پھینکی۔ ”اب میں سول ڈریس میں ہوں۔ میں تجھے اسی لباس میں سزا دوں گا تیرے آدمیوں نے میرا گھر اجاڑا تھا نا۔ تب سے میں تیری تلاش میں تھا۔ آج موقع ملا ہے تو تجھے زندہ کیسے چھوڑ دوں۔“ کہہ کر اس نے سفید سوٹ میں ملبوس مرشد کے داہنے پیر میں گولی ماری۔

مرشد کو اندازہ نہ تھا کہ انسپکٹر فائر کردے گا۔ مرشد بھی مسلح تھا۔ اس نے بھی جوابی فائر کیا۔ گولی انسپکٹر کے شانے کو چھوتی ہوئی گزری۔

”اب میں تجھے گرفتار کروں گا اور حوالات میں اس وقت تک رکھوں گا جب تک تو مر نہیں جاتا۔ تو اذیت میں تڑپے گا اور مجھے چین ملے گا۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”شہباز پولیس کی نظروں میں تم بھی مجرم ہو اور تم ہمہ وقت میری نظروں میں تھے۔ تمہیں میں نے جان بوجھ کر موقع دیا۔ اب ایک اور موقع دے رہا ہوں تم یہاں سے بھاگ جاؤ، ورنہ......“

اس نے پھر فائر کیا۔ اس بار اس نے مرشد کے شانے میں گولی ماری تھی۔

بھیڑ جمع ہو رہی تھی.... جو کام مجھے کرنا تھا وہ اس انسپکٹر نے کر دیا تھا۔ اب میرا وہاں رکنا بے معنی تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”کار ریورس کرو۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دور ہٹ جانا ہے۔“

وہاں سے ہم واپس اسی بنگلے میں آئے جہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ بنگلا اب گیسٹ ہاؤس جیسا بن چکا تھا۔ وسیم، سفیر اور عبداللہ کے آدمی مختلف کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس لیے بنگلے پر پہنچنے کے بعد میں نے سب سے پہلے ریاست خان کو بلایا۔ دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا، ”تم نے وطن کی خاطر بہت کچھ کیا۔ وطن کو تمہاری ضرورت ہے۔ میں اب یہ بتا ہی دوں کہ ہمارا تعلق وطن کی کسی ایجنسی سے نہیں ہے۔ ہم نجی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ اتفاق ہے کہ اس جنگ میں ملک دشمن طاقتیں بھی آتی چلی گئیں اور جنگ کا نقشہ بدل گیا۔“

کاشف زبیر کے انتقال کی وجہ سے ”سراب“ ادھوری رہ گئی تھی۔ اسے مکمل کرنے کی ذمے داری جس قلم کار کو سونپی گئی اس کا نام مخفی رکھ کر اعلان کیا گیا تھا کہ انداز تحریر سے قارئین بتائیں کہ یہ کس مصنف کی تخلیق ہے۔ کئی ہزار قارئین نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ صحیح جواب ”زین مہدی“ ہے۔ صحیح جواب تیرہ افراد نے دیا ہے۔ جن کے نام محب اجمل (کراچی)۔ نعیمہ ادریس (لاہور)۔ افتخار شاہین (حسن ابدال)۔ نوید احمد (جھنگ)۔ فہیم الدین (چنیوٹ)۔ نیاز ملک، ماریہ ملک (فیصل آباد)۔ اسماعیل شاہ (حیدرآباد)۔ شکیل صدیقی، وکیل خان (کراچی)، نعیم الحسن (ایبٹ آباد)۔ احمد صغیر، مقصود احمد (ملتان) ہے۔ انعامی رقم ان کے درمیان تقسیم کردی گئی ہے۔

"اچھا آپ لوگ آئی ایس آئی کے اہلکار نہیں ہیں؟" ریاست خان کے لہجے میں حیرت تھی۔
"ہاں، ہم عام سے شہری ہیں لیکن محب وطن ہیں، جب وطن پر بات آئی تو ہم فوج کی طرح سینہ سپر ہو گئے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ وطن کی سلامتی پر جب بات آتی ہے تو ہر شہری پر فرض ہو جاتا ہے کہ وطن دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جائے۔ ہم نے یہی کیا ہے۔ صرف ہم نے نہیں تم نے بھی یہی کیا۔ تم بھی وطن کی ہی محبت میں ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔ وطن کو تمہاری ضرورت ہے۔ اپنے ماضی کو بھلا کر تم کوئی نیا کاروبار کرو۔ ہم سب دو ایک دن میں اس ملک کو چھوڑ رہے ہیں۔"
"اگر مناسب سمجھیں تو اپنے ساتھ ہمیں بھی لے لیں۔"
"ہم کہاں جائیں گے اس کا خود ہمیں بھی پتا نہیں۔ تمہارا فون نمبر میرے پاس ہے۔ اگر کہیں سکون ملا تو بلا لیں گے۔ فی الحال تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ گلگت چلے جاؤ اور وہیں کوئی مناسب سا کام کرو۔"
ریاست خان آبدیدہ ہو گیا تھا مگر اسے جانا پڑا۔ اسی طرح وسیم سفیر اور عبداللہ نے بھی اپنے اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دیا۔ ان الجھنوں سے فرصت پا کر جب ہم چاروں یعنی وسیم، سفیر، عبداللہ اور میں اکٹھے بیٹھے تو مرشد کا ذکر آ گیا۔ میں نے کہا۔ "اس کہاوت پر آج یقین آیا ہے کہ ماہر تیراک ہمیشہ اتھلے پانی میں ڈوبتا ہے۔ مرشد نے خود کو بہت طاقت ور بنا لیا تھا۔ کرنل صاحب جنہوں نے ایک بار پہلے بھی میری مدد کی تھی۔ ان کا کچھ دیر پہلے فون آیا تھا وہ بتا رہے تھے کہ وہ لوگ بھی مرشد کی نگرانی کر رہے تھے۔ خبر تھی کہ مرشد وطن دشمنوں سے مل گیا ہے۔ انہی کی ایماء پر انسپکٹر نے اپنا بدلہ لیا ہے۔ اس دن انسپکٹر ہی نہیں وہاں کئی ایسے افراد تھے جو مرشد سے بدلہ لینا چاہتے تھے اور سب نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا۔ اس گھر سے چھ ایسی لاشیں نکلی ہیں جو دشمن ملک کے ایجنٹ تھے۔ کہیں یہ مسئلہ عالمی نہ بن جائے اس لیے خبروں میں آنے نہیں دیا ہے۔ انہوں نے بھی مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں وطن چھوڑ دوں اس لیے کہ عدالت میں کیس ہے اور مرشد مارا گیا ہے۔ کہیں کوئی اس کا ہمدرد ہمیں نہ کھینچ لے۔"
"اب کیا کرنا ہے۔" وسیم نے پوچھا۔
"ٹھہرو بتاتا ہوں۔" کہہ کر میں نے گھر فون کیا۔ بابا کو ساری بات بتا کر کہا۔ "ہم نے یہ جنگ جیت تو لی ہے لیکن اب یہاں رہنا ہمارے لیے مناسب نہیں اس لیے فیصلہ کیا ہے کہ ہم وطن سے دور جا کر نئی زندگی شروع کریں گے۔"
"یہ تمہارا فیصلہ ہے۔ ایک فیصلہ ہم نے بھی کیا ہے اس لیے تم جتنی جلد ممکن ہو گھر آ جاؤ تمہاری ماں تمہاری منتظر ہے۔" بابا نے اتنا کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔
"ہم لوگ اسی دن گھر کے لیے نکل گئے۔ اس لیے کہ بابا نے گول مول بات کر کے مجھے الجھا دیا تھا وہاں پہنچے تو حویلی میں خوب رونق تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ صوفی بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ پہنچی ہوئی تھی خوب رونق لگی تھی میری نظریں سویرا کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ پتا نہیں کہاں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس ظالمانہ برتاؤ کی وجہ اس وقت سامنے آئی جب رات بابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ اماں پہلے سے وہاں موجود تھیں بابا نے ادھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد کہا۔ "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ گھر کی عزت گھر میں ہی رہے، سویرا سے بھی پوچھ لیا۔ تم جہاں جانا چاہتے ہو جا سکتے ہو لیکن اب سویرا تمہارے ہی ساتھ رہے گی۔ صبح نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"
بابا کی زبان سے اپنے دل کی بات سن کر میں خوشی سے نہال ہو گیا لیکن زبان سے صرف ایک جملہ کہا "جیسی آپ کی مرضی!"
"ہاں تمہارے ساتھ ایک نکاح اور بھی ہوگا۔ عبداللہ اور بانو کا نکاح۔ کیوں کہ عبداللہ کو بھی ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ وہ اور بانو ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں یہی بہتر ہے۔"
"بابا کی اجازت پا کر میں خوشی سے باہر والے کمرے میں آیا تو وہاں کا ماحول ہی کچھ اور تھا سب مل کر عبداللہ کو چھیڑ رہے تھے اس لیے کہ مونا کے ذریعہ یہ خبر باہر آ گئی تھی جسے سفیر نے براڈ کاسٹ کر دیا تھا۔ عبداللہ اس طرح شرما رہا تھا جیسے وہ خود دلہن ہو۔ مجھے دیکھتے ہی سفیر اور وسیم نے مشترکہ نعرہ لگایا "ایک اور دولہا بابو آ گئے۔"
وہ رات ایسے گزر گئی جیسے برف تپتی دوپہر میں سورج کی تپش سے پگھل جائے۔
نکاح کے دوسرے ہی دن سفیر نے فون پر دبئی کے لیے سب کے ٹکٹ کنفرم کرا لیے۔ مانی نے پہلے ہی ایک پوری عمارت کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب ہم سب ایک جگہ ایک خاندان کی طرح رہیں گے۔

بیت بازی

قارئین

(محمد احسن جاوید ڈی جی خان کا جواب)

نعیم الدین......ملک وال

اظہر کی نیکیوں کی بہت دھوم تھی مگر
ہم کو تو شہر بھر میں وہ بدنام سا ملا

عشرت علی......ساہیوال

اس کو اپنا رقیب سمجھو تم
جو لگاتا ہے گھاؤ لہجے میں

منعم سید......سیالکوٹ

اجل ہے راہ کا پتھر اسے ہٹا کے چلو
دلوں کو رکنے نہ دو ہم سفر بنائے چلو

اظہر حسین......شادی پور

اسی نے فرض کیا سب سے قیمتی خود کو
پھر اپنے آپ کی قیمت گھٹائی بھی اس نے

(قاضی مشرف معروف حمیدی کراچی کا جواب)

محمد فہیم......لاڑکانہ

ایک لمحے میں چھوڑ دیتی ہے
کتنی بے اعتبار ہے دنیا

زہیب علی......جہلم

اس علاقے میں بدلتی نہیں تاریخ کبھی
لوگ اس شہر میں رہتے ہیں کلینڈر کی طرح

عطاءاللہ......جیکب آباد

اٹھا رہے ہیں قسم حرمت قلم کی جو لوگ
ازار بند قلم سے ہی ڈالتے ہیں میاں

محمد احمد رضا انصاری......کوٹ ادو

ڈالے گئے اس واسطے پتھر مرے آگے
ٹھوکر کھا کر ہوش سنبھل جائے تو اچھا

(قندیل اثر فیصل آباد کا جواب)

رفیق احمد ناز......ڈیرہ غازی خان

وفاؤں کے چراغوں سے نئی دنیا بسا لی ہے
زمانہ چھوڑ کر ظالم نئی دنیا سجا لی ہے

زریں اسلم خان......پشاور

وہ حبس ہے کہ شجر دم بہ خود کھڑے ہیں تمام
کہ جیسے طاقتِ گفتار ہی نہیں رکھتے

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان ڈاہرانولہ کا جواب)

نوشین جاوید......مظفر گڑھ

نہ جانے کب سے معروف تھا تماشاہیوں نہیں معلوم
کہیں دیکھا ہے کیا مجھ سا کوئی جاندار می رقم

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

یہ صبر یہ ہمت بھی ہے لازم میرے دوست
جدائی کے لمحات بے جانکسل ہوتے ہیں

انجم رفیق......کراچی

یہ میرا شہر مرے لوگ بے خبر تو نہیں
یہیں کہیں سے کوئی وار ہونے والا ہے

احمد قریشی......حیدر آباد

یہ دل کسی کسی پہ ہی دھڑکا ہے ناگہاں
نظروں کا انتخاب ہوا ہے کوئی کوئی

(اکبر توحید کا جواب)

یاسر غیب ربانی......ملتان

روح آباد کرو گے تو بدن اجڑے گا
اک خرابی تو جنم لیتی ہے تعمیر کے ساتھ

(عینی فہم کا جواب)

رضا احمد اعوان......دریا خان بھکر

ہے آج بھی ہماری انا کا وہی مزاج
مشکل ہے اپنے درد کا اظہار آج بھی

اشرف حسن......منڈی بہاؤالدین

ہاں مری پہلی محبت کی گواہ
اس گلی کی آخری دیوار تھی

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

زاہد ندیم..........سکھر

ناپسندیدہ بات کا سہنا
ایک دریا کا آنکھ سے بہنا

اشرف عباس..........دبئی

نئے موسم کی جوانی کا منظر
ہماری خاک سے پہلے نہیں تھا

ضغیم زیدی..........لاہور

نہ کوئی رنج ان آنکھوں میں تھا دم رخصت
نہ تھی زبان میں لکنت سوال کرتے ہوئے

(منشی عزیز مئے لڈن کا جواب)

انیس الرحمٰن..........کراچی

یہی سزائے سفر ہے، یہی عطائے سفر
اتر کے عرش سے چلتے ہی جا رہے ہیں مدام

شہباز احمد..........جہلم

یہ خدا بن کر رعایت نہیں کرتے وسی
ان حسن والوں کو کبھی قبلہ و کعبہ نہ بنا

(ممتاز قادری شادی پور کا جواب)

عبدالحکیم ثمر..........کراچی

میری دھڑکنوں سے قریب تھے وہ مری چاہ تھے مرا خواب تھے
وہ جو روز و شب مرے پاس تھے وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

(نزاہت افشاں مہورہ جنگ کا جواب)

احمد توحید بھائی..........کراچی

یاد ہیں جور و جفا تیرے مگر میں چپ ہوں
تو ستم گر ہے بڑا تو بڑا ہرجائی ہے

فریدہ بٹ..........جہلم

یوں تو لغت میں لفظ و معانی نہیں ہیں کم
اک لفظ عشق چن لیا اچھا لگا مجھے

(حسنین مصطفیٰ کامرہ کا جواب)

سعید احمد چاند..........کراچی

اشکوں کی ضمانت بھی جہاں کام نہ آئے
اس بزم میں باتوں کا یقیں کون کرے گا

ضیاء الاسلام..........مظفر گڑھ

وہ تازہ دم تھا منزلیں آگے بلاتی تھیں اسے
رکھتا بھی ساتھ اس کے ہمیں آخر کو رستہ کب تلک

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

محمد عمر..........میر پور خاص

یہ گھڑی کیسی گھڑی ہے اس گھڑی کا کیا کروں
کیوں نہ خود سے مات کھا لوں غم کی یہ گھڑیاں ٹلیں

محمد حسیب خان..........پنڈی

یہی بہت ہے کہ اس دور کم نگاہی بس
ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں

فاریہ گلریز..........شیخوپورہ

یہ بھی مرے مرشد کی عارف اک کرامت ہے
ساحل سمندر پہ چشمہ میٹھے پانی کا

نوید اصغر..........کراچی

یہ تاریخ گواہی دے گی اپنے وطن کے خاکے میں
وقت پڑا تو اپنے لہو کا رنگ بھی بھرنا سیکھا تھا

زاہد علی خان..........لاہور

یہ کون شیر جاں سورج کی سوت میں ہے مگن
سواد درد میں بھی رقص شام کس کا ہے

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

انصار حسین..........چکوال

وہاں تھی جبہ و دستار کی پذیرائی
غریب کا یہ پرانا دوشالہ کیا کرتا

ادیب احمد..........لڈن وہاڑی

واقعہ کچھ ایسا ہے سانحہ کچھ ایسا ہے
داستاں سنا کر بھی داستان باقی ہے

(ہما اختر مظفر گڑھ کا جواب)

رفیق احمد ناز..........ڈی جی خان

ابر کرم کہوں تجھے یا ابر ستم
تشنہ لب دریا تے صحرا کو سیر کر گیا

(نیلوفر شاہی اسلام آباد کا جواب)

عباس علی..........کراچی

مابین تحل ہو کوئی ملا نہ برہمن
جو شے کی حقیقت کو سمجھتے نہیں دیتا

بیت بازی کا اصول ہے، جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جنوری 2017ء تک علمی آزمائش 133 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

94

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 133

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 31 جنوری 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ لاہور سے ریاضی اور معاشیات میں بی اے پھر اردو میں ایم اے کیا۔ ریڈیو ٹی وی کے لیے بے شمار ڈرامے تحریر کیے۔ حکومت نے تمغۂ امتیاز سے نوازا۔

علمی آزمائش 131 کا جواب

وسیم حسن راجا ملتان میں 3 جولائی 1952ء میں پیدا ہوئے۔ بائیں ہاتھ کے بیٹس مین اور لیگ بریگ گگلی بالر تھے۔ 1985ء تک ٹیسٹ کرکٹ کھیلی۔ 2821 رنز بنائے جن میں 4 سنچریاں شامل ہیں۔ بہترین اسکور 125 ہے۔ 51 وکٹیں حاصل کیں۔ 20 کیچ پکڑے۔ پاکستان کے نامور کرکٹ کھلاڑی کہلاتے ہیں۔

انعام یافتگان

1۔ ابرار الحسن، کوئٹہ   2۔ زاہد علی خان، حیدر آباد   3۔ فیض احمد، کھلابٹ ٹاؤن

4۔ رضیہ مسعود۔ لاہور   5۔ عاشق علی، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عباس رضوی، حمیرا احمد اکرم، نسرین عزیز، امامہ تجمل، بلال شاہد، منور یاسمین، ڈاکٹر حسین پروین اختر، انعام اللہ، وسیم اختر، نسیم بخاری، زینت رفیق، فیض الحسن، خالق نیاز عبدل، نثار حسن، ارباب حسن، سید عباس، خالدہ یوسف، یاسین خان، ایم ناصر، اشتیاق محمد، دانش قریشی، مزمل صدیقی، عباس زیدی، توقیر ناصر، منیبہ حبیب، منیر الحسن، اکبر حیات، عنایت خان، مرزا سلیم، خادم حسین، صالح محمود، کامران خان، عباس خان، راغب الحسن، شجاع رضوی، طیب خان، اشرف اللہ خان، سید فرح محمود، فیض محمد، دانش قریشی، محمد اختر، توقیر عباس اچکزئی، سلطان جونانی، ایاز نثار احمد۔ شورکوٹ جھنگ سے سکھیر انیب الرحمن، زینت النسائی، وجاہت وکیل عثمان خان، شاہد اقبال شاہد، محمد اختر، سلطان خان، فرحین سلطان، ناصر حسین، عارف اچکزئی، خادم حسین، نسرین

عزیز، عبدالحکیم تھر، کیپٹن فواد خالد خان، امجد اسلام، نازو، نمرہ، صاحب شاہ، شبینہ کوثر۔ ڈیرہ غازی خان سے محمد احسن جاوید، جاوید آنوز، رفیق احمد ناز، محمد مستقیم۔ وزیر آباد سے سلمٰی فرحت، نسیم احمد۔ لاہور سے مسرت اسلم، فیض مصطفٰی، نازش ممتاز، ابن حسن زیدی، محمد منظور مغل، نغمہ نفیس، عبدالجبار رومی، نغمہ نفیس، شاہد علی، عنایت علی، امداد اللہ، ڈاکٹر کامران آرزو، مسز احمد جمال، نگین بٹ، ظفر جتوئی، فہد اللہ، خادم علی، نوید اصغر، محمد اکرام، عباس علی، سرور جاوید، آصف خان، عبدالخالق، انیس الحسن، ظفر قاسم، نواب احسن، فاضل اختر، شیخ محمد، یاسمین محمد، فرحت مصطفٰی، ناصر الحسن، زرینہ ایوب، چوہدری فضل اللہ، برکات اللہ، ذیشان علی، احمد صدیقی، ناظم حسین سید، راحیل عثمان، نیاز ملکانی، کائنات علی، تابش بلوچ، فرحت بٹ، جاوید عثمانی، ابرار رضوی۔ پشاور سے شیر نواز گل، مظہر حسین غلام عباس طوری بنگش، فتح باری، نوازش علی سید، اکرام مصطفٰی، باسط علی، شاہ زرولی، رضوان شاہ، قدرت خان، ملک نوروز علی، زاہد زرعلی، بخت آور خان، خرم پاشا، عنایت علی، محمد عرفان، وزیر محمد خان، عباس حسن زئی، گلفشاہ گل سید بخاری، نعمان شاہ۔ خانیوال سے ناصر حسن، حشمت علی بٹ۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری، محمد امیر ماجد۔ ملتان سے رمیض احمد، گلفشاں افسر، محمد معین چشتی، عنبرین چشتی، اشرف عبداللہ، اقبال انصاری، لبنیٰ ارشاد، نوید اصغر بخاری، محمد معین خضر حیات بھٹی، خواجہ محمد حسین، بابر سعید، محمد آصف، اویس سلمان، حسین ارشاد، معین خان، سلطان فتح علی، ناصر گواچہ، توقیر عباس، فتح محمد حسن، رشید علی سید، آفاق حسن، راشد علی خان، امام بخش، انعام حسن، فصاحت انس، پیر ناصر شاہ بخاری، امداد شاہ، اسماعیل آفاق، غلام علی شاہ بخاری، برکات اللہ بخش، ارشاد کاظمی، نہال کاظمی، شیخ نہال احمد، سید فرحت عباس، مظہر حسین سید، فرقان اللہ۔ منڈی بہاؤ الدین سے سیف اللہ، پیر محمد۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ۔ مظفر آباد آزاد کشمیر سے رفعت عباس، اسماعیل حیات، زرین مجید، زاہد شاہ، ملک زین، حکیم حسن خان، ابرار حسن، ضیاء الحسن، فرحت عباس، جاوید بٹ، کاظم حسن شاہ۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، زین العابدین، درشہوار، عباس عسکری، نازش ممتاز، نیلم فیض الرحمن، عاشق حسین، ارباز خان، افشاں زیاد، افشاں زیادہ، شیخ فتح یاب، صدیق بھٹی، ساغر علی، عبداللہ، عبدالاحد، خرم لودھی، فہد ملک، فیض بخش، شگفتہ مشتاق، یوسف احمد گل، عباس نیازی، ارشد خانم بتول کاظمی، جہانزیب خان، قیام حسین، ملائکہ احسن، وسعت اللہ، توصیف ہمدانی، مغیر خان۔ راولپنڈی سے رضوانہ قریشی، محمد آصف محمود، ڈاکٹر سعادت علی خان، عنایت اللہ ککھر خان زادہ، وسیم الدین ہمدانیم زرین زرولی، کاظم حسین، معین خان، زرفشاں، ثمر متین، علی اسد، طیب حسن، آصف علی، عباس مشہدی، عنایت بھٹو، زویا اعجاز۔ کھاتاں سے سلیم کامرینڈ۔ پاک پتن سے زہرا نوشین۔ فیصل آباد سے حامد امین صوفی ایڈووکیٹ۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے جاوید مسیح، جمعہ مسیح، نوید احمد علیزئی، اعجاز احمد علیزئی۔ اٹک سے سید محمد حسین شاہ، جیا علی، فلک خان اچکزئی، نعمان ملک۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی (فرید ٹاؤن) میانوالی سے اظفر کمال، شہاب شیخ، فتح الدین، خرم بٹ۔ سیالکوٹ سے عنایت علی، لیلیٰ اقبال، فیروز حسن۔ حیدر آباد سے نثار احمد، رضوان مشہدی، مریم بنت کاشف، ناصر رند، وسیم چانڈیو، امامہ تجمل، دانش فتح محمد، کاظم علی کاظمی۔ سانگھڑ سے عاشق حسین مغل، رضوانہ اسحاق، ملک یاسر، عفت انصاری، عائشہ اعوان، منیر الدین، بدر اسحاق، عباس علی، عثمان پیرزادہ، بھیرو مل جسکانی، یحییٰ علی سید۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ (کچھی درہ)۔ بہاولپور سے محمد منیب جاوید، سعیدہ طارق، ذیشان احمد۔ وزیر آباد سے سلمٰی فرحت، ظریف حسن، محمود علی، فیض محمد شاہ۔ مردان سے م انور (باڑی چم ہوتی)۔ گوجرانوالہ سے محمد وقار بٹ، ملک ممتاز۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے صائمہ عمران، عبدالجبار خان، فرید الدین، مشتاق ناز، دانش احسن، ناصر خان، توقیر ضیائی، یاسین احمد، شاہد خان۔ ڈیرہ غازی خان سے محمد احسن جاوید، رفیق احمد ناز، ماریہ حسن، غلام علی، لبنیٰ فرید، اصغر نوید، معین احسن، ابرار حسن، برکات اللہ۔ میلسی سے محمد جہانگیر شاہ، شگفتہ پروین۔ بگرام سے زین الاسلام۔ جہلم سے ملک شاہین۔ لودھراں سے محمد یار شاہد، حافظ الدین۔ شیخوپورہ سے سلمٰی مہر، منیر چوہان۔ اوکاڑہ سے صاحب جان، اسماعیل شاہ، نذر محمد، عباس جتبانی، شبیر علی ڈرائیور، صالح الدین۔ لیہ سے امروز اسلم مغل، یمیس ناظر، اسلم شیخ، ظریف ابن علی، عبدالقادر، نعمانہ شیخ، رابعہ متین، زبیر اسلم پراچہ۔ کمالیہ سے زاہد طارق۔ خوشاب سے شمس الاسلام، حافظ فیروز، محمد محسن۔ ہری پور ہزارہ سے طوبیٰ شاہ، الماس فاطمہ، نازش سلطان، اشرف الدین، شریف خان، رفیق ناز۔ بہاولنگر سے غلام یاسین، زرین اشفاق، ساجد شاہ۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ میر پور خاص سے طاہر الدین بیگ، وسعت اللہ خان۔

بیرون ملک سے آفاق حسن (اوسلو ناروے)۔ نصیر الدین (جدہ)۔ ارشد علی ارشد (سعودی عربیہ)۔ احمد توحید، ملک محمد ظفر عباسی، نصیر الدین (مانچسٹر یوکے)۔ ارشد فیصل (اوسلو، ناروے)۔ منیر الحسن (العین)۔

سنگ دل

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
دراصل یہ سرگزشت میری نہیں، میری بہن نادیہ (فرضی نام) کی ہے، ہمارا گھرانا دوسرے گھرانے سے بالکل الگ ٹائپ کا ہے۔ اس لیے میں نے تمام نام بدل دیے ہیں لیکن کہانی بالکل سچی ہے۔

مسز اکرم
(لاہور)

پورے محلے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ مولوی برکت اللہ کی لڑکی رات کی تاریکی میں گھر سے فرار ہو گئی۔ نادیہ میری بڑی بہن تھی اور صرف مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کے ساتھ گئی ہے لیکن میں نے اپنے ہونٹ سی لیے اور صبح اٹھتے ہی انجان بن کر یہ خبر گھر والوں کو سنائی کہ نادیہ اپنے بستر پر نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں امی، بابا دوسرے میں میرے تینوں بھائی اور تیسرا کمرا ہم دونوں بہنوں کے تصرف میں تھا۔ مجھ سے تابڑ توڑ سوالات کیے جارہے تھے لیکن میرے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔ وہ رات میرے ساتھ ہی سوئی تھی۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو اس کا بستر خالی تھا۔ میں نے باتھ روم، کچن ہر جگہ دیکھ لیا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔“

”یہ ہو ہی نہیں سکتا۔“ بڑا بھائی آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ”کہ تجھے کچھ معلوم نہ ہو۔ تم دونوں چوبیس گھنٹے ساتھ رہتی ہو۔ ایک ہی کالج میں پڑھتی ہو۔ ساتھ آتی اور ساتھ جاتی ہو۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں کچھ نہ بتایا ہو۔“

یہ کہہ کر اس نے میرے بال پیچھے سے پکڑ لیے اور انہیں جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ”جلدی سے اپنی زبان کھول دے۔ بتا وہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ ورنہ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

میں درد سے بلبلا اٹھی لیکن میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ بابا نے بھائی سے کہا۔ ”اسے چھوڑ دے اکبر۔ اس سے ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے لڑکی کو تلاش کرنا ضروری ہے۔“

بابا نے مجھے کمرے میں بند کردیا اور تینوں بھائی نادیہ کو ڈھونڈنے نکل گئے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ نادیہ ان لوگوں کی پہنچ سے دور جا چکی ہو۔ رات میں کئی گاڑیاں ہمارے شہر سے گزرتی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی گاڑی میں سوار ہوگئی ہوگی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کہاں گئی ہے اور اسے لے جانے والا کون ہے لیکن میں نے اس راز کو اپنے سینے میں چھپانے کا عہد کیا تھا اور مجھ پر کتنی ہی سختی کیوں نہ کی جاتی اسے افشا نہ کرتی کیونکہ میں اپنے باپ بھائیوں کو ظالم اور نادیہ کو مظلوم سمجھتی تھی۔ اس لیے اس کی مدد کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ اگر وہ یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتی تو اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے جہنم بن جاتی کیونکہ میرے ظالم باپ نے اس کی شادی ایک پچپن سالہ رنڈوے سے طے کردی تھی جس کا بڑا بیٹا نادیہ کے برابر تھا۔

ہماری برادری میں شادی کے سلسلے میں لڑکیوں کی مرضی معلوم نہیں کی جاتی بلکہ انہیں بھیڑ بکری سمجھ کر کسی دوسرے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ بابا نے نادیہ کا رشتہ جس شخص سے طے کیا وہ نہ صرف اس سے عمر میں تیس سال بڑا بلکہ چار بچوں کا باپ بھی تھا۔ اسے بیوی نہیں بلکہ گھر کے کام کاج کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھی جو اس کے بچوں کی دیکھ بھال بھی کر سکے۔ بابا اس کے احسان مند تھے کیونکہ اس نے برے وقت میں ان کی مدد کی تھی چنانچہ جب اس نے نادیہ کے لیے پیغام دیا تو وہ انکار نہ کر سکے اور اسے اپنا داماد بنانے پر راضی ہو گئے۔ امی کو البتہ اس رشتے پر اعتراض تھا۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن بابا نے بری طرح جھڑک دیا اور بولے۔ ”بک بک نہ کر۔ میں نے تجھ سے مشورہ نہیں مانگا۔ لڑکی کا باپ ہوں۔ اس کے بھلے کے لیے ہی سوچوں گا۔ اشرف خان اچھا آدمی ہے۔ نادیہ اس کے ساتھ خوش رہے گی۔“

اس کے بعد کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کچھ کہتا۔ بیوی شریکِ زندگی ہوتی ہے لیکن امی کے ساتھ بابا کا سلوک بہت ہی خراب تھا۔ وہ انہیں نوکرانی سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ انہیں صرف بابا کا حکم ماننا تھا۔ زبان کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر بابا کو کوئی بات ناگوار گزرتی تو وہ انہیں مارنے لگ جاتے تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز امی کی پٹائی ہوتی۔ ہم دونوں بہنیں ڈر کے مارے کمرے میں دبک جاتیں اور تینوں بھائی منہ پھلا کر باہر نکل جاتے۔ شاید ان میں بھی یہ منظر دیکھنے کی تاب نہیں تھی لیکن بابا کے آگے کون بول سکتا تھا۔ وہ انتہائی ظالم اور سنگ دل انسان تھے۔

سچ پوچھیں تو بابا کے دو چہرے تھے۔ ایک وہ جو ہم گھر میں دیکھتے تھے اور دوسرا وہ جو دنیا والوں کو نظر آتا تھا۔ انہوں نے اپنے اوپر مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ لوگ انہیں متقی، پرہیزگار اور نیک انسان سمجھتے تھے۔ پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھتے۔ باقاعدگی سے روزے رکھتے اور زکوٰۃ بھی دیتے تھے۔ ایک بار عمرہ کر چکے تھے اور اب حج پر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ہمیشہ سفید لباس پہنتے اور ان کی شلوار ٹخنوں سے اوپر ہوتی تھی۔ کبھی کسی نے انہیں ننگے سر نہیں دیکھا تھا۔ یہ ان کا ظاہری روپ تھا لیکن ان کے اندر کی خباثت کسی کو نظر نہیں آتی تھی۔

مین بازار میں ان کی آڑھت کی دکان تھی اور ان میں وہ تمام دنیاوی عیوب تھے۔ جن سے مذہب نے منع کیا ہے۔ یعنی ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، ناجائز منافع خوری، ناقص مال کی فروخت اور ناپ تول میں ڈنڈی مارنا لیکن لوگوں کی نظروں سے یہ عیب چھپے ہوئے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک باریش اور مذہبی شخص یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ انہوں نے تینوں بیٹوں کو کاروبار میں شریک کر لیا اور وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔

گھر میں ان کا چہرہ بہت ہی بھیانک تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کا مذہب عورت سے شروع ہو کر عورت پر ہی ختم ہوتا ہے۔ پہلے انہوں نے مذہب کی آڑ لے کر امی پر بے جا پابندیاں عاید کیں۔ انہیں سہاگ رات کو ہی یہ حکم سنا دیا گیا کہ وہ تمام نامحرم مردوں سے پردہ کریں گی۔ ان میں سسر، جیٹھ اور دیور بھی شامل تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ان لوگوں سے پردہ کیا جاتا چنانچہ ان کی موجودگی میں امی کمرے میں بند ہو جاتیں۔ ان کے سسر سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے بابا سے کہا کہ وہ الگ گھر میں چلے جائیں۔

الگ گھر میں جانے کے بعد بابا کو من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ مل گئی اور انہوں نے امی پر مزید پابندیاں عائد کر دیں۔ نہ جانے کس جاہل مولوی نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ عورتوں پر سختی کرنا چاہیے ورنہ وہ بگڑ جاتی ہیں۔ بابا نے امی کو مکمل طور پر قید کر دیا تھا۔ وہ باہر جاتے وقت گھر کو تالا لگا کر جاتے۔ اس دوران امی گھر میں تنہا ہوتی تھیں۔ انہیں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر بابا کی موجودگی میں محلے کی کوئی عورت امی کے پاس آجاتی تو اس کے جانے کے بعد وہ سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے۔ یہ کون تھی؟ کس لیے آئی تھی؟ کیا کہہ رہی تھی؟ ان لوگوں کو منہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ نہ جانے کس قماش کی ہے۔

پھر نہ جانے کس کے کہنے پر انہوں نے تالا لگانا چھوڑ دیا لیکن امی کو سختی سے تاکید کر دی کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں اندر سے دروازہ کی کنڈی لگا لیا کریں اور کوئی بھی آئے، دروازہ نہ کھولیں۔ انہیں گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مہینے میں ایک مرتبہ انہیں میکے والوں سے ملوانے لے جاتے اور دو تین گھنٹے بیٹھ کر ساتھ ہی واپس لے آتے۔ امی شادی کے بعد ایک مرتبہ بھی اپنے میکے میں رہنے کے لیے نہیں گئیں۔

بچوں کی پیدائش کے بعد بھی یہی صورتِ حال رہی۔ تینوں بھائی اور نادیہ مجھ سے پہلے اس دنیا میں آئے۔ میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے بابا کی لاڈلی تھی۔ وہ کبھی کبھار مجھے گود میں بٹھا کر پیار کر لیتے تھے لیکن جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی۔ مجھ پر بھی وہی پابندیاں لگ گئیں جو اس گھر کی عورتوں کا مقدر تھیں۔ ہم دونوں بہنوں نے بچپن میں کبھی فراک نہیں پہنی اور نہ ہی کبھی بال کٹوائے۔ امی ہمارے لیے گھر میں ہی بند گلے اور پوری آستین کی قمیص اور پاجامے سیتی تھیں۔ اسی طرح بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی باندھ دی جاتی۔ بچپن سے ہی ہمیں پردہ کروایا گیا۔ گھر میں کوئی مرد آتا تو ہمیں کمرے سے باہر آنے کا حکم نہیں تھا۔ اسکول میں داخلہ ہوا تو پہلے دن سے ہی چادر اوڑھا دی گئی اور آٹھویں جماعت میں برقع پہننا پڑ گیا۔

تینوں بھائی پڑھائی میں نکمے نکلے تو بابا نے میٹرک کرنے کے بعد اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ دیکھنے میں ان کی وضع قطع مولویوں جیسی تھی۔ داڑھی، سفید شلوار کرتہ، ٹخنوں سے اوپر پائنچے لیکن ان کا مذہب سے برائے نام واسطہ تھا۔ وہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے ظہر کی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ دیگر نمازوں میں باقاعدگی نہیں تھی۔ وہ تینوں بابا کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ انہی کی طرح سنگ دل، ظالم اور سفاک۔ ان کی نظر میں ماں کی کوئی عزت نہیں تھی۔ بہنوں کو وہ نوکرانی سمجھتے اور اپنے سارے کام ہم سے کرواتے۔ اگر کسی کام میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ ہمارے گھر میں ریڈیو، ٹی وی اور فون نہیں تھا۔ صرف بابا نے اپنے استعمال کے لیے موبائل فون رکھا ہوا تھا۔ اسی طرح کوئی اخبار یا رسالہ بھی نہیں آتا تھا۔ ہمیں کورس کی کتابوں کے علاوہ کچھ پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ نادیہ اپنی کسی سہیلی سے ڈائجسٹ لے آئی۔ اکبر بھائی نے اسے وہ رسالہ پڑھتے دیکھ لیا تو بابا سے جا کر شکایت لگا دی۔ انہوں نے نادیہ کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ اگر آیندہ اسے ڈائجسٹ پڑھتے دیکھ لیا تو اسکول سے اٹھا لیں گے۔

اس گھٹن زدہ ماحول میں ہماری پرورش ہو رہی تھی۔ ہم کالج میں دوسری لڑکیوں کو ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے اور اپنے کزنز کی باتیں کرتے سنتے تو ان کی قسمت پر رشک آنے لگتا، ان میں سے بعض کا تو افیئر بھی چل رہا تھا۔ ہمارے بھی کئی کزنز تھے لیکن کسی نے ہماری یا ہم نے ان کی شکل نہیں دیکھی تھی البتہ یہ سن رکھا تھا کہ چچا نے اپنے بیٹے اکرم کے لیے مجھے بچپن میں ہی مانگ لیا تھا۔ میری شادی اس سے ہو گی۔ وہ لاہور میں رہتے تھے اور بابا کی طرح قدامت پسند نہیں تھے۔ میں روزانہ نماز پڑھ کر دعا مانگتی تھی کہ میری شادی جلد از جلد ہو جائے تاکہ اس قید سے چھٹکارا حاصل ہو۔

پھر ایک دن وہ ہو گیا جس کی مجھے بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ ہوا یوں کہ نادیہ کی ایک سہیلی نجمہ کے گھر میلاد کی محفل

تھی۔ اس نے مجھے اور نادیہ کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ دراصل اس سے پہلے نادیہ نے کالج میں ہونے والی محفل میلاد میں نعت پڑھی تھی۔ نجمہ کی امی بھی آئی ہوئی تھیں۔ انہیں نادیہ کے پڑھنے کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ نادیہ ان کے گھر ہونے والی محفل میں بھی نعت پڑھے۔ ہمیں کسی سہیلی کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے نجمہ سے معذرت کی اور اسے اپنی مجبوری بتا دی لیکن نجمہ کہاں ماننے والی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہا۔ وہ بابا کو جانتے تھے چنانچہ شام کو گھر آگئے اور انہوں نے بابا سے کہا۔ ''میری بیوی کی خواہش ہے کہ آپ کی بیٹی ہمارے گھر ہونے والی محفل میلاد میں نعت پڑھے۔ میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ بچیوں کو لانے اور لے جانے کی ذمے داری میری ہے۔''

بابا انہیں انکار نہ کرسکے اور بولے۔ ''آپ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ میں اپنے چھوٹے بیٹے انور سے کہہ دوں گا وہ یہ ڈیوٹی سرانجام دے گا۔''

دوسرے دن انور بھائی نے ہمیں نجمہ کے گھر چھوڑا اور دو گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ میلاد شریف ختم ہونے کے بعد نادیہ اور نجمہ مہمانوں کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئیں۔ نادیہ پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی کہ اچانک ہی ساجد وہاں آگیا۔ وہ نجمہ کا بڑا بھائی تھا اور چھٹیوں میں کراچی سے آیا ہوا تھا۔ یہ نجمہ نے بعد میں بتایا کہ وہ کراچی میں ملازمت کرتا ہے اور شام میں لاء کالج میں بھی داخلہ لے رکھا ہے۔ دو ماہ بعد اس کا فائنل امتحان ہے پھر وہ وکیل بن جائے گا۔

نادیہ اپنے سامنے اچانک ایک اجنبی کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ چھپایا اور وہاں سے جانے لگی۔ نجمہ بولی۔ ''یہ میرے بڑے بھائی ساجد ہیں۔ ان سے کیا پردہ۔'' پھر وہ اپنے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''ساجد بھائی! آپ یہاں کیوں آگئے۔ اپنے کمرے میں جائیں۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

''میں تو پانی پینے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ یہاں پردہ دار لوگ موجود ہیں۔''

نادیہ بھاگ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور چہرہ پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد انور بھائی ہمیں لینے آگئے۔ گھر آنے کے بعد نادیہ نے مجھے پوری روداد سنائی اور بولی۔ ''مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے اگر بابا کو پتا چل گیا تو قیامت آجائے گی۔''

''پاگل ہوگئی ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''انہیں کیسے معلوم ہوگا۔'' پھر اس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''کیسا ہے وہ؟''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کہا۔ ''بہت ہینڈسم، بالکل خوابوں کے شہزادے جیسا۔''

اس وقت میں نے خلوص دل سے دعا مانگی کہ کاش میری بہن کو کوئی خوابوں کا شہزادہ ہی ملے۔

دوسرے دن نادیہ کالج گئی تو نجمہ اسے ایک کونے میں لے جاکر بولی۔ ''تم نے میرے بھائی پر کیا جادو کردیا۔ وہ تو پہلی ہی نظر میں تم پر دل و جان سے فریفتہ ہوگیا۔ اس نے کل سے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ وہ تم سے ہی شادی کرے گا۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' نادیہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ''ہمارے یہاں برادری سے باہر رشتے نہیں ہوتے۔ تم بھی اس بات کو یہیں ختم کردو۔ کسی سے کچھ مت کہنا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تو خاموش ہوجاتی ہوں لیکن ساجد بھائی پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ وہ تمہیں اپنا بنا کر ہی دم لیں گے۔''

''انہیں منع کردو نجمہ۔'' نادیہ روہانسی ہوتے ہوئے بولی۔ ''وہ کیوں میری زندگی عذاب بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تم میرے گھر والوں کو نہیں جانتیں، اگر انہیں ذرا سا بھی شک ہوگیا کہ میں تمہارے بھائی کے سامنے آئی ہوں تو وہ میری ہڈی بوٹی ایک کردیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ تم خوامخواہ ڈر رہی ہو۔ تم ایک بار ساجد بھائی سے مل تو لو۔ وہ تمہیں سب سمجھا دیں گے۔''

''میں ان سے کیسے مل سکتی ہوں۔ کل تو میلاد کی وجہ سے تمہارے گھر آنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اب کیا بہانا بناؤں گی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ اچھا میں تمہاری ان سے فون پر بات کروا دیتی ہوں۔ تم خود ہی سن لو کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے پرس سے موبائل نکالا اور ساجد کا نمبر

ڈائل کرتے ہوئے بولی۔ ''بھائی آپ خود ہی نادیہ سے بات کرلیں۔''

یہ کہہ کر اس نے موبائل نادیہ کو پکڑا دیا۔ وہ ہچکچا رہی تھی لیکن جب ساجد نے دوسری طرف سے ہیلو کہا تو اسے بھی جواب میں جی کہنا پڑ گیا۔ ساجد نے کہا۔ ''مجھے نجمہ نے آپ کے گھر کے ماحول کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اس لیے میں ملنے پر اصرار نہیں کروں گا لیکن آپ مجھے اتنی اجازت دے سکتی ہیں کہ آپ سے نجمہ کے فون پر بات کر سکوں۔''

نادیہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس نے ایک بار پھر گھبراہٹ میں جی کہہ دیا۔

''میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ بس اتنا بتا دو کہ میں تمہیں کیسا لگا؟''

''آپ بہت اچھے ہیں۔'' نادیہ نے بے ساختہ کہا اور خود ہی شرما گئی۔

''کیا میں تمہیں پرپوز کرسکتا ہوں؟''

''میں کیا جواب دوں۔'' نادیہ نے ہمت کر کے کہا۔ ''یہ ناممکن ہے۔ میں نجمہ کو بتا چکی ہوں کہ ہمارے یہاں برادری سے باہر شادی نہیں ہوتی۔''

''ناممکن کو ممکن بنانا میرا کام ہے۔ تم صرف ہاں یا نہ میں جواب دو۔''

''ٹھیک ہے آپ کوشش کرلیں لیکن کامیابی کا چانس بہت کم ہے۔''

''تم صرف مجھ سے رابطے میں رہو اور جیسا کہوں وہی کرو۔ اللہ نے چاہا تو بہتر ہی ہوگا۔''

''جب نادیہ نے مجھے یہ باتیں بتائیں تو میں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ اس بات کو یہیں ختم کردے کیونکہ بابا اپنے اصولوں سے ہٹنے والے نہیں اور وہ ساجد کا رشتہ بھی قبول نہیں کریں گے۔''

''دیکھا جائے گا۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''فی الحال تو اسے امتحان دینا ہے اور جب تک اسے وکالت کا لائسنس نہیں مل جاتا۔ وہ رشتہ نہیں بھیجے گا۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ دنوں بعد ساجد کراچی واپس چلا گیا لیکن نجمہ کے موبائل کے ذریعے نادیہ سے اس کا رابطہ رہا۔ اس کے بعد بھی وہ چھٹیوں میں ایک دو مرتبہ گھر آیا لیکن اس نے نادیہ سے ملنے پر اصرار نہیں کیا۔ وہ اس کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا۔ اس دوران نجمہ کی امی

بھی ایک دو مرتبہ ہمارے گھر آئیں لیکن حیرت انگیز طور پر بابا نے ان کی آمد پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی امی سے کچھ پوچھ گچھ کی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ بابا وقت کے ساتھ ساتھ معتدل مزاج ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے امی سے سختی بھی کم کردی تھی اور ہم لوگوں سے نرم لہجے میں بات کرنے لگے تھے۔ میں سمجھی کہ شاید یہ عمر کا تقاضا ہو لیکن اصل وجہ کچھ اور تھی جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

دراصل انہیں کاروبار میں زبردست گھاٹا ہوا تھا۔ ان کے پیسے کئی جگہ پھنسے ہوئے تھے اور کہیں سے ادائیگی نہیں ہو رہی تھی۔ جب کہ انہیں مال اٹھانے کے لیے ایک لمبی رقم کی ضرورت تھی۔ ورنہ گودام خالی ہو جاتے جس سے ان کی ساکھ متاثر ہوتی۔ ایسے میں اشرف خان ان کے کام آیا اور اس نے ضرورت کے مطابق بابا کو رقم فراہم کردی جس سے بابا کا کام ایک بار پھر چل پڑا اور ان کی ساکھ بحال ہوگئی گو کہ انہوں نے اشرف خان کا تمام قرض ادا کردیا لیکن ہمیشہ کے لیے اس کے احسان مند ہو گئے۔ چنانچہ جب اس نے نادیہ کے لیے پیغام دیا تو وہ انکار نہ کر سکے اور اسے اپنی فرزندی میں قبول کرلیا۔

نادیہ کو معلوم ہوا تو اس نے رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کرلیا۔ یہ ایک غیر متوقع فیصلہ تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بابا اتنے سنگ دل ہو سکتے ہیں۔ وہ کافی دیر تک میرے گلے لگ کر روتی رہی۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے چپ کرایا اور بولی۔ ”اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اس مشکل سے نکلنے کی ترکیب سوچو۔“

”اب سوچنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔ بابا فیصلہ کر چکے۔ اب اس پر عمل کرنا باقی ہے لیکن میں بھی اپنی ضد کی پکی ہوں۔ جان دے دوں گی لیکن اس بڈھے کھوسٹ سے شادی نہیں کروں گی۔“

”جان دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم کل صبح نجمہ کو پوری بات بتا دو اور اس سے کہو کہ وہ ساجد کو فوراً بلا لے۔ اب اس کے ایکشن لینے کا وقت آگیا ہے۔“

وہ پہلی فلائٹ سے ہی آگیا اور جیسے ہی اس کا نادیہ سے رابطہ ہوا تو اس نے کہا۔ ”اب اس مشکل سے نکلنے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ تم میرے ساتھ کراچی چلو۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ گھر سے بھاگ جاؤں۔ یہ نہیں ہو سکتا ساجد۔ میں اپنے والدین کے منہ پر کالک نہیں مل سکتی۔“

”بس تو اس چار بچوں کے باپ سے شادی کر کے ساری زندگی اس جہنم میں جلتی رہو۔“

”تم ہی کچھ سوچو؟“

”کیا سوچوں۔ اب تو میں رشتہ مانگنے بھی نہیں آسکتا کیونکہ تمہاری شادی طے ہو چکی ہے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ لوگ چار دن باتیں بنائیں گے پھر کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ نادیہ نام کی کوئی لڑکی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی لیکن تم ساری زندگی کے عذاب سے بچ جاؤ گی۔“

”میرے بھائی مجھے مار ڈالیں گے۔“

”میں ایسا بندوبست کردوں گا کہ وہ تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ پھر بھی اگر کوئی خطرہ ہوا تو ہم ملک سے باہر چلے جائیں گے۔“

”لیکن میری ایک شرط ہے۔“ نادیہ نے کہا۔

”وہ کیا؟“

”پہلے نکاح ہو گا۔ تمہارے گھر پر، والدین کی موجودگی میں پھر ہم کہیں جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے تم دن اور وقت طے کرلو۔ میں قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرلوں گا۔“

”میں کل صبح گیارہ بجے اپنی بہن کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گی۔ تم قاضی اور گواہ تیار رکھنا لیکن یہ بھروسے کے لوگ ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی بھانڈا پھوڑ دے اور بعد میں تمہارے گھر والے پریشان ہوتے رہیں۔ نکاح کے بعد میں گھر چلی جاؤں گی۔ بابا نو بجے تک سو جاتے ہیں۔ میں گیارہ بجے گھر کی دہلیز پار کروں گی۔ تم میرے گھر سے کچھ فاصلے پر میرا انتظار کرنا۔ اس کے بعد ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔“

اس نے گھر آکر مجھے پروگرام بتایا تو مجھے اس میں کوئی جھول نظر نہیں آیا البتہ مجھے بھی قاضی اور گواہوں کی طرف سے خدشہ تھا کہ کہیں وہ راز اگل نہ دیں لیکن نادیہ نے کہا کہ ساجد نے یقین دلایا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

اگلے روز پروگرام کے مطابق میں نادیہ اور نجمہ، ساجد کے گھر گئے۔ وہاں تیاری مکمل تھی۔ آدھے گھنٹے میں نکاح کی کارروائی مکمل ہوگئی اور ہم تینوں کالج واپس آگئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ساجد کے باپ نے گواہوں کی مٹھی ٹھیک ٹھاک گرم کردی تھی۔ اسی طرح قاضی صاحب

کو بھی دگنی فیس دی گئی اس لیے ان کی زبان کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حسب معمول گھر کے سب افراد نو بجے ہی سونے کے لیے چلے گئے۔ نادیہ نے ایک چھوٹے سے بیگ میں ضروری سامان رکھا اور جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ میں نے کمرے کی لائٹ آف کردی تھی تاکہ اگر کسی کی آنکھ کھل جائے تو وہ یہی سمجھے کہ ہم دونوں بھی سورہی ہیں۔ رات دس بجے کمرے سے نکل کر دیکھا۔ میدان بالکل صاف تھا۔ سب گھر والے سو چکے تھے۔ ساڑھے دس بجے میں نے ایک بار پھر باہر نکل کر دیکھا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ گیارہ بجے میں دبے پاؤں گئی اور آہستہ سے بیرونی دروازہ کھول دیا۔ گلی میں بالکل سناٹا تھا۔ البتہ آخری کونے پر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً ساجد ہی تھا۔ اس نے دروازہ کھلتے دیکھا۔ تو ٹارچ ایک دفعہ جلا کر بند کردی۔ میں نے نادیہ کو اشارہ کیا۔ وہ بیگ لے کر آئی اور پلک جھپکتے میں گھر کی دہلیز پار کرگئی۔ میں نے بھی وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا اور دروازہ بند کرکے کمرے میں آگئی۔ البتہ اندر سے کنڈی نہیں لگائی۔

☆......☆

وہ تینوں سر جھکائے کھڑے ہوئے تھے۔ پورا گھر محلے کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ مرد باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ امی کی حالت بہت غیر تھی۔ ان پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ محلے کی عورتیں انہیں سنبھالنے کی کوشش کررہی تھیں اور ساتھ ہی ان کے بے رحم تبصرے بھی جاری تھے۔ بابا نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور نحیف آواز میں بولے۔ ''کچھ پتا چلا؟''

بڑے بھائی اکبر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، جہاں جہاں اس کے جانے کا امکان تھا ہم نے وہ سب جگہیں دیکھ ڈالیں۔ ریلوے اسٹیشن، لاری اڈا، ٹیکسی اسٹینڈ، ہم اس کے کالج بھی گئے، پرنسپل نے بتایا کہ وہ کل کالج آئی تھی اور پورے وقت وہاں رہی۔ ہم نے اس کی کلاس کی کچھ لڑکیوں سے بھی پوچھا کہ انہوں نے گزشتہ چند روز کے دوران اس کے رویے میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کی لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکیں۔''

''پولیس میں رپورٹ کریں جی۔ وہی اس کا سراغ لگائے گی۔'' پڑوسیوں میں سے کسی نے کہا۔

بابا نے غصے سے اسے دیکھا اور بولے۔ ''تم چپ رہو۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ ہم خود ہی نمٹ لیں گے۔'' وہ آدمی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ایک ایک کرکے لوگ رخصت ہونے لگے۔ شام تک چچا اور میرا منگیتر اکرم بھی آگئے۔ چچا کی بھی یہی رائے تھی کہ پولیس میں رپورٹ درج کرادینی چاہیے۔ وہ جب تفتیش کریں گے تو کوئی نہ کوئی سراہاتھ آہی جائے گا۔''

''کوئی فائدہ نہیں رحمت اللہ۔ میری عزت کا جنازہ تو نکل ہی چکا۔ پولیس نے اسے ڈھونڈ نکالا تب بھی اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہوچکے ہیں۔ اب وہ مجھے کسی حال میں قبول نہیں۔ اس لیے میں پولیس میں رپورٹ درج نہیں کراؤں گا۔''

جب محلے کی عورتیں اور مرد چلے گئے تو ایک بار پھر عدالت لگی اور مجھے کمرے سے نکال کر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کردیا گیا۔ بابا نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''پتر جو کچھ تجھے معلوم ہے بتادے، اس نے تجھے کچھ بتایا تھا۔''

''نہیں۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ چچا اور اکرم کے آنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ یہ لوگ مجھ پر تشدد نہیں کرسکیں گے۔ ''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا بلکہ وہ دو دن سے کچھ چپ چپ تھی اور پرسوں رات کافی دیر تک روتی رہی۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے مجھے جھڑک دیا اور بولی۔ تم تو ایسے انجان بن رہی ہو جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ میرا جنازہ اٹھنے کی تیاری ہورہی ہے۔'' میں دھڑلے سے جھوٹ بول رہی تھی۔

''اوہ، اب میں سمجھا۔'' بابا دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے بولے۔ ''وہ کیوں گھر سے بھاگی۔''

''کاش یہ بات پہلے آپ کی سمجھ میں آجاتی تو یہ حادثہ رونما نہ ہوتا۔ کہاں وہ پچاس سال کا بوڑھا اور چار بچوں کا باپ اور کہاں ہماری نوعمر بیٹی۔ کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔'' چچا نے کہا۔

''میں نے تو یہ سوچ کر اس کا رشتہ طے کیا تھا کہ کھاتا پیتا بندہ ہے۔ اسے خوش رکھے گا۔''

''وہ اتنا بڑا قدم تنہا نہیں اٹھا سکتی۔'' اکبر بھائی بولے۔ ''ضرور کسی نے اس کی مدد کی ہے۔ اسے تو شہر کے راستوں کا بھی علم نہیں۔ وہ آج تک کالج کے علاوہ کہیں نہیں گئی۔''

''چپ کر جاسوس کی اولاد۔'' بابا نے انہیں ڈانٹ دیا۔ ''وہ پردہ کرتی تھی ہمارے گھر میں کسی مرد کا آنا جانا

نہیں۔ نہ وہ کسی کے گھر جاتی تھی۔ اس کی مدد کون کرے گا۔ بس دعا کرو کہ اللہ اسے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔“

میرا دل چاہا کہ کہہ دوں کہ آپ لوگ اس کی فکر نہ کریں۔ وہ بالکل محفوظ ہے لیکن فی الحال میں یہ بات منہ سے نہیں نکال سکتی تھی ورنہ ساجد کے گھر والے مصیبت میں پھنس جائیں گے۔

اگلے روز کالج گئی تو نجمہ نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں کراچی پہنچ گئے ہیں اور فی الحال ان کا قیام ایک وکیل دوست کے گھر پر ہے۔ نادیہ وہاں بالکل محفوظ ہے اور اگر کوئی مسئلہ ہوا تو وہ وکیل دوست سنبھال لے گا۔ نجمہ نے وعدہ کیا کہ اب اگر ساجد کا فون آیا تو وہ نادیہ سے بھی میری بات کروادے گی۔

ہمارے گھر میں تین دن سوگ کی کیفیت رہی۔ پھر زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ بابا اور بھائیوں نے بھی دکان پر جانا شروع کردیا کیونکہ پیٹ روٹی مانگتا ہے اور روٹی کے لیے ہاتھ پاؤں چلانا پڑتے ہیں۔ البتہ بابا اس واقعے کے بعد بہت مضمحل اور نڈھال رہنے لگے تھے۔ ان کا سارا رعب دبدبہ اور طنطنہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتے اور خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو۔ میں ان کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہے تھے۔ انہیں شدت سے احساس ہوگیا تھا کہ اگر... وہ اشرف خان سے نادیہ کا رشتہ طے نہ کرتے تو وہ گھر چھوڑ کر نہ جاتی۔ وہ اپنے آپ کو اس واقعے کا ذمے دار سمجھنے لگے۔ انہوں نے دکان پر بھی جانا چھوڑ دیا تھا اور عملاً سارا کاروبار اکبر بھائی نے سنبھال لیا تھا۔

ان کی غیر موجودگی میں تینوں بھائیوں کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ اکبر بھائی اپنے فیصلے مسلط کررہے تھے جب کہ دونوں چھوٹے بھائیوں کو ان کی بالادستی قبول نہیں تھی۔ چنانچہ پہلے اصغر اور پھر انور بھائی نے دکان پر جانا چھوڑا۔ اصغر بھائی نے ایک انسٹی ٹیوٹ سے ویلڈر کا کورس کیا اور ایک ایجنٹ کے ذریعے دبئی چلے گئے۔ انہیں وہاں ملازمت مل گئی تھی تو انہوں نے انور بھائی کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ اس طرح اکبر بھائی کاروبار کے بلاشرکت غیرے مالک بن گئے۔

میں نادیہ سے مسلسل رابطے میں تھی۔ اس نے گلستان جوہر کے علاقے میں فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا اور انٹر کے امتحان کی تیاری کررہی تھی اگرچہ اتنے بڑے شہر میں اس کے پہچان لیے جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وہ عبایا اور نقاب میں ہی گھر سے باہر نکلتی تھی۔ ساجد نے بھی ایک سینئر وکیل کے ساتھ کام کرنا شروع کردیا تھا اور اب اسے لائسنس ملنے کا انتظار تھا۔ میں نادیہ کو گھر کے حالات سے باخبر رکھے ہوئے تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بابا گھر پر بیٹھ گئے ہیں اور امی ہر وقت اسے یاد کرتی رہتی ہیں تو وہ بے چین ہوگئی اور کہا کہ وہ ایک دفعہ گھر واپس آکر بابا سے معافی مانگنا چاہتی ہے تاکہ اسے زندہ اور خوش وخرم دیکھ کر امی اور بابا کو قرار آجائے۔

میں نے اسے منع کردیا کہ وہ فی الحال ایسی کوئی جذباتی حرکت نہ کرے۔ بابا بہت غصے میں ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ نادیہ ان کے لیے مرچکی ہے اور وہ مرتے دم تک اس کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کریں گے۔ یہی حال اکبر بھائی کا ہے۔ وہ بابا سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ اگر انہیں نادیہ کے ٹھکانے کا پتا چل جاتا تو شاید وہ اس کے ساتھ ساتھ ساجد کو بھی گولی ماردیتے۔ میں نے نادیہ سے یہی کہا کہ وہ مناسب موقع کا انتظار کرے جب حالات سازگار ہوں گے تو میں اسے بتادوں گی۔

بابا کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ انہوں نے چچا کو فون کرکے کہا کہ وہ اپنی زندگی میں ہی میرے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں لہٰذا وہ اپنی امانت آکر لے جائیں۔ چچا چاہ رہے تھے کہ اکرم کی تعلیم مکمل ہوجائے لیکن بابا کے اصرار کرنے پر وہ مان گئے اور ایک ماہ بعد ہی میں اکرم کی دلہن بن کر لاہور آگئی۔ چچا کے یہاں کا ماحول ہمارے گھر سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے اور انارکلی میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ بڑی بیٹی کی شادی ہوچکی تھی۔ اکرم اور اسلم پڑھ رہے تھے اور چھٹی کے بعد دکان پر بیٹھتے تھے۔ اکرم کا یونیورسٹی میں آخری سال تھا۔ اس کے بعد وہ سی ایس ایس کا امتحان دینے کا سوچ رہا تھا۔ ان کے گھر میں بھی نماز روزہ کی پابندی تھی لیکن وہ بابا کی طرح قدامت پرست نہیں تھے اور نہ ہی ان کے گھر میں عورتوں پر بے جا پابندیاں تھیں۔ مرد گھر کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے اور چچی پوری طرح خودمختار تھیں۔

نادیہ کو جب میری شادی کا علم ہوا تو وہ اس میں شرکت کے لیے بے چین ہوگئی۔ اس نے فون پر مجھ سے کہا۔ ”بابا چاہے مجھے جان سے ماردیں لیکن میں تمہاری شادی میں ضرور آؤں گی۔“

میں نے ایک بار پھر اسے سمجھایا کہ وہ ایسی کوئی حماقت نہ کرے، بابا نہیں تو اکبر بھائی ضرور اسے اور ساجد کو گولی ماردیں گے اور شادی کا گھر ماتم کدہ بن جائے گا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ صبر سے کام لے میں اکرم کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتادوں گی اور ہم دونوں حالات سازگار ہونے تک اس کے راز کی حفاظت کریں گے اور جب بھی موقع ملا اس سے ملنے کراچی آئیں گے۔

اکرم کو اس راز میں شریک کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اب میری اس سے شادی ہوچکی تھی اور میاں بیوی میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ اگر کل کو اسے کسی دوسرے ذریعے سے یہ بات معلوم ہوجاتی تو میری پوزیشن خراب ہوسکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ شادی سے پہلے میں نجمہ کے فون پر نادیہ سے رابطہ کرلیتی تھی لیکن اب یہ سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ گوکہ شادی کے دوسرے دن ہی اکرم نے مجھے ایک موبائل فون گفٹ کردیا تھا لیکن میں اس سے نادیہ کو فون نہیں کرسکتی تھی اگر کسی وقت اکرم میرا موبائل چیک کرلیتا تو اس کو مطمئن کرنا مشکل ہوسکتا تھا۔

ایک دن میں نے ہمت کرکے اکرم سے کہا۔ ''اگر تم رازداری کا وعدہ کرو تو میں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''اگر وہ کوئی ایسا راز ہے جس کے افشا ہونے سے کسی بڑے نقصان کا اندیشہ ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''ہاں فی الحال اس کا افشا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ ورنہ نقصان سے زیادہ خون خرابے کا خطرہ ہے۔''

''اچھا اب بتادو بھی۔ وہ کیا بات ہے؟''

اس کے جواب سے میری ہمت بڑھ گئی اور میں نے اسے الف سے لے کر یے تک پوری بات بتادی۔ اس دوران میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی جو لحہ بہ لحہ بدل رہے تھے۔ جب میں اپنی بات ختم کرچکی تو وہ بولا۔ ''سچ پوچھو تو مجھے اس معاملے میں نادیہ سے زیادہ تایاجی قصوروار نظر آتے ہیں، اگر وہ اس بوڑھے سے اس کی شادی طے نہ کرتے تو وہ گھر سے کبھی نہ جاتی۔ ابا جان بھی شروع دن سے یہی بات کہہ رہے ہیں لیکن جن لوگوں کو اصل وجہ معلوم نہیں وہ تو نادیہ کو ہی برا کہیں گے کہ اس نے گھر سے بھاگ کر ماں باپ اور خاندان کی عزت خاک میں ملادی۔''

''اس کے لیے بھاگنے کا لفظ استعمال نہ کرو۔ وہ بھاگ کر نہیں گئی بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے شہر چلی گئی ہے۔''

''یہ بات صرف تمہیں اور نادیہ کے سسرال والوں کو معلوم ہے۔ باقی لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ رات کی تاریکی میں گھر سے بھاگ گئی۔''

''ہمیں لوگوں سے کیا لینا دینا۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ بابا اسے معاف کردیں۔''

''ہوں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس کے لیے ابا جان کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ شاید وہ تایاجی کو قائل کرسکیں۔''

''سوچ لو۔ اگر بابا پھر بھی نہ مانے تو بات بگڑ سکتی ہے۔ اکبر بھائی شاید نادیہ تک تو نہ پہنچ پائیں لیکن اس کے سسرال والوں سے ضرور پنگا لیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ساجد اور اس کے گھر والوں کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کروادیں۔ ساجد کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن اس سے دونوں گھروں میں دشمنی کی بنیاد پڑجائے گی جس کا اثر نادیہ کی زندگی پر پڑسکتا ہے۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو۔'' وہ تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ایک کام کرتے ہیں تم نادیہ سے کہو کہ وہ خود تایاجی کو خط لکھ کر اپنے بارے میں سب کچھ بتادے تاکہ انہیں اطمینان ہوجائے کہ وہ خیریت سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان سے معافی مانگ کر گھر آنے کی اجازت طلب کرے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ ان کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔ البتہ اسے یہ احتیاط کرنا ہوگی کہ وہ ساجد اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہ بتائے، وہ کوئی بھی جھوٹ بول سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اس نے اپنی ایک سہیلی کے بھائی سے شادی کرلی ہے جو نکاح کرکے اسے کراچی لے گیا تھا اور میرا خیال ہے کہ یہ سچ بھی ہے۔ صرف ساجد کا نام ظاہر نہیں کرنا ہوگا۔''

اس کی تجویز معقول تھی۔ میں نے اسی روز نادیہ کو پہلی بار فون کیا اور فون پر ساری بات سمجھادی، یہ بھی کہہ دیا کہ جب وہ بابا کو خط لکھے تو مجھے بھی بتادے۔ میں دو تین دن کے لیے میکے چلی جاؤں گی تاکہ ان کا ردِعمل دیکھ سکوں۔ اپنے موبائل فون سے یہ سہولت ہوگئی تھی کہ میں بلا روک ٹوک نادیہ سے بات کرسکتی تھی اور مجھے اس کا فون سننے کے لیے نجمہ کی محتاجی نہیں تھی۔

تیسرے دن اس کا فون آگیا۔ اس نے بابا کو خط لکھ دیا تھا لیکن اس پر اپنا پتا تحریر نہیں کیا۔ البتہ رابطے کے لیے

فون نمبر دے دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اکبر بھائی اتنے ذہین اور پڑھے لکھے نہیں ہیں کہ پولیس کی مدد کے بغیر اس نمبر کے ذریعے اس تک پہنچ سکیں اور پولیس میں انہوں نے پہلے رپورٹ درج نہیں کروائی تو اب کیسے ان سے مدد مانگ سکتے ہیں۔ اگر تین دن میں بابا نے اس سے رابطہ نہیں کیا تو وہ اپنی سم بدل لے گی۔

اس کا فون سنتے ہی میں نے میکے جانے کی تیاری شروع کردی۔ شام کو اکرم گھر آیا تو میں نے اسے نادیہ کے فون کے بارے میں بتایا اور کہا کہ کل وہ مجھے میکے چھوڑ آئے۔ اس نے کہا کہ وہ بھی اس موقع پر وہاں موجود رہنا چاہتا ہے تاکہ اگر نادیہ نے اپنے خط میں کوئی بے احتیاطی کی ہو تو وہ اسے سنبھال سکے۔ میں شادی کے بعد سے اب تک میکے نہیں گئی تھی۔ اس لیے چچی نے بخوشی اجازت دے دی۔

امی اور بابا ہمیں دیکھ کر خوش ہوگئے۔ البتہ اکبر بھائی نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا اور معمول کے مطابق دکان پر چلے گئے۔ ان کی بے رخی کو امی نے محسوس کیا اور شرمندہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ''چڑچڑا ہو گیا ہے۔ شادی جو نہیں ہو رہی۔''

''کیوں؟ اس میں کیا رکاوٹ ہے؟'' اکرم نے پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' بابا غصے سے بولے۔ ''نادیہ کی وجہ سے ہماری بہت بدنامی ہوئی ہے۔ برادری والوں نے تقریباً ہم سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ میں نے ایک دو جگہ اس کی بات چلانے کی کوشش کی لیکن وہاں سے صاف انکار ہو گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم ایسے لوگوں سے رشتہ نہیں جوڑ سکتے جہاں کی لڑکیاں گھر سے بھاگ جاتی ہوں اور تم جانتی ہو کہ ہمارے یہاں برادری سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔''

''تو کیا بھائی کی شادی کبھی نہیں ہو گی؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اس کی قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہو گا اس نادیہ نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔''

میں کہنا چاہ رہی تھی کہ نادیہ کو الزام نہ دیں۔ سارا قصور آپ کا ہے۔ آپ کے ایک غلط فیصلے نے کئی زندگیاں تباہ کردیں۔ نادیہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ ساجد بیوی کو لے کر گھر نہیں آسکتا۔ وہ کراچی میں روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ دونوں بھائی بدنامی کے ڈر کی وجہ سے ملک چھوڑ کر چلے گئے اور پردیس کی خاک چھان رہے ہیں۔ امی بیٹی کی یاد میں نیم پاگل ہو گئی ہیں۔ اکبر بھائی کو کوئی رشتہ نہیں دے رہا اور آپ خود بھی بیٹی کی جدائی کے غم کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اگر آپ اس بڈھے کھوسٹ سے نادیہ کی شادی طے نہ کرتے تو یہ سب نہ ہوتا لیکن باپ کے ادب و احترام کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔

بابا کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ ابھی تک نادیہ سے ناراض ہیں اور انہوں نے اسے معاف نہیں کیا بلکہ اب تو انہوں نے اکبر بھائی کی شادی نہ ہونے کا ذمے دار بھی نادیہ کو ہی ٹھہرا دیا تھا۔ اس لیے مجھے بالکل بھی یقین نہیں تھا کہ نادیہ کے خط کا ان پر کوئی اثر ہو گا البتہ وہ یہ جان کر ضرور مطمئن ہو جائیں گے کہ نادیہ غلط ہاتھوں میں نہیں گئی بلکہ ایک پڑھے لکھے شخص سے شادی کر کے پُرسکون زندگی بسر کر رہی ہے۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ نادیہ کا خط پڑھ کر ان کے چہرے پر ہلکی سی رونق آئی لیکن پھر وہ سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے امی سے کہا۔ ''خوش ہو جاؤ تمہاری بیٹی زندہ ہے۔ اس نے ایک وکیل سے شادی کرلی ہے اور کراچی میں مزے کر رہی ہے۔''

امی سے پہلے اکبر بھائی بول اٹھے۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ہمارے چہرے پر کالک مل کر وہ کیسے عیش کر سکتی ہے۔''

''تجھے مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو دریا میں چھلانگ لگا دے۔'' بابا نے بھائی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اس کا شوہر وکیل ہے اگر تو نے نادیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ تجھے پھانسی پر لٹکا کر ہی دم لے گا۔ میرے بڑھاپے پر رحم کھا اور یہ مرنے مارنے کا خیال دل سے نکال دے۔''

''بابا آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ اس کی وجہ سے ہی میری شادی نہیں ہو رہی۔''

''اگر تجھے شادی کرنے کا اتنا ہی ارمان ہے تو جا لے آ کسی چوڑی چمارن کو۔ میری طرف سے اجازت ہے لیکن نادیہ کا پیچھا چھوڑ دے۔''

''اب یہی کرنا پڑے گا۔'' بھائی نے گستاخ لہجے میں کہا۔

ان دونوں کی بحث کی وجہ سے اصل بات بیچ میں رہ

گئی تھی۔ میں نے اکرم کو اشارہ کیا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تایا جی پھر آپ نے کیا سوچا ہے۔ اسے فون کریں گے۔"

"نہ پتر، یہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے مجھے بہت گہرا زخم لگایا ہے جو کبھی نہیں بھر سکتا۔ اگر اسے معاف کر دیا اور گھر آنے کی اجازت دے دی تو برادری کے لوگ مجھے بے غیرت ہونے کا طعنہ دیں گے اور شاید میرے جنازے میں بھی شریک نہ ہوں۔ اس لیے میرے جیتے جی وہ اس گھر میں نہیں آ سکتی۔"

اب ہماری ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ میں نے اسی وقت نادیہ کو فون کر کے بابا کے ردِعمل سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ ان کے فون کا انتظار کرنے کے بجائے سم تبدیل کر دے۔ اگر بابا کے رویہ میں تبدیلی آئی تو میں اسے بتا دوں گی۔ یہ سن کر وہ رونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں اور اکرم انہیں منانے کی کوشش کرتے رہیں گے شاید وہ نرم پڑ جائیں۔

اکبر بھائی نے وہی کیا جو کہا تھا۔ ان کی دکان پر ایک لڑکی کپڑے خریدنے آتی تھی۔ اکبر بھائی کا اس سے افیئر شروع ہو گیا۔ وہ کسی غریب گھر سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لیے اکبر بھائی میں کشش محسوس کرنے لگی۔ انہوں نے اسے شادی کا پیغام دے دیا اس نے لڑکیوں والے روایتی انداز میں کہا کہ وہ اپنے والدین کو رشتہ مانگنے اس کے گھر بھیجیں۔ جب اکبر بھائی نے بابا سے ذکر کیا تو وہ چراغ پا ہو گئے اور بولے کہ وہ کسی قیمت پر بھی برادری سے باہر نہیں جا سکتے۔

بھائی من مانی کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے بابا کی ناراضی کی پروا نہیں کی اور خود ہی رشتہ مانگنے اس لڑکی کے گھر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے بھی بابا کی غیر موجودگی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ جانتے تھے کہ ماں باپ ساتھ نہیں رہتے لیکن لڑکا ہاتھ سے نکل گیا تو اتنا اچھا رشتہ دوبارہ نہیں ملے گا چنانچہ انہوں نے اس لڑکی سے اکبر بھائی کا نکاح کر دیا اور وہ اسے لے کر گھر آ گئے۔

بابا بہت چیخے چلائے۔ انہوں نے اکبر بھائی کو گھر اور کاروبار سے بے دخل کرنے کی دھمکی بھی دی لیکن اس پر عمل نہ کر سکے کیونکہ ایسی صورت میں وہ بالکل تنہا ہو جاتے۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اکبر بھائی کی بیوی پردہ نہیں کرتی تھی اور پورے گھر میں دوپٹے کے بغیر پھرتی تھی۔ بابا نے اسے کئی بار ٹوکا لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔

امی کا صبر رنگ لا رہا تھا۔ بابا نے اپنی زندگی میں ہی وہ سب کچھ دیکھ لیا جس سے انہیں نفرت تھی۔ اب اس گھر میں ٹی وی ہی نہیں بلکہ کیبل بھی آ گیا تھا اور بھائی کی بیوی زرینہ زیادہ وقت اس پر فلمیں دیکھنے میں گزارتی۔ گھر میں اخبار لگ گیا تھا۔ رسالے اور ڈائجسٹ بھی آنے لگے۔ زرینہ کو اچھے کپڑے اور فیشن کرنے کا شوق تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن بھائی کے ساتھ اپنے میکے چلی جاتی۔ البتہ اس میں ایک بات اچھی تھی اس نے گھر کا پورا کام سنبھال لیا تھا۔ اس طرح امی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اوپر کا کام کرنے کے لیے ماسی آتی تھی لیکن بابا نے اب بھی امی کی جان نہیں چھوڑی۔ انہیں امی کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی اور پراٹھے کھانے کی عادت تھی۔ لہٰذا امی یہ ڈیوٹی انجام دیتی رہیں۔

اکرم کے امتحان ختم ہو گئے تو ہم نے کراچی جانے کا پروگرام بنایا۔ گھر والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نادیہ سے رابطے میں ہوں۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم کسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔ چچا جان نے صرف ایک ہفتے کی اجازت دی تھی۔ وہ کراچی کے حالات سے خوفزدہ تھے۔ میں صرف اپنی بہن سے ملنا چاہ رہی تھی۔ کینٹ اسٹیشن پر نادیہ اور ساجد ہمیں لینے آئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہوگا۔ وہ دیکھنے میں ہی پڑھا لکھا اور مہذب لگ رہا تھا۔ مجھے یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ اس نے کار خرید

لی تھی۔ اسی میں بیٹھ کر وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ نادیہ کا فلیٹ بہت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا اور اس کے گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ ایک خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کررہی تھی۔ البتہ اسے والدین سے بچھڑنے کا قلق تھا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد ساجد اور اکرم ٹہلنے چلے گئے۔ نادیہ نے چائے بنائی اور ہم دونوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ وہاں ایک بڑے سائز کا LED لگا ہوا تھا۔ نادیہ نے ریموٹ سے اسے آف کیا اور بولی۔

''اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ساجد میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میں نے ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بس اب تو ایک ہی خواہش ہے۔ ہر وقت یہی دعا مانگتی ہوں کہ بابا کا دل پسیج جائے اور وہ مجھے معاف کردیں۔ ایک بار صرف ایک بار ان سے ملنا چاہتی ہوں تاکہ یہ خلش دور ہو جائے۔''

''اللہ نے چاہا تو وہ دن ضرور آئے گا۔ میں اور اکرم کوشش کررہے ہیں لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ برادری سے ڈرتے ہیں۔ شاید وہ دل میں تمہیں معاف کرچکے ہوں لیکن دنیا کو دکھانے کے لیے انہوں نے یہ رویہ اپنا رکھا ہے۔''

ساجد اور نادیہ نے ایک ہفتہ کے دوران ہمیں کراچی کے بھی قابلِ دید مقامات دکھا دیے۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ہم مزید کچھ دن قیام کریں کیونکہ اتنے بڑے شہر کو دیکھنے کے لیے ایک ہفتہ کم ہے لیکن ہم نے اس سے معذرت کرلی اور کہا کہ موقع ملنے پر دوبارہ چکر لگائیں گے۔

لاہور آنے کے بعد ایک دن اکرم نے کہا۔ ''کاش تایا جی! اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان کی بیٹی کتنی خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے اگر اس نے یہ بولڈ اسٹیپ نہ لیا ہوتا تو اب تک خون تھوک کر مرچکی ہوتی۔''

''کیوں نہ ہم ایک کوشش اور کریں۔ شاید بابا جان مان جائیں۔''

''لیکن اس بار بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ جب میں نے بابا سے کہا کہ اب وہ بالکل تنہا ہوچکے ہیں۔ تینوں بھائی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ میں اپنے گھر کی ہوچکی ہوں۔ امی آج بھی نادیہ کو یاد کرکے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔ اب تو اسے معاف کردیں۔''

''پتر! میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔ البتہ میرے مرنے پر وہ آسکتی ہے۔''

نہ جانے بابا نے کس گھڑی یہ بات کہی تھی کہ ایک ہفتے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ میں نے نادیہ کو اطلاع کی تو وہ پہلی فلائٹ سے ہی آگئی۔ دونوں بھائی بھی دبئی سے آگئے تھے۔ میں نے سب سے کہہ دیا کہ بابا نے نادیہ کو آنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس لیے کوئی اسے ان کے دیدار سے محروم نہ کرے۔ نادیہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ بار بار بابا کا ماتھا چومتی اور ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگتی رہی۔ جب وہ امی سے لپٹ کر روتی تو دیکھنے والوں کی بھی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

بابا کی تدفین ہوگئی۔ سوئم کے بعد امی نے ایک لفافہ چچا کو دیا اور کہا۔ یہ مرحوم کی وصیت ہے اسے سب لوگوں کی موجودگی میں کھولا جائے۔ چچا نے لفافہ چاک کیا اور با آواز بلند پڑھنے لگے۔

''میں مولوی برکت اللہ ولد نعمت اللہ بقائم ہوش و حواس یہ وصیت قلم بند کررہا ہوں جس کی رو سے میری تمام تمام جائیداد اثاثے شرع کے مطابق میرے وارثوں یعنی بیوی، بیٹیوں اور بیٹوں میں تقسیم کردیے جائیں۔ البتہ دکان بڑے بیٹے اکبر کی ملکیت ہوگی کیونکہ اسے بڑھانے اور سنبھالنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ میں نے اپنی بیٹی نادیہ کو بھی دل سے معاف کردیا ہے اور سب لوگوں کو اس سے تعلق قائم کرنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ گھر سے نہیں بھاگی بلکہ میں نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا اگر میں اپنے مفاد کی خاطر اس کی شادی ایک پچاس سالہ شخص سے طے نہ کرتا تو وہ کبھی یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتی۔ جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا۔ میں نے اسے معاف کردیا لیکن میری انا اس کے اظہار کی اجازت نہیں دے رہی تھی پھر برادری کے خوف کی وجہ سے بھی میں ایسا نہیں کرسکتا تھا چنانچہ مجھے سنگ دل بننا پڑا۔ میں نے آخر وقت تک اسے گھر آنے کی اجازت نہیں دی۔ اس واقعے سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو اولاد کے رشتے کرتے وقت ان کے جذبات کا خیال نہیں رکھتے۔''

فقط ایک بدنصیب باپ

میں نے دیکھا کہ اکبر بھائی کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے نادیہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا صبر رنگ لایا اور وہ ایک بار پھر اپنوں میں واپس آگئی۔

سچا آدمی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
اس وقت ہمارا معاشرہ ٹھگوں، جعلی پیروں اور چار سو بیسی کرنے والوں سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ ہر کوئی اس انتظار میں ہے کہ وہ دوسرے کو ٹھگ لے۔ ایسے معاشرے میں اچھے لوگوں کا وجود بھی باقی ہے۔ ایسے ہی ایک شخص نے میری زندگی کو بکھرنے سے بچایا ہے۔ گو کہ یہ واقعہ برسوں پرانا ہے لیکن سبق بھرا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ سرگزشت پڑھنے والوں سے بھی اس واقعہ کو شیئر کرلوں۔ اگر واقعہ پسند آجائے تو سرگزشت میں جگہ ضرور دے دیں۔
تبسم عرفان
(لاہور)

نہ جانے کیا پریشانی ہے۔
حالانکہ میری شادی کو ابھی صرف تین ہی برس ہوئے تھے لیکن ہر طرف سے انگلیاں اٹھائی جارہی تھیں کہ اولاد کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی گود کیوں نہیں بھری۔

خدا کی پناہ۔ یہ سب سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ ایک خیال ہم دونوں کو (یعنی مجھے اور میرے شوہر عرفان) آیا تھا کہ شاید ہم میں سے کسی کے جسمانی نظام میں کوئی خامی ہے لیکن جب ہم نے اس شبے کو دور کرنے کے

لیے اپنے ٹیسٹ کروائے تو سب ٹھیک تھا۔ نہ تو مجھ میں کوئی خرابی تھی اور نہ ہی عرفان میں۔

میں نے جب ڈاکٹر حمیدہ سے پوچھا تو وہ ہنس پڑی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسی پڑھی لکھی خواتین بھی اتنی پریشان ہو جاتی ہیں۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ صرف تین سال۔ میں تو ایسی خواتین کو جانتی ہوں جو دس دس سال سے بے اولاد ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے ڈاکٹر لیکن پرابلم یہ ہے کہ میری سسرال والوں کے لیے اولاد کا نہ ہونا بہت بڑا ایشو ہے۔''

''کیا آپ کے شوہر میں بھی۔''

''نہیں بالکل نہیں۔ ان کے علاوہ میری ساس، میرے سسر اور میری دونوں نندیں۔ ان کے علاوہ خاندان کی کچھ عورتیں۔ ان سبھوں نے مل کر میرا جینا حرام کر دیا ہے۔''

''تو پھر ان سے یہ کہیں کہ جائیں اور خدا کی مصلحتوں سے جنگ کریں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

یہ سب اپنی جگہ ہی لیکن میں دوسروں کو کیا سمجھاتی۔ ان میں سے اکثر کا یہ خیال تھا کہ میں بانجھ ہوں۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ وہاں ایک پرابلم یہ بھی ہے کہ اس قسم کے لوگ فوراً مرد کو دوسری شادی کا مشورہ دینے لگتے ہیں۔

''ہاں یہ تو ہے لیکن جب تک آپ کے شوہر آپ کے ساتھ ہیں آپ کی اور اپنی پرابلم کو سمجھتے ہیں اس وقت تک آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ڈاکٹر نے تو اپنی طرف سے مطمئن کر دیا تھا لیکن کیا میں مطمئن ہو گئی تھی۔

نہیں، میری سسرال میں میرے اطمینان اور عرفان کے اطمینان اور صبر کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اصل باگ ڈور ساس اور نندوں کے ہاتھ میں تھی اور ان کے کچھ جاہل رشتے داروں کے ہاتھوں میں، جو الٹی سیدھی دل توڑنے والی باتیں کیا کرتے۔

میری پریشانی دیکھ کر ایک بار عرفان نے کہا تھا۔

''تبسم! جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''عرفان! میں آپ کی طرف سے تو مطمئن ہوں لیکن دوسروں کا کیا کروں ان کی باتوں نے مجھے چھلنی کر کے رکھ دیا ہے۔''

''تم انہیں اگنور کرتی جاؤ۔'' عرفان نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔''

''عرفان مجھے تو صرف ایک دکھ ہے۔'' میری آواز اس وقت رندھی ہوئی تھی۔

''وہ کیا ہے؟''

''دوسری شادی۔''

''ہیں، کیا مطلب؟'' عرفان نے آنکھیں دکھائیں۔ ''کیا تم دوسری شادی کرنے جا رہی ہو۔''

''اوہو بکواس نہیں۔ میں تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں۔''

''کیا پاگل ہو گئی ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔'' عرفان نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ بس اب تم بے فکر ہو جاؤ۔''

میری ساس نے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ عرفان نے انہیں سمجھا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ براہِ راست تو کوئی ایسی بات نہیں کہتیں لیکن چٹکیاں لیتی رہتی تھیں۔

ایک بار میری ساس کی ایک رشتے دار ملنے کے لیے آئی۔ ان کے پانچ بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ باقی سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان سبھوں نے مل کر پورے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔

ہم اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے۔ جب ساس کی رشتے دار نے میری ساس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''خالدہ بہن! معاف کرنا میرے بچوں نے تمہارے پورے گھر کو ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے۔''

''ارے کیا بات کر رہی ہو۔'' ساس جلدی سے بولیں۔ ''یہی تو زندگی ہے۔ کتنی رونق لگی ہوئی ہے گھر میں۔ بچوں کے بغیر تو گھر قبرستان جیسا ہو جاتا ہے۔''

ظاہر ہے وہ مخاطب تو اپنی اسی رشتے دار سے تھیں لیکن طنز مجھ پر کر رہی تھیں۔ یہ بات مجھے سنانے کے لیے کہی گئی تھی۔

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ان لوگوں سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ انہیں اس بات کی کیا پروا ہو سکتی تھی کہ کسی کے دل پر کیا گزر گئی ہو۔

پتا نہیں ہمارے معاشرے میں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ عورت ہی عورت کی دشمن کیوں ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید شوہر کو اتنی زیادہ کمی کا احساس نہ ہوتا ہو جتنا احساس دادا یا دادی وغیرہ کو ہوا کرتا ہے اور اپنی خواہش کے نتیجے میں

بہو کی زندگی تلخ کر کے رکھ دیتے ہیں۔
خود میرے خاندان میں ایسے کئی کیسز تھے کہ سات سال کے بعد اولاد ہوئی تھی۔ میں اکثر اپنی ساس کو مثالیں بھی دیا کرتی لیکن ان کی ایک ہی رٹ ہوتی تھی۔ ''میں یہ سب نہیں جانتی۔ مجھے تو اپنے آنگن میں پھول چاہیے۔''
''اماں جب تک خدا کی مرضی نہ ہو آنگن میں پھول کہاں سے آسکتا ہے۔''
اس کا کوئی جواب نہ ہونے کے بعد بھی وہ بلیک کرتی رہتیں۔
ان کو مہمیز کرنے والی ان کی دونوں بیٹیاں یعنی میری نندیں تھیں۔ ان دونوں کی ابھی شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہا کرتی تھیں اور میری زندگی کے لیے عذاب بنی ہوئی تھیں۔
نہ جانے کیوں۔ کچھ دنوں سے مجھے یہ خیال آنے لگا تھا کہ شاید میرا وہ اندیشہ صحیح ہونے جا رہا ہے۔ عرفان کی دوسری شادی کا اندیشہ۔
کچھ دنوں سے ایک ایسی عورت کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہو گیا تھا جو رشتے لگوایا کرتی تھی۔ مجھے اس طرح معلوم تھا کہ میری دونوں نندوں کے رشتوں کے لیے وہی کوشش کر رہی تھی۔
خیر اس سلسلے میں اس کا ہمارے یہاں آنا جانا کوئی ایسی حیرت یا اعتراف کی بات نہیں تھی لیکن مجھے شک اس وقت سے ہونا شروع ہوا جب ایک دن وہ عورت آئی ہوئی تھی۔ ساس سے اس کی باتیں ہو رہی تھیں اور جب میں اچانک ان کے سامنے آگئی تو دونوں خاموش ہو گئیں۔
ان کی خاموشی بہت معنی خیز تھی۔ بہت کچھ بتا رہی تھی۔ اس کے بعد بھی کئی بار ایسا ہوا کہ جب میں ان کے سامنے آتی تو وہ دونوں خاموش ہو جاتیں۔
اگر بات نندوں کے رشتوں کی تھی تو پھر مجھ سے راز داری کس بات کی تھی۔ ان کو تو میرے سامنے بھی گفتگو کرتے رہنا چاہیے تھا۔
اور پہلی بار عرفان بھی یہ سن کر سنجیدہ ہو گئے تھے لیکن میری تسلی کے لیے کہنے لگے۔ ''پریشان مت ہو۔ میں نے اماں کو سمجھا دیا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ میں کسی بھی حال میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔''
اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے سکون رہا۔ پھر ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ یہ بھی ایک عام سا مشاہدہ ہے اب بہت سے گھرانوں میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔
وہی پیروں فقیروں والی کہانی۔ فلاں بابا، فلاں بابا۔ فلاں کی گود ہری ہو گئی۔ فلاں کے دن بدل گئے۔ فلاں کا مقدمہ ختم ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔
بدقسمتی سے میری ساس اور دونوں نندوں کا مزاج بھی ایسا ہی تھا۔ عرفان تو بظاہر ایسی باتوں کے خلاف تھے۔ لیکن کیا معلوم کہ وہ بھی اندر ہی اندر ایسی لغویات کے قائل ہوں۔ ماں کا اثر تو آیا ہی کرتا ہے۔
میں یہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار میں ان لوگوں کی باتوں میں آکر کسی بابا وغیرہ کے چکر میں پھنس گئی تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔
نہ جانے اس ملک میں ایسے کتنے ہی واقعات ہوا کرتے ہیں۔
ایک دن میرا اندیشہ درست ہو گیا۔ ساس نے مجھ سے براہ راست اس موضوع پر بات کر لی۔ ''تبسم بیٹا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' خلاف معمول ان کا لہجہ بہت نرم اور دھیما تھا۔ میں اسی وقت کھٹک گئی۔ جب وہ میرے پاس آکر بیٹھی تھیں۔
''جی اماں بتائیں۔''
''بیٹا! تم پڑھے لکھے لوگ ایسی باتوں کو نہیں مانتے، یہی پریشانی ہے۔''
''کیسی پریشانی؟''
''ارے بیٹا یہ جو اللہ والے ہوتے ہیں نا ان کی دعاؤں سے ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔''
میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہی کہانی ہونے والی ہے۔ ''جی اماں، میں سمجھتی ہوں۔''
''خوش رہو۔ تو بیٹا ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔'' ساس نے کہا۔ ''کسی سے ایک پائی نہیں لیتے۔''
''تو پھر یہ کام کیوں کر رہے ہیں؟''
''کیسی بات کر رہی ہو۔'' ساس اس تبصرے پر کچھ ناراض ہونے لگی تھیں۔ ''ارے بیٹا وہ تو مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے یہ سب کرتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تم ان کے پاس جاؤ گی۔ میں خود لے جاؤں گی تمہیں۔ تم دیکھ لینا کس طرح گود ہری ہوتی ہے۔''
اس کا مطلب یہ تھا کہ میری ساس پکا ارادہ کر چکی تھیں کہ وہ ہر حال میں مجھے اس بابا کے پاس لے کر جائیں گی۔ چاہے وہ کیسا ہی ہو۔ اس کی نیت کتنی ہی خراب کیوں

نہ ہو۔ اس پاگل اور جاہل عورت کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔
شام کو جب عرفان آئے تو میں نے انہیں بتاتے ہوئے کہا۔ ''سن لیا آپ نے اب بچے کے چکر میں مجھے کہاں جانا ہے، کسی عامل بابا کے پاس۔ پتا نہیں کیا ہو گیا۔ روزانہ اخبار میں خبریں شائع ہوتی ہیں۔ ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے کہ یہ بدفطرت لوگ ہوتے ہیں۔ عورت کی عزت سے کھیلنے والے۔ پھر بھی مجھے اس کے پاس جانا پڑ رہا ہے۔''
''تبسم اب یہ تو مجبوری ہے نا۔'' عرفان نے دھیرے سے کہا۔
میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ سب سن کر بھڑک اٹھیں گے۔ سختی سے اپنی ماں کو منع کر دیں گے کہ وہ ان چکروں میں نہ پڑیں لیکن اس کے بجائے وہ یہ کہہ رہے تھے کہ یہ مجبوری ہے۔''
''عرفان کیا آپ کو اس بات کی بھی پروا نہیں ہو گی کہ میں کسی مکار عامل بابا کی ہوس کی بھینٹ چڑھ جاؤں۔''
''ارے جان ایسا کچھ نہیں ہو گا۔''
''کمال ہے۔ مجھے اس وقت آپ کی باتوں پر حیرت ہو رہی ہے لیکن کان کھول کر سن لیں میں نہیں جاؤں گی۔''
''ضد نہ کرو، چلی جاؤ۔''
''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ ایک باخبر آدمی ہیں۔ اس کے باوجود آپ یہ کہہ رہے ہیں۔''
''ہاں یہ میں کہہ رہا ہوں۔ تم جا کر تو دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے۔ پھر یہ بھی تو سوچو کہ تم چلی گئیں تو اماں کو اطمینان ہو جائے گا کہ تم نے ان کی بات مان لی ہے۔''
اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں جھلا کر بولی۔ ''اگر آپ بھی اس میں خوش ہیں تو میں ضرور جاؤں گی۔ چاہے میرے ساتھ کچھ بھی ہو جائے۔''
میں نے اپنی ساس سے کہہ دیا کہ ہاں میں ان کے عامل بابا کے پاس جانے کو تیار ہوں۔ ساس یہ سن کر خوش ہو گئی تھی۔ یہ سب تو تھا لیکن میں عرفان سے ناراض رہی۔ میں نے دو دنوں تک اس سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ خدا جانے یہ مرد بھی کس مزاج کے ہوتے ہیں۔
ایک طرف تو اتنے روشن خیال پڑھے لکھے اور دوسری طرف یہ کہ مجھے کس چیز کے پاس بھیجنے کو تیار۔ اب ایسی بھی کیا مجبوری۔ شادی کو ابھی صرف تین ہی سال تو ہوئے تھے تیس سال تو نہیں ہو گئے تھے۔ پھر یہ کیسی بے قراری تھی۔
میری ساس اس بابا سے ملاقات کا وقت بھی لے کر آ گئی۔ وہ بہت پُرجوش اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ''بس بیٹا سمجھو کہ ہمارا کام بن گیا۔''
''وہ کیسے؟''
''ارے وہ بابا بہت مشکل سے ملنے کا وقت دیتے ہیں تمہارے لیے فٹافٹ وقت نکال لیا۔''
''وہ تو ٹھیک ہے۔ یہ بتائیں پیسے کتنے لیے۔''
''کیسی بات کر رہی ہو۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے لیے ایک پیسا بھی نہیں لیتے۔ کوئی مسجد بنا رہے ہیں اس کے لیے لیتے ہیں۔''
''اور آپ کتنا دے کر آئی ہیں؟''
''صرف پانچ ہزار۔'' ساس نے بتایا۔ ''اولاد جیسی نعمت پانے کے لیے پانچ ہزار کی کیا حقیقت ہے۔''
''ہاں واقعی کوئی حقیقت نہیں ہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ''چلیں ٹھیک ہے۔ تو پھر کب کا وقت دیا ہے آپ کے پہنچے ہوئے بزرگ نے؟''
''کل شام کا۔'' ساس نے بتایا۔ ''بس کل شام کو ان کے یہاں حاضری دینی ہے۔''
مختصر یہ کہ دوسری شام کو میں اور میری ساس مجھے لے کر بابا کے پاس پہنچ گئیں۔ مجھے راستے میں معلوم ہوا کہ ہم جن کے پاس جا رہے تھے ان کا نام انور ہاشمی تھا۔
ایک عام سا گھر تھا۔ ایک منزلہ۔ اس قسم کے سو دو سو گز پر بنے ہوئے مکانات شہر کے بہت سے علاقوں میں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ بابا کے آستانے کے باہر جھنڈے وغیرہ لگے ہوں گے اور بہت سے عقیدت مند حلقہ باندھے بیٹھے ہوں گے لیکن وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔
بالکل سناٹا ہو رہا تھا بلکہ وہ گلی ہی ویران ہو رہی تھی۔ اب گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں ضد میں آ کر ساس کے ساتھ یہاں تک چلی تو آئی تھی لیکن اب طرح طرح کے اندیشے مجھے گھیرنے اور پریشان کرنے لگے تھے۔
دروازے پر ایک گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ ساس نے اس گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد لوہے کا چھوٹا سا گیٹ کھل گیا تھا۔
دروازہ کھولنے والا چودہ پندرہ برس کا ایک لڑکا تھا جو سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔
''ہم ہاشمی صاحب سے ملنے آئے ہیں۔'' ساس نے

بتایا۔

''بابا تو سو رہے ہیں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔ اس وقت پتا چلا کہ یہ لڑکا ہاشمی صاحب کا بیٹا تھا۔

''بیٹا ہم بہت دور سے آئے ہیں۔'' میری ساس نے کہا۔ ''بابا نے ہمیں وقت دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' لڑکے نے کچھ سوچ کر گردن ہلا دی۔ ''آپ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں بابا کو بتاتا ہوں۔''

ہمارے لیے گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں بیٹھ کر میری وحشت کچھ اور بڑھنے لگی تھی۔

کمرے کی سجاوٹ تو عام سی تھی۔ وہی صوفے، میز اور قالین وغیرہ لیکن اس کمرے میں کچھ عجیب طرح کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کچھ نامانوس سی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کس قسم کے عطر کی خوشبو ہے یا اگربتیاں جل رہی ہیں۔ بہرحال اس خوشبو نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔

دس منٹ اس طرح گزر گئے۔ دس منٹ کے بعد وہی لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ دونوں میں سے ضرورت مند کون ہے۔'' شاید یہ جملہ اسے رٹا دیا گیا ہوگا۔

''بیٹا یہ میری بہو ہے۔'' ساس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس کے ساتھ آئی ہوں۔''

''تو پھر آئیں آپ آنٹی۔'' لڑکے نے مجھے مخاطب کیا۔ ''بابا آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''میں بھی چلوں۔'' ساس نے پوچھا۔

''نہیں آپ نہیں، صرف یہ جائیں گی بابا کے پاس۔''

میرا خون کھول اٹھا۔ وہ اپنے کمرے میں صرف مجھے بلا رہا تھا اور وہ بھی اتنی دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ۔

''نہیں اماں، میں اکیلی تو نہیں جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت میری ساس بھی کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔

''چلیں جلدی، بابا کو کہیں جانا بھی ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔'' میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر اس کم بخت نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو میں ہنگامہ مچا دوں گی۔

''چلو۔'' میں نے اس لڑکے سے کہا۔ ''مجھے لے چلو۔''

لڑکا ایک کمرے کے دروازے پر آکر رک گیا۔

''جائیں اندر چلی جائیں۔''

میں ہلکی سی دستک دے کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرے کا ماحول صاف ستھرا تھا۔ ایک تخت پر ہاشمی صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

ہاشمی صاحب چالیس اور پچاس کے درمیان ہوں گے۔ میرا پہلا تاثر ہی غلط ثابت ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس طرح کے بابا ہوں گے جس طرح کے بابا حضرات ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں۔ وحشت زدہ چہرہ، بڑھی ہوئی

داڑھی، ہاتھ میں انگوٹھیاں اور کڑے وغیرہ۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

ہاشمی صاحب صاف ستھرے کپڑوں میں تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہاشمی صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں نہیں جانتا کہ ہمارے ملک سے جہالت کب ختم ہوگی۔''

''جی!'' میں نے حیران ہوکران کی طرف دیکھا۔ یہ بات بالکل غیر متوقع تھی۔

''لوگ سمجھتے ہیں کہ اولاد پیروں اور باباؤں کے ہاتھ میں ہے اور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کی خواہش کسی اور سے کرنا کفر ہے۔ جو دیتا ہے وہ اللہ دیتا ہے۔ تمہیں میری بجائے ڈاکٹرز کے پاس جانا چاہیے تھا۔''

''جی میں وہاں بھی گئی تھی۔'' میں نے دھیمی زبان میں بتایا۔ اس وقت میرے غبارے سے ساری ہوا نکل چکی تھی۔

''وہی برابر راستہ ہے۔'' ہاشمی صاحب نے کہا۔ ''اتنی سی بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی جعلی پیروں اور فقیروں کے چکر میں پڑ کر اپنے آپ کو برباد کرلیتی ہیں۔''

وہ جو کچھ بھی کہہ رہے تھے وہ مجھے حیران کیے جارہا تھا۔

''کیا بات ہے تم اس طرح حیران ہو کر مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ میرے ذہن میں تو کوئی اور بات تھی کچھ اور تصور تھا۔ آپ تو اس کے برعکس نکلے۔''

''ہاں میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہے۔'' ہاشمی صاحب ہنس پڑے۔ ''لوگوں کو یقین ہی نہیں آتا اور ہاں۔'' انہوں نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ ''لو یہ تم رکھ لو۔''

''یہ...... یہ کیا ہے جناب۔'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہ وہ پانچ ہزار روپے ہیں جو تمہاری بے وقوف ساس مجھے دے گئی تھی۔ یہ تم اپنے پاس رکھ لو لیکن اپنی ساس کو نہیں بتانا۔''

''لیکن جناب مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''کچھ بھی نہیں۔ تم بس بچہ بن جاؤ۔ میرا مطلب ہے کہ اولاد کے لیے خدا سے اس طرح ضد کرو جیسے کوئی بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے۔ اس نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہاں میری ایک نصیحت یاد رکھو گی؟''

''کیوں نہیں جناب، آپ فرمائیں۔''

''کسی پیر فقیر یا بابا وغیرہ کے پاس مت جانا۔ ہم میں سے ہر شخص اللہ والا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کو اس نے پیدا کیا ہے۔ اپنی دعائیں خود مانگا کرو۔ بس اتنا کہنا تھا اور ہاں اپنی ساس کو بھیج دینا میں اس کو بھی کچھ سمجھا دوں۔''

کمرے میں آتے ہوئے میرے تاثرات تو کچھ اور تھے لیکن ہاشمی صاحب کے کمرے سے نکلتے ہوئے تاثرات بالکل بدل چکے تھے۔ میں غصہ لے کر اندر آئی تھی اور اب عقیدت لے کر باہر جارہی تھی۔

میں نے ساس کے پاس آکر کہا۔ ''جائیں بابا صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' ساس جلدی سے کھڑی ہوگئیں۔ ''یہ بتاؤ کیسے ہیں بابا۔''

''کیا مطلب۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا۔''

''نہیں تو میں نے تو بس تعریف سنی تھی۔''

''واقعی بہت بڑے انسان ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ بس آپ مل کر آجائیں۔''

ساس چلی گئی۔ دس منٹ کے بعد واپس آئی تو بہت پرجوش اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ''انہوں نے کہا ہے کہ دو سال کے اندر اندر اولاد ہو جائے گی۔''

میں نے دل ہی دل میں اس نیک انسان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے زبردست حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے میری ساس کو دو سال تک کے لیے اطمینان دلا دیا تھا اور اس دوران اگر خدا کی مدد شامل حال رہتی تو بہت کچھ ہوسکتا تھا۔

اس کے بعد ہوا یہ کہ میری ساس مطمئن ہو کر بیٹھ گئیں۔ رشتہ لگانے والی کا آنا جانا بھی ختم ہوگیا اور ایک سال کے بعد خدا نے ہمیں ایک اولاد بھی دے دی۔

میں خدا کے بعد اس نیک انسان کی شکر گزار تھی اور آج تک ہوں اور اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہزاروں جعلی اور دھوکے باز قسم کے باباؤں کے درمیان ہاشمی صاحب جیسے اچھے انسان بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ خدا انہیں خوش رکھے۔
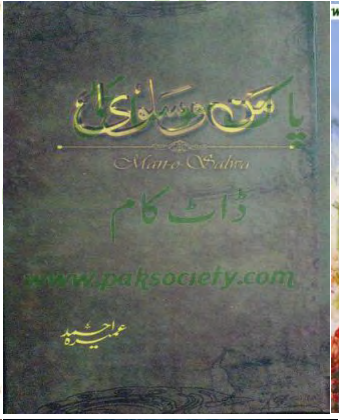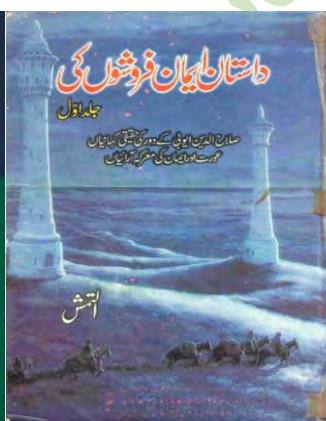
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کولہو کا بیل

جناب معراج رسول
السلام علیکم
میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں لیکن سرگزشت پڑھنے کی شوقین ہوں۔ عرصے سے اس میں شامل سچ بیانیاں پڑھ رہی ہوں۔ دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھتے پڑھتے خیال آیا ہے کہ اپنی آپ بیتی بھی لکھ لوں۔ جس طرح ممکن ہوا اسے لکھ لیا ہے لیکن کسی قلم کار کی طرح اچھے اچھے جملے لکھ نہیں سکی۔ اس لیے گزارش ہے کہ کسی اچھے قلم کار سے اسے دوبارہ لکھوا لیں۔
نازو
(خانیوال)

میں خانیوال کے ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ میرے گھر میں دولت کی ریل پیل ہے، مویشی ہیں، میرے شوہر کی زرعی زمین ہے لیکن اس کے باوجود میں گھر میں نوکروں کی طرح کام کرنے پر مجبور ہوں۔ نوکر تو پھر کچھ رعایت کے حق دار ہوتے ہیں، میں تو دن رات گدھوں کی طرح کام کرتی ہوں اور میری سوکن عیش کرتی ہے۔ جی ہاں میں اپنے شوہر رشید کی دوسری بیوی ہوں۔

میں صبح منہ اندھیرے اٹھتی ہوں، بھینسوں کا دودھ

دو ہنے کے بعد ان کے چارے کا بندوبست کرتی ہوں۔ پھر دودھ سے مکھن نکالنے بیٹھ جاتی ہوں۔ اسی دوران میں رشید اور میری سوکن زرینہ کے بچے اٹھ جاتے ہیں۔ میں ان سب کے لیے ناشتے کا انتظام کرتی ہوں، رشید کے کپڑوں پر استری کرتی ہوں۔ رشید خاصا خوش پوش اور جامہ زیب ہے۔ لباس کے معاملے میں وہ بہت حساس ہے۔ اپنے کپڑوں یا جوتوں پر گرد و غبار کا ایک ذرہ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اس کی یہی خوش لباسی اور جامہ زیبی دیکھ کر تو میں ریجھ گئی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہوکر میں گھر بھر کے کپڑے دھونے بیٹھ جاتی ہوں اور میری سوکن زرینہ تخت پر بیٹھی میری بے بسی کا تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ کپڑوں سے فارغ ہوکر صفائی، برتن دھونے اور کھانے کا بندوبست کرنے میں پورا دن گزر جاتا ہے۔ جب میں سونے لیٹتی ہوں تو میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے اور مجھے ہوش نہیں ہوتا کہ میرے اردگرد کیا ہورہا ہے۔ پھر ایسی نیند آتی ہے کہ مجھے کچھ ہوش نہیں رہتا لیکن نیند کا یہ وقفہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ میری تھکن پوری طرح اترنے بھی نہیں پاتی کہ نئے دن کا آغاز ہوجاتا ہے۔

اپنی اس مصیبت بلکہ عذاب کی ذمے دار بھی میں خود ہی ہوں۔ شاید یہ میرے پہلے شوہر اکبر کی بددعا کا اثر ہے۔ میں نے اس سیدھے سادے انسان کا دل دکھایا ہے، اس کے اعتماد کا خون کیا ہے۔ اس کی سزا تو مجھے ملنا ہی تھی۔

میں اپنے گاؤں کی حسین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ یہ میرا نہیں بلکہ گاؤں کی عورتوں کا خیال تھا۔ ان کے اس خیال کو تقویت گاؤں کے نوجوانوں کے رویے سے ملی۔ اکثر منچلے میری راہ میں آنکھیں بچھائے رہتے تھے۔ مجھ سے کچھ کہنے کی جرأت ان میں سے کسی کو نہ تھی کیونکہ میں خاصی ہتھ چھٹ واقع ہوئی تھی اور گاؤں کے کئی لڑکوں کی سرِعام پٹائی کرچکی تھی۔

بابا کی کچھ زرعی زمین تھی۔ گاؤں میں ہمارا پختہ مکان تھا، ڈھور ڈنگر تھے۔ زندگی بہت سہل تھی۔

بابا کو تعلیم کا شوق تھا۔ وہ خود تو علم حاصل نہ کرسکے تھے لیکن چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی علم ضرور حاصل کرے۔ بابا نے مجھے گاؤں کے اسکول میں داخل کرادیا۔ ان کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے ارمان تھے۔ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ مجھے پڑھنے لکھنے سے بالکل دلچسپی نہیں تھی لیکن میں فطری طور پر ذہین تھی۔ اس لیے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود میری تعلیم جاری تھی اور ہر سال معقول نمبروں سے پاس بھی ہوجاتی تھی۔

میں ان دنوں پانچویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ اسکول کی چھٹیاں تھیں اس لیے میں دن بھر اپنی سہیلیوں نوری اور کلثوم کے ساتھ گاؤں کے کھیتوں میں ماری ماری پھرتی تھی۔ اکثر ہم لوگ چاچا فتح محمد کے آموں کے باغ کی طرف نکل جاتے اور اس وقت تک کیریاں توڑتے رہتے جب تک کھیتوں کا رکھوالا خیرو وہاں نہ آجاتا۔

خیرو چالیس پچاس سال کا آدمی تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں کو ایک آدھ تھپڑ بھی ماردیتا تھا لیکن مجھے صرف ڈانٹ کر چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت تو مجھے احساس نہ ہوا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے لیکن دو تین برس بعد مجھے اس مہربانی کا سبب معلوم ہوگیا۔ وہ بے چارہ میرے حسن سے مرعوب تھا۔

اس صبح بابا نے مجھے منہ اندھیرے اٹھادیا اور بولے۔ ”اٹھ جا نازو میں شہر جارہا ہوں۔ تجھے کچھ منگوانا ہے تو بتا دے۔“

میں نہ جانے کب سے بابا کے شہر جانے کے انتظار میں تھی اور اپنی چیزوں کی ایک فہرست بنا رکھی تھی۔

بابا میرا ماتھا چوم کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے ان کی واپسی کا انتظار شروع کردیا۔ میں نے شہر سے اپنے لیے کپڑے، نئے فیشن کی سینڈل، سرخی پاؤڈر اور اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں منگوائی تھیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اب بابا کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

دوپہر کو ایک بجے کے قریب گاؤں میں اطلاع پہنچی کہ بابا جس بس میں جارہے تھے وہ ایک تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا گئی۔ اس حادثے میں بابا سمیت پانچ آدمی جاں بحق ہوئے تھے۔ زخمیوں کی تعداد ان کے علاوہ تھی۔

میری تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ مجھے بابا سے شدید محبت تھی۔ اماں کی حالت مجھ سے بھی زیادہ قابلِ رحم تھی۔ وہ بالکل گم صم ہوکر رہ گئی تھیں۔

بابا کی زمین کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اماں نے وہ زمین چاچا نور محمد کو ٹھیکے پر دے دی۔ چاچا نور محمد، بابا کا دوست تھا۔ وہ انتہائی دیانت دار اور مخلص شخص تھا۔ گاؤں والے اس کی عزت کرتے تھے۔ یوں بابا کے بعد ہمیں مالی طور پر کوئی پریشانی نہ ہوئی اور زندگی اسی طرح گزرنے لگی۔ البتہ یہ فرق پڑا کہ اماں نے مجھے اسکول سے

اٹھالیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں اور مجھے گھر میں بیٹھنا چاہیے۔

مجھے اس فیصلے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ مجھے یوں بھی پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بابا کی ضد کے باعث میں نے مارے باندھے پانچویں پاس کرلی تھی اور اماں کے خیال میں یہ تعلیم میرے لیے کافی تھی۔

نور پور اماں کا میکہ تھا۔ ان کے میکے میں اب سوائے رشتے کے ایک بھائی کے اور کوئی نہیں رہا تھا۔ ان سے بھی ہمارے کوئی ایسے خاص تعلقات نہیں تھے۔ بس اماں کبھی کبھی اپنے ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے اور اپنا آبائی گھر دیکھنے کے لیے سال چھ مہینے میں ایک دفعہ نور پور چلی جاتی تھیں۔ جب تک بابا زندہ تھے میں کبھی اماں کے ساتھ نور پور نہیں گئی تھی۔ ہاں بچپن میں اماں کے ساتھ وہاں جاتی رہی تھی۔

ایک دن اماں پھر نور پور جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ میں گھر میں اکیلی تو رہ سکتی تھی لیکن اماں کا خیال تھا کہ جوان جہان لڑکی کو تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ نور پور کا فاصلہ ہمارے گھر سے ڈیڑھ سو میل کے قریب تھا۔ ہم لوگ صبح لاری میں سوار ہوئے تھے، شام ڈھلے نور پور پہنچے۔

ہمارے گاؤں کے مقابلے میں نور پور خاصا بڑا تھا۔ وہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مڈل اسکول بھی تھا اور اسپتال بھی۔ ہمارے گاؤں کے مقابلے میں وہاں کا بازار بھی کافی بڑا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں میرا دل نہیں لگ رہا تھا کیونکہ وہاں میری کوئی سہیلی نہیں تھی۔

میں ایک دن اکیلی ہی قصبے کی سیر کو چل دی۔ میں وہاں کا بازار دیکھ کر ایسی مگن ہوئی کہ آگے ہی آگے بڑھتی رہی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ ایک دو بدمعاش لڑکے میرے پیچھے لگ گئے۔ میں بازار کے دوسرے سرے پر نکل گئی۔ وہاں آبادی کچھ کم تھی اور مکان بڑے بڑے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اس لیے گلی میں لوگوں کی آمد بھی برائے نام تھی۔

ویرانہ دیکھ کر وہ دونوں بدمعاش میرے نزدیک آ گئے تو مجھے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔ انہیں اپنے سر پر دیکھ کر میں خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگی تو وہ دونوں بھی میرے تعاقب میں بھاگے اور کچھ دور جا کر ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔

ان میں سے ایک نے میری کلائی پکڑی اور اوباش لہجے میں بولا۔ ''بھاگی کہاں جارہی ہو میری جان، ہم اتنے

پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق فاسٹ بالر سرفراز نواز یکم دسمبر 1948ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر سے انہوں نے اپنے کرکٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ پاکستان کی جانب سے 55 ٹیسٹ میچوں میں انہوں نے 177 وکٹیں حاصل کیں، جبکہ 45 ون ڈے میچوں میں وہ 45 کھلاڑیوں کو اپنا شکار بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کے والد مرحوم محمد نواز لاہور کے معروف کنٹریکٹر تھے۔ تعمیراتی کام کے حوالے سے انہیں بہت زیادہ شہرت حاصل تھی۔ ان کی والدہ حسن آرا بیگم گھریلو خاتون تھیں۔ سرفراز نواز کے دو بھائی ہیں۔ جاوید نواز، جو کہ ان سے بڑے ہیں اور شاہد نواز ان سے چھوٹے ہیں۔ بڑے بھائی لاہور میں اور شاہد انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ چھوٹے بھائی نے انگلینڈ میں پروفیشنل لیگ کرکٹ کھیلی جبکہ پاکستان کے قومی سطح کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا، تین بہنیں عظمت، فضیلت غفور اور عائشہ شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش گوار زندگی بسر کر رہی ہیں۔

مرسلہ: ریحانہ ہمدانی، لاہور

برے تو نہیں ہیں۔''

''میرا ہاتھ چھوڑو۔'' مجھے ایک دم غصہ آ گیا لیکن میرا لہجہ کھوکھلا تھا۔

''تیرا ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا ہے۔'' وہ مکاری سے ہنس کر بولا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو ورنہ میں شور مچا دوں گی۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''اچھا۔'' وہ مجھے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر مچا شور۔''

میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

میرا تھپڑ کھا کر وہ غضب ناک ہو گیا اور اس نے جوابی طور پر میرے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا اور میرے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔

میری چیخ نکل گئی اور میں بے اختیار زور زور سے چیخنے لگی۔

اس وقت ایک مکان کا دروازہ کھلا اور دراز قد

نوجوان گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کا بدن کسرتی اور ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ''تاجے یہ کیا کررہا ہے۔ کون ہے یہ؟''

''اوئے تو اپنے کام سے کام رکھ۔'' اس بدمعاش نے بپھر کر کہا۔

''برے کام کو چھوڑ۔'' نوجوان بھی بپھر گیا۔ ''اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دے۔''

''تو اس چکر میں مت پڑ اکو۔'' بدمعاش بھنا کر بولا۔ ''جا اندر جا۔''

نوجوان واقعی اندر چلا گیا۔ وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ دوسرا بدمعاش ہنس کر بولا۔ ''واہ تاجے استاد! اکو تو تیری ایک ہی جھڑک میں بھاگ گیا۔''

مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا لمبا، اونچا اور مضبوط جوان تھا، بس ایک ہی جھڑک میں وہاں سے بھاگ گیا۔

''اب شور مچا۔'' تاجا تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ ''تیرا حمایتی تو بھاگ گیا۔''

مجھ پر گویا خون طاری ہو گیا۔ میں نے تاجے کے چہرے پر کئی تھپڑ رسید کر دیے اور اس کی کلائی میں دانت گاڑ دیئے۔ میں دیوانہ وار لاتیں بھی چلا رہی تھی۔

اچانک تاجا چیخ مار کر... پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت میری نظر اس نوجوان پر پڑی جسے تاجے نے اکو کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی اور مضبوط لاٹھی تھی۔ اس نے لاٹھی کا دوسرا وار تاجے کی ٹانگوں پر کیا۔ تاجا بلبلا کر زمین پر گر گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی شاید پہلے ہی وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

''تو نے اچھا نہیں کیا اکو۔'' تاجا کراہ کر بولا۔ ''مجھ سے دشمنی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔''

''اب دفع ہو جا یہاں سے۔'' تاجا بپھر کر بولا۔ ''ورنہ میں تیرا سر کھول دوں گا۔'' اکو نے کہا۔

تاجا کراہتا ہوا بہ مشکل زمین سے اٹھا، اس نے ایک نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی، پھر اکو سے بولا۔ ''ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن تجھے چھوڑوں گا نہیں۔'' پھر وہ لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''تو کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟'' اکو نے مجھے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''تو مجھے اس پنڈ کی تو نہیں لگتی۔''

''میں امین پور سے آئی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مامے رحمت کے گھر۔''

''اچھا، اچھا تو چاچے رحمت کی مہمان ہے؟'' اکو نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کا گھر تو یہاں سے دور ہے تو یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''میں گاؤں کی سیر کو نکلی تھی۔'' میں نے اپنے بال سمیٹتے ہوئے کہا۔

''چل میں تجھے گھر چھوڑ دوں۔'' پھر وہ بڑبڑایا۔ ''اوہنہ گاؤں کی سیر کو نکلی تھی۔''

میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ خاصا خوش شکل جوان تھا لیکن شاید اسے عورتوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں تھا۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر اپنی لاٹھی کندھے پر رکھے ایک طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ ماما رحمت کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اسے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اماں دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ لپک کر میرے نزدیک آ گئی اور تڑپ کر بولی۔ ''شاداں تو کہاں چلی گئی تھی؟'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''اور یہ تیرے چہرے پر کیا ہوا؟''

''اماں، بس بھول ہو گئی۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔ ''اگر اکو وہاں نہ آتا تو وہ بدمعاش مجھے اٹھا کر لے جاتے۔''

''تیری بہت مہربانی بیٹا۔'' اماں نے کہا۔

اسی وقت ماما رحمت گھر سے نکل آیا۔ اکو نے اسے دیکھا تو جھٹ بولا۔ ''سلام چاچا۔''

''وعلیکم السلام۔'' ماما نے جواب دیا۔ پھر اس سے بولا۔ ''اے چاچی یہ اپنے اصغر کا بیٹا ہے اکبر۔''

''اصغر بھائی وہ کولہو والا؟'' اماں نے کہا۔

''ہاں چاچی! میں اصغر کا بیٹا ہوں۔'' اکو نے کہا۔

''ارے پھر تو تو ہمارا رشتے دار ہوا۔'' اماں ہنس کر بولی۔ ''بھائی اصغر کیسا ہے؟''

''اس کی تو چار مہینے پہلے وفات ہو گئی چاچی۔'' اکو نے کہا۔

''بڑا افسوس ہوا بیٹا۔'' اماں نے کہا۔ ''تیری امی نوری کیسی ہے؟''

''اماں بھی بیمار رہتی ہے۔ اسے نظر بھی بہت کم آتا ہے۔'' اکو نے بتایا۔ ''میں اس کا علاج کرا تو رہا ہوں لیکن

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کی آنکھیں اب ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔"
"اللہ رحم کرے گا بیٹا۔" اماں نے کہا۔ "تو اندر تو آ۔"
"نہیں چاچی، میں اب چلوں گا۔ اماں انتظار کر رہی ہو گی پھر میرا بیل بھی بھوکا ہو گا۔"
"اچھا میں کسی وقت نوری سے ملنے آؤں گی۔ اسے میرا اسلام کہنا۔"
اکو نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور اپنی لاٹھی کندھے پر رکھ کے چلا گیا۔
اماں مجھے اندر لے گئی۔ وہ مجھ سے اس واقعے کی تفصیل پوچھنے لگی۔ میں اس کے سوالات کا جواب تو دے رہی تھی لیکن مجھے بار بار اکو کا خیال آ رہا تھا۔
دوسرے دن اماں خالہ نوری سے ملنے اس کے گھر پہنچ گئی۔
خالہ نوری بہت سیدھی سادی اور ملنسار عورت تھی۔ اس نے اماں سے کہا۔ "آج تجھے برسوں بعد میرا خیال کیسے آ گیا۔ میں تو اکثر بھائی رحمت سے سنتی تھی کہ تو نور پور آئی اور مجھ سے ملے بغیر چلی گئی۔"
"کل اکو نے مجھ پر ایک احسان کیا ہے نوری۔" اماں نے کہا۔ "وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔"
"اکو نے تجھ پر کون سا احسان کر دیا؟" خالہ نوری نے پوچھا۔
جواب میں اماں نے اسے گزشتہ روز کا سارا واقعہ بتا دیا۔
"لے بھلا یہ بھی کوئی احسان ہے۔" خالہ نوری ہنس کر بولی۔ "اکو ایسا ہی ہے۔"
"وہ ہے کہاں؟" اماں نے میرے دل کی بات کہہ دی۔
"ہو گا کہاں؟" خالہ نوری ہنس کر بولی۔ "اپنی بیل کی سیوا کر رہا ہو گا۔"
"بیل کی سیوا؟" میں نے حیرت سے کہا۔
"ہاں، اکو کے باپ نے کئی برس پہلے کولہو لگایا تھا۔ اس سے ہمیں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اکو نے کولہو سنبھال لیا۔ اسے بیل سے کچھ زیادہ ہی پیار ہے۔ کہتا ہے کہ بیل ہی تو ہماری روزی روزگار کا ذریعہ ہے اس لیے وہ اس کی خدمت کرتا رہتا ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "میں اسے بلاتی ہوں۔" خالہ نوری اٹھ کر باہر والے کمرے کی طرف چلی گئی۔
تھوڑی دیر بعد وہ اکو کے ساتھ واپس آئی۔ اکو نے اماں کو سلام کیا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
میں اسے پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن اس نے ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے اس کی یہ ادا بھی بہت پسند آئی ورنہ گاؤں کے نوجوان تو مجھے یوں گھورتے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے نگل جائیں گے۔
"اکو بیٹا۔" اماں نے پوچھا۔ "کچھ پڑھائی بھی کی ہے؟"
"ہاں خالہ جی، میں نے مڈل تک پڑھا ہے۔" اکو نے جواب دیا۔ "ابا تو مجھے زیادہ پڑھانا چاہتا تھا لیکن پڑھائی میں میرا دل نہیں لگا۔ بس پھر میں ابا کے ساتھ ہی کولہو میں لگ گیا۔" پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "خالہ جی میں ذرا ہیرا کو دیکھ لوں۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی تھک گیا ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ وہاں سے چلا گیا۔
ہیرا اس کے بیل کا نام تھا۔ مجھے اس کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ گھر میں میرے ہوتے ہوئے اسے اپنے بیل کی فکر تھی۔
خالہ نوری نے ہمارے لیے لسی پانی کا انتظام کیا۔ پھر بولیں۔ "اکو کو اپنے بیل کی بہت فکر ہے۔ کہہ رہا تھا کہ ہیرا آج صبح سے کچھ نڈھال ہے۔ آج کچھ کام بھی زیادہ تھا۔ اب وہ بیل کو حکیم صاحب سے لائی ہوئی دوا پلا رہا ہو گا۔"
اماں دو دن بعد نور پور سے لوٹ آئی لیکن میرا دل وہیں رہ گیا۔
ایک ہفتے بعد ماما رحمت ہمارے گاؤں آیا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ ماما رحمت تو کبھی ہمارے گاؤں نہیں آتا تھا۔ وہ اصل میں میرے لیے اکو کا رشتہ لے کر آیا تھا۔ اماں کو تو اکو بہت پسند تھا۔ اس نے میری مرضی پوچھی تو میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ "اماں اگر تجھے پسند ہے تو پھر مجھ سے کیا پوچھتی ہے؟"
یوں ایک مہینے کے اندر اندر میں بیاہ کر نور پور چلی گئی۔
اکو بہت سادہ دل اور کھرا آدمی تھا۔ خالہ نوری تو بے چاری بہت ہی سیدھی سادی تھی۔ پھر اسے نظر بھی بہت کم آتا تھا اور اس کی بینائی تیزی سے زائل ہو رہی تھی۔ وہ اس کے باوجود گھر کا ہر کام کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے تو وہ

پریوں کی طرح رکھتی تھی۔ اکو بھی میرا بہت خیال رکھتا تھا لیکن اس کی ایک بات کھٹکتی تھی۔ اس میں وہ گرم جوشی نہیں تھی جو نئے شادی شدہ نوجوانوں میں ہوتی ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے بیل کی فکر رہتی تھی۔ وہ ہر وقت اس کی سیوا میں لگا رہتا تھا۔ کبھی اس کے بدن پر کھریرا کر رہا ہے، کبھی اسے نہلا رہا ہے، کبھی اس کے پیروں کی مالش کر رہا ہے۔ بس صبح سے شام تک وہ کولہو اور بیل میں ہی لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ مجھے بیل ہی لگتا تھا۔

دن بھر کولہو اور بیل میں لگا رہنے کے بعد وہ رات کو گھر کے اندر آتا۔ کچھ دیر اماں کے پاس بیٹھتا پھر کھانا کھا کر کمرے میں آجاتا۔ مجھ سے دو چار باتیں کرتا ان میں بھی بیل کا تذکرہ ہوتا۔

مجھے اب اس کا رویہ بہت کھلنے لگا تھا۔ اس آدمی کی نظر میں میری کوئی وقعت ہی نہیں تھی۔ مجھ سے اچھا تو وہ بیل تھا جس کے گلے میں اکثر وہ بانہیں ڈالے بھی نظر آتا تھا۔ ہماری شادی کو آٹھ ماہ ہوگئے تھے لیکن اکو مجھے اب تک کہیں گھمانے پھرانے نہیں لے گیا تھا۔ گھمانا پھرانا تو دور کی بات ہے وہ تو مجھے کبھی نور پور کے بازار میں بھی لے کر نہیں نکلا۔ خود ہی میرے لیے ڈھیروں کپڑے اور میری ضرورت کا دوسرا سامان لے آتا تھا۔ مجھے روپے پیسے کی بھی کوئی تنگی نہیں تھی لیکن ایسے پیسے کا کیا فائدہ کہ میں ایک طرح سے اکو کی قیدی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ اللہ کرے یہ کم بخت بیل ہی مر جائے۔ یہ بددعا دیتے وقت مجھے یہ بھی خیال نہیں آتا تھا کہ اس بیل ہی کی وجہ سے ہماری روزی روٹی چلتی ہے۔ گھر میں ہر طرح سے خوش حالی ہے۔

ایک دن میرے گاؤں سے ایک آدمی آیا اور اس نے بتایا۔ ”شاداں! چاچی کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ تجھے بہت یاد کر رہی ہے۔“

اماں کی بیماری کا سن کر میں دیوانہ وار کولہو والے کمرے میں بھاگی۔ اکو اس وقت کولہو چلا رہا تھا اور بیل سے بات بھی کرتا جا رہا تھا۔ ”بس میرے یار، اب دو چار چکر اور رہ گئے ہیں۔ تھوڑی سی ہمت اور کرلے، پھر ہم دونوں کھانا کھائیں گے۔“

مجھے دیکھ کر اکو نے بیل کو روکا اور مجھ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے شاداں تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”میری اماں کی حالت بہت خراب ہے اکو۔“ میں بلک بلک کر رونے لگی۔ ”مجھے اپنی اماں کے پاس جانا ہے۔“

اکو نے نرم لہجے میں مجھ سے کہا۔ ”پریشان نہ ہو شاداں، خالہ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں تجھے آج ہی وہاں لے چلوں گا تو تیاری کرلے۔“

”مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو مجھے اماں کے پاس لے چل۔“

اس نے اپنی پڑوسن سکینہ کو بلا کر کہا۔ ”میں شاداں کے گاؤں جا رہا ہوں، پرسوں تک لوٹ آؤں گا تو اماں کا خیال رکھنا اور بیل کو وقت پر چارا دے دینا۔“

اماں کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ مجھے دیکھ کر ان کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔

اکو دوسرے ہی دن واپسی کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے اپنے بیل کی فکر تھی۔ میں نے تو صاف انکار کر دیا کہ میں اماں کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ اس نے مجھے کچھ دن کے لیے اماں کے پاس چھوڑ دیا اور خود نور پور لوٹ گیا۔

اس کے جانے کے دو دن بعد اماں کی حالت پھر بگڑ گئی۔ حکیم صاحب نے کہہ دیا کہ انہیں فوراً بڑے اسپتال لے جاؤ۔

گاؤں والے اماں کو شہر لے جانے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ اماں مجھ سے روٹھ کر بہت دور چلی گئی۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔

اماں کے مرنے کے بعد دوسرے دن اکو وہاں پہنچا۔ میں اسے دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ سپاٹ لہجے میں مجھے تسلیاں دیتا رہا۔ پھر وہ دو دن رہنے کے بعد چلا گیا۔ وجہ وہی پرانی تھی۔ اسے اپنے بیل کی فکر تھی۔ خالہ نوری بھی بیمار تھی لیکن اسے خالہ سے بھی زیادہ اپنے بیل کی وجہ سے پریشانی تھی۔

میں چالیسویں تک گاؤں میں رہی۔ گاؤں میں اب اماں کے بعد میرا کوئی نہیں رہا تھا۔ ہمارے پڑوسی چاچا عنایت نے مجھے مشورہ دیا کہ جانے سے پہلے اپنا مکان بیچ دے۔ مکان زیادہ دن خالی رہے تو اس پر کوئی نہ کوئی قبضہ کرلیتا ہے۔ میرا مکان چچا عنایت نے خرید لیا اور رقم مجھے دے دی۔

اکو چالیسویں کے موقع پر گاؤں آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ واپس لے گیا۔

میں تو اماں کے غم میں ہنسنا بولنا ہی بھول گئی تھی۔ خالہ

نوری مجھے تسلیاں دیتی رہتی تھی لیکن اکو نے کبھی مجھے جھوٹوں بھی تسلی نہیں دی۔

ان ہی دنوں اس کا بیل بیمار ہو گیا۔ اکو تو اس کے لیے پاگل ہو گیا۔ وہ اسے گاؤں کے ایک سیانے کے پاس بھی لے گیا۔ وہ مختلف دواؤں اور ٹوٹکوں سے گاؤں کے جانوروں کا علاج کرتا تھا اس نے اکو کو مشورہ دیا کہ اسلام پورے میں رشید گجر رہتا ہے۔ اس کے پاس چودہ پندرہ بھینسیں اور کئی بیل ہیں۔ وہ اپنے جانوروں کا علاج بھی خود ہی کرتا ہے۔ تو اسے بلا کر اپنا بیل دکھا دے۔

''پر وہ یہاں کیوں آئے گا۔'' اکو نے کہا۔ ''اور میں اتنی دور اپنا بیل لے جا نہیں سکتا۔''

''رشید گجر بہت اچھا بندہ ہے۔'' رسول بخش نے کہا۔ ''جانوروں کی تکلیف تو وہ دیکھ نہیں سکتا۔ تو فکر مت کر میں کل ہی اسے بلوا لوں گا۔ گاؤں میں دو تین جانور اور بھی بیمار ہیں۔ ان کی بیماری میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔''

دوسرے دن دروازے پر دستک ہوئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس وقت خالہ نوری بھی سو رہی تھی۔ میں نے کولہو والے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اکو بھی نہیں تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو میں دروازے پر پہنچ گئی اور پردے کی آڑ لے کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں رشید ہوں۔'' باہر سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ''اکبر کا بیل بیمار ہے اسے دیکھنے آیا ہوں۔''

میں نے بھی اکو سے رشید گجر کا ذکر سنا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اکو تو اس وقت نہیں ہے۔ آپ اندر آجاؤ۔'' میں نے اسے بیٹھک میں بٹھا دیا۔

''شاداں بیٹا! مہمان کو کچھ لسی پانی پلا۔'' خالہ نوری نے کہا۔

''وہ سب تو ہوتا رہے گا۔ پہلے ذرا مجھے وہ بیل دکھا دو بھابی جی۔'' رشید نے کہا۔

میں اسے کولہو والے کمرے میں لے گئی۔ رشید نے کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح بیل کا معائنہ کیا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں دیکھیں اور اس کا منہ کھولنے کی کوشش کی۔

اجنبی ہاتھوں کا لمس پا کر بیل نے اپنا سر زور سے جھٹکا۔ میں اس سے بچنے کے لیے بے اختیار پیچھے ہٹی تو میرا پیر پھسل گیا۔ میں سر کے بل گرتی لیکن اچانک مجھے رشید گجر نے اپنی مضبوط بانہوں میں تھام لیا۔ اس کی بھرپور مردانہ گرفت میں تو میں گویا پگھل کر رہ گئی۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا۔ رشید کی گرم گرم سانسیں مجھے اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے مجھے آہستگی سے کھڑا کر دیا۔ میں نے ایک نظر اسے دیکھا لیکن اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور گھبرا کر باہر چلی گئی۔

اسی وقت اکو آ گیا۔ خالہ نوری نے اسے بتا دیا تھا کہ ملتان سے کوئی بندہ بیل کا علاج کرنے آیا ہے۔ وہ سیدھا کولہو والے کمرے میں پہنچا۔ رشید اس سے تھوڑی دیر بیل کے بارے میں باتیں کرتا رہا، پھر اسے لے کر بیٹھک میں آ گیا۔

اکو نے مجھ سے کہا۔ ''شاداں! مہمان کے لیے روٹی پانی کا بندوبست کر، یہ آج رات یہیں رہے گا۔''

میں نے اس کے لیے خاص طور پر اچھا کھانا بنایا اور کھانا لے کر جا ہی رہی تھی کہ اکو کمرے سے باہر نکلا اور بولا۔ ''میں بیل کے لیے کچھ خاص جڑی بوٹیاں لینے نزدیکی قصبے جا رہا ہوں تو مہمان کا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی سائیکل اٹھائی اور چلا گیا۔

میں کھانا لے کر بیٹھک میں پہنچی تو رشید چارپائی پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''بھابی جی آپ اس گاؤں کی تو نہیں لگتیں؟''

''کیوں، کیا میرے ماتھے پر میرے گاؤں کا نام لکھا ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اس گاؤں کی لڑکیاں اتنی حسین نہیں ہیں۔ آپ کو اکبر کہاں مل گیا؟''

''بس مقدر ہی کہہ لیں۔'' میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

رشید خاصا گھاگ آدمی تھا۔ وہ میرے لہجے سے سمجھ گیا کہ میں اکو کے ساتھ خوش نہیں ہوں۔ وہ چونک کر بولا۔ ''ارے بھابی جی، آپ بھی کھانا کھائیں نا۔''

''نہیں میں بعد میں کھا لوں گی۔'' میں نے کہا۔

اکو کے آنے میں دیر تھی اس لیے وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتیں بہت دلچسپ تھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں بیل کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ مجھے اس کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔

کھانے کے بعد رشید نے سگریٹ سلگا لیا اور بے تکلفی سے بولا۔ ''بھابی جی یہاں شاید چائے تو نہیں ملے گی؟''

”بالکل ملے گی۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں بھی کبھی کبھی چائے پیتی ہوں۔ ابھی آپ کے لیے بنا کر لاتی ہوں۔“

وہ چائے پی کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اکو آ گیا۔ وہ ساتھ والے قصبے کے پنساری سے نہ جانے کون سی جڑی بوٹیاں اور دوائیں لے کر آیا تھا۔

وہ دونوں ایک مرتبہ پھر کولہو والے کمرے میں چلے گئے۔

”بھائی اکبر تیرا بیل اب بڈھا ہو گیا ہے۔ اب یہ کام کے قابل نہیں رہا۔ میری بات مان تو اسے بیچ دے اور کوئی دوسرا بیل خرید لے۔“

”بھائی رشید!“ اکبر نے کہا۔ ”ابھی میری اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں نیا بیل خرید سکوں۔ پھر میرا یہ بیل مجھے بہت پیارا ہے اس نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ میں نے اگر دوسرا بیل لے بھی لیا تو اس بیل کو بیچوں گا نہیں۔ میں اسے یوں ہی کھلا سکتا ہوں۔“

”تیری مرضی ہے بھائی۔“ رشید نے کہا۔

دوسرے دن جانے سے پہلے موقع پا کر رشید نے مجھ سے کہا۔ ”شاداں! میں اگلے ہفتے آؤں گا۔ تو گاؤں کے قبرستان کے پاس میرا انتظار کرنا۔“

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ میں سوچتی ہی رہ گئی کہ اس نے یہ بات کیسے کہہ دی۔ پھر اس نے مجھے بھابی جی کے بجائے شاداں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

اکو کو تو میری پروا تھی ہی نہیں۔ جب سے بیل بیمار ہوا تھا اس نے اپنی چارپائی بھی کولہو والے کمرے میں ڈال لی تھی۔ میں رات رات بھر کروٹیں بدل کر گزار دیتی تھی۔

مجھے غیر شعوری طور پر اگلے ہفتے کا انتظار تھا۔

اگلے ہفتے میں تیار ہو کر شام ہی سے بیٹھ گئی۔ اکو اتنا بے حس تھا کہ اسے یہ بھی احساس نہ ہوتا تھا کہ میں نے خصوصی تیاری کی ہے یا گھریلو کپڑوں میں ہوں۔

جب اندھیرا پھیل گیا تو میں نہ چاہنے کے باوجود قبرستان والے راستے پر ہو لی، درختوں کے جھنڈ میں رشید اپنے سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ گھوڑے سے اتر گیا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں میں بے اختیار اس کی بانہوں میں چلی گئی۔ پھر دو گھنٹے تک ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم رہے۔

واپسی میں رشید نے مجھے آخر تک چھوڑنا چاہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس مرتبہ اس نے دو دن بعد آنے کا کہا تھا۔

پھر ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اکو کے مقابلے میں رشید بہت گرم جوش اور محبت کرنے والا تھا۔ میں تو یوں بھی کسی کی محبت کی ترسی ہوئی تھی اس لیے رشید کے بغیر مجھے چین نہیں ملتا تھا۔

ایک دن میں نے رشید سے کہا۔ ”رشید! میں اب تیرے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”تو پھر اکبر سے طلاق لے لے۔ میں تجھے شادی کر کے یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”اکبر مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس کی عادت سمجھتی ہوں۔ وہ مجھے اپنی ملکیت سمجھتا ہے اس لیے مجھے کبھی بھی چھوڑنے پر راضی نہ ہو گا۔“

”تو کوشش تو کر۔“ اس نے کہا۔

مجھے ایک دن موقع مل گیا۔ میری بچپن کی سہیلی کی شادی تھی۔ میں گاؤں جا رہی تھی۔ اکو نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں تیرے ساتھ نہ جا سکوں گا۔ میرا بیل بیمار ہے۔

مجھے اچانک غصہ آ گیا۔ میں تنک کر بولی۔ ”بیل کا اتنا ہی خیال ہے تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔ بیل نہ ہوا میری سوکن ہو گیا۔ یہ منحوس مرتا بھی تو نہیں۔“

”اپنی زبان کو لگام دے شاداں۔“ اکو بپھر کر بولا۔ ”میرے بیل کے بارے میں ایسے الفاظ مت نکال ورنہ زبان کاٹ کر رکھ دوں گا۔“ شادی کے بعد پہلا موقع تھا کہ اکو نے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی۔

”ہوش میں رہ کے بات کر اکو۔“ ماسی توری نے اسے جھڑک دیا۔

”میرے بیل کے بارے میں ایسی بات کرے گی تو میں سچ مچ اس کی زبان کاٹ لوں گا اماں۔“ اکو بھڑک کر بولا۔

”مجھ سے زیادہ تجھے اپنا بیل پیارا ہے تو پھر مجھے چھوڑ دے۔“

”مجھ سے طلاق لے کر تو جائے گی کہاں؟“ اکو کے لہجے میں تحقیر تھی۔

”میں کہیں بھی جاؤں مگر اب تیرے ساتھ نہیں رہوں گی۔“

”دیکھ شاداں طلاق کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ تو

یوں منہ اٹھا کر طلاق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ شوہر کی ٹھکرائی ہوئی عورت نہ گھر کی ہوتی ہے نہ گھاٹ کی۔''

''میں یہاں سے جانے کے بعد چاہے گلیوں میں بھیک مانگوں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تیرے ساتھ نہیں رہوں گی۔ مجھے اپنا حق مہر بھی نہیں چاہیے۔''

''تو پھر تو بھی کان کھول کر سن لے۔'' اکو نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تجھے طلاق نہیں دوں گا۔''

میں پیر پٹختی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

رات کو اکو میرے پاس آیا تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''شاداں! تو میری بیوی ہے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق نہیں دی جاتی۔ ایسے تو گزارہ نہیں ہو گا۔''

''مجھے نہیں کرنا ہے گزارہ۔'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''جب سے میں شادی ہو کر یہاں آئی ہوں مجھے سکون کا ایک سانس بھی نصیب نہیں ہوا۔ میں اب تیرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''شاداں مجھے لگتا ہے تجھے کسی نے بھڑکایا ہے۔ میں پھر تجھ سے کہوں گا کہ طلاق یافتہ عورت کو کوئی قبول نہیں کرتا۔''

''مجھے کسی کے قبول کرنے کی پروا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس میں تیرے ساتھ اب نہیں رہ سکتی۔ تو اپنے بیل کے پاس جا، وہ تیرے بغیر اداس ہو گیا ہو گا۔''

یہ اس کی دکھتی رگ تھی۔ وہ ایک دم مشتعل ہو گیا اور بولا۔ ''مجھے بیل کا طعنہ نہ دے شاداں۔'' وہ غصے میں تن پھن کرتا باہر نکل گیا۔

اس مرتبہ رشید سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بتایا کہ اکو مجھے طلاق دینے پر آمادہ نہیں ہے۔

''تو کوشش کرتی رہ۔'' رشید نے کہا۔ ''ہاں اگر اکو تیرے ساتھ مار پیٹ کرے تو تمہارے محلے میں چودھری فضل رہتا ہے تو اس کے پاس چلی جانا۔ وہ اکو کا دماغ درست کر دے گا۔''

''وہ فضل گجر؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہ میری ہی برادری کا ہے۔ میں نے اس سے ذکر کیا تھا کہ اکو کی اپنی گھر والی سے نہیں بن رہی ہے۔ بات زیادہ خراب ہوئی تو وہ تیرے پاس آ جائے گی۔ پھر اکو تیرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔''

ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ اچانک اکو کے بیل کی حالت خراب ہو گئی۔ اکو تو اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ فوراً ایک ویگن کا بندوبست کر کے بیل کو ملتان لے گیا۔ جانوروں کا بڑا ڈاکٹر تو ملتان ہی میں تھا۔ بیل کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب زندہ نہیں بچے گا۔

اکو کے ساتھ محلے کا ایک لڑکا بھی گیا تھا۔ وہ دوسرے دن واپس آ گیا اور اس نے بتایا کہ اکو کا بیل مر گیا۔

''بیل مر گیا؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے اس خبر سے انجانی سی مسرت ہوئی تھی۔ ''تو پھر اکو کہاں ہے؟''

''اس کا حال بہت خراب ہے۔'' لڑکے نے جواب

دیا۔ ”ملتان ہی میں اس کا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ اس نے اکو کو روک لیا کہ ایک دو دن میرے ساتھ رہے گا تو اس کا غم کچھ ہلکا ہو جائے گا۔“

اکو تین دن بعد گاؤں لوٹا تو اپنے ساتھ ایک خوب صورت اور صحت مند بیل بھی لے کر آیا۔ اس کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

”یہ بیل کہاں سے لائے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

اس کا رویہ اچانک بدل گیا اور اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تجھے اس سے مطلب؟ ایک بیل تو ٹو کھا گئی۔ کیا اسے بھی کھائے گی؟“ پھر وہ محبت سے بیل کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

بیل واقعی بہت خوب صورت اور صحت مند تھا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اکو میری سوتن لے آیا ہو۔

”ٹھیک ہے تم بیل کے ساتھ رہو، مجھے اب آزاد ہی کردو تو بہتر ہے۔“

”آزاد کردوں؟“ اکو نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”چل میں تجھے آزاد کیے دیتا ہوں۔“ پھر اس نے اچانک کھڑے کھڑے مجھے طلاق دے دی۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”اب تو اس گھر میں نامحرم ہے۔“ اکو نے کہا۔ ”اس لیے اب تجھے یہاں رہنے کا کوئی بھی حق حاصل نہیں ہے۔“

میں نے چادر لپیٹی اور گھر سے نکل گئی۔ اچانک مجھے فضل گجر کا خیال آگیا۔ رشید نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی بھی مشکل اور پریشانی میں فضل کے گھر چلی جانا۔

مجھے فضل کے گھر کا علم تھا۔ میں سیدھی اس کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے میری روداد سن کر مجھے اپنے گھر میں جگہ دے دی اور بولا۔ ”شاداں بی بی! رشید نے کہا تھا کہ تم پر کوئی پریشانی آجائے تو میں تمہاری مدد کروں۔ اب تم عدت یہیں پوری کرو۔ ہاں اکو سے حق مہر کی رقم لینا ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں اس سے ابھی لے آتا ہوں۔“

”نہیں مجھے اکو سے اب کچھ نہیں چاہیے۔“ میں نے جواب دیا۔

ایک ہفتے بعد رشید گجر بھی گاؤں آگیا اور پردے کی اوٹ میں بیٹھ کر مجھ سے بولا۔ ”شاداں بس تو عدت یہاں پوری کرلے پھر میں تجھ سے نکاح کر کے اپنے گھر لے جاؤں گا۔“

میں سوائے انتظار کے اور کیا کرسکتی تھی۔ سو انتظار کرتی رہی۔ وہاں مجھے اکو کے بارے میں بھی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اپنے نئے بیل کی سیوا میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا کولھو ایک مرتبہ پھر پہلے کی طرح چلنے لگا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ اکو نے گاؤں ہی کی کسی لڑکی سے شادی کرلی۔ یہ خبر سن کر میرے دل کو ٹھیس لگی لیکن پھر میں نے سوچا کہ اب اکو سے میرا واسطہ ہی کیا ہے؟ وہ ایک چھوڑ چار شادیاں کرے۔

عدت پوری ہونے کے بعد رشید نے فضل اور کئی دوسرے محلے داروں کی موجودگی میں میرے ساتھ نکاح کرلیا اور مجھے لے کر روانہ ہوگیا۔

وہ گاؤں جانے کی بجائے وہاں سے لاہور پہنچا اور میری حیرت دیکھ کر مجھ سے بولا۔ ”شاداں میں چاہتا ہوں کہ تو خوب دل بھر کے گھوم لے، بعد میں تجھے ایسا موقع نہیں ملے گا۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”بعد میں کیا تیری محبت ختم ہوجائے گی؟“

”یہ بات نہیں ہے۔“ رشید جلدی سے بولا۔ ”گاؤں جا کر مجھے وقت نہیں ملے گا۔ میرا اچھا خاصا دودھ کا کاروبار ہے۔ پھر سبزی منڈی میں پیاز اور لہسن کی آڑھت بھی کرتا ہوں۔“

ہم دونوں خوب دل بھر کے گھومے، رشید نے مجھے ڈھیروں شاپنگ کرائی، میری ضرورت کی ہر چیز اس نے مجھے دلوادی۔

ایک مہینے بعد رشید مجھے لے کر اپنے گاؤں پہنچا تو وہاں کسی نے بھی خوش دلی سے میرا استقبال نہیں کیا۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ رشید نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس کے کئی بچے بھی ہیں لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی سب سے بڑی بیٹی عمر میں مجھ سے چار پانچ سال ہی کم ہوگی۔ ان لوگوں نے مجھے دیکھتے ہی مسترد کردیا تھا۔

میں دو دن تک یوں ہی اپنے کمرے میں پڑی رہی۔ رشید کی چھوٹی بیٹی زلیخا مجھے کمرے میں کھانا دے دیا کرتی تھی۔

ایک رات رشید ڈرتے ڈرتے میرے پاس آیا اور آتے ہی لحاف میں گھس گیا۔ میں نے اس سے بات کرنا چاہی تو وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”شاداں میں نے تجھ سے شادی تو کرلی ہے لیکن میری بیوی اور بچے اس شادی کے مخالف ہیں لیکن تو فکر نہ کر میں تجھے طلاق نہیں دوں گا۔“

میرے دل میں چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ رشید تو محبت

کے بڑے بڑے دعوے کرتا تھا۔ اس کے ورغلانے پر تو میں نے اکو سے طلاق لی تھی۔ اب وہ بھی اپنی مجبوریاں ظاہر کررہا تھا۔

بس وہ دن اور آج کا دن ہے میں رشید کی بیوی اور بچوں کی بے دام غلام بنی ہوئی ہوں۔ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی ہوں۔ میرے کانوں میں رہ رہ کے اکو کے الفاظ گونجتے ہیں۔ ''شاداں! طلاق یافتہ عورت کبھی باعزت مقام نہیں پاسکتی۔''

مجھے اکو کے گھر میں ہر طرح کا سکھ تھا۔ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتا تھا۔ یہ تو میری ہی بدنصیبی تھی کہ میں سکون کی اس چھاؤں کو چھوڑ کر اس جہنم میں آ گری تھی۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہوتی تھی کہ اکو نے مجھے طلاق کیسے دے دی۔ وہ بھی اتنی آسانی سے۔ جہاں تک میں اسے سمجھی تھی وہ کسی بھی قیمت پر مجھے طلاق نہیں دیتا۔

میں نے سوچا تھا کہ کوئی بچہ ہو جائے گا تو میرا دل اس میں بہل جائے گا لیکن رشید نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اب کوئی بچہ نہیں چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو میری پہلی بیوی تمہیں اس گھر سے نکال کر دم لے گی۔

میں رشید کو چھوڑ بھی نہیں سکتی ہوں۔ اسے چھوڑ دوں تو پھر کہاں جاؤں۔ اپنا مکان تو میں پہلے ہی بیچ چکی ہوں۔ اب تو بس اسی طرح رو رو کر زندگی گزارنا ہوگی۔

ایک رات رشید میرے پاس آیا تو وہ کسی وجہ سے خاصا پریشان تھا اور وہ نشے میں بھی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اکو نے مجھے اچانک اور اتنی آسانی سے طلاق کیسے دے دی؟''

رشید طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''میں نے تجھے آج تک یہ بات نہیں بتائی ہے شاداں لیکن آج بتا رہا ہوں۔ تیرے ساتھ شادی کا تو میرا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ میں تو وقت گزاری کررہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میں تیرا عادی ہو گیا۔ ان ہی دنوں ایک رات قبرستان کے پاس اکو نے ہم دونوں کو دیکھ لیا اس نے تجھ سے تو کچھ نہ کہا لیکن غصے میں بھرا ہوا میرے پاس پہنچ گیا اور بولا۔ ''میری بیوی سے دور رہ رشید ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''تو یہ مشورہ اپنی بیوی کو کیوں نہیں دیتا؟''

اس نے مجھ سے کہا۔ ''میں شاداں پر اپنا بھرم توڑنا نہیں چاہتا۔ وہ جیسی بھی ہے میری بیوی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں اسے شرمندہ کروں۔''

''تو پھر تو اسے طلاق دے دے۔'' میں نے کہا۔

''طلاق تو میں اسے ہرگز نہیں دوں گا۔''

اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں مزید تلخ کلامی ہوتی۔ فضل گجر وہاں آ گیا اور اکو وہاں سے چلا گیا۔

''پھر اس نے مجھے طلاق کیوں دے دی؟'' میں نے پوچھا۔

''تجھے یاد ہوگا اکو اپنا پیارا بیل لے کر ملتان گیا تھا؟''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' میں نے کہا مجھے رہ رہ کر اپنے رویے پر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اتنے محبت کرنے والے شخص کا دل دکھایا تھا۔

''ملتان میں اس کا بیل مر گیا۔'' رشید نے کہا۔ ''میں بھی ان دنوں ملتان میں تھا اور بیلوں کی جوڑی مویشیوں کے ایک میلے میں لے کر گیا تھا۔ بیل کے مرنے سے اکبر بہت دل گرفتہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو میرا ایک بیل لے لے۔''

وہ حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میرا مذاق مت اڑا رشید، تو جانتا ہے کہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

''میں تجھ سے پیسے نہیں مانگ رہا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بس میری ایک ہی شرط ہے تو یہ بیل لے کر شاداں کو طلاق دے دے۔''

اس نے فوراً بیل کی رسی پکڑ لی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ کچھ دیر پہلے میرے دل میں اکو کے لیے جو ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ اس کی جگہ نفرت نے لے لی۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔

''اس بدمعاش کے نزدیک میرا مول محض ایک بیل تھا۔ کولہو کا بیل!'' اس وقت اکو اگر میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا خون پی جاتی۔

اس دن کے بعد سے مجھے چپ لگ گئی۔ اب میں صبح سے شام تک کام کرتی ہوں لیکن زبان پر شکایت کا ایک حرف بھی نہیں لاتی۔ میں تو ایسی بدبخت ہوں جو ایک بیل سے بھی گئی گزری ہوں۔ میں اب خود کولہو کا بیل بن کر رہ گئی ہوں۔ جب تک جسم میں سانس ہے میں رشید گجر کا کولہو چلاتی رہوں گی۔ آخر اس نے بھی تو ایک بیل کی قربانی دی ہے۔

اندیکھا سودا

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلام مسنون
گزشتہ دنوں سرگزشت میں ایک ایسی کہانی پڑھی ہے جسے پڑھ کر لگا کہ یہ ہو بہو میری کہانی ہے۔ بس میں نے قلم سنبھال لیا اور اپنے آپ پر گزرنے والے واقعہ کو کاغذ پر اتار دیا تاکہ دوسرے بھی عبرت حاصل کریں۔

انجم جمال
(کراچی)

"میں ایک تنہا لڑکی ہوں۔ کیا آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں آرام کے لیے اپنے کمرے میں آیا تھا اور بستر پر لیٹنے ہی والا تھا کہ موبائل کی گھنٹی نے چونکا دیا تھا۔
میرے دوست و احباب رشتے دار وغیرہ عام طور پر مجھے رات دس بجے کے بعد فون نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں جلد سو جانے کا عادی ہوں اور صبح جلد اٹھ کر اپنا

کام شروع کر دیتا ہوں۔ پھر یہ کس نے فون کیا تھا۔

میں نے نمبر دیکھا۔ نمبر بھی میرے لیے نیا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ لائن کاٹ دی لیکن کچھ دیر بعد جب دوبارہ بیل ہوئی تو میں نے کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو۔'' میں نے اپنی دھیمی آواز میں کہا۔

اور دوسری طرف سے جو بات کہی گئی وہ یہی تھی۔

''میں ایک تنہا لڑکی ہوں۔ کیا آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے؟''

''کیا تم مجھے جانتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھی طرح، آپ انجم جمال ہیں، رائٹر ہیں، میں آپ کی فین ہوں۔ آپ کی درجنوں کہانیاں پڑھی ہیں میں نے۔''

''اور میرا یہ نمبر کہاں سے ملا آپ کو؟'' میں نے پوچھا۔

''رہنے دیں۔ آپ ایک مشہور اور جانے پہچانے آدمی ہیں۔ آپ کا نمبر چھپا کیسے رہ سکتا ہے۔''

وہ یہ بھی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ویسے اس کی آواز بہت دلکش تھی۔ اس کی لہراتی ہوئی خوب صورت آواز نے اس کے سراپے کی ایک تصویر نگاہوں کے سامنے بنادی تھی۔

''چلیں مان لیا۔ اب آپ یہ بتائیں آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''میں نے بتایا ناں کہ میں ایک تنہا لڑکی ہوں اور تنہائی کم از کم کسی سے گفتگو کا تو خواہش رکھ سکتی ہے ناں تو میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیسی باتیں۔''

''کچھ بھی۔ موسم کے حوالے سے، زندگی کی خوب صورتی اور بدصورتی کے حوالے سے۔ لٹریچر کے حوالے سے۔''

ویسے تو اس کا لہجہ صاف ستھرا اور مہذب تھا۔ جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ پھر اس نے لٹریچر کی بات کہہ کر چونکا دیا تھا۔

''لٹریچر کے کس شعبے سے دلچسپی ہے آپ کو؟''

''ادب برائے زندگی۔'' اس نے کہا۔ ''میں ادب برائے ادب کی قائل نہیں ہوں۔ ادب کو زندگی کی عکاسی کرنی چاہیے، ہواؤں میں اپنا وجود نہیں رکھنا چاہیے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں آپ سے باتیں کرسکتا ہوں۔''

''خوشی ہوگی مجھے۔ اس طرح اس وقت میرا مطلب ہے کہ رات کے کچھ لمحے اطمینان سے گزر جائیں گے۔ کیونکہ دن تو ہنگاموں کے ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے مسائل۔ دنیا بھر کے کام۔ لیکن رات بے چینی اور تنہائی کی ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر باتیں ہوتی رہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔''

''ایک بات بتائیں۔ تنہائی سے کیا مراد ہے آپ کی۔ اپنی ذات میں تنہا یا اپنے ماحول میں تنہا۔''

''دونوں ہی میں بالکل اکیلی ہوں۔ میرے والدین بھی نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی دوسرا رشتے دار ہے۔''

''اور......! میرا مطلب ہے شادی؟''

''نہیں ایسا کوئی رشتہ میری زندگی میں شامل نہیں ہوا ہے۔''

بہت ہی اچھی گفتگو کررہی تھی وہ۔ اس کی باتوں سے اس کی ذہانت کا اندازہ ہورہا تھا۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس نے اپنا نام ماہا بتایا تھا۔

دوسرے دن اپنے کام کے دوران میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس قسم کی لڑکیاں عام طور پر فرسٹریشن کا شکار ہوتی ہیں۔ ورنہ اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ اتنی دیر تک کسی سے باتیں کی جائیں۔

دوسری رات بھی اس کا فون آیا۔ اس نے پھر اس انداز کی گفتگو کی۔ اس بار اس نے اپنے پسندیدہ شعراء اور ادیبوں کے بارے میں بتایا تھا۔

بلاشبہ بہت اعلیٰ ذوق تھا اس کا۔ انگلش لٹریچر سے لے کر اردو ادب تک اس کی گہری نگاہ تھی۔

اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''جناب! یہ مطالعہ کرتے رہنا میری مجبوری ہے۔ کیونکہ کتابیں تنہائی کی ساتھی ہوتی ہیں۔ میں نے کتابوں سے دوستی کرلی ہے اور اب آپ سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔''

اس کا فون یوں تو روزانہ ہی اپنے وقت پر آجایا کرتا لیکن کبھی کبھی ایک دو دنوں کا ناغہ بھی ہوجاتا۔ جس کے بارے میں وہ بتاتی کہ اس کی ایک سہیلی اس سے ملنے کے لیے آجاتی ہے جو اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتی ہے اور وہ اس کی موجودگی میں مجھے فون نہیں کرنا چاہتی۔

میں نے ایک بات یہ سن رکھی تھی کہ حسن اور ذہانت ایک ساتھ نہیں ہوتے۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ خوب صورت نظر آنے والے یا ذہین لوگ عام طور پر کم صورت

لگے ہوا کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ بھی ایسی ہی ہو۔
اب یہ سب اس وقت ہو سکتا تھا جب اس سے ملاقات ہوتی۔

میں نے اس کا فون آنے پر جب اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی جیسے یا تو میری بات بری لگی ہو یا کچھ ہچکچا رہی ہو۔

"کیا بات ہے آپ خاموش کیوں ہو گئیں۔" میں نے پوچھا۔ "شاید میری بات ناگوار محسوس ہوئی ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "میں یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھ سے مل کر آپ کو بہت مایوسی ہوگی۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ میں عام سی صورت شکل کی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "بلکہ بدصورت سمجھ لیں۔"

"ارے یہ کیا بات کردی تم نے۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اس بار تم کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ "اصل خوب صورتی تو انسان کے اندر ہوتی ہے۔ تمہاری وہ خوب صورتی میں دیکھ چکا ہوں۔"

"چلیں تو پھر میں ایک دو دنوں کے بعد جواب دیتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ سوچ کر بتا دینا۔"

دو دنوں کے بعد اس کا فون آیا تو اس نے ملنے پر رضامندی ظاہر کردی۔ ہماری یہ ملاقات ایک ہوٹل میں طے ہوئی تھی۔

اب سچ تو یہ تھا کہ میرا اس سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

یہ عجیب بات تھی لیکن سچائی یہی تھی میں نے صرف اس کا دل رکھنے کے لیے اس سے اندر کی خوب صورتی وغیرہ کا فلسفہ بیان کر دیا تھا جب کہ خوب صورتی میرا جنون رہی ہے۔

میں صدا کا حسن پرست ہوں۔ جب اس نے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ وہ ایک بدصورت سی لڑکی ہے تو میں اسی وقت اس سے اکھڑ گیا تھا۔

میری کہانیاں، انسانوں کو خوب صورتی کی تحریک دیا کرتی ہیں اور وہ سرے سے خوب صورت ہی نہیں تھی۔
اب ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں گول کر جاؤں۔ اس سے ملنے ہی نہ جاؤں۔ جب اس کا فون آئے تو جواب ہی نہ دوں لیکن یہ بھی غلط تھا۔

تو پھر کیا کرتا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اپنے ایک دوست عدنان فاروقی کا خیال آگیا۔ وہ ادیب یا شاعر وغیرہ تو نہیں تھا لیکن بہت ذہین تھا۔ اس کا مطالعہ بھی بہت اچھا تھا اگر میں ملاقات کے لیے عدنان کو بھیج دوں تو وہ جا کر چویشن کو سنبھال سکتا تھا۔

یہ ایک فلمی چویشن ہو جاتی۔

میں نے جب عدنان سے یہ بات کی تو وہ بھڑک اٹھا۔ "دیکھو یہ کسی کو دھوکا دینا ہوا۔"

میں تو بڑی معاملہ فہمی کے ساتھ، نرم انداز میں اس سے دور ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں اسے دھوکا نہیں دے رہا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس سے جا کر ملو اور اس سے کہو کہ تم یعنی میں شادی شدہ ہوں اور ہمارے راستے الگ ہیں۔"

"بے وقوف آدمی جب ایسا ہی کرنا تھا تو پھر اس بے چاری سے ملنے کی خواہش کیوں کی تھی۔"

"اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدصورت ہوگی۔" میں نے کہا۔ "تم تو میرا مزاج جانتے ہو۔"

"افسوس ہو رہا ہے اس پر۔"

"یار! افسوس بعد میں کرتے رہنا۔ پہلے اس سے جا کر مل لو۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ اتنی بے وقوف ہوگی کہ آواز بھی نہیں پہچانے گی۔"

"میرا دعویٰ ہے کہ وہ نہیں پہچانے گی۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میری اور تمہاری آوازوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ فون پر آوازوں کا کوئی خاص پتا نہیں چلتا۔ آوازیں بہت حد تک بدل جاتی ہیں۔"

عدنان نہیں مان رہا تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے منا ہی لیا۔ وہ بھی ایڈونچر سمجھ کر اس کام کے لیے راضی ہو گیا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ کرنا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھو بات یہ ہے کہ میں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "کم از کم فون پر تو نہیں۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم اس سے ملو اور سلیقے سے سمجھا دو کہ وہ تمہارا یعنی میرا پیچھا چھوڑ دے۔ اپنی زندگی کی طرف دھیان دے۔ زندگی کے سفر میں کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔"

"یار! تم نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

عدنان پریشان ہو کر بولا۔ ''تم ایک رائٹر ہو۔ لوگ تمہیں جانتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے تمہیں دیکھا ہو یا تمہاری تصویر دیکھی ہو یا بعد میں بھی دیکھ لے تو پھر کیا ہو گا۔''

''یار! بعد میں جو گا وہ دیکھا جائے گا۔''

''ایک بات بتاؤ۔ تم خود اس سے مل کر یہ سب کیوں نہیں کہہ دیتے۔''

''نہیں یار، کچھ بھی ہو میں ایک رائٹر ہوں، حساس دل کا آدمی ہوں۔ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

''چلو ٹھیک ہے میں ہی قربانی کا بکرا بن جاتا ہوں۔''

اس رات جب اس کا فون آیا تو میں نے پوچھا۔

''ماہا! یہ بتاؤ میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟''

''بہت آسان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نظر کا بہت موٹا سا چشمہ لگاتی ہوں۔ چال میں ہلکی سی لنگراہٹ ہے آپ مجھے دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔''

''یہ بتاؤ کیا تم نے مجھے دیکھا ہوا ہے۔''

''نہیں میں نے آج تک آپ کی کوئی تصویر نہیں دیکھی۔ اس لیے میں نے اپنی پہچان بتا دی ہے۔ کم از کم آپ تو پہچان ہی لیں گے۔''

میں نے اس کا حلیہ عدنان کو بتاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوٹل کے باہر کھڑا رہوں گا۔ تم مقررہ وقت سے پہلے جا کر بیٹھ جانا اور جب وہ آئے گی تو تم اسے پہچان ہی لو گے۔''

دوسری شام پروگرام کے مطابق میں ہوٹل کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب کہ عدنان ہوٹل کے اندر تھا۔

وہ بھی مقررہ وقت پر ہوٹل آ گئی تھی۔

اس نے اپنا حلیہ بتاتے ہوئے کچھ باتیں چھپا بھی لی تھیں۔ جیسے وہ بہت موٹی بھی تھی اور اس کا رنگ بھی گہرا سانولا تھا۔

بہر حال مجھے یقین تھا کہ عدنان اس کو سنبھال لے گا۔ میں نے ہوٹل کے باہر کھڑے رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنے فلیٹ واپس آ گیا۔ راستے میں عدنان کو فون کر کے میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو فارغ کر کے میرے پاس آ جائے۔

عدنان دو گھنٹے بعد آیا۔

''اتنی دیر لگا دی تم نے۔'' میں نے پوچھا۔

''کیا کرتا۔ وہ تو چپک ہی گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''بڑی مشکلوں سے جان چھڑائی ہے۔''

''اس نے تمہیں پہچانا تو نہیں۔''

رحمان کی صفت

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صاحب کو ایک مہم پر سردار بنا کر بھیجا اور اس پورے سفر کے دوران اس کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ ہر نماز میں سورۃ اخلاص پر قرأت ختم کرتے تھے۔ واپسی پر ان کے ساتھیوں نے آپؐ سے اس کا ذکر فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے تو ان کے پوچھنے پر ان صاحب نے فرمایا کہ اس میں رحمان کی صفت بیان کی گئی ہے، اس لیے اس کو پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔ حضور پرنورؐ نے فرمایا ان کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ انہیں محبوب رکھتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

مرسلہ: احمد حسن۔ سکھر

''نہیں تو۔ میں نے پرفارمنس ہی ایسی دی تھی کہ مجھے انجم جمالی سمجھتی رہی۔''

''اور باتیں کیا ہوئیں اس سے۔''

''چھوڑو بھی اب تفصیل کیا بتاؤں۔ کیا تمہارے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ اس سے تمہاری جان چھوٹ گئی ہے۔''

اور واقعی اس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد اس کا کوئی فون نہیں آیا۔ مجھے افسوس تو تھا لیکن میں اپنی طبیعت کو کیا کرتا۔ حسن پرستی جو مزاج میں تھی۔ وہ مجھے اِدھر اُدھر دیکھنے ہی نہیں دیتی تھی۔

بہر حال کئی دنوں تک اس کا فون نہیں آیا۔

اور شاید پندرہ یا بیس دنوں کے بعد ایک رات پھر اس کا فون آ گیا۔ ''انجم صاحب! آپ نے تو یہ سمجھا تھا کہ شاید میں آپ کو فون نہیں کروں گی لیکن دیکھ لیں کہ آج پھر فون کر رہی ہوں۔''

''چلیں شکریہ آپ کا۔''

''آپ کو ایک خاص خبر سنانے کے لیے فون کیا ہے۔''

''جی فرمائیں۔''

''میں نے اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''آخر کب تک حالات سے جھگڑا کر سکتی تھی۔ ایک

سہارا ملا تو میں نے اس کو اپنا سمجھ لیا اور اب اس سے میری منگنی ہونے والی ہے۔"

"چلو بہت مبارک ہو۔"

"ہاں ایک بات اور......! آپ نے اپنی جگہ جس کو بھیجا تھا اس بے چارے نے سب کچھ بتا دیا تھا کہ آپ کیوں نہیں آئے اور آپ نے اپنا نام دے کر اسے بھیجا ہے۔"

میں شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔ شاید میں نے اس لڑکی کے ساتھ زیادتی کر دی تھی۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اگر چند لمحوں کے لیے اس سے مل ہی لیتا تو کیا ہو جاتا۔ بہر حال رات گئی بات گئی۔

"ایک بات اور آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میری منگنی کس سے ہو رہی ہے۔"

"چلو جس سے بھی ہو رہی ہو، مبارک ہو۔"

"سن تو لیں۔ میری منگنی آپ کے اسی دوست عدنان سے ہو رہی ہے۔"

"کیا......!" مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ "عدنان سے ہو رہی ہے؟"

"جی انجم صاحب۔ اب میں آپ کی یہ خوش فہمی بھی دور کر دوں کہ صرف شاعر اور ادیب ہی حساس دل کے نہیں ہوتے۔ عام لوگ بھی ہوتے ہیں۔ آپ لوگ تو صرف اپنی انسانیت نوازی وغیرہ کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن اصل خوبیاں عام لوگوں میں ہوتی ہیں جو صرف باتیں نہیں کرتے۔"

وہ پتا نہیں کیا کیا بولتی رہی اور میں سوائے سنتے رہنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

دوسرے دن میں خود عدنان کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ "بے وقوف آدمی تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تم اس سے منگنی کر رہے ہو۔"

"یار! میں کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

"کیسی شرمندگی۔"

"یہی کہ میں تو تمہارا نمائندہ بن کر گیا تھا اور خود اس کو پسند کر بیٹھا۔"

"لیکن کیوں، مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ تم نے ایسا فیصلہ کیوں کر لیا۔"

"اس لیے کہ مجھے اس کی تنہائی اور بے بسی نہیں دیکھی گئی۔" عدنان نے کہا۔ "بہر حال اب اتنا تو کرو کہ میری منگنی کی مبارک باد دو اور منگنی میں شریک ہو جاؤ۔"

"ضرور، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔" میں مسکرا کر اس سے لپٹ گیا۔

اگلے ہفتے اس کی منگنی تھی۔ میں کسی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکا تھا لیکن مبارک باد کا پیغام ضرور دیا۔

دوسرے دن اس نے فون پر بتایا کہ ہم نے ایک ہوٹل میں ایک چھوٹی سی گیٹ ٹوگیدر رکھی ہے اور تجھے ہر حال میں آنا ہے۔

بہر حال اس کے اصرار پر میں ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے دونوں کے لیے تحفے بھی لے لیے تھے اور جب میں نے ہوٹل پہنچ کر اس لڑکی کو دیکھا تو میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

وہ تو بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ بہت ہی دلکش اور اس کے ساتھ وہ بھی تھی جس کو میں نے ہوٹل کے گیٹ پر دیکھا تھا۔

نظر کا موٹا چشمہ لگائے، موٹی سانولی سی۔

میں تو احمقوں کی طرح انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "انجم جمال صاحب! میں نے آپ کو مذاق میں بتایا تھا کہ میں ایک موٹی اور بدصورت لڑکی ہوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ادیب اور شاعر حضرات کیا واقعی اتنے ہی حساس ہوتے ہیں جیسا وہ ظاہر کرتے ہیں یا حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ افسوس ہوا کہ ویسے نہیں ہوتے جیسے ظاہر کرتے ہیں۔"

"اب کچھ مجھ سے سن لیں۔" اس موٹی لڑکی نے کہا۔ "میں اس کی دوست ہوں۔ اس نے جب اپنی فون والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ سے مذاق کر لیا جائے۔"

"اور آگے کی کہانی یہ ہے کہ تم نے اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتے ہوئے مجھے بھیج دیا۔" عدنان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"انجم جمالی صاحب! افسوس کہ آپ نے ہارون رشید اور بہلول دانا والا واقعہ نہیں سنا۔ ورنہ آپ بھی اَن دیکھی کا سودا کر لیتے۔ کبھی کبھی ان دیکھی کے سودے میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔"

وہ بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔

اب تو میں صرف سن ہی سکتا تھا۔ اب تو ان دونوں کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ دونوں اچھی زندگی گزار رہے ہیں اور میں پھر سے کسی انجانی کال کا منتظر ہوں۔

خادم

محترم مدیر
السلام علیکم
میں نے پہلی بار کوئی کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہانی میری نہیں میں ایک واقف کار کی ہے جس کی زندگی میں ایک خادم در آیا تھا۔ اس خادم نے کیسے اس کی زندگی بدل دی اسی واقعے کو میں نے کہانی کی شکل میں لکھی ہے۔

جلال اصغر
(ملتان)

جیسے ہی وہ میرے پاس آیا میں نے پاس پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر اس کو دے مارا۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔ اس کے باوجود وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

''ابے جاتا ہے یا نہیں۔'' میں نے دوسرا پتھر اٹھالیا۔

''نہیں بابا۔ میں نہیں جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔ ''چاہے تم مجھے پتھر مار مار کر ختم ہی کر دو۔''

صرف وہی نہیں بلکہ وہاں آنے والے ہر شخص کا یہی حال تھا۔ جب میں پہلی بار یہاں آکر بیٹھا تھا تو اندازہ بھی

نہیں تھا کہ لوگ مجھے کیا سمجھنے لگیں گے۔ میں تو اس لیے بیٹھا تھا کہ میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

میرا نام جلال اصغر ہے۔ بہت آرام کی زندگی گزر رہی تھی کہ سب سے پہلے نوکری گئی۔ وہ بھی اس لئے کہ مجھ سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ میں نے باس کے سالے کو کہہ دیا تھا کہ اسے کوئی کام نہیں آتا۔ باس نے خواہ مخواہ اسے اتنی بڑی ذمے داری دے دی ہے۔ کم سے کم اسے مینیجر تو نہیں بنانا تھا۔

دفتر میں اچھا خاصا کام چل رہا تھا میں عارضی طور پر منیجر کے فرائض انجام دے رہا تھا اور بہت خوبی سے سارے کام کررہا تھا کیوں کہ جو مینیجر تھا اس نے استعفیٰ دے دیا تھا اور ابھی کسی کا تقرر نہیں ہوا تھا۔ باس نے مجھے اس سیٹ پر عارضی طور پر بیٹھا دیا۔ اس نے کہا تھا۔ ''مسٹر جلال۔ اُمید ہے کہ تم اس گیپ میں یہ کام سنبھال لوگے۔''

''کیوں نہیں جناب۔'' میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

''او کے۔ تو پھر کل سے تم ہی کچھ دنوں کے لئے مینیجر کے فرائض انجام دو گے۔''

''او کے باس۔''

دوسرے دن سے میں نے اپنا کام کرنا شروع کردیا۔

چونکہ زندگی میں یہ ایک اچھا موقع ملا تھا۔ اسی لئے میں نے پوری ایمانداری اور محنت کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تھا۔ دفتر کے دوسرے ساتھی مجھے پہلے سے ہی مبارک باد دینے لگے تھے۔

''مبارک ہو جلال۔'' وہ کہا کرتے۔

''کس بات کی مبارک باد؟''

''یہی کہ تم مینیجر بننے والے ہو، تمہارے امکانات سو فیصد ہیں۔ ہم نے خود باس سے یہ کہتے سنا ہے۔''

مجھے بھی یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اچانک ایک دن نہ جانے کہاں سے باس کا سالا آٹپکا اور باس نے اس کو مینیجر بنا دیا۔ میرا دل ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ لعنت ہو۔ اس معاشرے میں ایمانداری اور محنت کی کوئی قدر ہی نہیں تھی۔

وہ ایک نمبر کا ناکارہ انسان تھا۔ اس نے بہت سے کام خراب کردیے تھے۔ وہ فیصلے کی قوت سے عاری تھا۔ اس کے علاوہ وہ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ اس میں صرف ایک خوبی تھی کہ وہ باس کا سالا ہے۔

میں نے فرم کی بھلائی کو دیکھتے ہوئے اس کے بارے میں باس سے بات کرلی۔ اس کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن مجھے فرم سے نکال دیا گیا۔ میں بے روزگار ہوگیا تھا۔ اس دور میں بے روزگار ہونا کتنا بڑا عذاب ہے۔ اس کا تصور صرف وہی کر سکتے ہیں جو اس صورت حال سے گزرے ہوں۔

ایک پرابلم یہ تھی کہ میں کرائے کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ جس کا کرایہ ہر مہینے دینا پڑتا۔ اس کا بھی اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ ویسے تو زندگی بہت سست رفتار ہوتی ہے لیکن جب آپ کرائے میں رہتے ہوں تو وقت اتنی تیزی سے گزر جاتا ہے کہ یقین ہی نہیں آتا کہ مہینا ختم ہوگیا ہے۔

تو صورت حال یہ تھی کہ میں پچھلے کئی مہینوں سے کرایہ نہیں دے سکا تھا۔ مالک مکان بے چارہ شریف انسان تھا۔ اس نے کچھ دنوں تک تو صبر کیا پھر اس نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔

میرے پاس سامان نام کی بہت تھوڑی سی چیزیں تھیں۔ کتابیں تھیں۔ کچھ جوڑے کپڑوں کے تھے۔ میری ڈگریاں تھیں۔ وغیرہ۔ کھانا وغیرہ چونکہ باہر ہی کھایا کرتا اسی لئے کچن کے سامان کی جھنجٹ نہیں تھی۔

اب میں کہاں جاتا۔ ایسا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ اس شہر میں میری ایک بہن تھی جس کی شادی ہوچکی تھی لیکن اس کے یہاں جا کر رہنا میرے مزاج کی بات نہیں تھی۔

میں اپنا مختصر سامان لے کر اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ میں سامان کے ساتھ آیا ہوں تو اس کی ہوائی اڑ گئی لیکن جب میں نے یہ کہا کہ میں کچھ دنوں کے لئے اپنا یہ سامان اس کے گھر رکھوانا چاہتا ہوں تو پھر اس کی جان میں جان آئی۔

''کیوں جلال خیریت تو ہے نا۔'' اس نے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

''ہاں۔ ہاں۔ سب خیریت ہے۔ میں ذرا کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر جارہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ مکان بھی چھوڑ دیا ہے۔ واپس آکر دوسرا مکان دیکھوں گا۔ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی؟''

''ارے کس بات کی تکلیف؟'' وہ سراپا اخلاق بن گیا تھا۔ ''یہ تمہارا ہی گھر ہے۔ رکھ دو سامان۔''

میں نے اپنا مختصر سامان اس کے گھر رکھ دیا اور چل پڑا۔ کہاں جانا تھا۔ یہ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی۔ اس وقت نہ جانے کیسی خودداری مجھ میں بے دار ہوگئی تھی کہ میں نے اپنے دوست سے کچھ پیسے بھی نہیں

پا تکے۔ حالانکہ میں نے صبح سے ناشتا بھی نہیں کیا تھا لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر آپ کی جیب میں کچھ نہ ہو تو کسی اور کے آگے سوال کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اس موقع کا ایک شعر بہت اچھا ہے۔
''ناکامیوں نے اور بھی خودسر بنا دیا۔ اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہو گئے۔''

اب کہاں جاتا۔ پرانے لوگوں اور پرانے محلوں سے جی اکتا گیا تھا۔ کیا فائدہ تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے میں ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ میں وہاں اس ارادے سے ہر گز نہیں بیٹھا تھا کہ میں یہیں اپنا اڈا بنا لوں گا۔ بلکہ صرف تھک کر بیٹھ گیا تھا۔ بہت دیر تک پیدل چلتا رہا تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ درخت کا سایہ اتنا گھنا اور آرام دہ تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ میرا خیال ہے کہ اتنی بے فکری کی نیند برسوں کے بعد میسر ہوئی ہوگی۔

سو کر اٹھا تو شام ہو چکی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے پاس ایک پلیٹ میں کچوریاں، بھاجی اور پانی کی بوتل کے ساتھ ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ میں حیرت سے یہ سب دیکھتا رہ گیا۔ کون خدا کا ایسا نیک بندہ تھا جو میرے کھانے کا بندوبست کر کے چلا گیا تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کھانا شروع کر دیا۔ جب خدا نے کھانے کا بندوبست کر ہی دیا تھا تو فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا۔ کھانے سے فارغ ہوا۔ سچ یہ ہے کہ اس درخت کے نیچے بہت آرام اور سکون مل رہا تھا۔

میں نے پلیٹ وہیں رہنے دی۔ اس کے بعد درخت کے پاس سے ہٹ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ جگہ ایسی تھی جہاں سے میں گزرا تو کئی بار ہوں گا لیکن رکنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی تھی۔

درخت سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پبلک ٹوائلٹ بھی بنا ہوا تھا۔ حالانکہ ہمارے شہر میں یہ رواج ختم ہو گیا ہے۔ اسی لیے جگہ جگہ دیواروں پر لکھا ہوتا ہے کہ یہاں پیشاب نہ کریں۔ وہ دیکھو کتے کا بچہ پیشاب کر رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کوئی بھی نہیں سنتا۔ اسی لیے ہمارے شہر کی ہر دیوار خوشبو دار ہوا کرتی ہے۔

اپنی کہانی میں یہ حصہ کچھ عجیب سا ہے۔ لیکن یہ ایک معاشرتی بیماری ہے۔ اس میں دونوں طرف سے بے حسی ہے۔ حکومت کی طرف سے بھی اور عوام کی طرف سے بھی۔ حکومت نے چونکہ ایسا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ اسی لیے عوام بھی مجبور ہے۔ وہ کیا کرے کہاں جائے۔

بہر حال یہ دیکھ کر دل خوش ہوا تھا کہ اس جگہ ایک لیٹرین بنی ہوئی تھی اور یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی تھی کہ صاف ستھری تھی۔ پانی کا بھی بہت معقول بندوبست تھا۔ کچھ دیر بعد میں اسی درخت کے پاس واپس آگیا۔

اب وہاں دو عورتیں تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی اور دوسری ایک جوان لڑکی تھی۔

وہ دونوں زمین ہی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں اور بہت ادب سے سلام کیا۔ میں نے حیران ہو کر سلام کا جواب دیا تھا۔

''سرکار۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے ہمارا نذرانہ قبول کر لیا۔'' ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔

مجھے دو باتوں کی حیرت ہو رہی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھے سرکار کہہ رہی تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ کسی نذرانے کی بات کر رہی تھیں۔ یہ بھید اسی وقت کھل گیا جب اس جوان لڑکی نے کہا۔

''جناب۔ امید ہے کہ آپ کو کھانا پسند آیا ہوگا۔''
''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو وہ تم لوگ دے گئی تھیں؟''
''جی سرکار۔'' اس عورت نے کہا۔ ''ہمارا گھر قریب ہی ہے۔ میں جب دوپہر کے وقت یہاں سے گزری تو آپ سو رہے تھے۔ میں اسی وقت آپ کو دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ خدا کا کوئی نیک بندہ ہمارے علاقے میں آگیا ہے۔ میں نے سوچ لیا کہ آپ کی خدمت کروں گی۔''

اس کی بات سن کر بڑی شرمندگی ہوئی تھی۔ ''ارے میں کہاں خدا کا نیک بندہ۔''

''نہیں سرکار۔ خدا کے نیک بندے تو اپنے چہرے سے پہچان لیے جاتے ہیں۔'' اس عورت نے کہا۔ ''اب ایک نگاہ کرم اس لڑکی کی طرف بھی کر دیں۔ یہ میری بیٹی ہے۔ ماہ جبیں نام ہے اس کا۔ ابھی تک اس کا کوئی رشتہ نہیں آیا ہے۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ آپ دعا کر دیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''دیکھیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں ایک گناہ گار قسم کا انسان ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں کیا اور میری دعائیں کیا؟''

اسی وقت ایک گاڑی سامنے آکر رک گئی۔ گرچہ وہ ایک پرانی قسم کی گاڑی تھی لیکن بہر حال گاڑی تو تھی۔ اس

لڑکی نے اس گاڑی کو دیکھتے ہی آواز لگائی ۔ "بابا۔ آجائیں۔"

گاڑی سے ایک آدمی اتر کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ ایک باوقار سا آدمی تھا۔ اس نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم دونوں یہاں کیا کررہی ہو؟"

"ارے جمیل۔ یہ خدا کے نیک بندے ہیں۔ ہم ان کے پاس ان کی دعائیں لینے آئے ہیں۔"

اس کا شوہر بھی اسی مزاج کا تھا۔ اس نے فوراً میرا ہاتھ تھام لیا۔ سرکار! میں جانتا ہوں کہ آپ واقعی خدا کے نیک بندے ہوں گے۔ میری مسز کی نگاہیں ان معاملات میں سچائی کو تلاش کرلیتی ہیں۔ میرا کئی بار کا تجربہ ہے اگر اس نے آپ کو خدا کا نیک بندہ کہہ دیا ہے تو آپ یقیناً ہوں گے۔

میری شرمندگی بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے کہا۔ "نہیں بھائی میں ایسا ہرگز نہیں ہوں۔"

"جانتا ہوں جناب۔" وہ مسکرادیا۔ "اللہ کا کوئی بھی نیک بندہ کبھی اپنی پبلسٹی نہیں کرتا۔ پلیز آپ ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیں۔ میں انکم ٹیکس میں ہوتا ہوں۔ اسسٹنٹ کمشنر۔"

مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنی ایک سی وی اس محکمے میں بھی دے دی تھی۔ یہ بہت اچھا موقع تھا۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ واقعی میری خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ تو مجھے اپنے محکمے میں جاب دلوادیں۔"

"جاب؟" وہ ہنس پڑا۔ "ارے سرکار آپ جیسوں کو جاب کی کیا ضرورت؟ آپ تو ایک اشارہ کردیں تو دنیا آپ کے قدموں میں جھک جائے۔"

میں تلملا کررہ گیا۔ دماغ خراب تھا ان لوگوں کا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ اجازت لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ اب کیا کرتا۔ درخت ہی ایک سہارا تھا۔ اس وقت ایک شعر یاد آرہا تھا۔ آپ بھی سن لیں۔ کچھ خانماں برباد تو سائے میں کھڑے ہیں۔ اس دور کے انسان سے یہ پیڑ بڑے ہیں۔"

دن تو کسی طرح گزر گیا تھا۔ اب رات ہوتی جارہی تھی۔ میرے پاس نہ تو کوئی بستر تھا۔ نہ کوئی تکیہ تھا اور نہ کوئی چادر۔ صرف میں تھا اور میری خانماں بربادی تھی۔

بہرحال اسی درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔ اچانک ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پورا ایک بستر تھا۔ "یہ لیں جناب۔" اس نے بستر میری طرف بڑھادیا۔

"کیا ہے یہ سب؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

"سرکار۔ میرے پڑوسی آپ کے پاس سے ہوکر گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "انہوں نے بتا دیا ہے کہ آپ کا کیا مقام ہے۔ میں اسی لیے ایک چھوٹی سی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اسے قبول کرلیں گے تو مہربانی ہوگی۔ ایک چادر ہے۔ بستر ہے اور تکیہ ہے۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم کردیں۔"

میرا تو دماغ ہی گھوم کررہ گیا تھا۔ میں کیا تھا۔ اور یہ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے تھے۔

اب کیا کرتا۔ یہ سب واپس کردوں یا لے لوں۔ پھر اپنی بے بسی کا خیال آیا۔ لے ہی لینا چاہیے۔ میرے پاس تو رات گزارنے کا بھی ذریعہ نہیں تھا۔ اب خدا نے آرام دہ بستر بھیج دیا تھا تو واپس کرنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے وہ سب کچھ لے لیا۔

میں نے اسی درخت کے نیچے اپنا بستر لگالیا تھا۔ نہ جانے حالات میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے تھے۔

رات بہت آرام سے گزر گئی۔ کسی نے آکر پریشان نہیں کیا۔ "اور نہ کوئی پوچھنے آیا کہ تم کون ہو؟ یہاں کیوں سو رہے ہو؟ میرا خیال ہے کہ یہ ملنگ قسم کے لوگ اسی لیے بے فکرے ہوتے ہیں کہ ان کو کوئی ٹینشن نہیں ہوتی۔ نہ تو بجلی کا بل۔ نہ گیس کی فکر۔ نہ پراپرٹی کا ٹیکس۔ نہ مکان کا کرایہ۔ کچھ بھی نہیں۔ بس جہاں چاہے سو گئے۔ پھر صبح اٹھ کر کسی اور منزل کی طرف چل دیئے۔"

دوسری صبح پھر وہی عورت اپنے شوہر کے ساتھ نمودار ہوئی جو گزشتہ روز مجھے کھانا دے گئی تھی۔ دونوں گاڑی پر آئے تھے۔ اس بار وہ لڑکی ان کے ساتھ نہیں تھی۔ دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔

اس بار وہ ایک بڑی سی ٹرے لے کر آئے تھے۔ جس میں ناشتے کا بھرپور سامان تھا۔ شوہر نے آتے ہی میرا ہاتھ تھام کر چومنا شروع کردیا۔

جبکہ وہ عورت انتہائی عقیدت سے مجھے دیکھے جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی کیفیت تھی جو عام طور پر تیرے قربان جاؤں قسم کی ہوتی ہے۔

"یہ کیا کررہے ہو بھائی؟ میں نے اس آدمی کی گرفت سے اپنا ہاتھ آزاد کرواتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں گناہ گار کررہے ہو؟"

"سرکار۔ میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ

آپ کوئی عام انسان نہیں ہیں۔'' عورت نے کہا۔
''سرکار۔ ہم کل آپ کے پاس سے ہو کر گئے ہیں اور میری بیٹی کا رشتہ آ گیا۔''
''کیا؟'' مجھے خود بھی حیرت ہوئی تھی۔ ''رشتہ آ گیا۔ اتنی جلدی؟''
''سرکار۔ یہ رشتہ ویسے تو بہت پہلے سے آیا ہوا تھا۔ لیکن بیچ میں وہ لوگ جیسے غائب ہو گئے تھے لیکن کل پھر چلے آئے۔ یہ سب آپ کی برکت سے ہوا ہے۔''
میرے لیے بہت نازک پوزیشن تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ یا تو ایسے خاموش رہوں جیسے واقعی میری وجہ سے اس کا رشتہ آیا ہے یا پھر ان لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کروں لیکن ہر انسان کے اندر خوشامد پسندی اور اپنی جھوٹی انا کی جو بیماری ہوتی ہے۔ اس نے مجھے کچھ بولنے نہیں دیا بلکہ یہ خیال آیا کہ اگر یہ لوگ ایسا سوچ رہے ہیں تو سوچنے دو۔ اس میں تیرا کیا جاتا ہے۔
میں خاموش رہا۔ وہ لوگ اجازت لے کر چلے گئے۔ میں ان کے لائے ہوئے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے جو کچھ بھی مل رہا تھا۔ اس میں میری کوئی دھوکا دہی نہیں تھی۔ میں نے کسی کو نہیں کہا تھا کہ میرے لیے ایسا کرو۔ اب اتفاق سے کسی کا رشتہ آ گیا تھا تو اس میں میرا کیا کمال تھا۔ لوگوں کا بھی کیا عقیدہ ہوا کرتا ہے۔
وہ لوگ کچھ دیر بعد چلے گئے۔ اس کے بعد دن بھر میں سوچتا ہی رہا۔ حالات نے مجھے کس موڑ تک پہنچا دیا تھا۔ دس گیارہ بجے کے بعد ایک آدمی میرے پاس آیا۔ وہ ایک خستہ حال بندہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی جیسے بہت ٹوٹا ہوا ہو۔
اس نے اچانک میرا پاؤں پکڑ لیا۔ ''سرکار رحم کریں مجھ پر۔'' وہ گڑگڑانے لگا تھا۔
میں جھلا کر رہ گیا۔ ''ابے کیا ہوا ہے تجھ کو؟ کیا رحم کروں؟''
''سرکار میں جانتا ہوں کہ آپ کی کیا شان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''پورا علاقہ یہ بات جانتا ہے۔ ایک نگاہ کرم کی ضرورت ہے۔ میں ایک مقدمے میں بلاوجہ پھنس گیا ہوں۔ اس سے میری جان چھڑا دیں۔ زندگی بھر غلامی کرتا رہوں گا۔''
''لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نہ تو کوئی جج ہوں اور نہ ہی کوئی وکیل ہوں۔ پھر میں تمہارے مقدمے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''سرکار۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بس میرے حال پر ایک نظر ڈال دیں۔''
''آخر کیا کروں میں؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔
''سرکار۔ آپ بس میرے لیے دعا کر دیں۔ میرا کام بن جائے گا۔'' اس نے کہا۔
''اچھا بھائی تمہاری تسلی کے لیے دعا کر دیتا ہوں،، میں نے یوں ہی ہاتھ اٹھا دیے اور کچھ بڑبڑانے لگا۔
میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لوگ مجھے کیا سمجھنے لگے ہیں۔ میں تو اپنی مصیبت ٹالنے کے لیے یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اور یہ خوامخواہ کی بزرگی گلے پڑ گئی تھی۔
بہر حال میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔
شام کے وقت ایک آدمی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ادھیڑ عمر انسان تھا۔ شیو بڑھی ہوئی۔ لباس میں بھی بے احتیاطی موجود تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔
''کیا بات ہے۔ بہت مزے آ رہے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔
مجھے اس کی بات بری لگی تھی۔ ''کیسی بات کر رہے ہو؟ کیسے مزے؟''
''یہی کہ اتنے آرام سے گزر رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''نہ کوئی کام نہ کوئی فکر۔ بس پڑے رہو۔ اور لوگوں سے اپنی خدمت کرواتے رہو۔''
''میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو؟''
''میرے دوست تم سب سمجھ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بہت معنی خیز تھا۔ ''لیکن تم فکر مت کرو۔ میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔ تم اپنا یہ کام جاری رکھو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''
اب میں بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ذرا اس کو کریدنا چاہیے تھا کہ وہ کس ارادے سے میرے پاس آیا ہے۔
''اچھا یہ بتاؤ۔ تم کس ارادے سے میرے پاس آئے ہو۔'' میں نے پوچھا۔
''تمہارے بزنس کو ترقی دینے کے لیے۔'' اس نے کہا۔
''کون سا بزنس؟''
''اب تم اتنے بھولے بھی نہیں ہو۔'' اس نے کہا۔ ''تم جو یہاں بیٹھ کر ڈھونگ رچا رہے ہو۔ یہ اور کیا ہے۔ یاد رکھو۔

یہ بہت زبردست بزنس ہے۔ مزہ آجائے گا۔ خود سوچو۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ نہ کسی کا ڈر۔ نہ خوف۔ نہ انکم ٹیکس اور نہ نوکری کی فکر۔ بس اپنا حلیہ تھوڑا سا اور بگاڑ لو۔ مزے ہی مزے ہیں۔"

"لیکن بھائی اس سلسلے میں تم کیا کرلوگے؟" میں نے پوچھا۔ اب میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"جو اسسٹنٹ کر سکتا ہے وہ کروں گا۔" اس نے کہا۔ آپ کی پبلسٹی۔ آپ کی کرامات کے تذکرے۔ اس کے علاوہ کلائنٹ کو گھیر کر لانے کی خدمات بھی انجام دوں گا اور وہ بھی بہت کم کمیشن پر۔ صرف پچیس پرسنٹ لیا کروں گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ کام چل جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"چلنا تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔ دوڑے گا۔ اس قوم کو جھوٹی تسلیوں کے سوا اور کیا چاہیے۔"

"چلو۔ ٹھیک ہے۔" میں نے ہامی بھرلی۔

ویسے بھی میرا کوئی کام تو رہا نہیں تھا۔ آوارہ اور بے گھر سا انسان ہو چکا تھا۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو جاتا تو ممکن تھا کہ زندگی میں کچھ اچھے دن بھی آجاتے۔

"چلیں بات یہاں تک تو آگئی۔" اس نے کہا۔ "اب تمہیں ایک قربانی دینی ہوگی۔"

"کیسی قربانی؟"

"اپنے آپ پر جبر کی۔" اس نے کہا۔

"کیا تم اپنی بات کی وضاحت کروگے؟"

"سیدھی سی بات ہے تم کو خود کو بے نیاز ظاہر کرنا ہوگا۔ جیسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی ہی نہ ہو۔ چاہے دنیا بھر کی نعمتیں تمہارے پاس آجائیں۔ تم خود کو یہی ظاہر کروگے کہ تم کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔"

"چلو یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔"

وہ اچانک بول پڑا۔ "یہ لو تمہارا پہلا امتحان۔ شاید وہ بندہ تمہارے لیے کچھ لے کر آرہا ہے۔"

میں نے سامنے دیکھا۔ ایک آدمی ایک ٹرے لے کر ہماری ہی طرف آرہا تھا۔ اس نے قریب آکر بہت ادب سے مخاطب کیا "شاہ صاحب۔ یہ نذرانہ قبول کرلیں۔"

میں نے اس اسسٹنٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اشارہ کررہا تھا کہ میں بے نیازی کی کیفیت طاری کرلوں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس آدمی سے پوچھا۔ "کیا ہے یہ سب۔"

اس آدمی نے ٹرے پر رکھا ہوا کپڑا ہٹا دیا۔ اس میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں تھیں۔

شامی کباب، کسٹرڈ، بریانی۔ کیلے وغیرہ۔

میرے پیٹ میں گڑبڑ سی ہونے لگی۔ بھوک کا شدید احساس ہونے لگا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ سکتا۔ وہ کمبخت اسسٹنٹ بول پڑا۔ "شرم نہیں آتی۔ شاہ صاحب کو ایسی چیزوں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ یہ اللہ والے لوگ ہیں۔ برسوں بھوکے رہتے ہیں۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔" وہ آدمی میری تعریف کرنے لگا۔

میرا دل چاہا کہ میں اس کمبخت اسسٹنٹ کا گلا دبا دوں جس نے مجھے بھوکا مارنے کی ترکیب کی تھی۔ لیکن اپنی بزرگی کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے یہ سب برداشت تو کرنا ہی تھا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے میرے سامنے کھانا بھی شروع کردیا اور میں حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے لیے کچھ نہ کچھ تو بچالے گا۔ لیکن کچھ بھی نہیں۔ وہ سب کچھ کھا گیا تھا۔

بھوک سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔

کھانا لانے والے نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "سرکار اب تو میرے حق میں دعا کردیں گے نا۔ میں ایک مقدمے میں پھنس گیا ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کردوں گا دعا۔" میری آواز بھی مشکل سے نکل رہی تھی۔

وہ اپنی ٹرے لے کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اس اسسٹنٹ پر برس پڑا۔ "ابے تجھے شرم نہیں آئی۔ دیکھ رہا ہے۔ میں صبح سے بھوکا ہوں۔ کچھ تو میرا خیال کیا ہوتا۔"

"سرکار آپ فکر ہی نہ کریں۔ ابھی تو بہت کچھ آئے گا۔"

"اور یہ سب تیرے پیٹ میں چلا جائے گا۔"

"ارے نہیں سرکار۔" وہ مکاری سے مسکرا دیا۔ "میں نے تو پوری پلاننگ کرلی ہے۔ آپ صرف رات کو کھایا کریں گے۔ جس طرح بھوک ہڑتال والے کرتے ہیں۔ وہ اس وقت جی کھول کر کھاتے ہیں۔ جب کوئی ان کو دیکھتا نہ ہو۔ یہی آپ کو کرنا ہے۔ رات کے وقت یہاں کون آئے گا۔ صرف آپ ہوں گے اور میں۔"

"سچ بتا۔" میری آواز روتی ہوئی تھی۔ "رات میں تو

کھانے کا موقع ملے گا نا؟''

''کیوں نہیں ملے گا یار۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ ''بس دن میں اپنا وقار قائم رکھنا۔ اپنی بزرگی کی لاج رکھنا۔''

کچھ دیر بعد ایک آدمی اور آ گیا۔ وہ بھی ایک ٹرے لے کر آیا تھا۔ اس بار اس اسسٹنٹ نے وہ ٹرے ایک طرف رکھ دی تھی اور مجھے اشارہ کیا کہ یہ سب میرے لیے ہے۔ میں رات کو کھاؤں گا۔

وہ آدمی مجھ سے دعا کروا کے واپس چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ''یار کچھ تو دے۔ اس وقت تو کوئی نہیں دیکھ رہا۔''

''نہیں بھائی۔'' اس وقت کچھ نہیں۔ نہ جانے کتنوں کی نگاہیں تم پر لگی ہوں گی۔ کون جانے کون چھپ کر دیکھ رہا ہو۔ اسی لیے احتیاط کر جاؤ۔ اپنی بزرگی کو دھبا نہ لگاؤ۔ بس رات ہونے ہی والی ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہو جائے گا۔''

''کیسے اندھیرا ہو گا؟ ابھی تو دن کے صرف دو بجے ہیں۔'' میں باقاعدہ کراہنے لگا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ تمہارے لیے یہ ایک امتحان کی گھڑی ہے۔ اس میں کامیاب ہو گئے تو ساری زندگی عیش کرو گے۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے مراقبہ میں چلا گیا ہوں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ نقاہت طاری ہونے لگی تھی۔ اس دوران اتنا احساس ہوتا رہا کہ لوگ آ رہے تھے۔ وہ دعاؤں کی درخواست کر رہے تھے۔ اور وہ ان کو ڈیل کر رہا تھا۔ نہ جانے کس کو کیا کیا گولی دی تھی اس نے۔ میں تو صرف سن رہا تھا اور لوگوں کے عقیدے پر افسوس کر رہا تھا۔

اتنا پتا چل رہا تھا کہ لوگ پیسے بھی لے کر آ رہے تھے۔ نذرانے کے طور پر اور وہ کمبخت قبول کرتا جا رہا تھا۔

میں اپنے بارے میں لوگوں کے تاثرات سن رہا تھا۔ لوگ اس بات پر خوش تھے کہ ایک اتنے بڑے ولی نے اس علاقے کو اپنی آمد سے رونق بخشی ہے۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ سرکار گزشتہ بیس برسوں سے بھوکے ہیں۔ پانی تک نہیں پیتے۔ یہ ان کی کرامت ہے۔ اور لوگ واہ وا کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے مجھے فرشتہ بنا دیا تھا۔

بہت دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو سناٹا تھا۔ سوائے اس اسسٹنٹ کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ ابھی تک مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اسی لیے سب سے پہلے میں نے اس کا نام دریافت کیا۔ ''خدا کے بندے اپنا نام تو بتا دے۔''

''بھائی میرا نام خادم ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور میرا کام خدمت کرنا ہے۔ بس اس کے علاوہ میری کوئی پہچان نہیں ہے۔''

''بھائی خادم یہ بتا مجھے کھانے کو کب ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔'' اس نے کہا۔

''کس بات کا افسوس؟ یعنی میں اگر کچھ کھا لوں تو تجھے افسوس ہو گا؟''

''نہیں اس بات کا افسوس کہ آپ جیسے اللہ کے ولی کو کھانے پینے کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ یہ بہت چھوٹی باتیں ہیں۔''

''ابے منحوس۔ میں کب اللہ کا ولی ہوں۔'' میرا پارہ اب چڑھنے لگا تھا۔ ''میں تو ایک عام سا انسان ہوں۔''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔ ذرا یہاں والوں سے تو معلوم کرو۔ وہ تمہیں کیا سمجھنے لگے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تمہاری کرامتوں کی تو دھوم مچ گئی ہے۔''

''ابے کون سی کرامات؟''

''میں نے اپنی ڈیوٹی سمجھ کر تمہارے بارے میں کچھ باتیں مشہور کر دی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''بس اب چپ رہو۔ کچھ لوگ آ رہے ہیں۔''

اس بار ایک فیملی آئی تھی۔ دو عورتیں تھیں اور تین مرد۔ وہ دعا کروانے آئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ ان کمزور عقیدے والوں سے کہوں کہ اگر تمہیں دعا کرنی ہے تو خود ہی کیوں نہیں کرتے۔ اپنے کیس کو خود تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے لیکن میں کہہ نہیں سکا۔ وہ خادم ان لوگوں کو ہینڈل کرنے میں لگ گیا تھا۔

ان عورتوں میں ایک لڑکی بھی تھی۔ بہت اچھی۔ دل چاہا کہ میں یہ سب ختم کر کے اس کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں۔

لیکن ظاہر ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میرے دل پر تو چھریاں اس وقت چلنے لگیں جب وہ خادم اس لڑکی سے باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ نہ جانے اسے کیا گولی دیے جا رہا تھا۔ اس نے تو حد ہی کر دی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ لوگ واپس گئے تو میں اس پر برس پڑا۔ ''یہ تم نے کیا لگا رکھا ہے؟''

''کیوں اب کیا بات ہو گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تم اس لڑکی سے باتیں کیوں کر رہے تھے؟''

''ارے تو اس میں کیا ہو گیا۔ تمہارا مرتبہ ایسا ہے کہ تم

کو کسی لڑکی یا نامحرم سے باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ اسی لیے یہ کام میں کر رہا تھا۔"

"اب مجھے تو اب کچھ زیب ہی نہیں دیتا۔ نہ تو میں کسی لڑکی سے باتیں کر سکتا ہوں، نہ میں کچھ کھا سکتا ہوں۔ پانی تک نہیں پی سکتا ہوں۔"

"بھائی یہ سب عام انسانوں کے لیے ہیں۔ تمہارا مرتبہ سب سے بلند ہے۔" اس نے کہا۔

"میں اب لفظ مرتبے سے چڑ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں ایسا مت کرنا بڑی مشکلوں سے ساکھ بنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔ فکر مت کرو۔ میں نے کھانے کی بہت سی چیزیں بچالی ہیں۔ تم رات کو پیٹ بھر کر کھا لینا۔"

"خدا کے لیے یہ تو بتا دو کہ رات ہونے میں کتنی دیر رہ گئی ہے؟"

"بس تین گھنٹے اور ہیں۔" اس نے بڑے اطمینان سے بتا دیا۔

"خدایا کیا دو تین گھنٹے اور بھوکا رہنا پڑے گا؟"

"کچھ حاصل کرنے کے لیے قربانی تو دینی پڑتی ہے نا۔"

"مجھ پر تو بے ہوشی طاری ہو رہی ہے۔"

"آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔ لوگ سمجھیں گے کہ مراقبے کی پوزیشن میں ہو۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے تو نیند ہی آ گئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک سوتا رہا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو منظر ہی عجیب تھا۔

میرے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ سب بڑی عقیدت کے ساتھ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ نیند سے اٹھتے ہی جو سب سے پہلی کیفیت تھی وہ شدید بھوک کی تھی۔ وہ کمبخت خادم پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔

"سرکار۔ یہ سب لوگ آپ کی محبت اور عقیدت میں جمع ہوئے ہیں۔" اس نے کہا۔ "کیوں کہ ہر طرف آپ کے چرچے ہو گئے ہیں۔"

"خادم۔ پہلے میرے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔" میں نے کہا۔ "بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"سرکار ایسا نہ کریں۔" اس نے کہا۔ "کیوں اپنی بنی بنائی ساکھ کو برباد کر رہے ہیں۔ آپ کی یہی تو شہرت ہے کہ آپ کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ لوگ اسی لیے آپ کا دیدار کرنے جوق در جوق چلے آ رہے ہیں۔ آپ کھائے پیئں گے تو سارا بھرم ختم ہو جائے گا۔"

"ارے کم بخت تو کیا میں بھوکا مر جاؤں۔"

ابھی میں اس خادم سے بات ہی کر رہا تھا کہ ایک آدمی نے آ کر میرا پیر پکڑ لیا۔ "سرکار مجھ پر رحم کریں۔ میرا بچہ بہت نافرمان ہوتا جا رہا ہے۔ ایک نظر کی ضرورت ہے۔ وہ فرمانبردار ہو جائے گا۔"

اس وقت میں اتنا بھنایا ہوا تھا کہ میں نے پاس پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر اس کو دے مارا۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔

خادم نے اسے مبارک باد دینی شروع کر دی۔ "مبارک ہو۔ تمہارا کام ہو گیا۔ سرکار جس کو پتھر مار دیں۔ اس کی قسمت بدل جاتی ہے۔ جاؤ تمہارا بیٹا فرمانبردار ہو جائے گا۔"

پتھر کھانے والا آدمی میرا شکریہ ادا کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وہ دن ہے اور آج کا دن میں پتھر والے بابا کے نام سے مشہور ہو گیا ہوں۔

میں بھی کم بخت کمزور عقیدے والوں کو کس کس کر پتھر مارتا ہوں۔ لیکن ان کی عقیدت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ اور زیادہ میرا احترام کرنے لگتے ہیں۔

میں دن بھر بھوکا رہتا ہوں۔ اب اتنی سہولت مل گئی ہے کہ میں رات کو چھپ کر کچھ نہ کچھ کھا لیتا ہوں۔ خادم نے اس کا بندوبست کر دیا ہے۔ اگر آپ کی بھی کوئی خواہش ہے اور پتھر برداشت کر سکتے ہیں تو ضرور آئیں۔ میں آپ کو اسی پیڑ کے نیچے ملوں گا۔ جس کے گرد ہر وقت لوگوں کی بھیڑ رہتی ہے۔

اور ایک مجہول سا آدمی آپ کو بے تحاشہ گالیاں دیتا دکھائی دے گا۔ وہ آدمی میں ہی ہوں۔

میرا تو خیر جو بھی حال ہو لیکن وہ کم بخت خادم بہت مزے میں ہے۔ دن بھر طرح طرح کے کھانے کھاتا رہتا ہے اور پیسے بٹورتا رہتا ہے۔ یہی دستور ہے۔ آپ بھی اگر پیسے جمع کیے جا رہے ہیں تو یقین کریں کہ وہ پیسے آپ کے تو نہیں البتہ خادم جیسوں کے کام ضرور آ جائیں گے۔

ذرا نظر تو دوڑائیں۔ آپ کے خاندان اور خود آپ کے گھر میں کتنے خادم ہوں گے۔

مگر یہ بتا دوں کہ یہ میری آپ بیتی نہیں ہے۔ یہ ایک مشہور بابا کی آپ بیتی ہے۔ بابا تو اب رہے نہیں لیکن خادم اب بھی عوام کی خدمت کر رہا ہے۔ اب اس کی خدمت کا دائرہ غیر ممالک تک پھیل چکا ہے۔

آپ نے بادامی باغ میں ایک فقیر کو دیکھا ہوگا جو وہیل چیئر پر بیٹھا آنے جانے والوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ پہلی نظر میں اسے میں پہچان نہیں سکا تھا۔ جب پہچانا تو حیران رہ گیا۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص اس حال کو کیسے پہنچا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے جو کچھ بتایا وہ میں اسی کی زبانی سنا رہا ہوں۔

کسی بدبودار اور گندے تالاب میں کوئی کنول کھل بھی جائے تو اس کی اہمیت وہ نہیں ہوتی جو ایک صاف

دردِ محبت

محترم ایڈیٹر

السلام علیکم

ہو سکتا ہے میری طرح آپ نے بھی بادامی باغ یا مال روڈ پر وہیل چیئر پر بیٹھے ایک شخص کو دیکھا ہو گا، جس کے دونوں پیر کٹے ہوئے ہیں۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ کسی ایکسیڈنٹ نے اسے معذور بنایا ہے لیکن ایک دن جب میں نے اسے کریدا تو یہ ہولناک کہانی ابھر کر سامنے آئی جو اتنے سارے دن گزرنے کے بعد بھی میرے ذہن سے چپکی ہوئی ہے۔ پردیس میں یہ خالی وقت کچھ زیادہ ہی ملتا ہے۔ اس لیے میں اس کہانی کو صفحہ قرطاس پر اتارتا چلا گیا۔ شاید آپ کو بھی پسند آئے۔

ارشد علی ارشد

(سعودی عرب)

ستھرے چمن میں کھلنے والے گلاب کی ہوتی ہے۔ ہاں مگر گندے تالاب کا خوبصورت پھول اپنی طرف متوجہ ضرور کرلیتا ہے۔ فیک آئی ڈیز کو میں بدبودار تالاب سمجھتا ہوں۔ گندے جوہڑ کے یہ مینڈک جب بھی مجھے فرینڈ ریکوسٹ بھیجتے ہیں پہلی فرصت میں انہیں بلاک کی ڈوز دے کر چپ کی نیند سلا دیتا ہوں۔ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رات گئے تک فیس بک کا استعمال اس قدر زیادہ ہوگیا کہ ایسے بدھک بدھک کرتے مینڈکوں کو لمحوں میں پہچان لیتا ہوں کہ ان کے چہرے پر جھوٹ کا ملمع چڑھا ہوا ہے۔ فیس بک کا کثرت سے استعمال میرے کام آرہا تھا۔ مجھے کافی تجربہ دے چکا تھا۔ یہ زنبیل یوزر کے میلان طبیعت کے مطابق ماحول کا پھیلاؤ کرتی ہے۔ اور اس کتاب کے چہروں میں انہی کو سامنے لاتی ہے جو دوستوں کے دوست ہوں، قریبی ایریا کے ہوں اور اس سے آن لائن ہوں۔

جب مجھے نواب علی خان کی فرینڈ ریکوسٹ موصول ہوئی تو سمجھ گیا کہ نواب صاحب کا دربار میرے ہی ایریا میں سجا ہوا ہے۔ میں اب لاہور یونیورسٹی کے کیمپ میں نہیں تھا بلکہ اپنے گاؤں کی فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ ریکوسٹ آتے ہی میں نے اس کی پروفائل چیک کی۔ پروفائل دیکھنے پر مجھے پہلے قدم پر ہی احساس ہوگیا کہ یہ گندے جوہڑ کا مینڈک ہے۔ میں اسے جوہڑ سے باہر لا کر بلاک کی مٹی میں دفن کرنے والا ہی تھا کہ ان باکس میسج آن دھمکا۔

”السلام علیکم۔ نوابوں کو نوابوں کی درخواست جلد قبول کرلینی چاہیئے۔“

”خوب! یہاں سچا اور کھرا خاکسار ہی نواب ہے۔ صیغہ جمع کا کیوں استعمال کیا۔“

”یہ بھی خوب رہی۔ ہماری اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ جو نواب نہیں اسے بھی عزت ایسی بخشی کہ نوابوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور صلہ یہ ملا کہ اصل کو ہٹا کر نقل کو منصب سونپ دیا گیا۔“

”اصل اور نقل کا فرق پتا ہے آپ کو؟“ میں چیٹ کے ساتھ ساتھ اس کی پروفائل بھی چیک کرنے لگا۔ نواب صاحب کی کوئی بھی مستند پوسٹ نہیں ملی۔ اس کی کشتی بھنور میں ہچکولے کھاتی نظر آئی۔ آوارہ پرندے کی طرح کبھی ایک شاخ تو کبھی دوسری شاخ پر براجمان نظر آیا۔ اس سے میرا یقین مزید پختہ ہوگیا کہ یہ صاحب واقعی فیک ہیں مگر ایک اسٹیٹس نے مجھے اپنے ارادے سے باز رکھا۔ اسٹیٹس تو کچھ خاص نہیں تھا مگر اس میں ہی کی بجائے شی استعمال ہوا تھا۔ انسان سب سے جیت سکتا ہے مگر فطرت سے نہیں۔ کہیں نہ کہیں فطرت اسے بچھاڑ ہی دیتی ہے۔ وہ اپنی جنس چھپا کر دوہرے جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ اب مجھے اس بلی کو تھیلے سے باہر نکالنا تھا۔ زیادہ دن نہیں ہوئے کہ وہ پردے سے باہر نکل آئی۔ وہ میرے لیے ایک خوشگوار سرپرائز تھا۔ میں لوہار کا بیٹا جس نے اپنی لگن اور محنت سے گریجویٹ کیا اور وہ اس علاقے کے ملک سخاوت کی بیٹی۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کون لگاتا ہے مگر وہ بضد رہی۔ میں دامن بچانے میں محو رہا اور وہ اس پر گرفت مزید مضبوط کرنے کی خواہاں، نتیجہ یہ نکلا کہ میں ان بکس میسج کے انبار تلے دبنے لگا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ کچھ باتوں کا اعتراف کرنا پڑا مجھے کہ جب بھی آن لائن ہوا اس کے میسج کی امید بھی جاگ اٹھی۔ تصاویر کا تبادلہ ہونے پر امید کے دیے کو حسن کی دیا سلائی روشن کرنے لگی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے یاد آتی تھی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ جب چلتا ہوں تو میرے گرد ہالہ بنا کر ساتھ چلتی تھی۔ بس ایسا ہے کہ محسوس ہوتا تھا وہ مجھے زندگی کی ہر روش میں دیکھتی رہتی ہے۔ جب یہ احساس ہو کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے تو ہر کام میں سلیقہ اتر آتا ہے۔ میں بھی ایک سلیقے سے اس کا طلب گار بنتا چلا گیا۔ اس سے میسج میں پوچھا ملوگی نہیں؟

جواب ملا۔ ”تمہیں زندگی عزیز نہیں۔ میں باہر بندوقوں کے سائے میں نکلتی ہوں۔ تمہارا یہ چھوٹا سا بدن بارود کے ڈھیر کا مقابلہ کب کرپائے گا۔“

”میں بارود کے ڈھیر سے گلاب چرالوں گا۔ تم ملنے کا وعدہ تو کرو۔“

”تم نئے دور کے نئے خون ہو۔ مہم جوئی تمہاری نسوں میں محو گردش ہے۔ مگر ذرا تحمل سے سوچو میں پتھر کی چٹان نہیں ہوں جسے تم اپنے ولولے اور جوش سے پاٹ لو گے۔ میں زندہ ذی روح ہوں مگر...... ایک مخصوص طبقے کے لیے۔ تمہارے لیے میں بس ایک تصور ہوں...... اور تصور کے لیے زندگی داؤ پر نہیں لگایا کرتے۔ تم نہیں جانتے ہو۔ میں جس فضا میں سانس لیتی ہوں وہ بھی مستعار ہوتی ہے۔“

”تم جن فضاؤں میں سانس لیتی ہو ان فضاؤں کو میرا سلام۔ اور یقین کرو ان فضاؤں کی ہوائیں مجھے تمہارے بدن کی خوشبو پہنچا دیتی ہیں۔ میں سرشاری کی کیفیت میں محو

تمھاری زلفوں کی زنجیر سے خود کو بندھا ہوا پاتا ہوں۔'' میسج کے جواب میں اس نے لکھا۔

''خواب بننا بری بات نہیں۔ تمہیں دیکھنے کے بعد میرے خانہ دل میں بھی کچھ تاریں خواب کی صورت ایک جال بنا چکی ہیں مگر۔

''مگر کیا؟''

''اس مگر کے آگے صرف اندھیرا ہے ۔اور اندھیرے میں سفر کرنے والے اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔''

''اور اگر اندھیرے میں جگنو کا ساتھ مل جائے تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تو میں لرز جاتی ہوں۔''

''مطلب؟''

''جگنو کے جلنے کا نظارہ نہیں کرسکتی۔''

''ڈرو مت۔ پروانہ آگ میں جلتا ہے تو وفا کا علمبردار بنتا ہے۔ جلنے دو مجھے۔'' میں نے وثوق سے کہا۔

''جلنے نہیں دے سکتی۔''

''کیوں؟''

''ملکوں کی بیٹی ہوں لوہار کے بیٹے سے ہار جاؤں۔ اس کھیل میں مر جاؤں گی پر تمہیں جلنے نہیں دوں گی۔''

''پرانی ریت ہے ہم کمی کمین چوہدریوں کے سر کا صدقہ ہوتے ہیں۔ تم ریت نہ بدلو۔'' میری بات پر وہ بولی۔

''میں ریت بدلنا نہیں، بنانا چاہتی ہوں۔''

''ایک کمی کمین کا ہاتھ تھام کر؟''

''پتا نہیں۔'' اس بار اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ میسج لکھتے ہوئے میری انگلیاں رک گئیں۔ اس دوران اس کا ایک اور میسج آیا۔

''اچھا سنو...... ایک اہم راز بتاتی ہوں ۔ہماری حویلی کے صحن میں دو انسان دفن ہیں مگر ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ انسانی لاشوں پر ہمارے ہاں گلاب کے پودے اگتے ہیں تبھی باہر کے گلابوں سے زیادہ سرخ ہوتے ہیں۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔

''تم بھی صحن میں دفن ہونے سے ڈرتے ہو نا؟''

''میں موت کے خوف سے بے خوف ہوں لیکن تم......''

''نہیں مجھے بھی کوئی خوف نہیں مرنا ہی ہے تو جی کر مروں گی۔ مر کر مرنا مجھے قبول نہیں۔''

''ہر روز مر تو رہی ہو مانا کہ چار دیواری میں تمہیں ہر سہولیات زندگی میسر ہے۔ مگر حویلی سے باہر دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے۔''

''باہر جاتی ہوں مہینے دو مہینے بعد مگر اونچی پگڑیوں اور لمبی بندوقوں والوں کے ساتھ۔ پتا نہیں کیوں بابا کو اپنے محافظ مرد نظر نہیں آتے۔ شاید اسی لیے ہماری جیسی حویلیوں کی جوانیاں ہمیشہ مالی اور ڈرائیور کے ہاتھ تھام لیتی ہیں۔''

''اگر تم طبقاتی فرق کا گلہ گھونٹ دو تو وعدہ رہا اس سفید اور بے داغ کپڑے پر کبھی داغ نہیں لگنے دوں گا۔''

''جو خواب تم دیکھ رہے ہو وہ کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہونے والا۔ میرے ارد گرد رواج کی زنجیریں ہیں ۔تم تو ویسے بھی بابا کو کھٹکتے ہو۔ لوہار کے بیٹے ہو کر شہر سے ڈگری لے آئے ہو۔''

''تم رسمیں نبھاؤ میں محبت۔ مگر جان لو محبت کی گود میں رسموں نے ہمیشہ دم توڑا ہے۔''

''وہ کوئی اور سماج ہوگا۔ میرے سماج میں رسموں کی چکی نے ہمیشہ محبتوں کو رگڑ رگڑ کر پیسا ہے۔''

''ملک کی بیٹی اور اتنی بزدل......''

''اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ تمہارے والدین نے خود کو آگ کی بھٹی میں اس آس پر تپایا ہے کہ بڑھاپا راحت آمیز ہوگا۔

''دلیلوں کا سہارا مت لو...... مجھے بتاؤ لوہار کے بیٹے کا ہاتھ تھامو گی؟''

''اگر تمہاری یہی منشا ہے تو ہاں......''

''کب ملو گی؟''

''کل۔''

''کہاں؟''

''جہاں تم کہو۔''

''میں تو پیاسا ہوں جہاں کنواں ملا بھاگتا چلا جاؤں گا۔ تم بتاؤ اپنے حسن کی آبشاریں کہاں کھولو گی تاکہ اپنی پیاسی آنکھوں کے مشکیزے لبالب بھر لوں۔''

''الیکشن ہو رہے ہیں، کل حویلی کے سارے مرد جائیں گے چچا رضاول کے کاغذات نامزدگی جمع کروانے، میں نکل آؤں گی اور آزما لوں گی تمہیں بھی اور اپنے آپ کو بھی۔''

''وقت اور جگہ بتاؤ۔ کل یہ پروانہ اپنی شمع کے قدموں میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔''

''دن دس بجے۔ سڑک کی اس موڑ پر جو ہمارے فارم ہاؤس کی طرف جاتی ہے۔''

''میں پونے دس بجے موڑ پر پہنچ جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں فارم ہاؤس کا یہ موڑ میری زندگی کو کون سا نیا موڑ دیتا ہے۔''

ایک دن ایک سال پر محیط کیسے ہوتا ہے یہ اس دن پتا چلا۔ سال بھر کا پیاسا شخص جب کنویں کے پاس پہنچے تو اس کی حالت دیوانوں جیسی ہوتی ہے، میری بھی وہی کیفیت تھی جب میں اس کی گاڑی میں سوار ہوا۔ گاڑی، ایک ڈرائیور اور وہ...... آج رسموں کی دیوار کیسے گر گئی؟ میں نے سوچا ضرور مگر سوال کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بھی چپ تھی بس ایک دو بار باہم آنکھیں ٹکرائیں تھیں۔ شاید ڈرائیور کی موجودگی خاموشی کا سبب تھی۔ پندرہ منٹ بعد ہم فارم ہاؤس کے باغیچے میں تھے۔ پہلی بار نقاب ہٹا تو مجھے لگا چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ وہ تصور سے زیادہ خوبصورت تھی۔

''کچھ بولو گے نہیں؟''

''تاب نہیں ہے۔ زبان ہے مگر الفاظ کھو گئے ہیں۔''

''میسج تو بڑے دھواں دھار لکھتے ہو۔''

''ان کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ آپ کو دیکھ لیں تو ساکت ہو جائیں۔'' شعر پڑھا۔

''تم سے آپ پر آ گئے ہو۔''

''بے ادبی نہیں کر سکتا۔''

''یقین نہیں مجھ پر۔''

''نہ ہوتا تو یہاں نہیں گھر میں فیس بک سے کھیل رہا ہوتا۔''

''تو پھر ''تم'' کہو تا کہ مجھے بھی احساس ہو میں کسی اور دنیا کی مخلوق نہیں ہوں یہیں کی باسی ہوں اور ایک عام لڑکی ہوں۔

میں نے اس کے گلنار چہرے کی طرف دیکھا اور سوچا تم عام کیسے ہو سکتی ہو۔ تم آسمان ہو اور میں زمین۔ زمین آسمان کو چھونے کے خواب پالنے لگی ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''ہوں...... کچھ نہیں۔''

''بولو۔ مجھ سے ڈھیر ساری باتیں کرو، میری زلفوں سے کھیلو، میرا ہاتھ تھامو مگر یوں بت بن کر مت کھڑے رہو۔ یہ بت ہر روز دیکھتی ہوں۔ تو اس نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ''تم یہ بت توڑ دو۔ وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولی۔ اس کی کیفیت دیکھ کر میں اندر سے ڈر گیا اور خود میں بے اختیار سمٹنے لگا۔ وہ سابقہ لہجے میں بولی۔

''ڈرتے کیوں ہو۔ محبت کرتی ہوں تم سے اس لیے مجھے محبوب کی طرح ملو ملازم کی طرح نہیں۔''

''محبوب بت بنایا کرتے ہیں توڑا نہیں کرتے۔''

''بے شک میرا بت تراشو مگر خود کو بت کے سانچے سے باہر نکالو۔''

''سوچتا ہوں مخمل میں ٹاٹ کا یہ پیوند کیسا لگے گا۔''

''بالکل ویسا ہی جیسا کانٹوں بھری شاخ کے ساتھ گلاب کا پھول لگتا ہے۔ تم میرے لیے ٹاٹ کا پیوند نہیں گلاب کے پھول ہو۔''

''ایک بات تو بتاؤ آپ......'' میں کہتے کہتے بے اختیار رک گیا۔ اس کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ''نہیں آپ نہیں...... تم......'' میرے کہنے پر اس کے شوخ لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''تم یہ گہری باتیں کیسے کر لیتی ہو۔ تم نے تعلیم حاصل کی ہے؟''

''ہاں اپنی حویلی میں۔ دو لیڈی ٹیچر آیا کرتی تھیں مجھے پڑھانے کے لیے۔ ان میں ایک نوجوان تھی اور خوبصورت بھی۔ میرے بھائی کی نظر پڑ گئی۔''

''پھر......؟''

''پھر کیا اسی فارم ہاؤس کے کسی کمرے میں اس کی سسکیاں اور چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ بعد میں یہیں کہیں۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی باغیچے میں، شاید اسی جگہ جہاں ہم ابھی کھڑے ہیں اس کے تار تار وجود کو دفن کر دیا گیا تھا۔''

''اوہ!'' میں نے ہونٹ سکڑ کر بے اختیار کہا۔

''تم مرد بھی عجیب ہو، تمہاری نظر میں عورت صرف وہ ہے جو تمہارے گھر کی چار دیواری میں سانس لیتی ہے باقی سب ایک کھلونا ہیں۔''

''نہ میں عجیب ہوں، نہ تم کھلونا ہو اس لیے۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے پہلے اپنے ہاتھ کو پھر مجھے دیکھا۔ ''جہاں ہم کھڑے ہیں یہاں کسی ایک کو دفن نہیں ہونا ساتھ جی نہ سکے لیکن مر تو سکتے ہیں۔'' میں نے اپنا ادھورا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ اس کا گرم ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔ میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اب تم خاموش ہو؟''

''پہلی بار کسی مرد نے مجھے چھوا ہے، احساس ہو رہا ہے کہ میں واقعی میں لڑکی ہوں۔ کبھی یہ......'' اس نے کہتے

ہوئے دوسرا ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ ''کبھی یہ ہاتھ چھوڑ تو نہیں دو گے۔''

''وعدہ کرتا ہوں مر جاؤں گا مگر ساتھ نہیں چھوڑوں گا مگر......''

''مگر کیا؟'' وہ تڑپ کر بولی۔

''تمہاری دنیا میں یہ سب ممکن نہیں۔ تمہیں اپنی دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔''

''میں تیار ہوں۔'' وہ اسی لہجے میں بولی۔ میں نے اس کے چہرے پر دو روشن دیوں کو دیکھا۔ ان کی چمک سوا ہو چکی تھی۔ میں نے کہا ''تو ٹھیک ہے چند دن ہفتے یا مہینے خود کو تیار کر لو پھر عشق کی آگ میں اترنا ہے ہمیں۔''

''تمہارے گھر والوں کا کیا ہوگا۔ میرے بابا انہیں زندہ جلا دیں گے۔''

''میری تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ جاب کے لیے اپلائی کر کے آیا ہوں اس لیے پہلے ہی انہیں کہہ چکا ہوں اگر مجھے لاہور میں جاب مل گئی تو آپ سب کو ساتھ لے جاؤں گا۔''

''پہلے کس کا نمبر ہے میرا یا ان کا؟''

''ان کا...... یہی عقل مندی ہے کہ اس گاؤں میں میرا سوائے تمہارے کوئی نہ رہے۔''

''ٹھیک ہے میں اس وقت کا انتظار کروں گی۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور آنکھوں میں نئے سپنے سجا کر نکل آیا۔

کہنے کو تو میں نے سپنوں کے کئی تاج محل بنا لیے تھے مگر رات جب سر تلے بازو رکھ کر لیٹتا تو خیالات ملک سخاوت اور ملک رضا ول بن کر مجھ پر حملہ آور ہونے لگے۔ میں لوہار کا بیٹا اتنی بڑی گستاخی کر بیٹھا کہ انہیں پتا چل جائے تو مجھے زندہ در گور کر دیا جائے گا اور انہیں پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ اور بدلے میں میری بہن۔۔۔ اُف میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ شاید اس نے ٹھیک کہا تھا کہ جو خواب میں دیکھ رہا ہوں وہ کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہونے ولا۔ تو کیا میں اس دعوے سے دستبردار ہو جاؤں جو عشق کے نام سے کیا تھا۔ کیا یہ اختیاری کام ہے؟ میں پوری رات مختلف وسوسوں میں گھرا رہا۔ صبح ہوئی تو مجھے پتا چلا میرا دماغ میرے دل سے نہیں جیت سکا۔

لاہور سے اپائنٹمنٹ کی ای میل آئی تو میں نے فوراً گھر والوں کو کہہ دیا کہ نوکری پکی ہو جانے کے بعد آپ سب کو میرے ساتھ جانا ہے مگر امی نے جانے سے انکار کر دیا۔

''نہ پتر نہ ہم پنڈ والے شہراں وچ نہی رہ سکدے۔ اور فیر تیری بہین دا رشتہ وی نال والے پنڈ وچ طے ہویا اے۔ (نہیں بیٹا نہیں ہم گاؤں والے شہروں میں نہیں رہ سکتے۔ اور پھر تمہاری بہن کا رشتہ بھی ساتھ والے گاؤں میں طے ہوا ہے)۔''

میں امی کے قدموں میں بیٹھ گیا ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''امی میں آپ کو اور ابا کو ہر مہینے صغراں سے ملوانے لے آیا کروں گا۔ اب دیکھو نا امی مجھے آپ لوگوں نے اتنی محنت اور مشقت سے پڑھایا، اس لیے تو نہیں نا کہ میں بھی ابا کی طرح بھٹی کے سامنے لوہا گرم کرتا رہوں۔ مجھے ایک اچھی نوکری ملنے والی ہے اب وقت آ گیا ہے کہ ابا اور آپ مکمل آرام کریں اور میں بہن کی دھوم دھام سے شادی کر سکوں۔''

''ہاں پتر تینوں کس نے روکا ہے۔ تو شوق سے جا پتر پر ہم لوگ۔''

''امی وہاں سے کئی کئی مہینے چھٹی نہیں ملتی۔ میں آپ لوگوں کو اور آپ مجھے دیکھنے کو ترس جائیں گے۔''

''اوئے ٹھیک کہتا ہے محمد علی پتر۔'' ابا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور پھر نرگس ہماری دھی نماڑی تو ہے ہی پرائے گھر کی، چلی گئی تو ہم دونوں کو ان دونوں کی یادیں بے موت مار دیں گی۔''

''وہی تو ابا۔'' میں فوراً ابا کے پاس پہنچ گیا۔ ''آپ لوگ میرے پاس ہوں گے تو میں بھی سکون سے نوکری کر پاؤں گا ورنہ تو چوبیس گھنٹے دھیان ادھر ہی اٹکا رہے گا۔''

''اوئے نہ محمد علی پتر۔ ہم تیرے ساتھ جائیں گے مگر صغراں کی شادی کے بعد پتر۔''

''مجھے منظور ہے ابا، اور میری نوکری لگتے ہی آپ لوگ چاچا امیر کو شادی کی تاریخ دے دیں۔''

''نوکری لگتے ہی۔'' ابا نے حیرانی سے کہا۔ ''پتر نوکری لگتے ہی پیسا ٹکا جمع ہو جاندا ایں؟''

''جمع ہو جائے گا (میں نے پُر اعتماد لہجے کہا۔'' نوکری ہاتھ میں ہو تو پیسا بہت ابا۔''

وہ پھر بھی میری بات نہیں سمجھے اسی طرح حیران ہو کر بولے۔ ''کی مطلب پتر!؟''

''بس آپ دیکھتے جائیں۔'' اس بار وہ خاموش رہے۔ نوکری لگنے اور تنخواہ'' بہتر سیٹنگ بنانے میں مجھے دو ماہ لگ ہی گئے۔ ان دو ماہ میں کنول سے ایک بار مل پایا اور اس نے ایک

لاکھ مجھے میسج کیئے۔ اس کی طرف سے ایک ہی سوال بار بار دہرایا گیا۔ مجھے کب اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے؟''

''میں نے کہا بس ذرا انتظار۔ مجھے حالات درست سمت میں لے جانے دو۔''

نوکری لگی۔ لاہور میں گھر لیا اور لاہور ہی کے دوستوں سے پیسے ادھار لے کر بہن کی شادی کر دی۔ اب گھر والوں کو نئے گھر لے جانا تھا۔ کنول کو بتایا تو اس کی بے چینی دیدنی تھی۔

''اوہ علی اس کا مطلب ہے ہمارے ملنے کے دن قریب آگئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں بہت جلد ہم گاؤں کے زرخیز لوگوں کے لیے ایک نئی مثال بننے جا رہے ہیں۔''

صغراں کی شادی کے بعد لاہور شفٹ ہوتے ہی میں نے کنول کو میسج کر دیا کہ تیاری پکڑو۔ اور پلان بھی بتاؤ کہ تم پنجرے سے باہر کیسے آؤ گی۔

''اگلے ماہ کی دس تاریخ کو چچا کے الیکشن ہیں۔ سارے مرد وہاں مصروف ہوں گے میں حویلی سے نکل سکتی ہوں۔''

''اچھا گڈ آج پچیس تاریخ ہے مطلب ٹھیک پندرہ دنوں بعد۔''

''ہاں تم اگلے دن ہی آجانا، ووٹ بھی کاسٹ کر دینا آخر تمہارے سر جی امیدوار ہیں۔''

''ضرور تم تیاری کر رکھو میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اور سنو ہم لاہور میں کورٹ میرج کریں گے۔ چند ماہ تمہیں الگ رکھوں گا۔ حالات نارمل ہو گئے تو گھر لے آؤں گا۔ ٹھیک ہے نا؟''

''تمہارا جو جی چاہے کرو میں تو داسی ہوں تمہاری۔''

اس کی انہی باتوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ میں نے ہر ممکن انتظامات کیے اور الیکشن سے ایک دن قبل گاؤں پہنچ گیا۔ صبح صبح ووٹ کاسٹ کر کے کنول کو میسج کیا۔

''کیا اطلاع ہے، حویلی کے حالات کیسے ہیں؟''

''ابھی سازگار نہیں۔ تم تیار رہنا میں مناسب موقع دیکھ کر میسج کروں گی۔''

''میں بالکل تیار ہوں بس تم حکم کرو۔'' ہمارے درمیان سب کچھ طے پا گیا تھا بس موقع ملنا تھا اور ہمیں پرواز کر جانی تھی۔ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے مگر میں کہتا ہوں محبت احمق بھی ہوتی ہے۔ اچھے بھلے انسان کی مت (عقل) مار دیتی ہے۔ میں لوہار کا بیٹا اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گاؤں کے امیروں سے پنگا لے بیٹھا۔ مگر محبت نے مت جو مار دی تھی۔

ضمنی الیکشن کی نشست ملک سخاوت کے بھائی ملک رضاول نے جیت لی تھی۔ اب وہ اپنے حجرے میں جشن منا رہے تھے اور میں حویلی کے عقبی حصے میں بائیک لیے کسی سائے کا منتظر تھا۔ ادھر ڈھولک کی تھاپ پر رقص جاری تھا ادھر دل کی زمین پر کنول کی صورت ایک نیا کنول کھل چکا تھا۔

بائیک نے جب گاؤں کی حدود پار کر لی تو کنول نے اپنی ساری قبائیں کتر ڈالی...... ہوا کی تیز لہر سے کھلی زلفیں یوں لہرانے لگیں جیسے درخت کے جھکے ہوئے خوشے لہراتے ہیں۔ اس کے منہ سے خوشی کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ میں اس کی کیفیت دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اسے میرے ملنے کی خوشی ہے یا اپنی رہائی کی۔ مگر جو بھی تھا میری محبت میری بانہوں میں تھی۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا مجھے بائیک پر ہی ساہیوال سے چیچا وطنی پہنچنا تھا۔ وہاں ایک دوست کے ہاں بائیک کھڑی کرنی تھی اور راتوں رات لاہور کی گاڑی پکڑنا تھی کیونکہ ملکوں کا جشن جب ختم ہوگا تو انہیں کنول کی گم شدگی کا پتا چل جانا تھا اور پھر انہیں انسان سے پاگل کتے بن جانے میں دیر نہیں لگنی تھی۔

''چیچا وطنی کتنا دور ہے یہاں سے۔'' کنول نے میرے کان کے قریب ہونٹ لاتے ہوئے تیز آواز میں پوچھا۔ میں نے دانستہ انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''کیا کہا؟''

اس بار وہ زیادہ قریب ہو کر بولی۔ ''چیچہ وطنی کب تک پہنچیں گے۔'' میں نے رفتار کچھ مزید تیز کر دی۔ ہوا کی چیخوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ گردن دائیں طرف گھما کر اونچی آواز میں کہا۔ ''اگر اسی اسٹائل میں بیٹھی رہو اور یوں ہی قریب سرک کر سوال پوچھو تو انشاء اللہ دو چار دن لگ ہی جائیں گے۔'' میری بات سن کر اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور سابقہ طریقے میں بولی۔

''رومانس چھوڑو سر دست کہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ تلاش کرو۔''

''ویسے تمہیں ڈر نہیں لگ رہا یا اپنے گھر کا اسلحہ بھول گئی ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''گھر سے باہر قدم رکھا تھا تو ڈر بھی لگا تھا مگر اب نہیں۔''

''اب کیا ہوا؟''

''ہمارے مرد کہاں تک بھاگ سکتے ہیں۔ موت تک ناں۔ تمہارا ساتھ اور قربت مل گئی ہے چند گھنٹے۔ اب موت بھی آجائے تو قبول ہے۔''

''اتنی جلدی مرنے نہیں دوں گا تجھے وعدہ ہے میرا۔''

''تمہارا فون بج رہا ہے۔'' کنول نے کہا تو مجھے احساس ہوا شاید پہلے بھی ایک دوبار کال آچکی ہے۔ میں نے بائیک ایک طرف روک کر فون نکالا تو چونک پڑا۔ گاؤں میں اپنے جگری یار وقار کو کہہ آیا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی تو فوراً مجھے کال کرنا۔ میں نے جلدی سے سبز بٹن دبایا۔

''ہاں وقار بولو۔''

''یار کب سے کالیں کر رہا ہوں کال اٹینڈ کیوں نہیں کر رہے ہو۔''

''سوری راستے میں مجھے پتا نہیں......''

''اچھا سنو کنول کے گھر والوں کو اس کی گم شدگی کا پتا لگ چکا ہے۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میں نے چونکتے ہوئے کنول کی طرف دیکھا۔ اس نے پلکوں کے اشارے سے پوچھا کہ کیا ہوا مگر میں وقار کی طرف متوجہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔'' ملک برادران بظاہر تو مبارک باد دینے کے لیے آنے والے لوگوں میں مصروف ہیں مگر اندرون خانہ کنول کی تلاش زور و شور سے جاری ہے۔ سب سے چھوٹے ملک جی اپنا لشکر لے کر باقاعدہ اس کی تلاش میں نکل چکے ہیں۔''

''کچھ اندازہ ہے وہ کس طرف ڈھونڈ رہے ہیں؟''

''کچھ بندے اردگرد کے تمام دیہاتوں میں روانہ کیے گئے ہیں اور کچھ ساہیوال شہر کی طرف۔'' وقار نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''تم لوگ کہاں ہو ابھی۔''

''ہم لوگ چیچہ وطنی کی طرف جارہے ہیں تمہیں پتا ہے چیچہ وطنی ساہیوال سے پچاس کلومیٹر دور ہے تو نصف راستہ طے کر چکے ہیں ہم لوگ۔''

''آگے کیا پروگرام ہے یار۔ مجھے لگتا ہے یہ لوگ چیچہ وطنی بھی ضرور جائیں گے۔'' وقار کے لہجے میں تشویش کا عنصر واضح تھا۔

''جانے کو تو وہ پورے پاکستان میں جائیں گے یار۔ بس دعا کرو ہم آج رات ہی لاہور پہنچ جائیں۔ کل صبح کی لو پھوٹتے ہی کورٹ میرج کرلیں گے۔''

''اچھا تو مزید دیر مت کرو نکلو تم لوگ۔ میں تمہیں آپ ڈیٹ کرتا رہوں گا۔ گڈ لک۔''

کال کٹتے ہی کنول بے تابی سے بولی۔

''کیا ہوا؟''

میں نے شوخی سے جواب دیا۔ ''ابھی کچھ نہیں۔ جو بھی ہوگا شادی کے بعد ہوگا۔''

''اُف، بتاؤ بھی میرا دل بیٹھ رہا ہے۔'' اس نے میرے بازو پر گرفت مضبوط کرکے کہا۔

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ موت بھی قبول ہے اور ڈر نہیں لگتا۔ ایک کال کے آتے ہی دل کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔''

''ایک بار شرعی طور سے میرے ہو جاؤ پھر اللہ کی قسم مر بھی جاؤں تو پچھتاوا نہیں ہوگا۔''

''یار بار بار مرنے کی باتیں مت کرو۔ میں حویلی سے زندہ لاش کو زندگی دینے کے لیے ساتھ لایا ہوں۔ اور تم جیو گی موت نے آنا ہوا تو اسے پہلے میرا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''تم نے اصل بات اب بھی نہیں بتائی۔'' میں نے بائیک کو کک لگاتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو بتاتا ہوں۔'' کچھ دیر چلنے کے بعد میں نے اسے وقار کی طرف سے دی گئی معلومات بتائیں تو وہ بولی۔

''چیچہ وطنی جانا ضروری ہے کیا۔ لاہور کے لیے یہاں سے بس نہیں ملے گی؟''

''گاڑی تو یہاں سے بھی مل جائے گی مگر موٹر سائیکل۔''

''دفع کرو اسے گاڑی پکڑو اور لاہور پہنچو۔ تم میرے بابا اور چچاؤں کو نہیں جانتے وہ تہیہ کر چکے ہوں گے کہ فجر کی اذان سے پہلے پہلے ہمارے جسم کی بوٹیاں پالتو کتوں کو کھلا دیں گے۔''

''ہمارا گوشت تمہاری حویلی کے کتوں کو ہضم نہیں ہو گا۔'' میں نے حتی المقدور رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے جانے والی گاڑی بھی چیچہ وطنی سے ہو کر ہی جائے گی تو کیوں نہ بائیک محفوظ ٹھکانے پر پہنچادی جائے۔''

''تمہارے دوست کی طرف گئے تو وقت ضائع ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم محبت کے نام پر اپنی بائیک قربان کردو۔''

''یہ بائیک میرے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اب تک تمہارے گھر والوں کو کم از کم یہ شک نہیں ہوگا کہ تم میرے ساتھ ہو سکتی ہو کیونکہ لوہار کا بیٹا اتنی بڑی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہاں تک وہ لوگ پہنچے گے تو میری بائیک کا یوں ملنا

انہیں مشکوک کر دے گا۔"

میری بات سن کر اس بار وہ خاموش رہی۔ ہم لوگ مزید سوا گھنٹے بعد دوست کے پاس موجود تھے۔ میں نے وہاں وقت ضائع نہیں کیا۔ بائیک اس کے حوالے کی اور وہاں سے رخصت ہوا۔ لاہور کے لیے گاڑی جلدی مل گئی۔ ہم لوگ صبح پانچ بجے لاہور پہنچ گئے۔ میں نے ایک متوسط کالونی میں دو کمروں کا چھوٹا سا گھر علیحدہ کرائے پر لے رکھا تھا وہاں جاتے ہی کنول چارپائی پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کے لیے اتنی مشقت بہت تھی۔ میری پلکوں کی جھالر میں بھی نیند اٹکی ہوئی تھی اس لیے میں بھی کمرے میں جا کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا میں چونک کر اٹھا اور کنول کی طرف جھانکا۔ وہ ہنوز نیند کے مزے لے رہی تھی۔ میں جلدی سے فریش ہوا اور اسے جگاتے ہوئے کہا۔ "اٹھو کنول تم فریش ہو جاؤ میں کھانے کے لیے کچھ لاتا ہوں۔"

اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو میں نے باتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "صابن اور ٹاول اندر ہی رکھ دیا ہے۔ میں بس دس منٹ میں آیا۔"

میں اس کا جواب سنے بغیر نکل گیا۔ باہر جاتے ہی مجھے سیل فون کا خیال آیا جسے سوتے وقت میں سائلنٹ موڈ پر لگا دیا گیا۔ اب دیکھا تو وقار کی دس کالیں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے فوراً اس کا نمبر ملایا۔

"معاف کرنا یار میں سو رہا تھا۔" نمبر لگتے ہی میں نے کہا۔

وقار بولا۔ "ابے ملکوں کی نیندیں حرام کر کے تو وہاں مزے کی نیند لے رہا ہے۔"

"یار بہت تھک گئے تھے ہم لوگ۔"

"اچھا سنو تمہارے سسر جی رات میں ہی اپنا قافلہ لے کر لاہور نکل گئے تھے۔ امید ہے کہ اب تک پہنچ بھی چکے ہوں گے۔"

"لاہور...... میں نے حیرت سے دہرایا۔ یار یہ سیدھا لاہور کیسے آ گیا۔ ایسا کون سا کلیو ہے جسے پکڑ کر وہ سیدھا لاہور آن دھمکا ہے۔"

"یہ تو پتا نہیں مگر اندر کی خبر ہے کہ انہیں تم پر ہی شک ہے۔"

"یار یہ اندر والے بھی مجھ جیسے شریف بندے پر شک کر رہے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"ویسے بڑے ڈھیٹ ہو یار۔ ایک جیتی جاگتی لڑکی اغوا کر کے بھی شریفوں کی صف میں کھڑے ہو۔ اچھا سنو میری بات مانو تو فوراً اس سے پہلے نکاح کر لو مارے جاؤ تو پچھتاوا تو نہیں ہوگا کہ کنوارہ مر گیا بے چارہ۔"

"تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں میں اتنی جلدی نہیں مرتا وہ بھی چوہدریوں کے ہاتھوں۔ فون رکھتا ہوں ہوٹل میں آ گیا ہوں کچھ پیٹ پوجا کرنے دو۔"

میں نے وقار سے ہنسی مذاق میں بہت کچھ کہہ دیا تھا مگر اندر سے میں خوف زدہ تھا۔ خاص اس بات پر کہ کنول کے گھر والے لاہور پہنچ گئے ہیں اور انہیں شک بھی مجھی پر ہے۔ آج عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل اعلیٰ الصبح کورٹ پہنچ جانا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ کنول کو ڈھونڈنے والے کم سے کم عدالت کا رخ نہیں کریں گے مگر اگلی صبح میرا اندازہ کانچ کے برتن کی طرح چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ میں اور کنول جیسے ہی کچہری پہنچے سامنے اس کا باپ اپنے تمام لاؤلشکر سمیت کھڑا ہوا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ کنول نے بے اختیار میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور میری حالت بھی غیر تھی ملک سخاوت میرے قریب آیا اور الٹے ہاتھ کا چانٹا میرے منہ پر دے مارا۔ کنول کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ لوگوں میں سے کوئی مدد کے لیے آگے آئے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ملک سخاوت میرے قریب آ کر بولا۔

"تو دو ٹکے کا لوہار کیا سمجھ بیٹھا تھا کہ ملکوں کی عزت اتنی سستی ہے جو تم بیچ چوک پر نیلام کر دو گے اور زندہ رہو گے۔"

"ملک صاحب ہم ایک دوسرے سے محبت......" میں نے کہنا چاہا مگر ایک اور زوردار تھپڑ میرے گال سرخ کر گیا۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو۔" ان کے حکم پر مجھے اس کے بندوں نے پکڑ کر گاڑی میں ٹھونس دیا۔ میں نے آخری بار کنول کو دیکھا اسے باپ کلائی سے پکڑ کر اپنی گاڑی کی طرف لے جا رہا تھا۔ آگے کی کہانی بہت مختصر ہے۔ میں کنول سے کیے گئے وعدے کو پورا نہ کر سکا۔ اسے بھی فارم ہاؤس کے لان میں دفنا دیا گیا تھا مگر اس بار وہ اکیلی نہیں دفنائی گئی بلکہ میری بہن بھی اس کی شریک قبر تھی۔ اور میں وھیل چیئر پر بیٹھ کر لاہور کی سڑکوں پر بھیک مانگ رہا ہوں کیونکہ ملکوں نے میری دونوں ٹانگیں کاٹ کر مجھے گاؤں والوں کے لیے بطور عبرت پھینک دیا تھا۔

درست فیصلہ

محترم مدیراعلی
سلام تہنیت
اس بار جو سچ بیانی ارسال کررہا ہوں یہ میری سرگزشت نہیں، یہ کہانی عاصم، عابد اور عاقب کی ہے۔ یہ تین دوست اب نہیں رہے لیکن ان کی دوستی دشمنی سے ہر کوئی واقف ہو چکا ہے۔ سرگزشت کے قارئین بھی ان کی کہانی سے سبق حاصل کریں گے۔
ناظم بخاری
(لودھراں)

مسجد میں عاصم کی موت کا اعلان ہوچکا تھا۔
قبر کھودی جاچکی تھی اور بعد نماز ظہر تدفین تھی۔ گھر میں اپنے یار کے غم میں رونے کی بجائے، اپنے گھر میں بیٹھا، اپنے غموں پر پریشان ہورہا تھا۔

میرا ایک ہی بیٹا تھا، عزیز۔ جو میری شادی کے پندرہ سال بعد بڑی منتوں اور مرادوں سے ملا تھا۔ آج صبح گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ گاؤں کے سب سے اونچے درخت پر چڑھتے ہوئے گر پڑا۔ نتیجے میں اس کا سر پھٹنے کے

ساتھ ساتھ سینے کی دو ہڈیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔

تیرہ، چودہ سالہ عزیز کو اس حال میں دیکھ کر میں تڑپ اٹھا تھا۔ ہماری بستی میں صرف ایک ہی ڈاکٹر تھا اور وہ تھا ڈاکٹر شعیب۔ میرے دوست عاصم کا بیٹا۔ جو شہر کے کسی اسپتال میں ڈیوٹی دیتا تھا ہر ہفتے اپنے اوطاق میں بیٹھ کر گاؤں والوں کا علاج کرتا تھا۔

مگر آج اس کا کلینک بند تھا۔ آج اس کا باپ اوپر والے کو پیارا ہو گیا تھا اور سارا گاؤں اس کے غم میں شریک ہونے، اس کے گھر جمع تھا۔ شعیب اپنے گھر بیٹھا، سب سے ہمدردی کے بول سمیٹ رہا تھا۔ آج کا دن میرے لیے دو دو دکھوں کا باعث تھا۔ ایک عاصم کے چلے جانے کا دکھ اور دوسرا اپنے بیٹے کے مجروح ہونے کا دکھ۔ جونہی مسجد سے عاصم کے گزر جانے کا اعلان ہوا تھا میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے سخت بیمار تھا اور شہر کے کسی اسپتال میں داخل تھا۔ مگر شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹر بھی اسے بچا نہیں پائے تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اظہار افسوس کے لیے اس کے بیٹے شعیب کے پاس جاتا، اچانک عزیز کے ساتھ یہ حادثہ پیش آ گیا تھا اور اب میں اسے اپنی گود میں لیے رو رہا تھا۔ آج جن حالات میں ڈاکٹر شعیب تھا، ان حالات میں عزیز کو اس کے پاس لے کر جانا، خود غرضی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا اور دوسرا اگر میں اسے اس کے پاس لے بھی جاتا تو بھی کیا پتا وہ میرے بیٹے کو دیکھتا یا نہیں؟ اس کے گھر میں باپ کی میت پڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر کیسے میرا غم دور کرتا؟ میرے پاس صرف ایک ہی رستہ تھا اور وہ یہ کہ میں فوراً ہی اسے شہر لے جاتا۔ مگر میں اکیلا اسے شہر نہیں لے جا سکتا تھا۔ میں ساٹھ سال کا ایک بڈھا، جس کا خود کو سنبھالنا بھی بہت دشوار تھا، وہ کیسے کسی اور کو سنبھالتا؟ اگر کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتا تو پھر بھی بات بن سکتی تھی مگر میں اکیلا؟

جس طرح شعیب کے باپ کی خبر پوری بستی میں پھیل گئی تھی، اسی طرح عزیز کی خبر سے بھی سب آگاہ ہو گئے تھے۔ سب جان پہچان والے اسے دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔ اچانک انہی میں مجھے ڈاکٹر شعیب نظر آیا۔ وہ اپنے باپ کی میت گھر چھوڑ کر ایڈ باکس اٹھائے میرے بیٹے کو دیکھنے آیا تھا۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے عزیز کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس نے اس کے سر پر پٹی کی اور اس کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ سینے کی ایک دو ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ آپ جتنا جلدی ہو سکے اسے شہر لے جائیں۔ اس کا مکمل علاج کسی اسپتال میں ہی ممکن ہے۔“

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”پتر، کس کے ساتھ شہر لے کر جاؤں؟ میں ایک اکیلا بندہ ہوں اور......“

”اچھا، آپ یوں کریں، میں نماز جنازہ پڑھ کر اسے شہر لے جاتا ہوں۔ آپ میرے پیچھے بابا کی قبر بنوا دینا......“ اور پھر دوپہر کو نماز جنازہ پڑھتے ہی وہ اپنی گاڑی میں عزیز کو شہر لے گیا تھا۔ اس کی واپسی مغرب کے بعد ہوئی تھی۔ تب تک ہم اس کے باپ کو اس کی آخری آرام گاہ میں ہمیشہ کے لیے سلا آئے تھے۔ واپسی پر اس نے بتایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ عزیز کو ایک اچھے سے اسپتال میں داخل کرا آیا ہے، جہاں اس کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ وہ دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔ اگلے دن وہ دوبارہ شہر گیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ عزیز سچ میں ایک اچھے اسپتال میں داخل تھا۔ جہاں اس کا اچھا علاج ہو رہا تھا۔

اگلے ایک ماہ میں عزیز ٹھیک ہو کر گھر لوٹ آیا تھا اور مجھے نئی زندگی مل گئی تھی۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا اور مجھے جان سے بھی پیارا تھا۔

اگلے دن میں ڈاکٹر شعیب کے کلینک پر اس کے روبرو بیٹھا اسے کہہ رہا تھا۔

”پتر! تمہارے ابا نے آج سے سینتیس سال پہلے ایک فیصلہ کیا تھا جو کہ میرے نزدیک غلط تھا۔ مگر اس نے کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب میں اس کے اس فیصلہ کو درست تسلیم کروں گا اور آج وہ وقت آ گیا ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے بابا کا فیصلہ بالکل بجا تھا۔“

”کیسا فیصلہ؟“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں تمہیں شروع سے ساری کہانی سناتا ہوں۔“

☆☆☆

یہ بات پورے گاؤں کے لیے خوش گوار حیرت کا باعث تھی کہ اس رات ہم تینوں نے اپنے اپنے گھروں میں ایک ساتھ ہی جنم لیا تھا اور وہ بھی قریباً ایک ہی وقت میں۔ ایک ہی رات میں تین بچوں کی پیدائش، ہمارے گاؤں میں پہلی بار ہوئی تھی۔ وہ تین بچے، میں، (عاقب) عابد اور عاصم تھے۔ ہم تینوں کی ایک ساتھ پیدائش کیا ہوئی، اتفاق

سے ہمارے گھر والوں نے جو ہمارے نام رکھے، ان کا پہلا حرف بھی مشترک تھا۔ شاید یہی وجہ تھی یا کوئی اور کہ جونہی ہم بھاگنے دوڑنے اور کھیلنے کودنے کی عمر کو پہنچے، ہم تینوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ ہمارے گاؤں کی چھوٹی سی مسجد میں ایک مولوی صاحب تھے، جو بستی کے تمام بچوں کو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ ہم تینوں بھی ان سے مدرسے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے لگے۔ کچھ دن بعد ہمیں گاؤں کے واحد اسکول میں بھی داخل کرا دیا گیا۔ ان دنوں انگریزی اسکول نہ ہونے کے برابر تھے اور گاؤں میں تو تھے ہی نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اور عابد یقیناً انہیں اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے۔ کیوں کہ میرا اور عابد کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ وہ ملکوں کے خاندان سے تھا اور میں شیخوں کے۔ اور ہمارے گاؤں میں یہی دو خاندان کسی قابل تھے۔ یعنی صاحب حیثیت تھے۔ (البتہ عاصم کا تعلق ایک بہت ہی غریب اور عام سے گھرانے سے تھا) مگر مجبوری کے عالم میں ہمیں بھی اس عام سے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ کچی سے لے کر پرائمری اور پرائمری سے لے کر مڈل تک ہم نے اسی اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی۔ مدرسے اور اسکول میں عاصم ہمیشہ ہم سے آگے اور بہتر رہا۔ مدرسے میں اس نے ہم سے پہلے قرآن مجید ختم کرلیا تھا۔ اسکول میں بھی وہ ہم سے ہر کلاس میں بہتر نمبر لے کر پاس ہوتا رہا۔ اس کی اس کامیابی کو میں اور عابد کھلے دل سے تسلیم کرتے تھے۔ وہ بچپن اور لڑکپن کا دور تھا۔ کدورت اور نفرت سے ابھی آشنائی نہیں ہوئی تھی اور شاید ہوتی بھی نہ، اگر ہم تینوں جوانی کی حدود میں داخل نہ ہو جاتے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ہم تینوں کے مشاغل بھی قریباً ایک جیسے تھے۔ ہم بچپن میں غلیل سے چڑیوں کا شکار کرتے، گلی ڈنڈا کھیلتے، پتنگ اڑاتے اور رات کو چھپن چھپائی کا کھیل کھیلتے۔ اس کے علاوہ ان دنوں کبڈی اور کشتی کا کھیل بھی تھا۔ کرکٹ دیہاتوں میں مقبول نہیں تھی۔ چھوٹے اور بڑے، سب کشتی اور کبڈی کو چاہتے اور سراہتے تھے۔ دوسرے کھیلوں کی طرح ہم تینوں کو کشتی کا بھی بہت شوق تھا۔ کشتی کے داؤ پیچ سکھانے کے حوالے سے بستی میں ایک چھوٹا سا اکھاڑا قائم تھا، جسے حیدر چاچا چلاتے تھے۔ اس اکھاڑے میں بڑوں کے ساتھ ساتھ بچے بھی بڑے شوق سے سیکھنے جاتے۔ مگر وہ، جو صاحب حیثیت ہوتے اور اکھاڑے میں سیکھنے کا خرچا اٹھا سکتے۔ یا پھر کسی تگڑی سفارش کے زور پر رکھے جاتے۔ اس حوالے سے میں اور عابد بہت خوش قسمت تھے۔ ہم دونوں صاحب حیثیت تھے اور ہم نے باآسانی اکھاڑے تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ مگر عاصم کا معاملہ الگ تھا۔ وہ ایک کمہار کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کے ساتھ مٹی کے برتن بنانے میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس کے پاس نہ ہی خاندانی پس منظر تھا اور نہ ہی اثر رسوخ۔ حیدر چاچا کے اکھاڑے تک رسائی حاصل کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ یہ الگ بات کہ ہماری طرح اسے بھی کشتی لڑنے اور اس کے داؤ پیچ سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہم تینوں اسکول میں اکٹھے ہوتے تو ایک دوسرے سے اپنے گزرے ہوئے کل کا حال احوال کہتے۔ جن میں سرفہرست اکھاڑے کا ذکر ہوتا۔ اکھاڑے کے ذکر پر عاصم کی آنکھوں میں دیپ سے جل اٹھتے۔ ہماری باتیں سن کر وہ حسرت سے کہتا۔ ”کاش یار...... میں بھی اس اکھاڑے میں کشتی کے داؤ پیچ سیکھ سکتا۔“ اس کی بات سے ہمارا سینہ فخر سے پھول جاتا کہ اکھاڑے میں سیکھنے کا اعزاز صرف ہمیں حاصل ہے، اسے نہیں۔ شاید میں اور عابد لاشعوری طور پر اس بات میں خوش تھے۔ یہی چاہتے تھے کہ اس کی اکھاڑے تک رسائی ممکن نہ ہو۔ شاید ہمارے دل میں یہ ڈر تھا کہ اگر وہ اکھاڑے تک پہنچ گیا تو دوسرے کھیلوں کی طرح وہ اس کھیل میں بھی بازی مار جائے گا اور ہم دونوں اس سے شکست کھا کر پیچھے رہ جائیں گے۔ ہمارے ہاں ہر سال کپاس کے موسم میں میلا لگتا تھا۔ وہاں دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ کشتی کا بھی مقابلہ ہوتا۔ اس بار یہ میلا لگنے میں صرف ایک ماہ باقی تھا۔ ان دنوں ہم تینوں ساتویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہماری عمریں بارہ، تیرہ سال کے لگ بھگ تھیں۔ مگر ہم اچھا کھانے پینے کی وجہ سے اپنی عمر سے سال دو سال زیادہ دکھتے تھے۔ ان دنوں میلے میں کشتی کے مقابلے کا بہت ہلا گلا ہو رہا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ اس بار بڑوں کے ساتھ ساتھ پندرہ سال تک کے بچوں کا بھی مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس مقابلے میں شرکت کے لیے آس پاس کے گاؤں کے دوسرے بچے بھی تیاری کر رہے ہیں۔ عابد کے اور میرے والد نے سختی سے حیدر چاچا سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہم دونوں پر خصوصی توجہ دے۔ ہمیں اس قابل بنائے کہ بچوں کے مقابلے میں ہم دونوں میں سے ہی کوئی جیتے۔ ادھر عاصم بھی حیدر چاچا کے اکھاڑے میں کشتی کے سارے داؤ پیچ سیکھ رہا تھا۔ یہ بات ہمارے لیے حیرت کا باعث تھی۔ جب ہمیں یہ خبر ملی تو ہم نے خود عاصم سے اس بات کی تصدیق کی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہاں یہ سچ ہے۔ میں بھی کشتی کے مقابلے میں حصہ لے رہا

ہوں۔" ہم دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ "مگر تمہیں کشتی کہاں آتی ہے؟ تو تو شروع میں ہی چت ہو جائے گا۔ اگر تمہیں مقابلے میں حصہ لینا ہے تو پہلے حیدر چاچا کے اکھاڑے سے کچھ داؤ پیچ سیکھ لو نہیں تو......"

"وہ تو میں سیکھ رہا ہوں۔" اس نے اعتماد سے کہا۔ مجھے اس کی بات سے حیرت ہوئی۔ "مگر تو ہمیں نظر تو نہیں آتا وہاں؟"

"میں وہاں نہیں سیکھ رہا، مجھے میرا ابا کشتی کے داؤ پیچ سکھا رہا ہے۔"

"تمہارا ابا؟" عابد نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ "وہ تو مٹی کے برتن بناتا ہے۔ اس نے یہ کام کب سے شروع کر دیا؟"

"اسے یہ سب آتا ہے؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرا ابا ہر فن مولا ہے۔ اسے سارے کام آتے ہیں۔ وہ جوانی میں پہلوانی کرتا رہا ہے۔" ہم نے اسے اور کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ اپنی دنیا میں مست تھا تو اس سے ہمارا کچھ نہیں جا رہا تھا۔ وہ مقابلے میں شامل ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اس میں بھی ہمارا فائدہ تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ اس بار جیت ہمارا مقدر بنے گی اور اس بار عاصم ہم سے شکست کھا جائے گا۔ اگر اس بار ایسا ہو جاتا تو میرا اور عابد کی خوشی کا ٹھکانا نہ ہوتا۔ ویسے ہم دونوں کو صاف محسوس ہو گیا تھا کہ اس بار وہ صرف اپنا وقت برباد کر رہا ہے اور کچھ نہیں۔ کشتی سیکھنا کوئی عام بات نہیں تھی اور نہ ہی ہر ایرا غیرا یوں سیکھ سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج یہ دنیا کشتی کے پہلوانوں سے بھری ہوتی۔ مگر افسوس کہ یہ ہماری خام خیالی تھی۔ اس نے ہماری ہر امید اور سوچ کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ ایک ماہ بعد جب میلا لگا اور بچوں کی کشتی کا مقابلہ ہوا تو عاصم نے نہ صرف دوسرے بہت سے بچوں کو چت کر دیا تھا، بلکہ اس نے میری اور عابد کی بھی پیٹھ لگا دی تھی۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ وہ ہم سے آگے نکل گیا تھا۔ اب سے پہلے بھی اس نے بہت سی جگہوں پر کامیابی حاصل کر کے ہمیں حیران کیا تھا۔ ویسے عابد کے جیتنے پر مجھے تھوڑا بہت ملال تو تھا، مگر اس کے ساتھ کسی حد تک خوشی بھی تھی۔ کیوں کی ہماری بستی کے بچوں میں وہ سب سے پہلے نمبر پر آیا تھا۔ میری بات الگ تھی۔ مگر عاصم کی اس جیت کے موقع پر عابد کے تیور کچھ الگ ہو گئے تھے۔ شاید اس سے عاصم کی جیت برداشت نہیں ہوئی تھی۔ اس دن پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں عاصم کے لیے نفرت دیکھی تھی۔ شاید اس بات کا اسے بالکل امکان نہیں تھا کہ کشتی میں بھی عاصم اس سے جیت سکتا ہے۔ بستی میں کشتی جیتنے کے سب سے زیادہ امکانات میرے اور عابد کے تھے، مگر عاصم نے یہ جیت بھی اپنے نام کر کے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اگلے چند برس بڑے تیزی سے گزرے۔ ہم تینوں لڑکپن سے نکل کر جوانی کے دور میں داخل ہو گئے۔ بستی کے مڈل اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد عاصم نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ مٹی کے برتن بنانے میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ میں نے اور عابد نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شہر کا رخ کیا تھا اور اپنی رہائش بھی وہیں رکھ لی تھی۔ ہم وقتاً فوقتاً گھر کا چکر لگاتے تو عاصم سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ ان دنوں پھر میلے کا موسم آنے والا تھا۔ پچھلے کچھ سالوں میں ایک چیز سب سے زیادہ میلے میں دلچسپی کا باعث بنتی جا رہی تھی اور وہ تھی کشتی کا مقابلہ۔ ہم تینوں پچھلے کچھ عرصے سے بچوں کی فہرست سے نکل کر بڑوں کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے۔ ان دنوں ہم تینوں کی عمریں اٹھارہ برس کے قریب تھیں۔ میرا اور عابد کا تعلق تو خیر کھاتے پیتے گھرانے سے تھا اور اس لیے ہماری صحت جوان ہونے کے ساتھ ساتھ اور بہتر ہو گئی تھی۔ مگر عاصم بھی ہم سے کسی طور پیچھے نہیں تھا۔ گو وہ دن رات اپنے باپ کے ساتھ محنت اور مشقت بھرا کام کرتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ وہ اپنے کھانے پینے پر دھیان دیتے ہوئے اپنی صحت کا بھی خیال رکھتا تھا۔ سو کہہ سکتے ہیں کہ صحت کے حوالے سے وہ ہم جیسا تھا۔ مگر ایک اور چیز تھی جو اسے ہم سے ممتاز کرتی تھی اور وہ تھی اس کی صورت۔ جوانی میں یوں تو ہر چیز ہی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ مگر عاصم پر کچھ زیادہ ہی رنگ روپ آیا تھا۔ وہ خوبصورتی میں بھی ہم سے ایک قدم آگے تھا۔ ان دنوں ایک بات پھر میلے کی آمد آمد تھی۔ کشتی کے مقابلے کا بہت شور و غل تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ ساتھ والی بستی کا بشیرا پہلوان بہت محنت کر رہا ہے۔ اس بار اس کے جیتنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ ادھر ہماری بستی کے جوان بھی بہت محنت کر رہے تھے، جن میں سر فہرست عابد تھا۔ اس بار کشتی کا مقابلہ بہت سنسنی خیز ہونے جا رہا تھا۔ ویسے پچھلے کچھ عرصے میں ہماری ہی بستی کے لوگوں نے کشتی کے سب چھوٹے بڑے مقابلے جیتنے تھے۔ اس بار بھی امید ہماری تھی۔ عاصم نے پچھلی بار بڑے بڑے پہلوانوں سے دو دو ہاتھ کر کے جیت اپنے نام کی تھی۔ اس بار بھی جیتنے کے زیادہ امکانات اسی کے تھے۔ اس دوران، میں نے دو تین بار شکست کھانے کے بعد کشتی کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا

تھا۔ مگر عاصم اور عابد کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ عابد بھی اس بار خوب محنت کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس بار جیت اس کے نام ہوتا کہ اس کا بھی اپنی بستی میں ایک نام ہو جائے۔

میلا آ گیا۔ کشتی کا مقابلہ شروع ہوا اور کئی دن تک جاری رہا۔ اس دن کشتی کا فائنل میچ تھا۔ جو کہ عاصم اور عابد کے درمیان تھا۔ ان دونوں نے باقی تمام لوگوں کو شکست دے دی تھی۔ کشتی کا یہ آخری مقابلہ دیکھنے کے لیے بستی کے سارے چھوٹے، بڑے، بزرگ، بچے اور خواتین آئی ہوئی تھیں۔ عورتوں کے دیکھنے کی جگہ علیحدہ تھی۔ ان لڑکیوں اور عورتوں میں ایک لڑکی سادی بھی تھی، جو عابد کی کزن تھی اور اس کے بڑے چاچے کی بیٹی تھی۔ سادی بہت ہی خوبصورت تھی۔ وہ یقیناً اس قابل تھی کہ کوئی بھی اس کی محبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اس کو دیکھا تھا اور سچ میں اس کے حسن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اگر اس دوران میری شائلہ سے منگنی نہ ہوئی ہوتی، میں اس کی محبت میں گرفتار نہ ہوتا تو میں یقیناً سادی پر مرمٹتا۔ دوران کشتی میں نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ عاصم کی نظریں بار بار عورتوں کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ یقیناً وہاں اس کا کوئی اپنا موجود تھا، جس کی کشش اسے اپنی طرف دیکھنے کے لیے مجبور کرتی تھی۔ وہاں اس کا ایسا کون تھا؟ اس بارے میں مجھے بعد میں پتا لگا تھا۔ اس شام کشتی کا وہ مقابلہ توقع کے عین مطابق عاصم جیت گیا تھا اور ایک بار پھر پوری بستی میں اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ کشتی جیتنے کے بعد بھی عاصم کی نظریں بار بار عورتوں کی طرف اٹھتی رہی تھیں۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ مچلتی رہی تھی۔ اگلے دن میں نے اس سے، میلے میں بار بار عورتوں کی طرف دیکھنے کی وجہ پوچھی تو وہ صاف مکر گیا۔ ”میں وہاں کیوں دیکھوں گا؟ شاید لاشعوری طور پر اس طرف کوئی نگاہ اٹھ گئی ہو، جس سے تمہیں غلط فہمی ہوئی ورنہ ایسی کوئی بات نہیں......“

”اچھا، یہ سادی کے ساتھ تمہارا کیا چکر ہے؟“

سادی کا نام سنتے ہی اسے ایک کرنٹ سا لگا۔

”دس...... سادی؟ کون سادی؟“

”اب زیادہ ڈراما مت کر۔ سچ سچ بتا نہیں تو میں خود پتا کرلوں گا۔“

اس بار اس نے ایک گہری سانس لے کر مجھے اپنی اور سادی کی ہر بات بتا دی۔ پچھلے سال سادی نے میلے میں کشتی لڑتے ہوئے عاصم کو دیکھا تھا اور وہ دل ہار گئی تھی اور اس بات کا اس نے فوراً اظہار بھی کر دیا تھا۔ سادی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے گھر میں نوکر چاکر تھے۔ گھر کے اندر عورتیں تھیں اور باہر مرد۔ سادی، اندر کی کسی عورت کو اپنا ہم راز بنا کر حال دل عاصم کے روبرو لائی تھی۔ عاصم کے لیے یہ سب قبول کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ ملکوں کی عزت تھی اور اس کے ساتھ ایسا کوئی سلسلہ استوار کرنا، موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مگر اس کے باوجود عاصم نے اس کی محبت کا ہاتھ تھام لیا۔ عاصم پہلے سے اس کا دیوانہ تھا۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ سادی سے اظہارِ عشق کرتا۔ مگر اب جو سادی کی طرف سے محبت کی پہل ہوئی تو عاصم نے بھی اپنی چاہت کے قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔ یہ سلسلہ قریباً ایک سال سے جاری تھا۔ اس ایک سال میں انہوں نے چھپ کر دو چار ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ پیار کی یہ ہلکی پھلکی ملاقاتیں ان کی زندگی کے یادگار لمحات تھے۔ مگر ان ملاقاتوں میں انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا، جس پر ان کی روح کو شرمسار ہونا پڑتا۔ شاید ان دونوں کو ہی معلوم نہیں تھا کہ ان کے نصیب میں ہمیشہ کا وصل ہے یا نہیں۔ اس لیے عارضی وصل کے جو لمحات انہیں میسر آتے، وہ انہیں غنیمت سمجھتے۔ ویسے ایک بات صاف تھی کہ ان دونوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہونا ممکن نہیں تھا۔ سادی ملکوں کے گھرانے سے تھی اور عاصم ایک کمہار کا بیٹا تھا۔ جو بظاہر کسی طرح بھی اس کے جوڑ کا نہیں تھا۔ عاصم کی اور میری، جوان ہونے کے بعد ذہنی ہم آہنگی اور بڑھ گئی تھی۔ اس لیے ہماری آپس میں بہت بنتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپاتے۔ انہی دنوں مجھے عاصم کی ایک اور بات معلوم ہوئی تھی اور وہ یہ کہ وہ شعروشاعری کرنے لگا ہے۔ اس نے ایک ڈائری بنائی ہوئی تھی، جس میں وہ اپنے دلی جذبات لفظوں کے روپ میں ڈھال کر کاغذ پر اتارتا رہتا۔ سادی اور اس کو ایک دوسرے کے پاس آنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ سو وہ دونوں اپنی بے چینی کے اظہار کے لیے ایک دوسرے کو خط لکھتے۔ خطوں میں شعر لکھتے اور شعروں میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے۔ اصل میں عاصم کو شاعری کا شوق سادی کی وجہ سے ہوا تھا۔ سادی کو شاعری کا بہت شوق تھا۔ دوسرے شعرا کے اشعار پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی شعر کہنے لگی تھی۔ اس کے پاس شاعری کی کتب کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، جس میں سے اس نے دو چار کتابیں عاصم کو بھی گفٹ کر دی تھیں۔ کتابیں تحفے میں ملنے کے بعد عاصم کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ بھی سادی کو ایک دو شاعری کی کتابیں

دے۔ ایک دن اس نے مجھ سے اس بات کا اظہار کیا اور ہم دونوں شہر کی طرف چل دیے۔ وہاں بڑی بڑی قیمتوں کے ساتھ بڑے بڑے شعرا کی کتابیں موجود تھیں۔ عاصم کے پاس اتنے سارے پیسے نہیں تھے کہ وہ شاعری کی بہت سی کتابیں خرید سکتا۔ اس نے صرف دو کتابیں خریدی تھیں۔ دو کتابیں میں نے خرید کر دی تھیں۔ ان چار کتابوں کو لے کر ہم واپس آ گئے تھے۔ وہ کتابیں پڑھنے کے بعد اس کی تشنگی کی آگ اور بھڑک اٹھی تھی۔ ان کتابوں میں سے اس نے دو کتابیں خود رکھی تھیں، دو سادی کو گفٹ کر دی تھیں۔ عاصم کی خواہش تھی کہ اس کے پاس بھی اپنی ایک ذاتی لائبریری ہو جس میں دنیا جہان کی شاعری کے مجموعے موجود ہوں۔ سادی کی محبت میں شاعری کرتے کرتے اسے حقیقتاً اچھے شعر کہنے آ گئے تھے۔ اسے اچھی شاعری اور اچھے ادب کی پہچان ہو گئی تھی۔ اب اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ بھی شاعری میں اپنا ایک نام پیدا کرے۔ ہر جگہ بڑے شاعر کے طور پر جانا جائے۔ شاعری اور کشتی دو متضاد چیزیں ہیں۔ مگر عاصم میں یہ دونوں چیزیں منتقل ہو گئی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ حیرت کی بات یہ تھی کہ جو شوق عاصم کو لاحق ہوئے تھے، وہی شوق کچھ عرصے بعد عابد کو بھی ہو گئے تھے۔ عاصم کی طرح اسے بھی شاعری کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔ اگلی بار شہر سے واپسی پر جب عابد گھر لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کالج کا ایک رسالہ تھا، جس میں اس کی غزل موجود تھی۔ اپنی غزل کی اشاعت پر وہ پھولے نہیں سمایا تھا۔ اپنے ہاتھ میں رسالہ لیے، وہ سب کو اپنی غزل دکھاتا پھرا۔ میں اور عاصم، اس کے شاعر ہونے پر بہت حیران ہوئے تھے۔ مگر ہم نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک تھا، جو مرضی کرتا۔ بظاہر ہم نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی مگر یہ بات آسانی سے نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ یہ تجسس ہمیں بے چین کیے رہتا کہ آخر اسے یہ شوق کیسے ہوا؟ ایک دن میں نے اس سے یہ بات پوچھ لی۔ اس وقت عاصم بھی میرے ساتھ تھا۔ عابد نے فلمی انداز میں مکالمے ادا کیے۔ ”بس یار محبت...... یہ سب محبت کی کارستانی ہے۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شاعری کہاں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ ایسی سوہنی کڑی ہے کہ نظر نہیں ٹکتی اس پر۔ پر وہ مجھے گھاس نہیں ڈالتی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ اسے شعر و شاعری کا شوق ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں یہ شوق اپنا کر اس کا دل جیتنے کی کوشش کروں۔ کیا پتا وہ پٹ جائے۔ اس لیے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسے دو چار خط بھی لکھے ہیں، مگر اس نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں۔ ایک نہ ایک دن تو میں اسے پٹا ہی لوں گا۔“

”کون ہے وہ؟“

”میرے چاچے کی بیٹی...... سعدیہ عرف سادی۔“

میں نے دیکھا، عاصم کے چہرے پر بے چینی اتر آئی تھی۔ ”وہی سعدیہ، جو شہر سے پڑھ کر آئی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بس یار، میں ایک بار اس کے دل میں جگہ بنا لوں، پھر میرے دل میں کوئی حسرت نہیں رہے گی۔“

اب ہم اسے کیسے کہتے کہ سعدیہ کے دل میں جگہ بنانا اب ممکن نہیں۔ اس کے دل میں پہلے ہی کوئی جگہ بنا چکا ہے۔ سال گزرتے پتا بھی نہیں چلا اور ایک بار پھر میلے کا موسم آ گیا۔ کشتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عاصم کے ارادے اس بار پھر توانا تھے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کشتی کے مقابلوں میں حصہ لیتا، اچانک وہ مجھے بہت پریشان اور الجھا الجھا نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے اس کی پریشانی دریافت کی تو اس نے کہا۔ ”میں کشتی کے مقابلے میں حصہ نہیں لے رہا، نہ ہی آیندہ کبھی لوں گا۔“

مجھے حیرت ہوئی۔ ”کیوں؟“

وہ چپ رہا۔

”بتاؤ مجھے؟“

اچانک اس کے لہجے میں دنیا جہاں کی نفرت سمٹ آئی۔ اس نے خود پر بمشکل قابو پایا۔ ”یہ عابد، بہت ہی کمینہ اور ذلیل ترین انسان ہے۔ میں سمجھا، کھاتے پیتے گھر کا چشم و چراغ ہے۔ وسیع ظرف کا مالک ہوگا مگر، اس نے تو کم ظرفی کی انتہا کر دی۔“ میں اس کی بات پر ٹھٹکا۔

”ایسا کیا کیا اس نے؟“

”یہ پوچھو کہ کیا نہیں کیا؟ اسے میری اور سادی کی محبت کا پتا چل گیا ہے۔ ساتھ ہی ایک دو خط بھی اس کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ مجھے پتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہوگا۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہے، مگر سعدیہ...... مجھے کسی طرح بھی اس کی بدنامی منظور نہیں۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے کشتی لڑنا چھوڑ دوں نہیں تو......“

”اور اسی لیے تم کشتی کے مقابلے میں حصہ نہیں لے رہے؟“

”میرے پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی

راستہ نہیں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر میں نے اس کی بات مان لی تو وہ اس بارے میں کسی کو نہیں بتائے گا، ورنہ...... بہت کمینہ انسان نکلا وہ۔ جس سے محبت کا دعویٰ تھا، اسی کی محبت کو ہتھیار بنایا ہے اس نے...... اور کمال دیکھو، یہ بندوق سادی کے کاندھے پر رکھ کر چلائی ہے اس نے...... اس کا پیغام دینے اور یہ سب کرنے کے لیے سادی میرے پاس آئی تھی......"

اس دن پہلی بار مجھے عابد سے نفرت محسوس ہوئی۔ مجھے اتنا تو پتا تھا کہ وہ عاصم کی جیت سے جلتا ہے۔ اس کی ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ عاصم کشتی کے مقابلے میں حصہ نہ لے مگر اپنی سوچ کو عملی جامع پہنانے کے لیے وہ اس حد تک بھی گر سکتا ہے، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی اس حرکت نے اسے میری نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گرا دیا۔ ہم تینوں بہت اچھے دوست تھے مگر اس نے دوستی کا لباس اتار کر دشمنی کا لباس پہن لیا تھا۔ اور یہ یقیناً اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ اس دن سے عاصم کی زندگی سے کشتی کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ میلا ختم ہوتے ہی عابد شہر لوٹ گیا اور عاصم اپنی پرانی زندگی میں۔ سعدیہ اور اس کی محبت کا سلسلہ برقرار رہا۔ مگر اب وہ دونوں بہت احتیاط کرتے تھے۔ وہ دونوں اب بھی ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے اور اپنی دلی کیفیات کو لفظوں میں سمو کر ایک دوسرے کے روبرو لے آتے تھے، مگر اب کے ان کا قاصد کوئی اور نہیں تھا، وہ خود تھے۔ مگر ان کی محبت کا اب کوئی مستقل قیام نہیں تھا۔ وہ دونوں برگ صحرا کے ایسے دو خشک پتے تھے، جنہیں حالات کی تند و تیز ہوا اپنی مرضی سے جہاں چاہے، لے جا رہی تھی۔ ان دنوں عاصم اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ایک عجیب اور رو کھو دینے والا حادثہ پیش آیا۔ اب سے پہلے ہماری بستی میں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں عاصم نے اپنے باپ کے ساتھ مل کر مٹی کے برتنوں کا بہت سا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ اگلے دن وہ ڈھیر آگ کی بھٹی میں پکنے کے مراحل سے گزرنے والا تھا۔ اس کے بعد وہ برتن گدھا گاڑی پر لاد کر شہر لے جائے جاتے اور وہاں فروخت ہوتے۔ عاصم اور اس کے گھر والوں کا یہی ذریعۂ معاش تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب دیہات کے اکثر گھروں میں کچی مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواریں بنی ہوتی تھیں۔ دروازوں کے نام پر ایک خلا سا ہوتا، جس پر پردہ ڈال کر اسے دروازے کا نام دے دیا جاتا۔ اس وقت سب لوگ مخلص تھے۔ تانکا جھانکی کا کھیل نہیں تھا۔ سب دوسروں کے گھروں کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ ان دنوں چوری چکاری بھی نہیں ہوتی تھی۔ عاصم کے گھر والوں کے دو مکان تھے۔ ایک وہ، جہاں وہ رہتے تھے اور دوسرا وہ، جہاں وہ جا کر مٹی کے برتن بناتے تھے۔ وہ جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ مگر اتنی تھی کہ ان کا کام با آسانی ہو رہا تھا۔ اس مکان میں چھوٹی چھوٹی دیواریں تھیں اور دروازے کی جگہ ایک ٹاٹ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس دن عاصم اور اس کا باپ اپنے کام پر پہنچے تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ان کے، چاک پر بنائے گئے سارے کے سارے مٹی کے برتن، دوبارہ مٹی ہو چکے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر پوری بستی میں پھیل گئی کہ کسی نے فیضو کمہار کے بنائے ہوئے سارے برتن توڑ کر ان سے دشمنی نکالی ہے۔ مگر یہ بات سب کے لیے حیرت اور دکھ کا باعث تھی کہ ایسا کس نے کیا ہے اور کیوں؟ کیوں کہ عاصم اور اس کا باپ بہت ہی بھلے مانس تھے۔ ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ عاصم اور اس کا باپ بہت ہی صابر اور شاکر انسان تھے۔ انہوں نے اس مٹی کے ڈھیر کو اکٹھا کیا اور اس پر دوبارہ محنت شروع کر دی۔ اس بات کا سوائے میرے کبھی کسی کو علم نہ ہو سکا کہ مٹی کے وہ برتن کس نے توڑے تھے اور کیوں؟ اس واقعے نے بہت سے لوگوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس دن شاید پہلی بار لوگوں کو اس بات کا خیال آیا تھا کہ اب اپنی چیزوں کی حفاظت کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔ اس واقعے کو کئی ماہ گزر گئے۔ اس کے بعد بستی میں پھر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں اور عاصم اپنی دنیا میں مست رہے اور عابد اپنی دنیا میں۔ سعدیہ اور عاصم کی محبت کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کے بارے میں وہ مجھے اکثر بتاتا رہتا تھا۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن حالات اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ سادی کو اپنا ہم سفر بنا کر اپنے گھر لے آئے گا اور اس کے دل پر پوری زندگی حکمرانی کرے گا۔ مگر افسوس، یہ اس کی بھول تھی۔ کیوں کہ انہی دنوں یہ خبر آ گئی تھی کہ عنقریب عابد اور سعدیہ کی شادی ہے اور یہ شادی بہت دھوم دھام سے ہو رہی ہے۔ اس بات پر مجھے بے حد افسوس ہوا تھا۔ اتنی پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی، جسے دیکھتے ہوئے دل نہیں بھرتا تھا، ایک ایسے شخص سے منسوب ہونے جا رہی تھی جو کسی طور بھی اس کے لائق نہیں تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے عابد ہی کی سازش تھی اسی وجہ سے وہ میری نظروں سے گر گیا تھا۔ وہ عاصم کا دشمن تھا اور اس سے اسی قسم کی توقع کی جا سکتی تھی، مگر سادی......؟ اس نے عاصم کے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے تو عاصم کے ساتھ بہت سے وعدے کیے تھے، قسمیں کھائی تھیں ......اور اب وہی عابد کی ڈولی میں بیٹھنے جا رہی تھی۔ مجھے عاصم

نے اپنے اور سعدیہ کے کئی محبت بھرے خط دکھائے تھے۔ جن میں اتنی شدت سے پیار کی باتوں کا اظہار کیا گیا تھا، جو دل کو چھو لیتی تھیں۔ ان میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی گئی تھیں، مگر سعدیہ نے عاصم سے چپ چاپ تعلق ختم کیا اور عابد کی ہونے کے لیے تیار ہو گئی۔ ساری کے یوں نظریں پھیر لینے سے، عاصم کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ویسے سعدیہ اور عابد کی شادی سے دو دن پہلے، عاصم نے بھی سعدیہ سے ملاقات کی تھی اور اس ملاقات کا سارا احوال مجھے بتایا تھا۔ شاید وہ اس بار اس سے ملاقات کے لیے آمادہ نہ ہوتی، اگر عاصم اسے خودکشی کی دھمکی نہ دیتا۔ وہ دونوں کچھ دیر کے لیے ملے اور رخصت ہو گئے۔ اس بارے میں اس نے مجھے اگلے دن بتایا تھا۔ ''کیا کہا اس نے، وہ اس اُلو کے پٹھے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئی ہے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''اس نے میری کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تمام وقت سر جھکائے کھڑی رہی اور...... جب میں اس پر اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا اور واپسی کے لیے پلٹا تو اس نے صرف اتنا کہا۔ اگر ممکن ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میں سچ میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تم سے جتنے وعدے کیے تھے، ان میں سے ایک بھی وفا نہ کر سکی۔ اور یقین کرو، اس کے لیے جتنی میں مجبور ہوں، شاید کوئی اور نہ ہو۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی تھی پھر وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی۔ میں اس سے اتنا بھی نہیں پوچھ سکا تھا کہ آخر وہ کیوں مجبور ہو گئی کہ......'' اس کی آواز میں درد تھا۔ ''ویسے ایک بات تھی۔ وہ جاتے جاتے میرے دل کا آدھا بوجھ ہلکا کر گئی تھی۔ اگر وہ جاتے جاتے مجھے میری اوقات کا طعنہ دیتی اور کہتی کہ اس کا اور میرا کیا جوڑ ہے تو میں اسے کیا کہتا؟ دوسرا وہ ملکوں کی عزت تھی اور میں ایک کمی کمو ڑا...... ایک کمہار کا بیٹا۔ یوں بھی اس کا اور میرا ایک ہونا ناممکن تھا۔ مجھے شروع میں ہی یہ بات اپنے ذہن میں رکھ لینی چاہیے تھی اور اپنی اوقات میں رہنا چاہیے تھا۔''

میں نے اس کی بات کی تردید کی۔ ''یہ بات تو اسے اظہار محبت کرنے اور تمہیں خط لکھنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا تم سے دل بھر گیا تو اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تمہارے ساتھ بھاگ کر بھی تم سے شادی کر سکتی تھی......''

وہ دکھ سے مسکرایا۔ ''اور اس کے بعد کیا ہوتا؟ اگر ہم ایسا کرتے تو عابد، اس کے باپ کو ہمارے بارے میں بتا دیتا۔ اس کا باپ ہم دونوں کو ڈھونڈ نکالتا اور زندہ دفن کر دیتا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''شاید یہی ہماری تقدیر میں لکھا تھا۔ ہمیں اسی پر سر جھکا دینا چاہیے۔''

گو اس نے تقدیر کے اس فیصلے پر سر جھکا دیا تھا مگر میں چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکا۔ میں کم سے کم ایک بار ساری سے مل کر اسے شرمندہ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ جس نے میرے اتنے مخلص دوست کا دل توڑا تھا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ یہ محبت کوئی کھیل نہیں کہ جب چاہا کھیل لیا، جب چاہا چھوڑ دیا...... سعدیہ اور عابد کی شادی میں صرف ایک دن رہ گیا۔ اس دوران سعدیہ سے ملنا قریباً ناممکن تھا۔ مگر اس کے باوجود میں نے کسی نہ کسی طرح اس سے ملاقات کر لی۔ ہماری ملاقات کا راستہ، میری منگیتر عالیہ بنی تھی۔ میں نے عالیہ کو ہر بات بتا دی تھی اسی نے سعدیہ کو مجھ سے ملاقات کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ویسے اسے اتنا پتا تھا کہ میں اس کی اور عاصم کی محبت سے آگاہ ہوں اور ان کے درمیان ہونے والی ہر بات جانتا ہوں۔ ہم دونوں روبرو ہوئے تو میرے لبوں پر بے اختیار سوال در آیا۔ ''تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ عابد کسی طرح بھی تمہارے قابل نہیں ہے۔ تمہیں عاصم سے بڑھ کر کوئی چاہنے والا نہیں ملے گا......''

اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک جھکائے رہی۔ پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ ''میں جانتی ہوں کہ مجھے پوری دنیا میں عاصم سے بڑھ کر کوئی چاہنے والا نہیں ملے گا، نہ ہی کوئی اس جیسا شخص ابھی تک پیدا ہوا ہے......''

''اس کے باوجود تم عابد سے شادی کر رہی ہو؟''

''میں بہت مجبور ہوں۔''

''آخر ایسی کیا مجبوری آگئی کہ تم یہ قدم اٹھا رہی ہو؟'' وہ چپ رہی۔

''بتاؤ مجھے؟''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں بتا دیتی ہوں مگر اس شرط پر کہ تم یہ بات عاصم کو نہیں بتاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے، میں نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر بات شروع کی۔ ''تمہیں یہ تو پتا ہوگا کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے کسی نے عاصم اور اس کے باپ کے بنائے ہوئے مٹی کے سارے برتن توڑ ڈالے تھے؟''

"پتا ہے۔"
"پر یہ پتا نہیں ہوگا کہ یہ کام کس کا تھا۔"
"ہاں یہ مجھے نہیں معلوم۔"
"پر مجھے معلوم ہے۔"
میں اس کی بات پر چونکا۔ "کس کا تھا؟"
"عابد کا۔ اس نے یہ کام کرایا تھا۔" اس نے جیسے میرے سر پر بم پھوڑا۔
"ہاں یہ سچ ہے اس نے یہ کام صرف مجھے دکھانے اور پسپا کرنے کے لیے کیا تھا۔ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ میں اور عاصم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کو کبھی بھی دکھ میں نہیں دیکھ سکتے۔ نہ ہی ایک دوسرے کا برا چاہ سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے وہ کمینی حرکت کی تھی۔ وہ سامنے کی بجائے پیٹھ پر وار کرنے کا عادی ہے۔ پچھلی بار اس نے میلے کے موقع پر کمینگی دکھائی تھی اور عاصم کو کشتی سے روک دیا تھا۔ اس بار اس نے یہ اوچھا وار کیا تھا۔
ان کے مٹی کے سارے برتن تڑوانے کے بعد اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اس سے شادی کے لیے آمادہ نہیں ہوئی تو وہ اگلی بار عاصم کو وہ نقصان پہنچائے گا، جو نا قابل تلافی ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ اس بار عاصم کو جان سے ہی ہاتھ دھونا پڑے۔ سچ پوچھو تو میں اس کی دھمکی سے ڈر گئی تھی۔ وہ بے حد کمینہ شخص ہے۔ اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ میں دنیا کی ہر بات برداشت کر سکتی ہوں، مگر مجھے یہ بات کبھی گوارہ نہیں کہ عاصم کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے۔ اس لیے میں اس کی یہ بات ماننے کے لیے مجبور ہوگئی۔"
میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب اس کے پاس رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میرے واپس پلٹنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس بارے میں عاصم سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایک بار پھر میرے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کرنے لگے۔ میں اب ہمیشہ کے لیے کسی اور کی ہونے جا رہی ہوں۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ میں اپنے ماضی کو یہیں ختم کر دوں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ بے فکر ہو جائے، ایسا بالکل نہیں ہوگا۔ میں نے اپنے اور اس کے درمیان ہونے والی ایک بات بھی عاصم کو نہیں بتائی تھی۔ اگلے دن عاصم کا پہلا پیار اس سے جدا ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی اور کا ہو گیا تھا۔
اگر یہ کہا جائے کہ پہلا پیار اور پہلی محبت کبھی دل سے نہیں نکلتی تو غلط نہ ہوگا۔ ایسا ہی معاملہ عاصم کے ساتھ تھا۔ سعدیہ کسی اور کی ہو جانے کے باوجود بھی اس کے دل سے نہیں نکلی تھی۔ عاصم نے اس کی محبت میں شاعری کا جو سلسلہ اپنایا تھا، اس میں اب پہلے سے بھی زیادہ شدت آ گئی تھی۔ جس طرح عاصم اور عابد کو شاعری کا شوق تھا، اسی طرح ان کو دیکھ کر مجھے بھی یہ شوق ہو گیا تھا۔ مگر یہ شوق صرف پڑھنے کی حد تک تھا، لکھنے کی حد تک نہیں۔ میرا اور عابد کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ، سعدیہ کو پانے کے باوجود عابد کا شاعری کا سلسلہ بھی جاری تھا جو کہ دن بہ دن عروج پر تھا۔ پہلے اگر اس کی شاعری کا مقصد سعدیہ کی محبت تھی تو اب اس کی شاعری کا مقصد، پاکستان کا سب سے بڑا شاعر بننا تھا۔ ایک ایسا شاعر، جس کی کم سے کم ایک درجن سے زائد کتابیں ہوں اور اس کی ہر کتاب بے حساب بکتی ہو۔ اور اب اس کا یہی خواب تھا۔
وہ اپنے ان اوٹ پٹانگ خیالوں کو کاغذ پر اتار کر خود کو بہت بڑا شاعر سمجھتا تھا۔ اس پر کمال یہ کہ اس کی یہ شاعری کالج اور دوسرے رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع بھی ہوتی رہتی تھی۔ جس سے اس کا دماغ اور بھی آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ ادھر عاصم کی شاعری کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ سادی کے وصل و ہجر کے احوال کو لفظوں میں اتارتے اتارتے وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ بہت ہی اچھے اچھے شعر اس سے سرزد ہونے لگے تھے۔ وہ اپنے دلی جذبات کو ایک ڈائری میں منتقل کرتا رہتا تھا۔ مجھے ان دنوں اوزان اور بحور وغیرہ کا علم تو نہیں تھا، مگر عاصم اور عابد کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے ایک بات بہت شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ اور وہ یہ کہ عاصم کی شاعری بہت رواں، دلکش اور دل کو چھو لینے والی ہوتی تھی اور عابد کی شاعری میں یہ بات بالکل نہیں تھی۔ وہ اپنی شاعری میں گھسے پٹے مضامین کو استعمال کرتا تھا، جسے پڑھتے ہوئے کسی خوشگوار احساس کی بجائے عجیب سی کیفیت کا احساس ہوتا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ ایسا کیوں تھا۔ کیونکہ اس کی شاعری وزن میں نہیں تھی۔ ادھر عاصم کو اچھی شاعری کرنے کا بھی شوق تھا اور پڑھنے کا بھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسے اچھی شاعری پڑھنے کا جنون تھا تو غلط نہ ہوگا۔ مگر اس کی مجبوری یہ تھی کہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ شاعری کی اچھی اچھی اور مہنگی کتابیں خرید کر پڑھ سکتا۔ ان دنوں فیس بک اور انٹرنیٹ کا دور اتنا عام نہیں تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو دیہاتی علاقوں میں ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہوتا۔ سو عاصم کے پاس اپنے ذوق کی تسکین کا

صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا میں۔ میں جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا، کالج کی لائبریری سے اس کے لیے ایک دو شاعری کی اچھی اچھی کتابیں لیتا آتا۔ میں جب تک گھر رہتا، وہ ان کتابوں سے استفادہ حاصل کرتا رہتا اور جب میں واپس جاتا تو وہ کتابیں اپنے ساتھ لے جاتا۔ جن دنوں میں گھر آتا، ان دنوں عاصم مجھے اپنی تخلیق کی گئی بہت ہی اچھی اچھی غزلیں پڑھ کر سنایا کرتا۔ ایک بار تو اس نے مجھے ایک ایسی غزل سنائی، جو سیدھی میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں نے اس کی اس غزل کی بہت تعریف کی تھی۔ اور ساتھ ہی میں نے وہ غزل ایک کاغذ پر لکھ کر محفوظ بھی کر لی تھی۔ میں وہ غزل سر باسط کو دکھانا چاہتا تھا۔ سر باسط ہمارے کالج کے لیکچرار تھے۔ ساتھ ہی وہ اردو کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کی دو کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کا شاعری ذوق بہت اچھا تھا۔ اردو ادب کے حوالے سے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ بڑے بڑے شاعروں کی بہت سی غزلیں انہیں زبانی یاد تھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں وہ غزل انہیں دکھاؤں گا اور ان کی رائے طلب کروں گا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ سر باسط کو وہ غزل پسند آئے گی اور وہ اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ مطلوبہ غزل پڑھنے اور دیکھنے کے بعد ان کی آنکھوں میں ستائش کی چمک اتر آئی تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”کیا بات ہے۔ کیا ہی خوبصورت اور لاجواب غزل ہے۔ کس کا کلام ہے؟“

”ایک دوست کا ہے۔ میرے گاؤں میں رہتا ہے۔“

”ہوں...... ماشاء اللہ۔“ وہ ایک پل کو رکے۔ ”اچھا ایک بات بتاؤ، آپ کے دوست کا کوئی استاد بھی ہے یا نہیں؟“

”نہیں سر، اس کا کوئی استاد نہیں ہے۔“

”پڑھا ہوا کتنا ہے؟“

”صرف مڈل تک پڑھا ہے۔“

”ویسے تو غزل بہت اچھی ہے مگر غزل میں دو تین مصرعے بے وزن ہیں۔ آپ کے دوست یقیناً نئے لکھنے والے ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر بحر اور اس کے ردھم کو سمجھ گئے ہیں اور اسی میں اچھی کوشش کر رہے ہیں مگر شاید وہ شاعری کی بنیادی چیزوں سے واقف نہیں ہیں۔ اور ایسا قریباً ہر نئے شاعر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر وہ شاعری میں سنجیدہ ہیں اور اچھے شاعر بننا چاہتے ہیں تو انہیں شاعری کی بنیادی باتیں ضرور سیکھنی چاہئیں۔ تاکہ انہیں آگے پریشانی نہ ہو۔“

”سر وہ بنیادی باتیں کیا ہیں؟ اگر اس بارے میں تھوڑی سی وضاحت ہو جائے تو......“

وہ میری بات پر مسکرائے۔ ”وہ ساری علمی اور بنیادی باتیں ”علم عروض“ میں آجاتی ہیں۔ علم عروض شاعری کا ایک علم ہے۔ جس سے شاعری کی فنی خامیوں کے ساتھ ساتھ بحر و اوزان کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس علم کا عام لوگ تو عام لوگ، اکثر شعراء کو بھی پتا نہیں ہے۔ وہ اپنی طرف تک شعر کہتے رہتے ہیں اور...... اگر کوئی شخص یہ علم سیکھ لے تو وہ شاعری کی خامیوں پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ اپنے کلام کو مزید نکھار اور سنوار سکتا ہے۔“ وہ مجھے اس بارے میں اور بھی بہت کچھ بتاتے رہے۔ مجھے اس بارے میں اپنی کم علمی پر شرمندگی ہونے لگی۔

”سر مجھے تو اس بارے میں علم نہیں ہے۔ البتہ میں عاصم تک آپ کی بات پہنچاؤں گا۔ وہ یقیناً آپ سے یہ علم سیکھنا چاہے گا۔“

وہ مسکرائے۔ ”اگر وہ یہ علم سیکھ گئے تو بہت فائدے میں رہیں گے۔“

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ ”اچھا سر، عابد کی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں تو اسے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی شاعری بے وزن ہوتی ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو شاعر کہتا اور سمجھتا ہے؟ ایک بار میں نے اس کی ایک بے وزن غزل پڑھ کر اسے اس بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے تکبر سے جواب دیا تھا کہ شاعری کے لیے وزن وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور دوسرا وہ جو شاعری کر رہا ہے، وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ اسے کسی قسم کی اصلاح اور مشورے کی ضرورت نہیں۔ بس اس دن کے بعد میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی۔ اگر کوئی شخص خود ہی اندھیرے میں رہنا چاہے تو شوق سے رہے۔“

”اور میرے اس دوست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، جس کی غزل ابھی آپ کو دکھائی ہے؟“

”اس کے بارے میں، میں پہلے ہی سب کچھ کہہ چکا ہوں۔ ان کے کلام میں آگے بڑھنے کے واضح امکانات ہیں۔ آپ کے دوست اچھے شاعر ہیں۔ مزید اچھے شاعر بن سکتے ہیں، اگر وہ علم عروض سیکھ لیں۔ اگر انہوں نے ریاضت جاری رکھی تو ایک دن یقیناً بڑے شاعر کے طور پر جانے جائیں گے۔“

”جی سر، انشاء اللہ۔ وہ ضرور آپ سے رہنمائی لیں گے

اور آگے بڑھیں گے۔"

"میں ان کی غزل کے بے وزن مصرعوں کو وزن میں ڈھال دیتا ہوں۔ یہ اصلاح شدہ غزل انہیں دکھا دینا۔ اگر وہ سمجھدار ہوئے تو اس فرق کو خود محسوس کرلیں گے۔"

انہوں نے اسی وقت بیٹھے بیٹھے اس غزل کی اصلاح کر دی تھی۔ اس دن مجھے پہلی بار پتا چلا تھا کہ عاصم اور عابد کی شاعری میں بنیادی فرق کیا ہے۔ وہ بنیادی فرق وزن کا تھا۔ جس کے بارے میں، میں بعد میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عاصم کا کلام دل کو بھاتا تھا اور عابد کا کلام متاثر نہیں کرتا تھا۔ گو اس بار مجھے عاصم کے کلام کے بارے میں بھی پتا چلا تھا کہ اس میں بھی ہلکی پھلکی غلطیاں ہوتی ہیں، جنہیں اصلاح کی ضرورت ہے، مگر عابد...... اس کا کلام تو کسی زمرے میں نہیں آتا تھا۔ اس بار میں چھٹیوں میں گھر واپس آیا اور میں نے عاصم کو سر باسط کی تمام باتیں اور اصلاح شدہ غزل دکھائی تو اسے بے حد خوش گوار حیرت ہوئی۔

اس نے میری باتوں کے جواب میں کہا۔ "یار شاعری کے لیے کسی نہ کسی استاد کا ہونا ضروری ہے۔ یہ بات میں دل سے مانتا ہوں۔ مگر میری یہ مجبوری رہی ہے کہ مجھے آس پاس کوئی ایسا استاد نہیں ملا، جن سے میں کچھ سیکھ سکتا۔ اگر سر باسط واقعی اس قابل ہیں اور مجھے شاعری کا بنیادی علم سکھا سکتے ہیں تو میں تمام عمر ان کا ممنون رہوں گا۔"

"وہ سکھانے کو تیار ہیں، اگر تم سیکھنا چاہو......"

"میں تو ضرور سیکھنا چاہوں گا۔"

اگلی بار میں شہر گیا تو اپنے ساتھ اسے بھی لے گیا۔ سر باسط اور وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کینٹین میں ہم تینوں کافی دیر تک علمی اور ادبی گفتگو کرتے رہے۔ عاصم ان کی شخصیت سے بہت متاثر نظر آرہا تھا۔ میرے اصرار اور عاصم کی خواہش پر سر باسط نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ وہ اسے کافی دیر تک "علم عروض" کے بارے میں بتاتے رہے۔

دو گھنٹے بعد ہماری یہ ملاقات اختتام پزیر ہوئی۔ عاصم کا روز روز شہر آنا ممکن نہیں تھا۔ سو اس نے سر باسط کا پوسٹل ایڈریس لے لیا تھا۔ اس کا ارادہ خط و کتابت کے ذریعے ان سے رابطہ رکھنے کا تھا۔

ان سے رابطہ رکھ کر عاصم نہ صرف ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا، بلکہ ان سے اپنے کلام کی اصلاح بھی لے سکتا تھا۔ جب عاصم نے اپنے ساتھ لایا ہوا کلام انہیں دکھایا تو انہوں نے اسے بہت سراہا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے کلام کو اصلاح کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ بس ہلکی پھلکی غلطیاں ہیں، جنہیں عروض سیکھنے کے بعد وہ خود بھی دور کر سکتا ہے۔ اس دن کے بعد ان دونوں میں استاد شاگرد کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہوگیا۔ ان دنوں ڈاک کا نظام بہت اچھا تھا۔ ایک ہفتے بعد ہی خط کا جواب آجاتا تھا۔ اگلے چھ ماہ میں عاصم نے تمام علم عروض بہت آسانی سے سیکھ لیا تھا۔ یہ علم سیکھنے کے بعد عاصم میں بہت اعتماد اور اس کی شاعری میں بہت نکھار آگیا جب بھی عابد کی شاعری کا ذکر آتا تو اس کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آجاتی۔ وہ مسکراتے ہوئے کہتا۔ "یار یہ شخص خوامخواہ شاعری میں اپنا وقت برباد کر رہا ہے۔ اسے شاعری کرتے ہوئے اتنا عرصہ ہوگیا ہے، مگر اسے ابھی تک اتنا پتا نہیں ہے کہ بحر اور وزن کس شے کا نام ہے۔"

وہ عابد کا نام لیتا تو میرے منہ میں کڑواہٹ گھل جاتی۔ "یار دفع کر اس شخص کو۔ تو اس کا نام بھی مت لیا کر۔ اس نے جو تیرے ساتھ کیا ہے، اس کے بعد تو تجھے اس کا بھولے سے بھی ذکر نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ جاتا۔ سر باسط نے علم عروض کے حوالے سے عاصم کو فارغ التحصیل قرار دے دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود عاصم کا ان سے رابطہ برقرار تھا۔

☆☆☆

ان دنوں سادی کے بڑے بھائی کی شادی تھی۔ شادی کے موقع پر دوسرے بہت سے پروگرام کے ساتھ ایک عدد چھوٹے سے مشاعرے کا بھی انتظام تھا۔ انتظام کیا تھا، بس یوں سمجھیں کہ سرائیکی کے مشہور و معروف شاعر شاکر شجاع آبادی کو بلایا گیا تھا۔ لوگ اس مست ملنگ اور دل کو چھو لینے والے سرائیکی دوہوں اور غزلوں کے خالق سے ملنا ایک اعزاز سمجھتے تھے۔ شاکر کو بلانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ لوگ اس عظیم شاعر سے ملاقات کر سکیں۔ اس کے علاوہ بستی کے لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ عابد اور عاصم بھی شاعری کے میدان میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ اس بہانے ان سے بھی ان کا کچھ کلام سننے کو مل جائے گا۔ شادی والے دن شاکر کی ہمارے گاؤں میں آمد ہوئی اور رات کو مشاعرے کا آغاز ہوا۔ اسٹیج پر سب سے پہلے عاصم کو اور پھر عابد کو اپنا کلام سنانے کا موقع ملا۔ اس دن عاصم نے ایک غزل سرائیکی میں سنائی تھی اور ایک اردو میں۔ اور اس کی دونوں غزلوں نے جیسے وہاں موجود ہر شخص کا دل جیت لیا تھا۔ اس دن بستی کے لوگوں کو پہلی بار پتا

چلا کہ ان کی بستی میں بھی کوئی اچھا شاعر موجود ہے۔ اور مجھے بھی پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ ہماری بستی میں بھی اچھی شاعری کا ذوق رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ اس دن ایک اردو اور ایک سرائیکی غزل کے علاوہ لوگوں نے عاصم سے دو چار دوہے ماہیے بھی سنے تھے، جو اسی کی تخلیق تھے۔ عاصم کے بعد عابد کو بھی اپنا کلام سنانے کا موقع ملا تھا۔ لوگوں نے عابد کے کلام پر بھی اسے بہت سی داد دی تھی اور واہ واہ کی تھی۔ مگر مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ لوگوں کی واہ واہ میں اس بار سچائی نہیں ہے۔ منافقت اور کھوکھلا پن ہے۔ وہ صرف بڑے ملک کی وجہ سے اسے داد و تحسین سے نواز رہے تھے۔ ورنہ اس کا کلام اس قابل نہیں تھا کہ اس پر داد دی جاتی۔ اس بات سے میری طرح عابد بھی بخوبی واقف تھا۔ عابد کے بعد شاکر شجاع آبادی کی باری آئی تھی اور اس نے گویا تمام محفل کا دل لوٹ لیا تھا۔ گو میں ذاتی طور پر عابد کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنا دوست نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں نے کھل کر بگاڑ بھی نہیں کی تھی۔ وہ بہت کینہ انسان تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو اسے شک ہو جاتا اور عین ممکن تھا کہ وہ مجھے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ سادی کے بھائی کی شادی نمٹ گئی تو عابد نے مجھ سے ملاقات کی۔ اسے اب بھی گمان تھا کہ ہم دونوں اچھے دوست ہیں اور کسی موضوع پر بھی کھل کر ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں۔ اس نے آتے ہی مجھ سے کھل کر بات کی تھی۔ ”یار ایک بات مجھے سچ سچ بتاؤ۔ عاصم کے کلام میں ایسی کیا بات ہے، جو میرے کلام میں نہیں؟“

میں اس کی بات پر چونکا تھا۔ ”کیوں؟ ایسا کیا ہوا؟“

”تم نے شاید دو دن پہلے غور نہیں کیا۔ جب وہ اپنا کلام سنا رہا تھا تو لوگ کیسے اس کے کلام پر واہ واہ کر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ اس وقت وہاں کا سب سے بڑا شاعر ہے۔“

”لوگوں نے تو تمہارے کلام پر بھی بہت واہ واہ کی تھی۔“

”ہاں...... مگر وہ صرف جھوٹی واہ واہ تھی اور میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”کیا تم واقعی سچ سننا چاہتے ہو کہ تمہاری اور عاصم کی شاعری میں کیا فرق ہے؟“

”ہاں...... بالکل سچ۔“

”میرے خیال میں تم اس سچائی سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ سچائی یہ ہے کہ اس کی اور تمہاری شاعری میں جو بنیادی فرق ہے، وہ وزن کا ہے۔ اس کا کلام وزن میں ہوتا ہے اور تمہارا کلام بے وزن...... اس کے علاوہ اس کے اور تمہارے تخیل میں بھی بہت فرق ہے۔ اس کے خیالات میں پختگی ہے اور تمہارے......“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”پہلے میں بحر اور اوزان وغیرہ کو نہیں مانتا تھا۔ مگر اب میں ان باتوں کو دل سے تسلیم کرنے لگا ہوں۔ مگر میری مجبوری یہ ہے کہ کوئی مجھے اس بارے میں نہ ہی کچھ بتاتا ہے اور نہ ہی سمجھاتا۔“ اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

”تم نے سر باسط سے رابطہ کیا؟ وہ اس بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ ان دنوں کی بات ہے، جب مجھے بحر و وزن کا کچھ پتا نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود میرا کلام رسائل و جرائد میں شائع ہوتا تھا۔ ان دنوں ایک بار سر باسط نے مجھے اس بارے میں بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر میں اس وقت ان کی ان باتوں کو خاطر میں نہیں لایا۔ اور بعد میں جب میں نے ان سے اس سلسلے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ مجھے خاطر میں نہیں لائے تھے۔“ وہ ایک پل کو رکا۔ ”میں نے سنا ہے کہ عاصم نے بھی ان سے علم عروض سیکھا ہے؟ اگر عاصم مجھے تھوڑا بحر اور وزن سکھا دے تو......“

میں اس کی بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ آخر اس نے عاصم کی بڑائی کو تسلیم کر ہی لیا تھا۔ ”تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اس سلسلے میں عاصم سے بات کروں اور اسے کہوں کہ وہ تمہیں یہ علم سکھائے؟“

”ہاں...... اور اس کے لیے میں اس کی کوئی شرط بھی ماننے کو تیار ہوں...... مطلب، اگر وہ کوئی فیس وغیرہ لینا چاہے تو میں خوشی سے دینے کو تیار ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں آج ہی عاصم سے بات کرتا ہوں۔“ ویسے مجھے ایک بات کی بہت خوشی ہو رہی تھی کہ وہ عاصم کے سامنے بہت چھوٹا پڑ گیا تھا۔ اس نے یہ بات مان لی تھی کہ عاصم اس سے بہتر اور سینئر ہے۔ میں نے اگلے دن ہی عاصم سے یہ بات کر لی۔ میری طرح وہ بھی بہت حیران ہوا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ سچ میں تم سے عروض سیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ کوئی بھی قیمت دینے کو تیار ہے۔ میری مانو تو ہاں کر دو۔ تم فیس لے کر اسے یہ علم سکھا سکتے ہو۔ ویسے بھی تمہارے حالات آج کل ٹھیک نہیں

ایک صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے اور کہا۔
''ڈاکٹر صاحب! مجھے عجیب سی بیماری ہو گئی ہے۔ جب میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ پلنگ کے نیچے کوئی ہے اور جب نیچے لیٹتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے جیسے اوپر کوئی ہے۔''
ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''یہ تو عام سی بیماری ہے۔ میں اس کا دو ہفتوں میں علاج کردوں گا اور صرف پانچ سو روپے خرچ ہوں گے۔''
مریض ''اچھا'' کہہ کر چلا گیا اور واپس نہیں آیا۔ تقریباً دو ماہ بعد راستے میں ڈاکٹر کی ملاقات اس مریض سے ہو گئی تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''آپ کو اپنی بیماری سے نجات مل گئی کیا؟''
مریض بولا۔ ''آپ پانچ سو روپے مانگ رہے تھے اور میں نے بیس روپے میں اس مرض سے نجات حاصل کرلی۔''
ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''
مریض نے کہا۔ ''میں نے بڑھئی کو بیس روپے دے کر پلنگ کے پائے ہی کٹوادیے۔''
مرسلہ: عنایت علی سرگونہ۔ پشاور

ٹھیک سے سکھانے کی کوشش کررہے ہو۔ اب وہ خود ہی نہ سیکھے تو یہ اس کا قصور ہے، تمہارا نہیں......''
''چلو کچھ دن اور دیکھتے ہیں۔ شاید اسے کچھ سمجھ آجائے۔'' مگر اگلے دو ماہ بعد بھی اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے عاصم نے بتائی تھی۔ ''عابد نے عروض سیکھنا چھوڑ دیا ہے۔''
مجھے اس کی بات سے بے حد حیرت ہوئی تھی۔
''کیوں......؟''
''کیوں کہ اس نے کہا ہے کہ عروض سیکھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔'' میرا دل بجھ سا گیا۔ اس بات سے نہیں کہ عابد عروض نہیں سیکھ پایا، بلکہ اس بات سے کہ عاصم کی جو فیس کی آمدنی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ میں نے اس بات کا اظہار اس سے کیا تو وہ مسکرا دیا۔ ''اس سے فیس لینے کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔''
''کیا مطلب......؟''
''مطلب یہ کہ اب اسے عروض سکھانے کی بجائے میں اس کے کلام کو وزن میں ڈھال کر اس کی اصلاح کر دیا کروں

ہیں۔ ان روپوں سے تمہارے بہت سے کام ہو جائیں گے۔ اور ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ کچھ عرصے بعد تمہاری شادی ہے۔ تم اپنی شادی کے لیے بھی چار پیسے جوڑ سکتے ہو......''
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''مجھے شادی کا شوق نہیں ہے۔ سادی کے بغیر میں کسی کے ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مگر میں ابا کی وجہ سے مجبور ہوں۔ وہ بڑے چاچا کے گھر شادی کرانا چاہتے ہیں۔ اور ان کی بات میں ٹال نہیں سکتا۔''
میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ سادی اب کسی اور کی ہو چکی ہے۔ تم بھی اب کسی کے ہو کر نئی زندگی کا آغاز کرو۔''
''اب شاید ایسا ہی کرنا پڑے گا۔''
''تو عابد سے کیا کہوں؟''
''جو تمہیں بہتر لگے۔''
''چل ٹھیک ہے۔ میں اس سے کہہ دیتا ہوں کہ تم مناسب فیس لے کر اسے سکھانے کو تیار ہو۔ فیس بھی اس سے میں خود طے کرلوں گا۔''
اگلے دن میں نے عابد سے اس سلسلے میں بات کر لی۔ میری بات سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ فیس کی اسے پروا نہیں تھی۔ وہ موٹی اسامی تھا۔ میں نے اس سے جو فیس طے کی، وہ خوشی سے ادا کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس دن سے عاصم، عابد کو علم عروض کی تعلیم دینے لگا۔ عابد جب تک گاؤں میں ہوتا، وہیں اس سے یہ علم سیکھتا۔ جب کالج چلا جاتا، خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رکھتا۔ مگر شاید اس علم پر دسترس حاصل کرنا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ کیوں کہ اگلے دو ماہ بعد جب میں نے عاصم سے اس بارے پوچھا تو اس نے کہا۔ ''یہ علم سیکھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے پچھلے دو ماہ میں جتنی محنت اس شخص پر کی ہے، اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا آدھا عروض سیکھ چکا ہوتا۔'' اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔
''پھر......؟''
''پھر کیا...... سوچ رہا ہوں کہ اسے سکھانا چھوڑ دوں۔''
''یہ بے وقوفی مت کرنا۔ اس سے تمہیں اچھی بھلی فیس مل رہی۔ تم بس اسے مدنظر رکھو۔ وہ سیکھے نہ سیکھے یہ اس کا دردسر ہے......''
''مگر مجھے مفت میں فیس لینا اچھا نہیں لگتا۔''
''یہ مفت کی فیس نہیں ہے۔ تم اپنی طرف سے اسے

گا۔اور اس کے بدلے وہ مجھے ماہانہ فیس دیتا رہے گا۔‘‘اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔’’اور سچ پوچھو تو اس جیسے شخص کو عروض سکھانے سے، اس کے کلام کی اصلاح کرنا زیادہ بہتر ہے۔اگر وہ روزانہ مجھے ایک غزل بھی اصلاح کے لیے دے تو بھی میں اسے پندرہ منٹ میں نمٹا دوں۔‘‘اس کی بات پر میں بھی مسکرا دیا۔اس دن یہ بات سچ میں ثابت ہو گئی تھی کہ عروض سیکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

زندگی اپنی مخصوص رفتار سے گزرتی رہی۔عابد اور عاصم، دونوں کا رابطہ برقرار رہا۔عاصم اس سے فیس لے کر اس کے کلام کی اصلاح کرتا رہا۔اس دوران آس پاس اگر کہیں مشاعرے ہوئے تو اس میں بھی ان دونوں نے شرکت کی۔جن میں کبھی کبھار میں بھی شامل ہوتا۔گو اب عابد کا کلام بے وزن نہیں ہوتا تھا۔کوئی بھی اسے اس بات کا طعنہ نہیں دے سکتا تھا، مگر اس کے باوجود اس کے کلام میں وہ بات نہیں تھی، جو عاصم کے کلام میں تھی۔عاصم کا کلام سیدھا دل پر اثر کرتا تھا۔عابد کا کلام اس صلاحیت سے محروم تھا۔گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ عاصم اپنے باپ کے ساتھ مٹی کے برتن بھی بناتا رہا اور عابد کی فیس کے پیسے بھی تھوڑے تھوڑے کر کے جوڑتا رہا۔کچھ عرصے سے اس نے ایک خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔وہ تھا، اپنی کتاب کے شائع ہونے کا خواب۔شاعری کو وہ بھرپور وقت دیتا تھا۔اس میں دن رات محنت کر رہا تھا اور ایک سے بڑھ کر ایک معیاری کلام تخلیق کرتا جا رہا تھا۔اس دوران اس نے بھاگ دوڑ کر کے دو چار پبلشرز سے رابطہ بھی کر لیا تھا۔اس کا کلام معیاری تھا۔ایک پبلشر نے اس کا کلام مناسب قیمت میں شائع کرنے کی ہامی بھر لی۔اس سے کچھ عرصہ پہلے، عابد بھی اپنی ایک کتاب مارکیٹ میں لے آیا تھا۔مگر اسے اپنی کتاب کی اشاعت کے بعد جس پزیرائی کی توقع تھی، وہ اسے نہیں ملی تھی۔حالانکہ اس نے وہ کتاب اپنے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو مفت میں دی تھی۔ان لوگوں میں، میں اور عاصم بھی شامل تھے۔عابد کی کتاب تسلی سے پڑھنے کے بعد میں ہنس پڑا تھا۔میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔’’یار مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر اس شاعری میں ایسی کیا خوبی ہے کہ اس نے اسے کتابی شکل میں شائع کرانے کا سوچا۔مجھے تو پڑھ کر ہنسی آ رہی ہے۔یوں لگتا ہے، جیسے یہ کتاب عابد نے نہیں، کسی کچے ذہن نے لکھی ہے۔‘‘

عاصم صرف مسکراتا رہا تھا۔عابد کی کتاب کی اشاعت کو کئی ماہ گزر گئے۔سب کی طرح اسے بھی بخوبی اندازہ تھا کہ اس نے شہرت کا جو قلعہ سر کرنے کا سوچا تھا، وہ اسے سر نہیں کر سکا۔شاید وہ اسے کبھی سر بھی نہ کر سکے۔کیوں کہ وہ قدرتی یا فطری شاعر نہیں تھا۔بلکہ وہ زبردستی شاعر بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

عاصم کی بہن کی شادی کے دن قریب آ گئے۔انہی دنوں عاصم کی شاعری کا مسودہ بھی ایک پبلشر کے پاس پہنچ چکا تھا، جو بہت جلد کتابی شکل میں ڈھلنے والا تھا۔مگر افسوس کہ عاصم کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہو سکا۔کیوں کہ جس رات عاصم کی بہن کی رخصتی تھی، اس سے دو دن قبل ان کے گھر میں ’ڈاکا‘ پڑا۔ڈاکو ان کے گھر کی ہر قیمتی چیز لوٹ کر لے گئے۔جس میں عاصم کی کتاب کی اشاعت کے لیے رکھے ہوئے پیسے بھی تھے اور اس کی بہن کے جہیز کے زیور اور دوسری قیمتی چیزیں بھی۔گو وہ غریب لوگ تھے۔ان کے پاس زیادہ مال و متاع نہیں تھا۔مگر اس کے باوجود عاصم کے ماں باپ نے اپنی پہلی بیٹی کی شادی کے لیے قطرہ قطرہ کر کے بہت کچھ جوڑ رکھا تھا۔یہ ’ڈاکے‘ کی واردات بھی پہلی بار ہمارے گاؤں میں ہوئی تھی۔اس واردات نے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو ڈرانے کے ساتھ سوچ بچار میں مبتلا کر دیا تھا کہ آخر ان کے گاؤں میں یہ ہو کیا رہا ہے اور وہ بھی عاصم کے گھر والوں کے ساتھ؟ کچھ عرصہ پہلے ان کے مٹی کے کچے برتن توڑ دیے گئے تھے اور اب گھر میں ڈاکا پڑ گیا۔اگر ’ڈاکوؤں‘ نے ڈاکا ڈالنا ہی تھا تو چوہدریوں اور ملکوں کے گھر میں ڈالتے، جہاں سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا تھا۔مگر پتا نہیں کیوں ڈاکوؤں نے ان بڑے گھروں کو چھوڑ کر اس چھوٹے سے گھر کو ’تاڑا‘ تھا۔اس رات، اس گھر میں موت کا سا سناٹا تھا۔یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔اگلے دن گاؤں کے بہت سے لوگ ان سے اظہارِ افسوس کرنے ان کے گھر جمع تھے۔مگر صرف افسوس کرنے سے ان کا لوٹا ہوا سامان واپس نہیں آ سکتا تھا۔افسوس کے لیے آنے والوں میں عابد بھی شامل تھا۔وہ بظاہر افسوس کرنے والوں میں شامل تھا، مگر مجھے اس کی آنکھوں میں افسوس کی بجائے خباثت نظر آئی تھی۔اس نازک موقع پر چاہنے کے باوجود بھی میں عاصم کی زیادہ مدد نہیں کر سکا تھا۔میں ان دنوں برسرِ روزگار نہیں تھا اور عابد کے ساتھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔دو دن بعد عاصم کی بہن کی اسی طرح دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی، جیسے ان لوگوں نے سوچ رکھا تھا۔ڈاکو جو سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔اس کی بہت حد تک تلافی ہو گئی

تھی۔اور یہ مہربانی عابد نے کی تھی۔کیوں کی تھی؟اس کی وجہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوگئی تھی۔اس شادی کے چند دن بعد میں نے عاصم سے پوچھا۔"یار وہ تمہاری کتاب کا کیا بنا؟تم کتاب شائع کرا رہے تھے نا؟"

مجھے اس کے چہرے پر اذیت کی لہر محسوس ہوئی۔"نہیں، میں کوئی کتاب شائع نہیں کرا رہا۔اب میری کبھی کتاب شائع نہیں ہوگی۔"

"کیا مطلب؟" مجھے حیرت ہوئی۔"مطلب یہ کہ میں نے اپنی شائع ہونے والی کتاب کا مسودہ، عابد کو بیچ دیا ہے۔میری شاعری، وہ اپنے نام سے شائع کرا رہا ہے۔"

"کیا......؟" اس بار میں قریباً چیخ اٹھا۔"یہ...... یہ کیوں کیا تم نے؟"

وہ ہولے سے مسکرایا۔"کیوں کہ مجھے اپنی بہن کی دھوم دھام سے شادی کرنا تھی اور اس کے لیے بہت سا پیسا چاہیے تھا۔وہ سارا پیسا عابد نے دیا ہے مجھے۔اور اتنا دیا ہے کہ میں نے اپنی بہن کی اچھی طرح سے شادی کر دی۔اب اس نے بدلے میں مجھ سے میرا مسودہ مانگ لیا تو کیا برا کیا؟اتنا تو اس کا حق ہے......ویسے بھی مجھے کتاب شائع کرا کر کیا مل جاتا......؟ صرف دو چار لوگوں کی واہ واہ اور سستی شہرت۔" اس کے لہجے میں اداسی در آئی۔میں صرف اسے رنجیدہ نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔یہ صرف میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی۔اس نے جو کلام خون جگر سے، راتوں کی نیند حرام کر کے تخلیق کیا تھا، وہ یوں آسانی سے کسی کے نام کر دینا کوئی عام بات نہیں تھی۔اس کے لیے بہت حوصلہ اور ظرف چاہیے تھا اور یہ بات عاصم نے خود میں پیدا کر لی تھی۔اگلے کچھ ہفتوں میں عاصم کی زندگی میں کچھ اور تبدیلیاں آئی تھیں۔پہلے عاصم کی شادی ہوئی اور اس کے عرصے بعد یکے بعد دیگرے عاصم کی ماں اور باپ دنیا سے چل بسے تھے۔ان کے پیچھے گھر کی ساری ذمہ داری عاصم کے کاندھوں پر آ پڑی۔گھر میں اب صرف وہ تھا، اس کی بیوی تھی اور اس کی دو جوان بہنیں تھیں۔اب برتن بنانے کا کام صرف وہی کرتا تھا۔وہ دن کو برتن بناتا اور رات کو خون دل سے شعر تخلیق کرتا۔معلوم نہیں اس کے دل میں اب بھی اپنی کتاب کی اشاعت کا خواب تھا یا نہیں مگر اس کے شعر کہنے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔البتہ اب اس کے شعر کہنے کی رفتار بہت کم ہوگئی تھی مگر اس کے ساتھ ایک اور کام بھی ہوا تھا۔ اس کی شاعری بہت لاجواب ہوگئی تھی۔

اس کی ہر غزل قابلِ تعریف ہوتی تھی، جو سیدھی دل میں اتر جاتی۔

اگلے دو سالوں میں اس نے اپنی آخری دونوں بہنوں کی بھی شادی کر دی۔

اس کے سر پر ذمہ داریوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔اس دوران عاصم کو خدا نے ایک بہت ہی پیارے اور خوبصورت بیٹے سے نوازا، جس میں عاصم کی جان تھی۔

ادھر عابد نے عاصم کے مسودہ سے جو کتاب اپنے نام سے شائع کرائی تھی، ادبی حلقوں میں اس ایک ہی کتاب نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

عابد بہت ہی چالاک اور کمینی صفت کا انسان تھا۔اس نے ادبی حلقوں میں اس کتاب کو اپنی پہلی کتاب کہا تھا۔اسے پتا تھا کہ اگر اس نے اس کتاب کو اپنی دوسری کتاب کہا تو اس سے پہلی کتاب کی مطالبہ کیا جائے گا اور جب ناقد اس کی پہلی کتاب پڑھیں گے تو کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی شخص کے قلم سے نکلی ہیں۔اس کی اس دوسری کتاب کی اشاعت کو دو سال گزر گئے تھے۔شاعری اور اس کی شہرت کی گرد دھیرے دھیرے بیٹھتی جا رہی تھی۔عابد کی ایک بار پھر کوشش تھی کہ کسی طرح عاصم اپنا لکھا ہوا سارا کلام اسے منہ مانگی قیمت پر بیچ دے اور وہ ایک اور شاہکار کتاب اپنے نام سے مارکیٹ میں لے آئے...... مگر اس بار عاصم نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔پچھلی بار وہ مجبور ہو گیا تھا، مگر اس بار اسے کوئی مجبوری نہیں تھی۔ادھر عابد نے بھی اسے ذاتی طور پر مجبور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی......شاید وہ اس بار خوف زدہ تھا۔اس کا خیال تھا کہ اگر اس بار اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو شاید وہ خود کو چھپا نہ پائے اور یوں اس کی شخصیت کھل کر لوگوں کے سامنے آ جائے گی۔گو ان دنوں عاصم مجبور نہیں تھا، مگر یہ لازمی نہیں تھا کہ آئندہ آنے والے دنوں میں بھی اسے کوئی مجبوری پیش نہ آئے......اور یہ مجبوری صرف چھ ماہ بعد ہی اسے پیش آ گئی تھی عاصم کے بیٹے کی پیدائش بڑی مشکل سے اور شہر کے اسپتال میں ہوئی تھی۔ کیس کچھ ایسا پیچیدہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا، اب شاید اس بچے کے بعد اس کا کوئی دوسرا بہن بھائی پیدا نہ ہو سکے۔اور پھر ہوا بھی وہی۔

عاصم کی پہلی اولاد کے بعد ان کے گھر میں یہ نعمت پھر کبھی نہ آ سکی۔بات ہو رہی تھی عاصم کے مجبور ہونے کی۔ہوا یوں کہ عاصم کا بیٹا بہت بیمار ہو گیا۔معلوم نہیں اسے کیا بیماری لاحق ہوئی تھی کہ گاؤں کا واحد حکیم بھی اسے ٹھیک نہ کر

سکا۔ مجبوراً عاصم کو اسے شہر لے کر جانا پڑا۔ وہاں عاصم کو اپنے بیٹے کی شفایابی کی اُمید تو بندھ گئی تھی، مگر وہاں کا علاج اتنا مہنگا تھا کہ عاصم کو ایک بار پھر اپنے خوابوں کو بیچنا پڑا۔ اس نے اس بار بھی اپنی غزلوں کا مسودہ عابد کو بیچ دیا تھا۔ مگر عابد اس بار عارضی داؤ کھیلنے والا نہیں تھا۔ وہ عاصم کی مجبوری سے بخوبی واقف تھا۔ سو اس نے عاصم کو ہمیشہ کے لیے مجبور اور پابند بنانے کے لیے اس کے ساتھ پکے کاغذوں پر ایک سمجھوتا کیا۔

وہ سمجھوتا یہ تھا کہ عاصم ہر تین چار سال بعد اسے ایک کتاب کا مواد دے گا اور جواب میں عابد اس کے بیٹے کا ہر طرح سے خرچا اٹھائے گا اور اس کا خیال رکھے گا۔ مطلب، ہر دکھ سکھ کے علاوہ عاصم اسے کسی اچھے اسکول میں داخل کرائے گا تو وہ اس کی تعلیم کے تمام اخراجات خود برداشت کرے گا۔ یہی سے لے کر میٹرک اور اس کے بعد کالج یونیورسٹی تک، وہ جب تک پڑھنا چاہے...... عاصم کو اپنے بیٹے کو پڑھانے لکھانے اور ڈاکٹر بنانے کا بہت شوق تھا۔ مگر شاید وہ اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے اس خواب کو کبھی پورا نہ کر پاتا، اگر عابد اس سے یہ سمجھوتا نہ کرتا۔ اپنے بیٹے کے بہترین مستقبل کے لیے اس نے اپنے تمام خواب ہمیشہ کے لیے عابد کو بیچ دیے۔

☆☆☆

معلوم نہیں کتنے برس گزر گئے۔ ہمارا جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر طے ہوگیا۔

اس دن ہماری بستی کے دو گھروں میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ایک عاصم کے گھر اور دوسرا عابد کے گھر۔ عاصم کے گھر اس لیے کہ اس کے بیٹے نے اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنی ڈاکٹری کا کورس مکمل کرلیا تھا۔ اس دن عاصم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے جو خواب دیکھا تھا، آج اس کی اسے تعبیر مل گئی تھی۔ سو آج وہ میرے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھا تھا اور بہت خوش تھا۔ اس کی خوشی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ آج وہ عابد سے کیے گئے معاہدے سے آزاد ہوگیا تھا۔ اب وہ عابد کے لیے خود کو ذہنی کوفتوں میں مبتلا کرنے سے آزاد تھا۔ ادھر عابد کے گھر میں اس لیے جشن تھا کہ آج اس کی دسویں کتاب کی اشاعت کی رونمائی تھی۔ ان دس کتاب کی اشاعت نے اسے بہت نام، شہرت اور دولت سے نوازہ تھا۔ اسے بہت سے ایوارڈز دیے تھے۔ یہ الگ بات کہ ان ساری چیزوں کے پیچھے عاصم کی محنت تھی۔ پیسے کے بل بوتے پر عابد نے دو چار صحافیوں کو بھی اپنے گھر میں بلایا ہوا تھا، جو اگلے دن

اپنے اپنے کالموں میں اس کی شاعری کی تعریف میں زمین آسمان ایک کرتے۔ عابد کو اس مقام پر دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ یہ سب عاصم کی محنت تھی۔ اس عزت و شہرت پر صرف اس کا حق تھا۔

اگر عاصم اپنا سارا کلام حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر فروخت نہ کرتا، تو آج یقیناً وہ اس مقام پر ہوتا، جہاں عابد تھا۔ ایک پل کو مجھے خیال آیا کہ عاصم نے ماضی میں عابد سے سمجھوتا کر کے ایک غلط فیصلہ کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج نا جانے کہاں ہوتا۔

میں نے اپنی اس بات کا اظہار اس سے کیا تو وہ مسکرا دیا۔ ”میرا وہ فیصلہ غلط نہیں، بالکل ٹھیک تھا۔ گو میرا عابد کو اپنا کلام دینا درست فعل نہیں تھا، مگر میں نے اس کے بدلے جو حاصل کیا ہے، وہ بھی کچھ کم نہیں...... اور ایک وقت آئے گا، جب تم خود تسلیم کرو گے کہ میرا یہ فیصلہ درست تھا، غلط نہیں تھا۔“

☆☆☆

میری طرح اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی نمی تھی۔ ”مجھے نہیں پتا تھا کہ میرا بابا اتنا عظیم انسان تھا۔ اس نے اپنے خواب بیچ کر مجھے اس قابل بنایا کہ......“ اس کی آواز بھیگ گئی۔

”مگر یہ دیکھو کہ اس نے جو فیصلہ کیا تھا، بالکل بجا تھا۔ اس نے تمہاری اتنی اچھی پرورش کی، تمہیں اس قابل بنایا کہ تم نے اپنے گھر میں پڑی ہوئی باپ کی میت چھوڑ کر میرے بیٹے کے علاج کے لیے میرے گھر آ گئے تھے۔“

”اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ میرا فرض تھا۔“

”مگر یہ فرض ان حالات میں پورا نہیں کیا جاسکتا، جن حالات میں تم نے کیا...... اور صرف اتنا ہی نہیں، اس کے بعد میرے بیٹے کو اسپتال لے گئے۔ اتنی بھاگ دوڑ کی...... آج کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے؟ اس کے لیے میں تمہارا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے......“

”چاچا...... اب اور شرمسار مت کریں مجھے۔ آپ میرے بابا کی جگہ ہیں اگر ان کے ساتھ کچھ ایسا ہوجاتا تو بھی میں یقیناً ایسا کرتا......“

ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں اور وہ اس کی باپ کی قبر کے پاس کھڑے فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا باپ ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم انسان تھا، جو کبھی کبھی اور کہیں کہیں پیدا ہوتا ہے۔

وقت کی ٹنل

محترم مدیر
السلام علیکم
ہر انسان کی زندگی میں ایک دو واقعات ایسے ضرور آتے ہیں جو سوچ کے در کھول دیے۔ یہ اقعہ بھی کچھ ایسا ہے۔ مجھے تو بہت پسند ہے اب پتا نہیں آپ کو کیسا لگتا ہے۔ اگر پسند آجائے تو شامل اشاعت کرلیں
سلمی اعوان
(لاہور)

"اللہ اگر کہیں چور ڈاکو ہمارے دو کنال پر پھیلے اس گھر کی پروقار سی عمارت کی بیرونی شان وشوکت اور رعب داب کو دیکھتے اور ہمیں موٹی اسامی خیال کرتے ہوئے اندر آجائیں تو بیچارے کتنے مایوس ہوں گے کہ ننگے بچے کمروں کی الماریاں، صندوق اور پیٹیاں بھی کتابوں اور لنڈے کے کپڑوں سے ناکوں ناک بھری پڑی ہیں۔"

'چچ چچ' اس نے زبان تالو سے لگا کر یہ آواز نکالنے اور چہرے پر خود ترسی اور ترحم آمیزی جیسی کیفیات پیدا

کرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے پانچ فٹ گیارہ انچ کے وجیہہ مرد کی طرف دیکھے بغیر سلسلہ کلام جاری رکھا۔
ہاتھ جھاڑتے ہوئے یہ بھی کہیں گے نا۔ ''اے ہے کن فقیروں کے گھر آگئے ہیں۔''
زندگی کی حرارت اور سرشاری سے بھرپور منصور کا قہقہہ کمرے میں گونجا۔ جب اس قہقہے کی گونج ختم ہوئی۔ اس نے قدرے تیکھے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
''میرے خیال میں تھوڑا بہت سونا تو میرے ماں باپ نے تمہیں چڑھایا ہوگا۔ کچھ تھوڑا سا دوسری جانب سے بھی دان ہوا ہی ہوگا۔ اب اسے الللے تللوں میں ضائع کرنے کی بجائے ایک دو تولے سنبھال لینا تھا نا۔ بیچاروں کا مایوسی سے بچنے کا کچھ سامان تو ہو جاتا۔ اب رہیں کتابیں اور لنڈے کے کپڑے تو بھئی ایک عشق میرا ہے۔ دوسرا تمہارا۔ اب ہمیں ایک دوسرے کے عشق سے سمجھوتا تو کرنا ہی ہے نا۔''
اس نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ خاموش ہو گئی تھی۔ جانتی تھی کہ اگر کچھ اور کہے گی تو یہ نہیں سنے گی۔
''جانم خدا کا شکر ادا کیا کرو۔ اس نے رہنے کو یہ خوبصورت سی چھت دی ہے جو یقیناً خدا کی عنایت کے بعد ہمارے والد گرامی کی محنت شاقہ اور رزق حلال کا نتیجہ ہے۔ ہنستے کھلکھلاتے گل گوتھنے سے بچے بھی دیئے ہیں۔''
اب ایسے میں وہ کسرنفسی کے طور پر اپنی ذات کو بیچ میں سے حذف کر جاتا۔ اگر وہ بھی یہ کہہ دیتا کہ ایسا لائق فائق خوبصورت اونچے عہدے پر فائز شوہر بھی تم جیسی معمولی صورت رکھنے والی عورت کو خدا نے دیا ہے جو صد ہزار بار تمہارے لیے مقام شکر ہے۔ تو بھلا ایسی ننگی سچائی کے روبرو کچھ کہنے یا کسی بات کو جھٹلانے کی پوزیشن میں تھی کیا؟
ہوائیں نیچے لان میں سے رات کی رانی کے پھولوں کی ساری خوشبو اڑا اڑا کر کھڑکیوں کے راستے اندر آرہی تھیں۔ اور وہ ناک کے نتھنوں کو پھلاتا اس خوشبو کو لمبے لمبے سانسوں سے اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش میں تھا۔ چھت سے فرش تک لمبی کھڑکیوں سے لان میں جابجا اگے پھولوں کا دلفریب نظارہ بھی نگاہوں کو مسحور کرتا تھا۔
ایک طائرانہ سی نظر اس نے کمرے پر ڈالی۔ کس قدر روکھا پھیکا سا تھا یہ۔ سوائے بیڈروم کے کسی کمرے کی کھڑکی پر پردے نہیں تھے کہ اس کے شوہر کے خیال میں فضول کی یہ شوبازی ہوا اور دھوپ کے راستے میں یونہی ٹانگیں پسار لیتی ہے۔ فرش پر میٹنگ بھی اس کے خیال میں نری گندگی اور ڈسٹ الرجی کی پیدائش کا موجب تھی۔ کمرے میں یہاں وہاں دھری زیبائشی اشیا کا بھی کیا کام؟ ایسے ہی ان کی موجودگی کمرے کی کشادگی کی راہ میں حائل ہوتی تھی۔ کبھی کبھی میں جل بھن کر خود سے کہتی۔ یہ حجرہ شاہ مقیم کی اس احمق مٹیار جٹی سے کہیں مختلف ہے، جو کہتی تھی۔

گلیاں ہو جاون سنجیاں
تے وچ مرزا یار پھرے

کتاب سے اسے عشق تھا اس لیے گھر میں ان کی موجودگی لازمی امر تھا۔ موسیقی کا وہ رسیا تھا بہترین کلیکشن کا ایک ڈھیر تھا اس کے پاس۔ اچھے کھانوں، اچھے لباس اور سیرسپاٹوں کا دلدادہ۔
شہر میں ہونے والے اوپیرا اور میوزک کنسرٹ کا ٹکٹ خریدنا اس کے لیے کھانے کی طرح ہی ضروری تھا۔
فرض شناس اور ذمہ دار افسر تھا۔ ایک نیم گورنمنٹ ادارے میں اپنی تعلیم اور محنت کے بل بوتے پر جلد ہی کلیدی پوسٹ پر چلا گیا تھا۔ یہ پوسٹ ناجائز کمائی کے بہت سے راستوں کی طرف جاتی تھی۔ پر اس کے اکیسویں گریڈ کے ریٹائرڈ باپ نے اس کی اور اپنے بقیہ بچوں کی پرورش خالصتاً رزق حلال سے کی تھی۔ شوقیہ لوازمات بھی پورا کرنے ضروری تھے۔ اپنی ساری ضروری مدوں کے لیے رقم نکال کر وہ بقیہ تنخواہ اس کے ہاتھ میں تھما کر فارغ ہو جاتا۔
اب ایسے میں کچھ اپنا اور کچھ بچوں کا بھرم رکھنے کے لیے لنڈے جانا اور لنڈے کو گھر میں لانا کس قدر ضروری تھا۔
یوں وہ اس دریا کی قدیمی شناور تھی۔ سالوں پہلے تقسیم کے بعد جالندھر کی مضافاتی بستیوں سے اٹھ کر آنے والی اس کی ماں، ماسیاں، پھوپیاں اور ممانیاں جب لاہور جیسے قدیم اور تاریخی شہر میں آکر بسیں تو انہوں نے سب سے پہلے برقعے اوڑھے پھر اتوار کے اتوار شوہروں اور بچوں کے ساتھ تانگوں میں لد لدا کر تاریخی جگہوں پر جانا اپنا معمول بنایا۔ گھروں میں واپس آکر اگلے کئی دنوں تک اس شہر کا کانپور اور جھانسی سے مقابلہ ہوتا کہ جہاں انہوں نے اپنے محنت کش شوہروں کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا۔
پھر ایک دن ان پینڈو عورتوں نے ایک عجیب سی ایک ایکٹویٹی کی۔ یہ بہار کے دن تھے جب انہوں نے چھوٹے بچوں کو بڑے بچوں کی تحویل میں دیا۔ چھت پر ہولے

بھوننے اور کھانے کے عمل میں انہیں مصروف کیا اور خود برقعہ اوڑھ کر کہیں چلی گئیں۔

شام ڈھلے جب وہ نیچے اتری۔ اسے محسوس ہوا جیسے گزشتہ سال کی آسمان کے سینے پر دیکھی ہوئی قوس قزح ان کی انگنائی میں اتری ہوئی ہے۔ فرش پر ریشمی کپڑوں کا بازار سا بکھرا ہوا تھا۔ خوشگوار حیرتوں کے ساتھ اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر انہیں اٹھا اٹھا کر دیکھا۔ لمبی لمبی فراکیں، چھوٹے چھوٹے گھگرے، ان پر ہاتھ پھیرا۔ یوں لگا جیسے ہاتھ تو کہیں مکھن پر پڑے ہوں۔ جیسے کچی ملائی ہوا ان کے نیچے۔ سرسر کرتے پھسلتے دور تک چلے گئے تھے۔

اس کی ماں جب اپنے حصے کا مال اٹھا کر کمرے میں لائی تو میں دیر تک انہیں پہن کر مٹک مٹک کر چھوٹے سے کمرے میں گھومتے پھرتے خود کو پڑھی ہوئی کہانیوں کی کوئی شہزادی خیال کرتی رہی۔

بس تو یہیں میرے اور لنڈے میں وہ تعلق اور ربط استوار ہوا جو آنے والے وقتوں میں ہڈیوں گوڈوں میں بیٹھ گیا۔ میٹرک تک تو جو ماں نے پہنایا میں نے پہنا پر کالج جا کر میرے پر پھوٹے۔ مصنوعی جیولری، کچے موتیوں، نایاب ونادر اشیاء اور بہترین کپڑے کی زیرِ زمین دکانیں بھی اس نے کھوج لیں۔ کالج میں اس کے سوئیٹروں اس کے انتہائی قیمتی شفون کے دوپٹوں اور قیمتی قیمصوں کی دھوم تھی۔

آغاز میں تو کوئی اس کی قیمتی قمیص یا سوئیٹر کو شانے سے چٹکی میں پکڑ کر اگر یہ کہتے ہوئے ''اف بھئی کس قدر شاندار ہے۔ کہاں سے لیا ہے؟'' جیسا استفسار کرتا تو وہ بڑی بیچ پتری بنتے ہوئے آنکھوں میں معنی خیز مسکراہٹ کی چمک بھر کر ابروں اور کولہوں کو ٹھمکا لگاتے اور دائیں بازو کو پیچھے کی جانب لمبا سا جھلا دیتے ہوئے ایک خفیہ اشارہ دیتی، جسے سمجھ کر مخاطب زور سے ٹھٹھا لگاتا۔

پھر میں نے جانا کہ یہ تو کھوتا کھوہ میں ڈالنے والی بات ہے۔ اسی لیے یونیورسٹی کے زمانے میں یورپ کے مختلف ملکوں میں اس کے بے شمار چچا ماموں سیٹل ہو گئے تھے جن کی وہ بڑی دلاری بھانجی بھتیجی تھی اور آئے دن ان کی جانب سے تحفے وصول کیا کرتی۔

امریکن یونیورسٹی بیروت میں قیام کے دوران ایک بار جب پاکستانی طلبہ کی پاکستانی سفیر کی رہائش گاہ پر ڈنر کے موقع پر سفیر کی بیگم نے میری قمیص کے کلر کمبی نیشن اور کپڑے کی تعریف کی تو میں نے شکریہ کہتے ہوئے دل میں کہا۔ ''لو بھئی قیمت وصول ہو گئی اس کی تو۔''

مجھے یاد آیا تھا۔ خدایا کس قدر تکرار ہوئی تھی دکاندار سے۔ اس کی طرف سے پیش کردہ قیمت پر وہ دیدے گھما کر بھناتے اور مجھے ایک طرح پھنکارتے ہوئے بولا تھا۔ ''بابا معاف کرو۔ بیچنا نہیں چاتو۔ آگے جاؤ۔ تم کو کچھ معلوم نہیں کپڑے کا۔''

میں بھی اوّل نمبر کی ڈھیٹ ہڈی تھی۔ بحث کرتے ہوئے دل میں اسے صلواتیں سناتے ہوئے ''کمبخت خنزیر کا بچہ۔ تم سے تو زیادہ پہچان ہے مجھے۔ جانتی نہ تو تیری دو دو ٹکے کی باتیں سنتی۔''

ایک دھیلا کم نہ ہوا۔ اس نے بھی صبر شکر کے مصداق خرید لیا۔

اس کا کمپیوٹر کی طرح کام کرتا ذہن کپڑا ہاتھ میں پکڑتے ہی اس کی ڈیزائننگ کرتا۔ کاریگر ہاتھ اس کی مہارت اور عمدگی سے سلائی کرتے۔ اور تن پر سج کر وہ اپنے کسی اعلیٰ نسل سے ہونے کا چیخ چیخ کر اعلان کرتا۔

وہ پھیکے پکوانوں سے اونچی دکانیں سجانا سیکھ گئی تھیں۔ مختلف زبانوں سے نکلتے تحسین آمیز کلمات اور کہیں نگاہوں سے چھلکتے تحیر زدہ جذبات، اس قربت میں ایک ایسا تسلسل تھا جو شادی کے بعد بھی جاری رہا۔

منصور سے شادی بھی ایک ڈرامے سے کم نہ تھی۔ اماں بوکھلائے پھرتی تھی جوان کماؤ بیٹی جس کی روٹیاں تو اگرچہ ان کے منہ کو نہیں لگی تھیں کہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق کے باوجود مختصر سا خاندان ہونے اور ہر فرد کے کام کرنے کی وجہ سے گھر میں خوشحالی سی تھی پر ایسی اونچے درجے کی پڑھی لکھی بیٹی کو کھل کر ڈانٹ ڈپٹ اور پھٹکار بھی نہ سکتی تھی۔

''اے بیٹی سنو تو!'' وہ تھوڑی دیر بعد ملتجی سے لہجے میں کہتی۔

''اماں! جو تم مجھے سنانا چاہتی ہو وہ میں نہیں سنوں گی۔''

وہ بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہتی اور اِدھر اُدھر کام میں مصروف ہو جاتی۔

''تمہارا خیال ہے تمہارے لیے کوئی شہزادہ آسمان سے اتر کر آئے گا؟'' ماں تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق تلخی پر اتر آتی تھی۔

''شہزادے شہزادیوں کے لیے اترا کرتے ہیں۔

میں ٹھہری ایک مزدور کی بیٹی۔ میری سوچ کی اڑان اتنی اونچی کیسے ہوسکتی ہے؟''

وہ فرش پر پھسکڑا مارے ایک بڑی سی شیٹ پر گاؤں کی ایک گلی میں گزرتے ہوئے بہشتی کی تصویر بنا رہی تھی۔ بھاری مشک سے بوڑھی کمر دہری ہوئی جاتی تھی۔

''دیکھ بیٹی اچھے رشتوں کا قحط پڑا ہے۔ ایک انار سو بیمار والی بات ہے۔ اپنے رشتہ دار ہیں دیکھے بھالے لوگ جن سے کوئی خطرہ نہیں۔''

''کوئی نہیں قحط وحط۔ وقت آئے تو سبھی کچھ مل جاتا ہے۔''

اماں نے میری اس بات پر انگشت شہادت ہونٹوں پر رکھ لی اور طنز سے بھرپور لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ''ابھی وقت آنا ہے کیا؟ تمہاری ابھی شاید عمر نہیں۔ پچیس تو کب کی پاٹ چکی ہو۔ چند سال اور گزر گئے تو کوئی گھاس بھی نہ ڈالے گا۔''

اور اب میرے تلملانے کی باری تھی...... مار کر زمین پر پھینکتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کوئی گھاس ڈالے یا نہیں تمہاری منتیں نہیں کروں گی اماں۔''

وہ کمروں میں پھنکارتی پھری۔ پھر کسی دوست کے ہاں چلی گئی۔ شام پڑنے پر لوٹی تو ماں بھی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر اس نے جائے نماز اٹھائی اور پلنگ پر لیٹی ہوئی بیٹی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر پھونک مارتے ہوئے بولی۔ ''آخر اس انکار کی وجہ تو بتاؤ!''

''اماں تم میری شادی کرنا چاہتی ہو۔ کر دو۔ مگر یہاں نہیں کسی اور جگہ۔''

''بچی میرے پاس رشتوں کی بھرمار ہے کیا؟ جو اسے چھوڑ کر کسی اور کو پکڑوں۔''

''ایک تو اماں آپ نے ان کی نیک نامیوں کا ایسا ڈھنڈورا پیٹا ہے کہ مجھ جیسی کسی حد تک آزاد خیال لڑکی الجھن میں پڑ گئی ہے۔ سچی بات ہے اماں یہ دیندار لوگ بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ جینا حرام کر دیتے ہیں۔ میرا بھلا کہاں گزارہ ہوگا ان کے ساتھ؟''

اماں تو ہکا بکا سی ہوگئیں۔ ان کی بیٹی کیسی طرم خان بنی ہوئی تھی۔ تلملا کر بولیں۔ ''تو یوں کہو تمہیں لچے لفنگے انسان چاہئیں۔ لاکھ بار تمہیں سمجھایا ہے کہ اپنے رشتہ دار ہیں۔ پرانی باڑ کو نیا چھاپا لگنے والی بات ہے۔ لڑکے کے والدین دل سے خواہش مند ہیں۔''

''ان کی خواہش کو چاٹوں جب کہ لڑکا رضامند نہیں ہے۔''

ماں نے بوکھلا کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''لڑکا کبھی ہمارے ہاں نہیں آیا۔ تم ان کے گھر کبھی نہیں گئیں، تو پھر یہ پسند ناپسند کا چکر کیسا ہے؟''

''تم تو میری جان کو آگئی ہو ماں۔ میں نے تو بس یونہی کہہ دیا تھا۔''

وہ جز بز ہوتے ہوئے میرے پاس سے اٹھ گئی۔ پر میرے کانوں نے سرد آہ میں ڈوبی یہ آواز سن لی تھی۔ ''سیانے سچ کہتے تھے لڑکیوں کو زیادہ پڑھانا ٹھیک نہیں۔ وہ نکیل جو مجھے اس کی ناک میں ڈالنی چاہیے یہ میرے ناک میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ یہ ایم اے پاس ہے۔''

اور میں یہ سب بتا کر اپنا فضیحتا نہیں کروانا چاہتی تھی۔

گزشتہ سال مجھے ایک بڑے گرامر اسکول کے جونیئر سیکشن کی انچارج کی جاب ملی تھی۔ اس دوپہر جب بچوں کے والدین سے ڈیل کرتے کرتے وہ اکتا گئی تھی۔ اپنے آفس میں کرسی کی پشت سے سر لگا کر میں نے آنکھیں موند لیں۔ برقی پنکھے کی ہوا خوشگوار تھی اور میری ناک سے لگا گلاب کا وہ پھول جسے صبح سویرے ایک چھوٹی سی بچی نے مجھے پیش کیا تھا، بھینی بھینی خوشبو دے رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر پھول کو بغور دیکھا۔ اس کی صبح والی بشاشت غائب تھی۔ عین اس وقت ایک فربہی جسم کی عورت اندر آئی۔ وہ اپنے بچے کو سیکنڈ اسٹینڈرڈ میں داخل کرواتے کی خواہش مند تھی۔

''یہ تو ممکن نہیں۔ ایڈمیشن کا وقت نہیں اب۔'' میں نے بے اعتنائی سے کہا اور میز پر رکھے پیپر ویٹ کو گھمانے لگی۔

''میرا بیٹا آپ کے کزن کا کلاس فیلو اور دوست ہے۔'' خاتون نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرنی چاہی، مگر میرے چہرے پر حیرت کے آثار پا کر وہ جلدی سے بولی۔

''منصور احمد مکینیکل انجینئر!''

''اس نے آپ کے بارے میں مجھ سے بات کی تھی۔ اسے میرے بیٹے کے ساتھ خود آنا تھا۔ مگر کسی

ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکا۔''

میں دونوں کہنیاں میز کی چکنی سطح پر ٹکائے ہتھیلیوں کے ہالے میں تھوڑی جمائے اس خاتون کو بغور دیکھ رہی تھی۔ یہ سن کر اپنے آپ سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ''اگر اسے آنا تھا تو پھر بھلا تم کاہے کو چلی آئیں۔ اچھا تھا اسے اس بہانے دیکھ ہی لیتی۔ اماں جو دن رات تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہتی ہیں۔ پتا چل جاتا کتنے پانی میں ہے؟''

منصور احمد کے ساتھ اس کی قرابت داری بہت نزدیک کی نہ سہی، بہت دور کی بھی نہ تھی بس درمیان ہی میں کہیں اٹکی ہوئی تھی۔ منصور کے والد کے مختلف اسٹیشنوں پر رہنے کی وجہ سے آمدورفت کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ جب سے لاہور تبدیل ہو کر آئے تو میل ملاپ شروع ہوا اور وہ بھی صرف بڑوں کا۔ بچے نہ ان کے کبھی آئے اور نہ کبھی ہم لوگ گئے۔

ماں کا کہنا تھا کہ منصور کے والدین اس رشتے کے متمنی ہیں۔ گو انہوں نے ابھی کھل کر بات نہیں کی، تاہم اشاروں کنایوں سے پتا چلتا ہے۔

میں نے خاتون کو داخلے کے قواعد وضوابط سمجھائے۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکی تو عورت نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو لمبے چوڑے چکر ہیں۔ میرا بیٹا کل آئے گا وہی آپ سے بات کرے گا۔''

اگلے دن کوئی گیارہ بجے وہ آفس میں بیٹھی تھی کہ چپڑاسی نے ایک چٹ لا کر دی۔ اس نے پڑھی۔ انگریزی کے کیپٹل حروف میں منصور احمد لکھا ہوا تھا۔ وہ کوئی نوخیز سی بالی عمر کی لڑکی تو نہیں تھی کہ یوں نروس ہو جاتی پھر بھی میرا چہرہ قدرے سرخ ہوا۔ دل کے دھڑکنے کی رفتار بھی تیز ہوئی۔ میں نے ٹھنڈے پانی کا لبالب بھرا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ چپڑاسی خاموشی سے منتظر نظروں سے عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ آدھا پانی پی چکنے کے بعد میں بولی۔ ''جاؤ انہیں اندر بھیج دو!''

وہ خوش پوش سے نوجوان اندر آئے اور اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور احمد کون سا ہے؟ یہ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا۔ ساتھی لڑکے نے اپنے بھائی کے متعلق بات شروع کر دی تھی۔ ماں ٹھیک کہتی تھی۔ اس نے دل میں سوچا۔

وہ بلاشبہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ خدوخال دلکش اور اعضاء سے مردانہ وقار ٹپکتا تھا۔ میں نے متانت اور سنجیدگی سے ساری کارروائی انہیں سمجھائی۔ ایک دو بار اس کا دوست کلرک کے پاس بھی گیا۔ مگر وہ وہیں آفس میں ہی بیٹھا رہا۔ ہلکی پھلکی باتیں ہوئیں۔ جانے لگے تو اس نے میز پر پڑی ڈیل کارنیگی کی کتاب How to win friends اٹھائی اور اس سے مخاطب ہوا۔

''نوازش ہوگی اگر چند دنوں کے لیے مجھے یہ کتاب عنایت کر دیں۔ مدت سے اس کی تلاش تھی۔''

ان کے چلے جانے کے بعد میں مسکرائی۔ مجھے منصور احمد پسند آیا تھا۔

چلچلاتی گرمیاں آئیں۔ برکھارت گزری۔ پھر دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوئیں۔ ایک دن جب آسمان گھٹاؤں سے بھرا ہوا تھا اور سرما کی پہلی بارش کسی بھی لمحے متوقع تھی۔ وہ بہار کے کسی معطر جھونکے کی طرح اس کے آفس میں داخل ہوا۔

اس نے کتاب میز پر رکھی اور اتنی دیر بعد لوٹانے پر معذرت کی۔ انہوں نے چائے پی۔ اس نشست میں ان کے درمیان گھریلو باتوں کا ذکر رہا۔ رشتہ داروں پر بھی مختصر تبصرہ کیا گیا۔ اس نے اپنی ماں کے بارے میں کھل کر بات کی وہ سخت مزاج خاتون ہیں۔ یہ بتانے میں بھی کوئی تامل نہ کیا کہ ماں کہتی ہے سوچ سمجھ لو لڑکی بہت پڑھی لکھی ہے۔ زیادہ پڑھ کر لڑکیوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں اور وہ اچھی بیوی اور اچھی ماں بننے کے قابل نہیں رہتیں۔

میں ہنسی اور بولی۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کی والدہ کا نقطہ نظر کس حد تک درست ہے؟''

''فی الحال میں نے ابھی اس پر غور نہیں کیا۔'' اس نے سادگی سے کہا اور اس موضوع پر گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ وہ پھر آیا۔ وہ کلاس چیک کرنے گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو اسے آفس میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔

''ارے'' اس پر نظر پڑتے ہی میرے دل میں عجیب سی جل ترنگ بجی۔ جس نے میرا چہرہ بھی تھوڑا سا گل رنگ کیا اور آنکھوں میں بھی دیئے کی لو سی چمکی۔

''کب سے آئے ہیں؟ چپڑاسی سے کہہ کر مجھے بلوا لیا ہوتا۔''

بیٹھنے کے ساتھ ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ خاموش

ہے اور کچھ گومگو جیسی کیفیت سے دوچار ہے۔ میں نے خود ہی ہمت کی اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”میری منگنی میرے چھوٹے چچا کی بیٹی سے ہوگئی ہے۔ دراصل ننھیالی اور ددھیالی رشتہ داروں میں ٹھن گئی تھی۔ حالات اتنے نازک ہوگئے تھے کہ فوراً کوئی عملی قدم اٹھانا پڑا۔“

اس کا اوپر کا سانس اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔ گم صم اسے دیکھتی رہی۔ ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔

یہ ٹھیک تھا ان کے درمیان محبت نہیں تھی۔ کوئی قول وقرار نہ تھا۔ دوستی نہ تھی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بس ماں نے اپنے خیال میں بات اتنی پختہ بنا رکھی تھی کہ اس کا ذہن بھی متاثر ہوچکا تھا۔ خاص طور پر جب سے اس نے اسے دیکھا تھا۔

بڑی بوجھل تکلیف دہ اور ناگوار سی خاموشی کافی دیر ہمارے درمیان چھائی رہی۔ پھر اس نے اپنے سامنے دیوار پر آویزاں کلاک پر نگاہیں جماتے ہوئے قدرے مدھم آواز میں کہا۔ ”ضروری تھیں شادی ہی ہو۔ ہم اچھے دوست بھی ہوسکتے ہیں۔“

اور مانو جیسے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہوں۔ تیل کے کھولتے کڑاہے میں گر گئی ہو۔ غصے سے اسے پھنکارتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ میرا تعلق سوسائٹی کی جس کلاس سے ہے، اس میں دوستیوں کے لیے کہاں گنجائش ہے؟ یوں بھی یہ کالک اگر مجھے اپنے ماتھے پر لگوانی ہی ہے تو آپ اس کے لیے قطعاً موزوں نہیں۔ آپ جیسے ٹٹ پونجیے کی جیب دوستی کے اللے تللے اٹھانے کی بھلا متحمل ہوسکتی ہے؟“

میرے منہ میں جو آیا بولتی چلی گئی۔ لگتا تھا جیسے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہوں۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔

دونوں گھروں میں بڑوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد مجھے پتا چل گیا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کی کہیں منگنی وگنی نہیں ہوئی تھی۔

اور یہ کیسا خوفناک انکشاف تھا؟ دکھ اور کرب کی ایک لمبی لہر تھی جو کلیجہ چیر گئی تھی۔

”اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں اسے اچھی نہیں لگی تھی یا وہ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھتا تھا۔“

شرمندگی اور ندامت میں پور پور ڈوبے ہوئے سوالوں کا ہجوم تھا جو ایک کے بعد ایک سامنے آرہے تھے۔ خوفناک اور توہین آمیز تصویریں دکھاتا اور مجھے بے کل کر جاتا۔ بہت دنوں تک میں تجزیوں کی سولی پر چڑھتی اپنے آپ کو لیرلیر کرتی رہی۔ سوچیں کس قدر اندوہناک اور تلخ تھیں۔

”ارے میرے بارے میں اس کی سوچ اتنی پست۔“ جب وہ یہ سوال اپنے آپ سے کرتی تو اس کی آنکھیں بھیگ سی جاتیں۔

میں بڑی سلجھی ہوئی بڑے مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہیں وہ اسے مل جائے تو اس کا سر پھوڑ دے۔ اس کا بھرتا بنا دے۔ ذلیل کہیں کا۔ دوستی کرنا چاہتا تھا۔ ڈھیروں گالیاں نکال کر وہ گویا اپنا اندر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی۔

اور اماں کو تو دیکھو...... میرا بیاہ وہاں رچاتی پھر رہی ہے۔

ان دنوں وہ باؤلی ہوگئی تھی۔ اماں معلوم نہیں کون کون سے وظیفے پڑھ کر اس پر پھونکتی۔ کبھی میں دم سادھے پڑی رہتی اور کبھی ہڑبڑا کر ہاتھ جھٹک دیتی۔

اور جس صبح وہ لوگ منگنی کی رسم ادا کرنے آرہے تھے رات گویا میں نے کانٹوں پر گزاری۔ ساری رات آنسو رخساروں پر بہتے رہے۔ ماں اس کے آگے ہاتھ جوڑتی رہی۔ عزت کا سوال پیدا ہوگیا تھا۔ صبح کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن چڑھے اٹھی تو دماغ میں عجیب سا خیال آیا۔

ظاہر ہے یہ سب اس کی مرضی ہی سے ہورہا ہوگا۔ لڑکا ہے زور زبردستی کا کیا سوال؟ اپنے کردار کے بارے میں وہ خلش اور چبھن جو اسے ہمہ وقت بے چین رکھتی تھی، اس پر ٹھنڈی پھوار پڑ گئی۔ ”چلو ہونے دو یہ سلسلہ۔ پوچھوں گی پھر کہ اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟“

اور پھر بینڈ باجے بجے، پکوان پکے، بہت سارے لوگ آئے اور ان کے جلو میں وہ نئے گھر روانہ ہوگئی۔ شب عروسی کو اس نے روایتی دلہنوں کی طرح گھونگھٹ نہیں نکالا...... وہ کمرے میں آیا، تو وہ صوفے پر تمکنت سے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر حجاب کی بجائے سنجیدگی طاری تھی۔ وہ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے وار کیا۔ ”یہ ڈھونگ آپ نے کیوں رچایا تھا؟“

وہ ہنسا، بوٹ کی ٹو سے فرش کو چند لمحے بجاتا رہا اور

پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ایک تیز طرار لڑکی کو بیوی بنانے سے ڈر لگتا تھا۔''

''تو پھر بنایا کیوں؟''

''بڑوں کی خواہش تھی۔''

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ روندھے ہوئے گلے سے بولی تھی۔ ''سخت غلطی کی۔ انسان میں اتنی اخلاقی جرأت تو ہونی چاہیے کہ وہ معاملہ جو خالصتاً اس کی ذات سے متعلق ہو اس کے لیے ڈٹ جائے۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا پھر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے بالکل قریب بیٹھا۔ اپنی پوروں سے ان آنسوؤں کو صاف کیا جو اس کی نچلی پلکوں سے لڑھک کر گالوں پر بہہ نکلے تھے۔

''اس شادی میں ابو جان کے ساتھ ساتھ میری بھی سو فیصد رضامندی شامل ہے۔ میں تھوڑا بہت جھوٹا تو ہو سکتا ہوں پر بزدل ہرگز نہیں۔ اطمینان رکھو۔''

اس کی شخصیت کی پہلی جاندار سی پرت شادی کی پانچویں رات اس کے سامنے کھلی۔ میں لان میں اپنی ساس کے پاس کھڑی کوئی بات کر رہی تھی جب بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے منصور کا چہرہ باہر نکلا اور میرا نام لے کر فوراً مجھے اوپر آنے کو کہا۔ ساس سے اجازت لے کر میں تقریباً بھاگتی ہوئی دو دو سیڑھیاں الانگتی پھلانگتی سانس کو لوہار کی دھونکنی کی مانند پھلاتی گراتی دہلیز پر آ کر کھڑی کیا ہوئی کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے... پاؤں فرش کی بجائے اس پر دھری کسی میگنیٹ سلیٹ پر پڑے ہوں اور وہیں چپک گئے ہوں۔ دروازے کے دونوں پٹوں کے بیچوں بیچ بے حس و حرکت کسی سنگی بت کی مانند ایستادہ ہو گئی۔

کمرے کا ماحول مرتعش سا تھا۔ سارے کمرے میں دل کو چھوتی موسیقی کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ میری آنکھیں پلکیں جھپکائے بغیر سحر زدہ سی سامنے دیکھتی تھیں جہاں موسیقار کے ہاتھوں کی ترتیب اور دماغی ترکیب مل کر سازوں سے نکلتے سر جیسے بادصبا کے نرم و ملائم جھونکوں کا پھولوں کے تختوں پر سے دھیرے دھیرے بہنا، جیسے ندی کے سبک خرام پانیوں کا ہلکی سی گنگناہٹ سے چلتے رہنا جیسا احساس دیتے تھے۔ پھر جیسے دل کو چھونے والے مدھم سے جادو جگانے والے سروں کی جگہ ایک ایسی سمفنی فضا میں ابھری جس نے پل جھپکتے میں ایک ایسا منظر تخلیق کیا کہ جیسے کہیں برق و رعد کی یلغار ہو۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہو۔ دل ڈوبتا ہو۔ کچھ لمحے اس کیفیت میں گزرے پھر ساز خاموش ہو گئے۔ ہیجان انگیز کیفیت کا تاثر زائل ہونے پر میرے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔ میں آگے بڑھی۔ صوفے پر بیٹھی۔ اسی کی دہائی میں چوبیس انچ چوڑی اسکرین والے ٹی وی پر وی سی آر سے ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے ایسے پروگرام دیکھنا بالائی طبقے کے لوگوں کے لیے تو ممکن ہو پر عام آدمی کے پاس تو اس کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

کسی تربیتی کورس پر وہ چھ ماہ کے لیے امریکا گیا تھا۔ اپنی ساری بچت اس نے اپنی ان دلچسپیوں کی نذر کر دی تھی۔

اور جب اس نے یہ پوچھا تھا کہ جانتی ہو یہ سمفنی کس موسیقار کی تھی تو اس نے احمقوں کی طرح سر نفی میں ہلایا۔

بیروت میں، میں نے دو میوزک کنسرٹ ضرور اٹینڈ کیے تھے۔ تھوڑا بہت سر ساز سے واقفیت بھی تھی پر ایسی ہرگز نہیں۔

وہ Mozart کا گرویدہ تھا۔ اس کے گن گا رہا تھا کہ ابھی سنی گئی موسیقی کا خالق موزرٹ تھا۔

صرف مغربی نہیں اسے تو مشرقی موسیقی کا بھی خاصا علم تھا۔ جب وہ ترانہ، خیال، ٹھمری اور دادرا جیسی اصناف موسیقی پر باتیں کرنے اور اسے اپنی کلیکشن دکھانے کے لیے کھڑا ہوا تو اس نے دہل کر اپنے دل میں کہا۔

''مارے گئے۔ اللہ ایک تو اندر بھوک سے کلبلا رہا ہے۔ اوپر سے نیند آنکھوں میں جالے تان رہی ہے۔ نئے نویلے عروسی شب و روز، انکار کروں تو کیسے؟'' بہر حال جی کڑکڑا کے میں نے مدھم سی آواز میں اتنا کہا۔ ''منصور خالہ جان انتظار میں ہوں گی۔ اسے پھر کبھی دیکھوں گی۔''

کتاب سے اس کی محبت اور دلچسپی کمرے میں رکھی کتابوں سے ہی ظاہر ہوتی تھی۔ پر وہ اس معاملے میں اتنا کریزی تھا، اس کا اندازہ اسے اس اتوار کو ہوا جب ساری فیملی حلوا پوریوں کے ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئی۔ وہ پورچ میں آیا۔ گاڑی کی بجائے اس نے چھوٹے بھائی کی موٹر بائیک اسٹارٹ کی اور مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں حق حیران کھڑی پوچھے چلی جا رہی تھی کہ جانا کہاں ہے؟ میں ذرا چینج تو کر آؤں۔

''ارے ٹھیک ہے سب۔ بیٹھو بیٹھو۔ اب اور کیا ہار سنگھار کرنے ہیں۔''

بگولے کی مانند اڑتے ہنستے اس نے مجھے انارکلی کے تھڑوں پر بکھری کتابوں کے درمیان لا پھینکا۔ اور مجھے محسوس

ہوا تھا جیسے کتابیں ان شمعوں کی طرح ہیں کہ جن پر وہ کسی پروانے کی طرح ٹوٹ کر گرا تھا۔ اس کی آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھی تھیں۔ کتاب اسے بھی پسند تھی پر یہاں تو معاملہ عشق و عاشقی والا تھا۔ کتابوں کے چناؤ کے بعد اس کی قیمت پر بحث و تکرار اس کا کام ٹھہرا۔ بھاؤ تاؤ کروانے میں تو وہ خاصی ماہر تھی۔ خوب خوب زبانیں چلیں۔ اس کا تھیلا بھر گیا۔ اور جب وہ اسے کیریئر کے ساتھ باندھ رہا تھا اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں مول تول میں ہمیشہ کا پھسڈی ہوں۔ تمہاری وجہ سے بہت سی کتابیں زیادہ خریدی گئیں۔“

کوئی اچھا ڈراما، کوئی میوزک کنسرٹ، کسی پُر فضا تفریحی مقام کی سیاحت، آفیشل ڈنرز بھی میں سرگرمی سے شرکت کرنا اس کی زندگی کے معمولات کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

جب اتنے متنوع قسم کے مہنگے مشاغل ہوں اور تنخواہ کا بٹوارہ بھی ڈھیر ساری مدوں میں ہوتا ہو تو خاتون خانہ کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ ساس نے تو دو ماہ بعد ہی یہ کہتے ہوئے ان کا چولھا چوکا علیحدہ کر دیا تھا کہ بس اب اپنا گھر سنبھالو۔ بچے کی آمد بھی فوراً ہی ہوگئی۔ منصور بڑا جز بز ہوا۔ ”لو بھلا ابھی اس کھڑاگ کی کیا ضرورت تھی؟“

”حد کرتے ہو منصور۔“ میں بھی بپھر سی گئی۔ ”جیسے اس کام میں میں اکیلی ہی تو شامل ہوں۔“

اس نے جواباً جھلاتے ہوئے کہا تھا۔

”افوہ بھئی تم سمجھا تو کرو۔ ذرا تھوڑا اور موج میلہ کر لیتے۔“

اس نے مزید کوئی تلخ جواب دینے کی بجائے خاموشی سے اٹھ جانا زیادہ مناسب سمجھا۔

معاملہ یک نہ شد دو شد والا ہوا۔ سرخ و سفید رنگوں والے identical twins آ گئے۔ دو بیٹے۔ اس مشکل مرحلے کو اس نے اپنی ماں کی مدد سے سنبھالا۔ بیٹی نے بھی آنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ بہر حال خاندان مکمل ہو گیا۔ اوپر تلے کے بچوں کی مشکلات سے ذرا نکلی تو پارٹیوں میں جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ پارٹیاں کیا تھیں فیشن شو۔ کپڑوں اور زیورات کی نمائش۔ تصنع اور بناوٹ سے پُر باتیں اور ماحول۔

میں نے بھی اپنی ذہانت اور مہارت دونوں استعمال کیا۔ اپنے بچوں کو وہ کپڑے پہنائے کہ یہی لگا کہ جیسے سینٹ مائیکل گارمنٹ فیکٹری سے ابھی ابھی تیار ہو کر آئے ہوں۔ پھولوں جیسے بچے ایسے ملبوسات میں تتلیوں کی طرح اڑتے پھرتے بڑے منفرد نظر آتے۔

بچے جب کالجوں میں گئے تو اس کے پاس وقت کی فراوانی ہوگئی۔ اور یہ فراوانی مجھے ڈسنے لگی تھی۔ کیا کروں یہ میں بار بار خود سے پوچھتی۔ منصور سے بات کرتی تو وہ کہتا۔ ”بھئی جو کرنا ہے کر لو۔ تمہاری اپنی ہمت ہے۔“

دو تین جگہ ٹیچنگ کے لیے کوشش کی۔ کہیں تنخواہ کم تھی اور کہیں ڈیوٹی سخت۔ طویل سوچ بچار کے بعد اس نے بوتیک کا کام شروع کیا۔

خوش قسمتی شاید اسی انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی کہ کب وہ کچھ شروع کرے اور کب وہ اس پر دھن، دولت اور کامیابیوں کی بارشیں کرے۔

آغاز میں کِن مِن کِن مِن ہوئی۔ شاید کام کی بنیادوں میں نیک نیتی اور اخلاص تھا کہ موسلا دھار ہونے لگی۔ میں جو سارا ماہ گھریلو بجٹ کو پلاننگ کی سوئی کے ناکے میں سے تھوڑی سی بچت کی خواہش میں گزارتے ہوئے ہانپ ہانپ سی جاتی اب کیسے بے نیازی ہوگئی تھی۔ بینکوں میں جانے، قرضے لینے لاکھوں چھوڑ کر کروڑوں کے معاملات کی ڈیل اب اس کا معمول تھی۔

پر ایک بات ضرور تھی۔ وہ دولت کی تقسیم پر ایمان رکھتی تھی۔ اس کی زندگی صرف گوشت دالوں چینی پتی جیسی چیزوں کی مہنگائی ہی سے بے نیاز ہوئی تھی۔ بقیہ سب معاملات اسی سادگی اور کفایت شعاری کے مرہون منت تھے۔

بیٹی ابھی بی۔ اے میں تھی جب میں نے اسے بیاہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کردیئے۔ منصور بڑا بیخ پا تھا۔

”منصور اچھے رشتوں کا کال پڑا ہوا ہے۔ لائق لڑکوں کے والدین کی آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی ہیں۔ سینکڑوں تو شرائط ہیں۔“

”تو تم ایسے لوگوں کو اہمیت کیوں دیتی ہو؟“

بہر حال یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جونہی بیٹی گریجویشن سے فارغ ہوئی بہت اچھی جگہ سے رشتہ آیا اور اس فرض سے فارغ ہوگئی۔

بڑے بیٹے نے باہر سے تعلیم مکمل کر کے واپس آنے پر خاندان کی ہی ایک لڑکی کو پسند کرلیا۔ اس نے بھی خود سے کہا۔

”چلو اچھا ہی ہے۔ باہر آنکھ مٹکا لگا لیتا یا کسی تیز طرار کو لے آتا تو بھلا میں کیا کر لیتی۔ فیملی کی لڑکی ہے۔ کچھ تو

رشتوں کا بھرم رکھے گی نا۔"

بڑے سے آدھ گھنٹہ چھوٹے لڑکے کی میں نے دیور کے گھر نسبت ٹھہرادی تھی۔

یوں گھریلو ذمہ داریوں کے بار سے خاصی ہلکی ہوگئی تھی۔

پھر ایک عجیب اور حیرت انگیز سا واقعہ ہوا۔

مجھے کسی پارٹی کو کچھ ایڈوانس پے منٹ کرنی تھی۔ دفتر سے اٹھتے ہوئے میرے منیجر نے پانچ لاکھ کی پانچ گڈیاں دیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پارٹی سے کچھ معاملہ طے نہ ہوا اور بینک کا ٹائم بھی ختم ہوگیا۔ وہ پیسے سمیت گھر آگئی۔ پرس میں سے رقم نکال کر اس نے اسے اپنے بیڈ سے ملحقہ دراز میں رکھ دیں۔ دراز کا لاک خراب تھا۔ گھر کے نوکروں کی طرف سے اطمینان تھا۔ ایک دو دن مصروفیت میں ہی گزر گئے۔

تیسرے دن صبح سویرے اس نے نماز کے بعد دراز کھولا۔ سامنے گڈیاں پڑی تھیں۔

"کمال ہے یار بے پروائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" میں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی۔

اپنے سر کو جھٹکے پر گراتے مجھے اسے یونہی خیال آیا۔

اب اگر گھر میں کوئی چوری کی نیت سے آجائے اور دراز کھولے تو کتنا خوش ہو کہ بغیر کسی تردد کے اتنا سارا پیسا ہاتھ لگ گیا ہے۔

ایسی الٹی پلٹی سوچیں سوچنے میں میں ہمیشہ سے بڑی تیز تھی۔

بہرحال آج بینک جاتی ہوں۔ اس نے خود سے کہا۔

پر اس دن محاورے کے مطابق سر اٹھانے کا بھی وقت نہ ملا۔ ایک بجے گھر آئی۔ کھانا کھایا۔ نماز پڑھی۔ تین بجے مجھے پھر باہر جانا تھا۔ جب میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی میں نے دراز کھول کر پیسے نکالے انہیں ایک لفافے میں ڈالا اور ریک کے اوپر والے خانے میں خوبصورتی سے چنی گئی کتابوں کی دیوار کے پیچھے چھپا دیا۔

ساڑھے سات بجے میری واپسی ہوئی۔ ٹی وی لاؤنج میں گھر کے افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ پر نہ تو ٹی وی دیکھا جارہا تھا اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی بات چیت تھی۔ بڑے صوفے پر منصور کے ساتھ بہو تھی۔ سامنے چھوٹا بیٹا۔ عجیب سی پُراسراریت اور پژمردگی کا سا ماحول محسوس ہوا تھا، شاید اسی لیے میں نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں بیٹھو۔" منصور بہو سے مخاطب ہوئے۔

"اپنی آنٹی کو بتاؤ۔"

خدایا خیر ہو۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔

فریحہ (بہو) کے چہرے پر ہمہ وقت دوڑنے والی شوخی اور چلبلا پن غائب تھا۔ بجھی بجھی تھی۔ آواز بھی روکھی سی تھی جب وہ بولی۔ "آنٹی غضنفر (شوہر) کا کوئی ساڑھے چار بجے فون آیا۔ رات کے کھانے پر اس کے تین دوست آرہے تھے اور کڑھی کی فرمائش بھی تھی۔ میں کچن میں آئی کچھ چیزیں نہیں تھیں۔ میں نے وحید (ملازم) کو مطلوبہ چیزیں لکھ کر دیں کہ وہ لے آئے۔ پروین ابھی کوئی تین بجے اپنے کوارٹر میں گئی تھی سوچا کہ ابھی ٹھہر کر اسے بلواتی ہوں۔ خود میں نے پیاز کاٹنا شروع کردیا۔ مدھم سی قدموں کی چاپ پر میں نے... یونہی سر اٹھا کر دیکھا۔"

فریحہ نے خوف سے یوں جھرجھری لی کہ ایک لمحے کے لیے میں بھی کانپ اٹھی۔

میرا سانس میرے سینے میں کہیں اٹک گیا تھا۔ میری آنکھیں دہشت سے خوفناک حد تک پھیل گئی ہوں گی۔ میں پتھر کی طرح ساکت اپنے سامنے دہلیز میں کھڑے ایک لمبے چوڑے سیاہ نقاب پوش جس کے ہاتھ میں پکڑا پستول میرا نشانہ لیے ہوئے تھا دیکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ اندر آیا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ان میں سرخی تھی۔ اس کا لہجہ درشت تھا اس نے پوچھا۔

"تمہارا زیور کدھر ہے؟"

"پل بھر کے لیے میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا خدا کہیں میرے بہت قریب ہے اور اس کے فرشتوں نے میری حفاظت کے لیے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔" جب میں نے آنکھیں کھولیں میں حوصلے میں تھی۔ اس نے اپنا سوال تلخ لہجے میں دوبارہ دہرایا۔ "تم نے سنا نہیں میں نے کیا پوچھا ہے؟"

"میرا زیور میری ماں کے گھر ہے۔"

"جھوٹ بولتی ہو۔ فوراً بتاؤ۔ ورنہ ابھی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

مجھے قطعی خوف محسوس نہیں ہوا۔ میں نے دلیری سے کہا۔ "جھوٹ کیوں بولوں گی۔ میرے کان، ناک، کلائیاں، گلا سب دیکھو ننگے پڑے ہیں۔"

"کیش کہاں پڑا ہے؟" اس بار اس کے لہجے میں خفیف سی نرمی تھی۔

"یہ لوگ کیش گھر میں نہیں رکھتے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''اندر چلو!'' وہ رخ پھیر کر میری پشت پر آیا۔ پستول کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ میں ٹی وی لاؤنج میں سے گزر کر آپ کے بیڈروم میں داخل ہوئی۔''

''اب میں نے اس کا دوسرا ساتھی بھی اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ سفید کپڑوں میں تھا اور اس نے خاکی کپڑے سے اپنا منہ سر ڈھانپا ہوا تھا۔ ان کی آپس کی بات چیت سے مجھے اندازہ ہوا کہ گیٹ پر بھی ان کے دو ساتھیوں کا پہرہ ہے۔''

''آنٹی آپ کے کمرے کو انہوں نے جس تنقیدی انداز میں دیکھا، اسے میں نے پہچانا تھا۔ اب ذرا دیکھیے نا۔ ریک کے چاروں خانوں میں کتابیں۔ بیڈ کے سرہانے میں جو خلا اس میں کتابیں، اس کے اوپر کتابیں۔ میز پر کتابیں، شیشے کی الماری کے خانوں سے جھانکتی کتابیں۔''

''کس کا بیڈروم ہے؟''

اس نے پستول ہلا کر استہزائیہ انداز میں پوچھا تھا۔

''میرے ساس سسر کا۔''

''بڑے پڑھا کو لگتے ہیں۔'' پہلے والے کے لہجے میں حقارت بھری کاٹ تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں عجلت میں کھولی گئیں۔ ایک میں ڈھیر ساری استعمال شدہ جرابوں کے جوڑے، نفرت سے اٹھا کر فرش پر پھینک دیے گئے۔ دوسری میں مختلف چھوٹے بڑے ڈبے، کسی میں دھاگے اور کسی میں بٹن۔ غصے سے انہیں بھی پھینکا گیا جو میٹ پر لوٹنیاں کھاتے پھرے۔ بیڈ کی درازوں کو کھولا گیا جن میں الم غلم بھرا ہوا تھا۔ کتابوں کے پاس حسیغم کا موبائل پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر جیب میں ڈالا گیا۔ انہیں کچھ نہیں مل رہا تھا۔ جھنجلاہٹ اور اضطراب ان کی حرکات سے مترشح تھا۔ خدا گواہ ہے اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ کہیں سے سات آٹھ ہزار روپیا ہی انہیں مل جائے تھوڑی سی تو ان کی تسکین ہو۔ بیڈروم سے تو ہاتھ جھاڑ کر نکلنے والی بات تھی۔ دونوں پھرتی ٹی وی لاؤنج میں آ کر کھڑے ہوئے۔ حسیغم والے کمرے میں منصور ماموں گہری نیند سو رہے تھے۔

''یہ کون ہیں۔'' استفسار ہوا۔

''میرے سسر ہیں۔'' پتا نہیں انہوں نے میرا جواب سنا یا نہیں، وہ اسٹور میں گھس گئے تھے۔

الماری کو کھولا۔ خانوں میں تہہ شدہ اور ہینگروں میں کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دفعتاً انہیں سیف نظر آیا۔ اسے کھولا۔ اندر لاک شدہ خفیہ خانے تھے۔ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی بھر جائے کچھ ایسی ہی کیفیت ان کے چہروں پر ظاہر ہوئی۔

''چابیاں کدھر ہیں؟ فوراً لاؤ۔''

میں بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یقین کرو مجھے نہیں پتا۔''

''الو کی پٹھی، بکواس کرتی ہو۔ کیسی بہو ہو؟ گھر میں رہتی ہو یا سرائے میں۔''

''میری ساس بہت dominating عورت ہے۔ میرے ہاتھ تو صرف روز کا خرچا پکڑاتی ہے۔ تم ان کے تالے توڑلو اللہ کرے اندر کچھ ہو۔''

سفید کپڑوں والے نے طیش میں پیٹی پر پڑے کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیوں کو اچھالا اور شعلے برساتی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہاں کیا فقیر رہتے ہیں؟ منگتوں کا گھر جان پڑتا ہے۔'' دو قدم آگے بڑھا کر پھر پلٹا۔ ''جی چاہتا ہے بٹ مار کر تمہارا سر پھوڑ دوں۔''

اور یہ خدا کا کس قدر احسان عظیم تھا کہ وہ گولی چلائے اور میرا بھیجا گن کی بٹ سے کھولے بغیر، جیسے آئے تھے ویسے چلے گئے۔

اور جب بہو کا موبوتشکر کی پھوار میں بھیگا میرے پورے وجود کو عجز کی صورت نمایاں کرتا تھا میں اٹھی بہو کے ماتھے پر شفقت بھرا بوسہ دے کر میں نے کتابوں کے ریک میں رکھے گئے لفافے کو ہاتھ کی پوروں سے چھو کر اس کے وہاں ہونے کے یقین کو مزید تقویت دیتے ہوئے کمر سیدھی کی۔ واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھی۔ چپ چاپ۔ ساکت بے حس و حرکت بہ ظاہر نظریں فریحہ کے چہرے پر جمائے... ہوئے تھی لیکن حقیقتاً کہیں بہت دور پیچھے گزرتے ہوئے وقت کی اس منزل میں پہنچی ہوئی تھی جہاں میں منصور سے کہہ رہی تھی۔

''اللہ اگر چور ڈاکو ہمارے گھر آ جائیں تو کیا کہیں گے کہ ہم کن فقیروں کے ہاں آ گئے ہیں۔''

کیا وقت کی ان لہروں میں کوئی جادوئی اثر تھا جنہوں نے لفظوں کو اپنی لپیٹ میں مدتوں جکڑے رکھا اور پھر ان کا سحر ختم ہوتے ہی کسی اور زبان سے فضا میں اچھال دیا۔

کیسی حیرت انگیز بات تھی۔

مسافت

جناب معراج رسول
السلام علیکم
انسان جب جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو وہ خود کو تباہی کے گرداب میں پھنسا لیتا ہے۔ یہ سچ بیانی بھی ایک ایسے ہی شخص کی ہے جس نے جھوٹ کا محل کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی مگر نتیجہ کیا نکلا؟ پڑھ کر آپ بھی میرے خیالات سے متفق ہو جائیں گے۔ لڑکی نے کیسا کرارا جواب دیا۔۔۔جس نے لڑکے کو دھوبی کا کتا بنا دیا۔

محمد فاروق انجم
(فیصل آباد)

اچانک شور سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹا کر سننے کی کوشش کی کہ یہ کیسا شور ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ صاف سنائی نہیں دے رہا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ نیند کا خمار ابھی پوری طرح سے اترا نہیں تھا اور دماغ بھی یکدم نیند سے بیدار ہونے پر پوری طرح سے کام نہیں کر رہا تھا۔ کچھ نیند کا خمار کم ہوا تو مجھے شور کی آوازیں واضح سنائی دینے لگیں۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بولنے والے تین چار مرد اور کچھ خواتین بھی تھیں جو ایک ساتھ لڑنے کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے لہجے تیز اور غصیلے تھے، ایک ساتھ بولنے سے مجھے کسی بات کی سمجھ آ رہی تھی اور کسی بات کی بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تیز، ملی جلی اور غصیلی آوازیں جو میری سماعت تک پہنچ رہی

تھیں وہ کچھ اس طرح سے تھیں۔

ہم یہاں انکار سننے نہیں آئے...... اور ہم تم لوگوں کے انتظار میں نہیں بیٹھے...... یہ ہمارا فیصلہ ہے اور تم لوگوں کو ہمارا فیصلہ ماننا پڑے گا...... ہم غلام نہیں ہیں کسی کے...... ہم اسے اُٹھا کر لے جائیں گے......

مجھے کسی بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی، باتیں تھیں اور شور تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور دیوار کے ساتھ کان لگا دیئے۔ دیوار کے ساتھ کان لگانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ ان کی آوازیں اور بھی تیز ہوگئی تھیں اور غصہ عروج پر تھا۔ پھر میں نے سنا کہ چچا جلال دین نے چیخ کر کہا کہ نکلو میرے گھر سے......

پھر ایک مردانہ آواز آئی ہے۔ "ہم جا رہے ہیں لیکن تجھے ہاں کرنی پڑے گی ورنہ اُٹھا کر لے جائیں گے۔"

اس کے بعد پھر جیسے آگ بھڑک اُٹھی ہو۔ تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہونے لگا اور شاید اس دوران چچا جلال دین نے انہیں گھر سے باہر نکال دیا تھا کیونکہ اب صرف چچا جلال کی آواز آرہی تھی جو غصے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل خاموشی ہوگئی اور ایسا سکوت چھا گیا جیسے ابھی چچا جلال کے ہاں کوئی جھگڑا ہوا ہی نہ ہو۔

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ میری نیند کوسوں دور چلی گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ میں بستر پر بیٹھ گیا اور پھر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

مجھے نیند تو نہیں آرہی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ چچا جلال کے گھر میں کون لوگ آئے تھے اور کس بات پر ان کے درمیان جھگڑا ہو رہا تھا؟

میرا تعلق ایک دور دراز گاؤں سے ہے۔ میں نے اپنی تعلیم اپنے گاؤں اور پھر وہاں سے پندرہ کلو میٹر دور واقع کالج میں مکمل کی تھی۔ میرے والد صاحب کی گاؤں میں تھوڑی سی زمین ہے، اس زمین پر میرے بھائی، والد صاحب کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ میں پڑھ لکھ گیا تھا اس لیے خواہش تھی کہ کہیں نوکری مل جائے۔ پہلے تو گاؤں کے آس پاس نوکری کی کوشش کی اور پھر اخبار میں اشتہار دیکھ کر میں نے شہر میں نوکری کی کوشش شروع کر دی۔

ایک دھاگے کی فیکٹری میں انٹرویو کے لیے کال آئی تو میں انٹرویو دینے شہر چلا گیا۔ شہر جانے سے قبل ابا نے مجھے ایک وزیٹنگ کارڈ دیا۔ وہ کارڈ منڈی میں بہت بڑے آڑھتی کا تھا۔ ابا اپنا مال ان کو ہی دیتے تھے۔ وہ ایک اچھے انسان تھے۔ ابا نے کہا کہ تم پہلے ان سے مل لینا شاید ان کی اس جگہ واقفیت ہو اور تمہیں نوکری ملنے میں آسانی ہو جائے۔

شہر آتے ہی سیدھا ان کی دکان پر پہنچا۔ انہیں جب میں نے اپنے والد صاحب کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور میری خوب آؤ بھگت کی۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ میں شہر کس مقصد کے لیے آیا ہوں۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی دھاگا فیکٹری میں ان کا بیٹا ایک اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ انہوں نے فوراً اسے فون کیا اور میں وہاں پہنچ گیا۔

جس پوسٹ کے لیے میں انٹرویو دینے گیا تھا وہ نوکری تو مجھے نہ ملی البتہ ان کے بیٹے نے مجھے کمپیوٹر سیکشن میں نوکری دلا دی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی اور میری خواہش کے مطابق کام تھا۔

شہر میں رہائش کا معاملہ ہوا تو میرا کولیگ نصیر جس کے ساتھ میری اچھی دوستی ہوگئی تھی وہ مجھے چچا جلال کے پاس لے گیا۔

چچا جلال ساٹھ سال سے زائد عمر کا توانا اور صحت مند شخص تھا۔ ان کا دھیما لہجہ اور انسان دوستی ان کی خوبی تھی۔ ان کے گھر کے ساتھ تھوڑی سی جگہ تھی جہاں ایک کمرا، باتھ روم اور چھوٹا سا کچن کے ساتھ صحن بھی تھا۔ آنے جانے کا راستہ الگ تھا۔ چچا جلال کو بھینسیں رکھنے کا بہت شوق تھا اس جگہ بھی انہوں نے بھینس ہی رکھی تھی لیکن جب بھینسیں شہر سے باہر رکھنے کا حکم جاری ہوا تو چچا جلال نے اپنا وہ شوق ہی ترک کر دیا اور اس جگہ کو سنوار کر کرایہ پر دے دیا مجھ سے پہلے اس جگہ ایک جوڑا رہائش پذیر تھا اور ان کے جانے کے بعد وہ جگہ خالی تھی اس لیے مختصر سی بات اور مناسب کرائے پر وہ جگہ مجھے مل گئی تھی۔

کیونکہ وہ تھوڑی سی جگہ تھی۔ وہاں دو میاں بیوی اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں گزارا کر سکتے تھے بڑے بچوں کے ساتھ وہاں رہنا ممکن نہیں تھا اس لیے وہ جگہ کسی کو کم ہی پسند آتی تھی اور ان میاں بیوی کے جانے کے بعد کئی ماہ سے خالی پڑی تھی۔ اسی وجہ سے وہ مناسب کرائے پر مجھے مل گئی تھی۔

چچا جلال کی بیوی بھی ان کی طرح بہت ہی اچھی نماتون تھیں۔ ان کا ایک بیٹا مراد تھا جو اکثر اپنے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر رہتا تھا۔ وہ مختلف شہروں سے سامان خریدتا تھا اور انہیں فروخت کرتا تھا۔

چچا جلال نے ایک دن بتایا تھا کہ ان کا بیٹا مراد ان پر بالکل بھی نہیں گیا۔ وہ غصے کا بہت تیز اور لمحوں میں فیصلہ کرنے والا ہے اور اپنا کیا ہوا فیصلہ وہ صادر کر کے اس پر قائم بھی رہتا ہے۔ ان کی ایک بیٹی بھی تھی جس کی نہ میں نے کبھی آواز سنی تھی اور نہ ہی شکل دیکھی تھی اور نہ میرے دل میں کبھی ایسی کوئی بات آئی تھی۔

چچا جلال اور ان کی بیوی کے ساتھ میری اکثر گپ شپ بھی ہونے لگی تھی۔ وہ میری طرف آجاتے تھے اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگتی تھیں۔ میں نے ان کو اپنے خاندان کے بارے میں بتادیا تھا۔ میرے گاؤں سے دس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک اور گاؤں تھا وہاں جلال دین کے کچھ رشتے دار بھی رہتے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ہمارے گاؤں میں کئی بار جا بھی چکے ہیں۔ چچا جلال نے ہمارے گاؤں میں موجود بھینسوں کے ایک بیوپاری کا بھی نام لیا تھا جنہیں میں بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔

میں صبح ساڑھے آٹھ بجے آفس چلا جاتا تھا اور شام کو واپسی پر گھر میں بند ہو جاتا تھا۔ دل چاہتا تھا تو خود پکا لیتا تھا ورنہ بازار سے کھالیتا تھا۔ کبھی کبھار چچا جلال یا ان کی بیوی کچھ کھانے کی چیز پلیٹ میں ڈھانپ کر مجھے دے جاتی تھیں۔ مراد سے میری ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت کم بولتا تھا لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ہی خوف سا آجاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ غصے میں گھور رہا ہو۔

مجھے اس جگہ رہتے ہوئے پانچ ماہ ہو گئے تھے۔ میں نے پہلی بار چچا جلال کے گھر میں اتنا شور سنا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا سو گیا کہ آخر چچا جلال کے گھر میں رات ڈیڑھ بجے کون لوگ جھگڑا کرنے آئے تھے؟

☆......☆

صبح میں آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ میرا موبائل فون بجنے لگا۔ اسکرین دیکھی تو گھر کا نمبر تھا۔ میں نے موبائل فون کان کو لگا کر ابھی ہیلو ہی کہا تھا کہ دوسری طرف سے میری ماں کی مسرت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مبارک ہو پتر...... ہم نے تیرا رشتہ طے کر دیا ہے......''

ماں کی پُرمسرت آواز میں خوشیوں کی کہکشاں بکھری ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں رشتہ طے کر دیا ہے؟''

''ہم نے تیرا رشتہ ثمینہ کے ساتھ طے کر دیا ہے......رات ہی ہاں ہوئی ہے۔ میں تو اسی وقت فون کر کے بتانا چاہتی تھی لیکن سوچا کہ تم سو گئے ہو گے خواہ مخواہ تمھاری نیند خراب ہو گی۔'' اماں خوشی سے نہال تھیں۔

ثمینہ میری ماموں زاد تھی۔ اماں کا ایک ہی لاڈلا بھائی تھا۔ اماں کی بڑی خواہش تھی کہ میری شادی ثمینہ کے ساتھ ہو جائے۔ اب جو اماں نے مجھے ثمینہ کے بارے میں بتایا تو اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

ثمینہ پانچ جماعت پاس تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ کے لگ بھگ تھا جبکہ اس کا رنگ سانولا اور نین نقش پُرکشش تھے۔ مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔

''پتر تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟'' اچانک اماں کی آواز آئی اور میں چونکا۔

''نہیں چپ تو نہیں ہوا۔''

''ہم نے ٹھیک کیا ہے ناں؟''

''آپ نے جو کیا وہ ٹھیک ہی کیا ہے۔'' میں ہولے سے مسکرایا۔ میں بہت پہلے یہ بات سوچ چکا تھا کہ میری شادی اماں، ثمینہ سے ہی کریں گی۔ کبھی کبھار میں اس کی تعلیم کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ اس کی تعلیم کم ہے پھر سوچتا کہ اگر تعلیم کم ہے تو کیا ہے، وہ گھر داری جانتی ہے، اسے اُٹھنے بیٹھنے کی تمیز ہے اور پھر یہ کہ وہ پُرکشش ہے۔

''اب تم ایسا کرو کہ کل چھٹی لے کر آجاؤ۔ ہم تمھاری منگنی کرنا چاہتے ہیں۔'' اماں نے کہا۔

''کل آجاؤں؟'' میں بولا۔ اپنی نوکری کے دوران میں نے ایک بھی چھٹی نہیں کی تھی ویسے بھی میں نے سوچا تھا کہ اس اتوار کو ساتھ ہی تین، چار چھٹیاں لے کر گاؤں رہ کر آؤں گا۔ اور اس سلسلے میں میں نے اپنے سینئر سے بات بھی کی تھی اور انہوں نے میرا ریکارڈ دیکھتے ہوئے رضامندی کا اظہار بھی کیا تھا۔

''ہاں کل......'' اماں نے اپنی بات پر زور دیا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' میں بولا۔

''کوشش نہیں تم کل آجانا۔'' اماں نے تاکید کی اور میں نے ان کو تسلی دی۔ کچھ باتوں کے بعد کال بند ہو گئی۔

میں ثمینہ کے خیالوں میں زیرلب مسکراتا ہوا تیار ہوا اور دفتر جانے کے لیے جیسے ہی باہر نکلا، چچا جلال کھڑے تھے۔

''دفتر جا رہے ہو؟'' چچا جلال کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''جی دفتر جا رہا ہوں۔'' میں نے ان کا جائزہ لیتے

ہوئے جواب دیا۔

"بیٹا اگر تم برا محسوس نہ کرو تو اپنے گھر کی چابی مجھے دو گے۔" چچا جلال نے کہا۔

"اس میں برا محسوس کرنے والی کون سی بات ہے۔ آپ چابی لے لیں۔" میں نے فوراً گیٹ کی چابی جو میرے ہاتھ میں تھی، وہ چچا جلال کی طرف بڑھادی۔

"بڑی مہربانی...... ہم شام کو بات کریں گے۔" چچا جلال کچھ عجلت میں تھے، میں نے بھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی اور بائیک پر بیٹھ کر چلا گیا۔

سارا دن آفس میں کام ہوتا رہا۔ اس دوران میں نے تین دن کی چھٹیاں بھی منظور کرالیں، اور چچا جلال کے بارے میں سوچتے ہوئے ثمینہ بھی کئی بار میری آنکھوں کے سامنے آئی۔

شام کو میں اپنے گھر پہنچا تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں ابھی بائیک کھڑی کرکے سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر تالا کیوں پڑا ہے، کہیں چچا جلال نے اچانک مجھے مکان سے بے دخل تو نہیں کردیا۔ اسی اثنا میں چچا جلال تیزی سے میری طرف آئے، انہوں نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے جیسے ہی بائیک اندر کی عقب سے چچا جلال نے دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈا لگادیا۔

"چچا جی خیر تو ہے؟" میں نے تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔

"خیر ہی تو نہیں ہے پتر۔" چچا جلال مجھے ایک طرف لے گئے۔ مکان کے اکلوتے کمرے کا دروازہ بند تھا۔

"ہم اس وقت ایک مصیبت میں مبتلا ہیں اور بہت پریشان ہیں۔" چچا جلال کو میں نے اس سے قبل کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ نگاہیں بھی دائیں بائیں گھوم رہی تھیں۔

"کیا بات ہے۔ مجھے بتائیں۔" میں نے کہا۔

"مراد کراچی گیا ہوا ہے۔ ہم نے اس سے ابھی رابطہ نہیں کیا۔ سوچا پتا نہیں وہ اپنے کام میں مصروف ہو اور ہماری بات سن کر بھاگتا ہوا آجائے۔ اس لیے ہم دونوں میاں بیوی نے بڑی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ جب تک مراد نہیں آتا ہم تم کو اپنا سہارا بنالیں۔" چچا جلال نے کہا۔

"آپ حکم کریں میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔ "بات دراصل یہ ہے۔ ایک سال قبل میں نے اپنی بیٹی رفعت کا رشتہ اپنے ایک رشتے دار کے بیٹے سے طے کردیا تھا۔ منگنی کو ایک سال ہوگیا تو مجھے پتا چلا کہ لڑکا کچھ غیر قانونی کام میں ملوث ہے۔ میں نے تحقیق کی تو بات صاف ہوگئی کہ وہ منشیات فروخت کرتا ہے اور ایک جرائم پیشہ گروہ کے لیے کام بھی کرتا ہے کئی بار جیل کی ہوا بھی کھا آیا ہے۔ ہم نے مشورہ کیا اور دو ماہ قبل منگنی ختم کردی۔"

چچا جلال چپ ہوگئے اور میں مزید جاننے کے لیے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولے۔ "ہمارا رشتہ ختم کرنا ان کو ہضم نہیں ہوا۔ پہلے تو وہ نرمی سے ہمیں زور دیتے رہے کہ ہم اپنا فیصلہ بدل لیں لیکن جب میں اور میرا بیٹا مراد اپنے فیصلے پر قائم رہے تو وہ چپ ہوگئے۔ ہمارا خیال تھا کہ انہوں نے ہمارا فیصلہ قبول کرلیا ہے۔ لیکن اچانک وہ رات میں آگئے۔ وہ مجھے اور میری بیوی پر زور دینے لگے کہ یہ منگنی قائم ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر رفعت کو اپنے بیٹے کی بیوی بنا کر ہی رہیں گے۔ ہمارے انکار پر اچھی خاصی بحث بھی ہوئی اور نوبت لڑائی تک بھی پہنچ گئی تھی۔ جاتے ہوئے وہ ہمیں دھمکی دے کر گیا ہے اگر ہم نے فیصلہ تبدیل نہ کیا تو وہ رفعت کو اُٹھا کر لے جائیں گے۔"

چچا جلال کہہ کر مضطرب انداز میں اپنے ہاتھ ملنے لگے پھر بولے۔ "صبح میں نے مراد کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ بندرگاہ پر مال اتر چکا ہے اور وہ اسے آج دیکھنے جائے گا۔ پھر جو مال اسے پسند آئے گا وہ اس کا سودا طے کرے گا۔ یعنی ابھی اسے مزید تین، چار دن لگیں گے۔ میں نے سوچا کہ بیٹا کام میں الجھا ہوا ہے، اس لیے رفعت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، تم نہیں جانتے کہ وہ غصے کا تیز ہے، اگر اسے میں بتادیتا تو وہ سارا کام چھوڑ کر واپس آجاتا اور ان کو سبق سکھادیتا کہ انہوں نے گھر آکر ہمیں دھمکی دینے کی جرأت کیسے کی۔"

"آپ نے ٹھیک کیا۔" میں نے ان کی بات سے اتفاق کیا۔

وہ بولے۔ "میں نے تم سے تمہارے مکان کی چابی اس لیے لی تھی کہ میں رفعت کو اس جگہ رکھ سکوں۔ میں نے باہر سے تالا لگادیا تھا اور سارا دن نگرانی کرتا رہا۔ رفعت اس وقت کمرے میں ہے۔" چچا جلال نے بتایا تو میری گردن غیر ارادی طور پر کمرے کی طرف گھوم گئی اور پھر میں نے چچا

جلال کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ”ہم دونوں میاں بیوی پریشان ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کریں۔ گھنٹا بھر پہلے فون آیا تھا۔ اس نے پھر دھمکی دی ہے کہ وہ اپنی منگ رفعت کو اُٹھا کر لے جائے گا سوچ رہا ہوں کہ مراد کو فون کر کے بلالوں۔“

چچا جلال اضطراب میں ٹہلنے لگے۔ وہ بے چین ہو گئے تھے۔ میں نے ایک لمحے میں سوچنے کے بعد کہا۔ ”اب اگر آپ اسے فون کریں تو سولہ، سترہ گھنٹے کا سفر ہے۔“

”یہی تو پریشانی کی بات ہے۔ اب کیا کروں میں۔ رفعت کو کہاں لے جاؤں۔“ چچا جلال کی پریشانی ان کے چہرے سے اور بھی عیاں ہو گئی تھی۔ میں نے ان کا جائزہ لیا اور ساری صورتِ حال کا یہ نتیجہ نکالا کہ چچا جلال اپنی بیٹی کے لیے بہت پریشان ہیں۔

”کیوں نہ ہم پولیس سے مدد مانگ لیں۔“ میں بولا۔

”اسی لیے مجھے مراد کا انتظار ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ اس کے تعلقات بھی ہیں۔ اس کے آنے سے پہلے میں کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ بس یہ چاہتا ہوں کہ دو دن تک رفعت کہیں محفوظ ہو جائے۔“ چچا جلال نے کہا۔

میں بھی سوچنے لگا کہ اس کا کیا حل ہو سکتا ہے۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ”چچا ایک بات ذہن میں آئی ہے۔“

”ہاں ہاں جلدی بولو کیا بات ذہن میں آئی ہے۔“ چچا جلال نے جلدی سے میری طرف دیکھا۔

”میں تین دن کے لیے گاؤں جا رہا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو رفعت کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ وہ اس جگہ بالکل محفوظ رہے گی اور جیسے ہی مراد آجائے آپ میرے ساتھ رابطہ کرلیں۔“

میری بات سن کر چچا جلال کی آنکھوں کی چمک دو چند ہو گئی۔ ”تم کب جا رہے ہو؟“

”میں نے چھٹیاں تو لے لی ہیں کل منہ اندھیرے نکل جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر تم کل کیوں نکلو گے۔ آج رات ہی نکل جاؤ۔ رفعت کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ وہ گاؤں میں بالکل محفوظ رہے گی۔ بلکہ تم اسے اپنے گاؤں لے جاؤ میں اپنے رشتے داروں کو فون کر دوں گا۔ وہ تمہارے گھر سے رفعت کو اپنے پاس لے جائیں گے۔“ چچا جلال فوراً میری بات سے متفق ہوتے ہوئے بولے۔

”چچا اب ہمیں اتنا بھی غیر نہ سمجھیں کہ ہم رفعت کی مہمان نوازی نہیں کر سکتے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں شکوہ کیا۔

”ایسی بات نہیں ہے میرا مطلب ہے کہ رفعت میرے رشتے داروں کے پاس چلی جائے گی۔“

”میں آپ کو چچا کہتا ہوں۔ میرے گھر میں میرے والدین، بھائی ان کی بیویاں رہتی ہیں۔ وہ سب غیر نہیں ہیں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ بہر حال جیسا تم مناسب سمجھو۔ مجھے تمھاری بات سے اتفاق ہے۔ تم رات ہوتے ہی گاؤں کے لیے نکل جاؤ۔ مجھے ڈر ہے کہ آج رات کچھ ہو نہ جائے۔“

”ٹھیک ہے میں رات کو ہی نکل جاتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیونکہ صبح اُٹھ کر جانا تو ہے ہی کیوں نہ ابھی چلا جاؤں اور چچا جلال کی پریشانی بھی کم ہو جائے گی۔

مجھے اپنا سامان پیک کرنا تھا۔ چچا جلال نے رفعت کو آواز دی تو وہ چادر میں لپٹی کمرے سے باہر آ گئی۔ میں نے سامان پیک کیا اور باہر آ گیا۔ رفعت دوبارہ اندر چلی گئی۔ چچا جلال بھی اپنے گھر چلے گئے۔ پندرہ منٹ میں وہ ایک چھوٹا سا بیگ اُٹھائے آ گئے۔ اس میں رفعت کا سامان تھا۔ ساتھ چچا جلال کی بیوی بھی تھیں۔ وہ کمرے میں چلی گئیں۔

رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے تھے۔ سردیوں کی رات تھی اس لیے ایسا لگتا تھا جیسے بہت رات ہو گئی ہو۔ گلی بھی سنسان تھی۔ چچا جلال نے اپنے واقف رکشا ڈرائیور کو بلایا تھا جو چچا جلال کی ہدایت پر رکشا پیچھے کھڑا کر کے اس گھر تک آیا تھا۔

چچا جلال نے رکشا ڈرائیور سے کہا کہ وہ رکشا میں جا کر بیٹھے۔ اس کے جانے کے بعد چچا جلال نے باہر کا جائزہ لیا اور رفعت کو لے کر اس طرف چل پڑے جہاں رکشا کھڑا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد میں بھی پیچھے چل پڑا۔

رکشا ایک طرف اندھیرے میں کھڑا تھا۔ رفعت اور چچا جلال رکشا میں بیٹھ چکے تھے۔ میں بھی رکشے میں سوار ہو گیا۔ رکشے والے نے رکشا اسٹارٹ کیا اور محلے سے نکل پڑا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہم لاری اڈے پر موجود تھے۔ میں نے جا کر دو ٹکٹ لیں۔ بس چلنے ہی والی تھی۔ ہم

دونوں بس میں سوار ہوگئے۔

رفعت کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ میں اس کے برابر میں براجمان ہوگیا تھا۔ رفعت پوری طرح سے چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور نقاب اس طرح سے لیا ہوا تھا کہ فقط آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے ایک بار بھی اس کی طرف غور سے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے رفعت کو بحفاظت گاؤں تک پہنچانا تھا۔ جب تک بس نہیں چلی تھی چچا جلال اسی جگہ بے چینی سے ٹہلتے رہے تھے۔ پھر بس چلی تو بھی چچا جلال جاتی ہوئی بس کو دیکھتے رہے تھے۔ بس رفتہ رفتہ شہر سے باہر نکلی اور سڑک پر جاتے ہی اس نے رفتار پکڑلی۔

☆......☆

ہم اس شہر سے بہت دور نکل آئے تھے۔ راستے میں چچا جلال کے مجھے کئی فون آچکے تھے کیونکہ لڑکے کا باپ کچھ رشتے داروں کے ساتھ آکر ان کے گھر ہنگامہ آرائی کرکے گیا تھا۔ میں نے چچا جلال کو تسلی دی تھی کہ ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے چچا جلال کے لہجے سے محسوس ہوا تھا کہ اب وہ اتنے فکرمند نہیں ہیں۔

رات کے سوا دس بجے کا وقت تھا۔ بس اپنی رفتار پر دوڑ رہی تھی۔ بس میں تقریباً خاموشی تھی۔ رفعت کھڑکی کے ساتھ لگی بیٹھی تھی اور وہ مسلسل باہر دیکھے جارہی تھی میں بھی اپنے دھیان میں بیٹھا تھا، موبائل فون پر گیم کھیل رہا تھا۔ ہم دونوں نے آپس میں ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ مجھے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی اور پھر میرے ذہن میں ایک بار بھی رفعت سے بات کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بہت سا سفر ثمینہ کے خیالوں میں بھی گزر گیا تھا کہ اچانک بس کی رفتار آہستہ ہونے لگی اور پھر ڈرائیور نے بس سڑک کنارے روک کر اپنے کنڈیکٹر سے کہا۔ ”اس ٹائر میں دیکھو ہوا کم تو نہیں ہے؟“

کنڈیکٹر نیچے اترا اور پھر اس کی تیز آواز آئی۔ ”ٹائر پنکچر ہے......“

اس کی آواز سنتے ہی ڈرائیور بس سے نیچے اتر گیا۔ ساتھ ہی مسافر بھی نیچے اترنے لگے۔ میں بھی اپنی سیٹ سے اُٹھا اور بس سے باہر نکل گیا۔ باہر سردی تھی اور ویران جگہ پر کچھ زیادہ ہی سردی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ دونوں ٹائر بدلنے کی تیاری کررہے ہیں۔ میں ایک طرف ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر بس کسی چائے کے کھوکھے کے پاس رکتی تو اس دوران ایک کپ چائے پی لیتا۔ بس تقریباً مسافروں سے خالی ہوچکی تھی شاید چند مسافر جن میں خواتین زیادہ تھیں وہ اندر موجود تھیں۔

میں ابھی ایک طرف کھڑا دائیں بائیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہیں جہاں تھیں اسی جگہ منجمد ہوگئیں۔ مجھے لگا جیسے میں کچھ اور دیکھنا ہی بھول گیا ہوں۔

رفعت نقاب ہٹا کر اُسے دوبارہ اپنے چہرے پر ٹھیک سے باندھنے میں مصروف تھی ایک جھلک نظر آئی تھی مگر میں اس کے حسن میں کھوگیا تھا۔ مجھے لگا جیسے زمین پر چاند اُتر آیا ہو۔ وہ اتنی حسین تھی کہ میری خیرہ نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ رفعت کو قدرت نے حسن سے ایسا مالا مال کیا تھا کہ میں نے اس سے پہلے ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

رفعت نے اپنا چہرہ دوبارہ نقاب کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ اور میں اسی جگہ مبہوت کھڑا تھا۔ میرے تو گمان میں بھی نہیں تھا کہ رفعت اتنی خوبصورت ہوگی۔

بس کا ٹائر بدل دیا گیا اور مسافر پھر سے بس میں سوار ہونا شروع ہوگئے تھے۔ میں رفعت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بس چل پڑی۔ رفعت مجھ سے بے نیاز کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی اور اب میری کوشش تھی کہ کسی طرح سے رفعت مجھ سے بات کرے۔ کیونکہ رفعت کا چہرہ میری آنکھوں میں بس گیا تھا اور جس ثمینہ کے لیے میں گاؤں جارہا تھا۔ وہ سانولی سی لڑکی مجھے کالی نظر آنے لگی تھی۔ اس کا پُرکشش چہرہ مجھے بدصورت دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ پانچ جماعت پڑھی لڑکی اب میری نظر میں جاہل تھی اور میں پڑھا لکھا نوجوان اس سے منگنی کرکے اپنی زندگی برباد کرنے جارہا تھا۔ یکدم سے ثمینہ میں مجھے کئی برائیاں دکھائی دینے لگی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مجھ جیسے پڑھے لکھے اور خوبصورت نوجوان کی بیوی رفعت ہونی چاہیے۔

یہ فتور اچانک میرے دل و دماغ پر آتے ہی مجھ پر غالب ہوگیا۔ میری سوچ میں تغیر آگیا تھا اور اب میں سوچنے لگا تھا کہ رفعت میرے ساتھ بات کرے اور ہم دونوں میں کسی طرح سے نزدیکی پیدا ہوجائے۔ میرے اندر کی مثبت سوچ نے دم توڑ دیا تھا اور میرا دماغ منفی رجحان کی طرف گامزن ہوگیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ رفعت سے بات کیسے کروں۔ کچھ سوچنے کے بعد میں نے جھک کر پوچھا۔
''بھوک تو نہیں لگ رہی......؟''
''نہیں۔'' رفعت نے میری طرف دیکھے بغیر مختصر جواب دیا۔
''ہم جلدی نکل آئے تھے اور آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا۔'' میں نے بات آگے بڑھانا چاہی۔
''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ اسی انداز میں بولی۔
''آگے چھوٹا سا بازار آئے گا اور بس وہاں رکے گی۔ وہاں سے کھانے پینے کا سامان مل جاتا ہے۔'' میں بولا۔ وہ میری بات سن کر چپ رہی۔
ہم دونوں کے درمیان پھر خاموشی حائل ہوگئی۔ میں نے پھر بات کا آغاز کیا۔ ''رفعت......''
شاید میرے اس طرح سے مخاطب کرنے سے وہ یکدم سی چونکی۔ اس نے محض اپنی نگاہیں کھڑکی سے ہٹائی تھیں میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میں بولا۔ ''رفعت تم خوفزدہ تو نہیں ہو......؟'' میں 'آپ' سے 'تم' پر آگیا تھا۔
اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر جواب دیا۔ ''کس بات کا خوف......؟''
''یہ کہ کہیں وہ لوگ نہ آجائیں۔'' میں نے کہا۔
''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔
''ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ تمھاری حفاظت کی ذمہ داری اب میری ہے۔ ویسے بھی ہم دور نکل آئے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ وہ میری بات سن کر چپ رہی اور باہر دیکھنے لگی۔
آگے ایک چھوٹا سا شہر آگیا تھا جس کا ایک ہی بازار تھا، وہاں رات گئے تک بسیں رکتی تھیں اس لیے وہاں پر مسافروں اور اشیا فروخت کرنے والوں کا رش رہتا تھا۔ اس وقت بھی اس جگہ کافی رش تھا۔ سامان بیچنے کے لیے آوازوں کی کھچڑی پک رہی تھی۔ بس اس جگہ پندرہ منٹ رکتی تھی۔
''میں کیا لے کر آؤں......؟ کیا کھانا پسند کرو گی۔'' میں نے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''کچھ تو کھالو...... میں برگر لے آتا ہوں، لیکن شاید اس جگہ کے برگر اچھے نہ ہوں اس لیے میں کچھ پھل لے آتا ہوں۔'' میں کہہ کر بس سے نیچے اتر گیا۔
میں پھل خریدتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ رفعت میری عمر بھر کی ہمسفر بن جائے۔ ایسا حسن کسی اور کی دہلیز پر نہ جائے۔ میری عجیب کیفیت ہوگئی تھی کہ اسے پانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوگیا تھا۔ اسے پانے کے لیے میرے پاس وقت بھی کم تھا۔ اگر میں رفعت کو لے کر گاؤں پہنچ جاتا ہوں تو پھر رفعت کو پانا میرے لیے مشکل ہوسکتا تھا۔ کیونکہ وہاں سب میری منگنی کی تیاری کرچکے تھے اور میں مجبور ہوجاتا۔ اس لیے مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ اپنے گاؤں پہنچنے سے قبل کرنا تھا۔ اس لیے میرا دماغ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔
پھل لے کر جیسے ہی میں بس کی طرف بڑھا میرے دماغ میں شبیر کا خیال کسی بجلی سی تیزی سے آیا۔
شبیر ہمارے گاؤں میں رہتا تھا لیکن غلط لوگوں کی دوستیوں نے اسے غلط راہ پر گامزن کردیا تھا۔ گاؤں میں وہ میرا سب سے پکا دوست تھا۔ لیکن اس کی حرکتوں کی وجہ سے ابا جی نے شبیر سے ملنے پر پابندی عائد کردی تھی۔ پھر بھی ہم چوری چھپے ملتے تھے اور گپ شپ لگاتے تھے۔
ایک بار جب شبیر کسی جرم کی وجہ سے پولیس کو مطلوب ہوا اور اس کی تلاش میں رات کو پولیس گاؤں میں آئی۔ شبیر کو اس بات کا پہلے سے علم تھا۔ اس نے فوراً مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے اسے اپنے بڑے سے گھر میں پناہ اس طرح سے دی کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ پولیس اسے تلاش کرنے کے بعد چلی گئی اور شبیر منہ اندھیرے میرا احسان مان کر اس گاؤں سے چلا گیا۔
شبیر کچھ عرصہ روپوش رہا تھا اور پھر اچانک وہ نمودار ہوا تو اسے پولیس کا کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ وہ کسی بڑے سیاست داں کا بازو بن گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے ساتھ والے گاؤں میں ڈیرہ بنالیا تھا۔ میں ایک دوبار وہاں گیا تھا اور شبیر نے میری خوب خدمت کی تھی۔
شبیر کا خیال آتے ہی ایک کھیل مجھے سوجھا......اس کھیل کو کھیل کر میں رفعت کو اپنی بیوی بنا سکتا تھا۔ اس وقت میرا دماغ خوب کام کررہا تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر شیطانیت چھائی ہوئی تھی۔
میں نے پھلوں کا شاپر رفعت کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''یہ لوتم کھاؤ۔ میں باہر کھڑا ہوں۔''
رفعت نے دودھ جیسا ہاتھ نکال کر مجھ سے شاپر لے لیا اور میں پھر بس سے نیچے اتر آیا۔ میں نے اپنا موبائل فون

نکالا اور نمبر نکالا۔ نمبر ملا کر میں نے فون کان سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شبیر کی بے تکلف آواز میری سماعت میں پڑی۔ ''ارے جان جگر...... کیا حال ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔'' میں ایک طرف جہاں شور قدرے کم تھا وہاں ٹہلتے ہوئے پہنچ گیا۔

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ مزے میں ہوں۔'' وہ چہکا۔

''کہاں ہو......'' میں نے پوچھا۔

''اپنے ڈیرے پر ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارے پاس آنا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی آنا ہے؟'' وہ ایک دم سے بولا۔

''ہاں ابھی آنا ہے۔'' میں نے ایک نظر بس کی طرف دیکھا جہاں رفعت اپنی جگہ پر براجمان سیب کھا رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی چادر کا پلو بھی پکڑا ہوا تھا جیسے پردہ کیے ہوئے ہو لیکن اس کا چہرہ کھڑکی کی طرف سے واضح نظر آ رہا تھا، میں ایک بار پھر اس کے حسن میں کھو گیا۔ وہ سنگ مرمر کی بنی گڑیا میرے دل کو مضطرب کر رہی تھی۔

''خیر ہے۔ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے تو مجھے بتاؤ میں ابھی آ جاتا ہوں۔'' شبیر نے فوراً فکرمندی سے کہا۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، خیر ہے۔ آ کر بتاؤں گا۔ سوا گھنٹے کا سفر...... باقی رہ گیا ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' میری نگاہیں بدستور رفعت کی طرف تھیں۔

''آ جاؤ میں انتظار کر رہا ہوں۔ بلکہ ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد میرے بندے گاڑی لے کر گاؤں کی سڑک پر ہوں گے۔'' اس نے کہا۔ اس کا گاؤں کیونکہ برلب سڑک تھا اور بس اسی جگہ رکتی تھی اور پھر گاؤں کی آبادی کی طرف دائیں جانب سڑک نکلتی تھی۔

''بہت بہتر۔'' میں نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

جب میں اپنی سیٹ پر پہنچا تو رفعت نقاب کیے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بس چل پڑی۔ بس کی رفتار تیز تھی۔

میں نے اپنا چہرہ رفعت کے کان کے پاس لے جا کر سرگوشی کی۔ ''میں نے کچھ مشکوک لوگ دیکھے ہیں۔''

میری بات سنتے ہی وہ یکدم سے چونکی اور اس نے پہلی بار میری طرف دیکھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ نقاب کے پیچھے تھا اور نقاب میں سے اس کی مخمور کر دینے والی آنکھیں میری طرف متوجہ تھیں۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ میری بات سن کر مضطرب ہو گئی ہے۔

''میں نے دیکھا کہ دو آدمی اس بس میں جھانک رہے تھے۔ تم نقاب میں تھی شاید وہ پہچان نہیں سکے۔ یا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے تمہیں پہچان لیا ہو۔'' میں نے اپنے کھوٹ سے بھرے دل کے ساتھ اسے ڈرایا۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس کی آواز نے مجھ پر سحر طاری کر دیا۔

''تم فکر نہیں کرو۔ تمھاری حفاظت کا ذمہ میں نے لیا ہے۔ بس ذرا احتیاط سے کام لینا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔ ''اب ہم گاؤں نہیں جائیں گے۔''

اس بار بھی وہ چونکی اور اس نے فوراً میری طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں سوال تھا جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ پھر کہاں جانا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سوال پڑھ لینے کے باوجود چپ سادھے رکھی۔ میں اس کی مترنم آواز سننا چاہتا تھا۔ میری خاموشی کو دیکھ کر اس نے وہی سوال کیا جو اس کی آنکھوں میں تھا۔

''پھر کہاں جانا ہے......؟''

''میں نے سوچ لیا ہے۔ بس تم اطمینان رکھو۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ پھر چپ ہو گئی۔ بس رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ رات کا اندھیرا دور تک چھایا ہوا تھا جسے بس کی طاقتور ہیڈ لائٹس معدوم کر رہی تھی۔

میرے گاؤں سے پہلے میرے دوست شبیر کا گاؤں آتا تھا جہاں اس کا ڈیرہ تھا۔ میں نے اُٹھ کر کنڈیکٹر کو آہستہ سے بتا دیا کہ مجھے اس گاؤں میں اترنا ہے۔ پھر میں نے شبیر کو کال کر کے بتایا کہ ہم دس منٹ میں بس سے اتر رہے ہیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے رفعت سے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ ہماری بس کا پیچھا ہو رہا ہے۔''

''کیا......؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے شک ہے کہ ایک کار اس بس کے پیچھے مسلسل آ رہی ہے۔ آگے گاؤں آ رہا ہے۔ میں نے اپنے دوست کو فون کر دیا ہے۔ اس کی کار وہاں کھڑی ہوگی۔ بس تم نے یہ کرنا ہے کہ بس سے اترتے ہی کار میں بیٹھ جانا ہے۔'' میں نے اسے کہا۔

"پھر ہم کہاں جائیں گے۔" اس نے پوچھا۔

"اس گاؤں میں میرے دوست کا گھر ہے۔ فی الحال ہم وہاں رہیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ ابو کو فون کر کے بتائیں کہ کوئی ہمارے پیچھے ہے۔" اس نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھ پر بھروسا رکھو۔" میں نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔

وہ چپ ہوگئی اور اس دوران بس رک گئی۔ ہم دونوں جلدی سے اُٹھے اور بس سے باہر نکل آئے۔ وہاں میرے دوست کا ڈرائیور کار لیے کھڑا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے آشنا تھے۔ اتفاق سے دور کوئی کار، یا ویگن آتی دکھائی دی۔ اس کی جلتی ہوئی ہیڈ لائیٹس کی طرف ایک نظر رفعت نے بھی دیکھا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا کہ رفعت کا ڈر اور خوف اس سے مزید مضبوط ہو جائے گا۔

ہم دونوں کار کی طرف بڑھے اور رفعت مجھ سے بھی پہلے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔

گاؤں کی طرف جاتی سڑک مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کار کی ہیڈ لائیٹس سے ہی سامنے دیکھا جا سکتا تھا جبکہ دائیں بائیں جو فصلیں تھیں وہ اندھیرے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ کار تیزی سے شبیر کے ڈیرے پر پہنچ گئی۔ ڈیرے کے ساتھ ہی اس کا گھر تھا۔ جہاں اس کی بیوی رہائش پذیر تھی۔

شبیر میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مجھے پُرتپاک انداز میں ملا۔ ایک ملازمہ رفعت کو اس کی بیوی کے پاس لے گئی۔ ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر کھانے پینے کا سامان آ گیا اور اس کے بعد چائے کا دور چلنے لگا اور اس دوران میں نے کہا۔ "اس لڑکی کا نام رفعت ہے اور یہ چند دن تمہارے پاس مہمان رہے گی۔"

"جب تک چاہے رہے......" شبیر نے کہتے ہوئے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ جاننا چاہتا ہو کہ یہ لڑکی کون ہے۔ اور رات کے اس وقت اسے کہاں سے لے کر آئے ہو۔ میں سب کچھ بس میں سوچ چکا تھا اس لیے خود ہی بولا۔

"تم کیونکہ میرے دوست ہو اس لیے میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ رفعت کی ماں مر چکی ہے اور اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اس کی سوتیلی ماں اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کرنا چاہ رہی تھی جو عمر میں بڑا اور عیاش شخص ہے۔ میں اس کی آمادگی پر اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آیا ہوں۔ لیکن ابھی اپنے والدین کو بتا نہیں سکتا کہ یہ کون ہے اور کیوں ساتھ لایا ہوں اس لیے یہاں چھوڑ کر اپنے گاؤں جا رہا ہوں کہ پہلے اس کے بارے گھر بات کر لوں پھر اسے ساتھ لے جاؤں۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے بےپروائی سے کہا۔

"اس بات کا ذکر تم رفعت سے نہ کرنا۔ اور نہ ہی بھابی اس سے اس بارے میں پوچھے۔ بھابی اگر اس بارے میں رفعت سے کچھ پوچھے گی، تو مجھے یقین ہے کہ وہ صحیح نہیں بتائے گی، شاید کوئی اور ہی کہانی بیان کر دے۔" میں بولا۔

"تم نے بتا دیا، ہم اس سے کیوں پوچھیں گے۔ وہ ہمارے گھر میں مہمان ہے۔ جب تک تم چاہو گے وہ یہاں رہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"اگر ایسی غیروں والی بات کرنی ہے تو ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔" اس نے مجھے پیار سے ڈانٹا اور میں نے ہنس کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

☆......☆

رات میں اپنا موبائل فون بند کر کے مزے سے سو گیا۔ باتوں باتوں میں میں نے شبیر سے یہ پوچھ لیا تھا کہ اس کی بیوی کے پاس موبائل فون تو نہیں ہے۔ شبیر نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے گھر کے اندر کوئی فون اور موبائل فون نہیں رکھا ہوا۔ مجھے اب مکمل اطمینان ہو گیا تھا کیونکہ اب رفعت کسی سے رابطہ نہیں کر سکتی تھی۔

صبح میں نے شبیر کے ساتھ پُرتکلف ناشتا کیا۔ اور پھر میں نے شبیر سے کہا میں رفعت سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کی ملازمہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔

وہ کمرا رفعت کو رہنے کے لیے دیا گیا تھا۔ شبیر نے اپنی ملازمہ کے ذریعے سے رفعت کو یہ پیغام نہیں بھجوایا تھا کہ میں اس سے ملنے آ رہا ہوں بلکہ میری بات سنتے ہی اس نے ملازمہ کو بلا کر حکم دیا تھا کہ وہ مجھے رفعت کے پاس لے جائے۔ مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے میں رفعت ہے۔ میں سمجھا تھا کہ مجھے جس کمرے میں لے جایا جا رہا ہے وہاں رفعت آئے گی۔

اب جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا، میں ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے پلنگ پر رفعت بیٹھی تھی۔ اس کے بال کھلے

ہوئے تھے اور چہرہ کسی بھی نقاب اور دوپٹے سے عاری تھا۔ اس کا سفید اور پُرکشش رنگ اور ایسی خوبصورتی کہ میری نظر میں اس سے زیادہ کوئی حسین ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے ہی رفعت نے مجھے اچانک کمرے میں دیکھا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی اور جلدی سے دوپٹا تلاش کرنے لگی۔ اس نے دوپٹا لیا اور سر پر اوڑھ کر نقاب کر لیا۔

میں آگے بڑھا۔ ”مجھ سے اتنا پردہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں غیر نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے تمھاری حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔“

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا اور ابھی تک مجھ پر اس کی خوبصورتی کا سحر تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اسی کمرے میں اس کے پاس بیٹھ جاؤں اور اس کا ہاتھ تھام کر کہوں۔ ”چلو ہم ابھی اور اسی وقت شادی کرلیں۔“

میں جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں تھا۔ میری شادی اس کے ساتھ آسانی سے نہیں ہوسکتی تھی اس کے لیے مجھے اس سوچ پر عمل کرنا تھا جو میں نے سوچ رکھی تھی۔

میں بولا۔ ”میں گاؤں جا رہا ہوں۔ تم ایک دن یہیں رہو گی۔ تمھیں ساتھ لے جانا مسئلہ ہے۔ کیونکہ تمھاری تلاش میں وہ یہاں تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ تم میرے ساتھ کیوں آئی ہو، کوئی بھی جھوٹ بول دینا۔ کہہ دینا کہ سوتیلی ماں کے ظلم ستم سے جان چھڑا کر آئی ہوں...... میں چچا جلال سے بات کرکے تمھیں لے آؤں گا۔“

میں کہہ کر چپ ہوگیا اور وہ بھی خاموش بیٹھی رہی۔ میں کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر ’خدا حافظ‘ کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ نقاب کے بغیر، آسمان پر چمکتے پورے چاند کی مانند تھا۔ نگاہوں سے محو نہیں ہو رہا تھا۔ اسے پانے کی چاہ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ دل میں شیطانیت کنڈلی مار کر بیٹھ گئی تھی کہ رفعت ہوگی تو میری ہوگی...... ورنہ کسی کی نہیں ہوگی۔

میں نے شبیر سے جانے کی اجازت لی اور اسے تاکید کی کہ وہ رفعت کا خیال رکھے۔ مجھے شبیر کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔ میں بس میں بیٹھ کر اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا تھا حالانکہ شبیر نے مجھے بہت کہا کہ اس کا ڈرائیور گاؤں چھوڑ آتا ہے لیکن میں نے منع کر دیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو پتا چلے کہ میں نے رات شبیر کی طرف گزاری تھی۔

اپنے گاؤں پہنچا تو اچانک یاد آیا کہ رات سے میرا موبائل بند ہے۔ میں نے موبائل فون آن کیا اور اسے جیب میں ڈال لیا۔ ابھی تانگے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اچانک بیل ہونے لگی۔ اسکرین پر چچا جلال کا نمبر تھا۔ میں نے فون کان سے لگا لیا دوسری طرف سے اچانک گھبرائی ہوئی چچا جلال کی آواز آئی۔

”میں رات سے فون کر رہا تھا۔ کیا بات ہے خیر تو ہے......“

”آپ سنائیں چچا کیا حال ہے۔“ میں نے جواب دینے کی بجائے حالات سے آگہی چاہی۔

”یہاں خیر نہیں ہے۔ آدھی رات کو وہ لوگ آگئے تھے۔ شکر ہے کہ میں رفعت کو تمہارے ساتھ بھیج چکا تھا۔ بہرحال بہت منہ ماری ہوئی اور گلی کے لوگ جمع ہوگئے تو انہیں جانا پڑا لیکن وہ دھمکی دے کر گئے ہیں کہ رفعت کو وہ اپنے گھر کی بہو بنا کر رہیں گے۔ تم بتاؤ رفعت ٹھیک ہے۔ تم لوگ گاؤں پہنچ گئے ہو۔“ چچا جلال نے کہا۔

”ہاں...... سب ٹھیک ہے...... میں بعد میں فون کرتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔“ میں بولا اور فون بند کردیا۔

میں تانگے پر سوار ہوگیا اور اپنے گھر پہنچ گیا۔ سب نے میرا خوب استقبال کیا اور میری ماں بار بار میرا ماتھا چومنے لگی۔ پورے گھر میں میرے آنے سے خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد گھر والے میرے اردگرد جمع ہوگئے ماں خوشی سے بتانے لگیں۔

”ہم نے منگنی کی ساری تیاری کرلی ہے۔ کل دوپہر کو ہم منگنی کرنے جائیں گے اور پھر اگلے دن وہ لوگ ہماری طرف رسم کرنے آئیں گے۔“

”میں تو کہتا ہوں کہ تم شہر کی نوکری چھوڑ کر یہاں ہمارے ساتھ رہو۔ کھاد کی ایجنسی لے دیتا ہوں۔ اپنا کاروبار کرنا۔“ ابا بولے۔

”تیرے ابا ٹھیک کہتے ہیں۔ مفت میں کام کرتے ہو اور ہم سے دور بھی رہتے ہو۔“ اماں نے فوراً کہا۔

”مفت میں تھوڑی کام کرتا ہوں اماں۔ تنخواہ لیتا ہوں۔“ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”آگ لگے ایسی تنخواہ کو جو ایک ماں سے اس کا بیٹا دور کردے۔“ اماں نے ہاتھ جھٹکا۔

”شہر کون سا دور ہے۔“ میں بولا۔

''بیٹا دروازے سے اوجھل ہو جائے تو ماں کے لیے وہ دوری بھی برداشت نہیں ہوتی۔ بس اب تم یہیں رہنا۔'' اماں نے کہا۔

''اماں اسے وہ انگوٹھی تو دکھاؤ جو تم اس کی ثمینہ کے لیے لائی ہو۔'' اچانک میری بڑی بھابی بولیں تو اماں نے خوش ہو کر انگوٹھی نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے انگوٹھی کی طرف دیکھا اور سوچا کہ یہ انگوٹھی رفعت کے ہاتھ میں کتنی اچھی لگے گی۔

وہ سب ثمینہ کی باتیں کر رہے تھے اور میں رفعت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہے اور میں رفعت کے خیالوں میں گم ان سے بہت دور تھا۔

دوپہر کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا تو اماں صحن میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ میں نے پاس جا کر پوچھا۔ ''کہاں چلے گئے سب...... بڑی خاموشی ہے۔''

''سب بازار گئے ہیں۔'' اماں نے بتایا۔

میرے لیے اچھا موقع تھا۔ میں اماں کے پاس بیٹھ گیا اور دائیں بائیں کی باتوں میں کہا۔ ''اماں آپ جانتی ہو کہ میری تعلیم کتنی ہے؟''

''جانتی ہوں...... بہت پڑھ لکھ گیا ہے تو۔'' اماں نے سادگی سے میری طرف دیکھا۔

''میں انگریزی میں لکھی بڑی بڑی کتابیں ایسے پڑھتا ہوں جیسے یہ میری زبان میں لکھی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتی ہوں۔'' اماں نے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

''آپ نے کبھی سوچا کہ ثمینہ کو تو اردو ٹھیک طرح سے پڑھنی نہیں آتی۔'' میں بولا۔

''ہم نے کون سا ثمینہ کو اسکول میں استانی لگوانا ہے۔'' اماں نے بے پروائی سے کہا۔

''ثمینہ کی تعلیم نا ہونے کے برابر ہے۔ وہ کالی سی ہے اور میں گورا چٹا ہوں......'' میں نے ابھی اپنی بات مکمل نہیں کی تھی کہ اماں کی متانت سے بھری نگاہیں اپنی جانب مبذول پا کر میں چپ ہو گیا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اماں نے پوچھا۔

''ثمینہ...... کی شادی کسی ایسی جگہ ہونی چاہیے جو اس جیسا ہو۔ جس کی تعلیم ثمینہ جتنی ہو۔ جو اسی گاؤں کا رہنے والا ہو اور......''

''تم جانتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟'' اماں نے ایک دم سے درشت لہجہ اپنا لیا۔ ''خبردار جو تم نے اب کوئی ایسی بات کی۔''

''میں ثمینہ سے منگنی نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے دوٹوک کہہ دیا۔ میری بات سن کر اماں دم بخود میری طرف دیکھنے لگیں۔

''تم ثمینہ سے منگنی نہیں کرنا چاہتے۔'' اماں بدستور میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ثمینہ کم تعلیم یافتہ اور معمولی شکل وصورت کی لڑکی ہے۔ وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے۔''

''ہم نے زبان دی ہے۔''

''آپ ان کو بتا دیں۔''

''ہم ایسا نہیں کریں گے۔''

''آپ کو کرنا پڑے گا۔ میں ایک جاہل اور ان پڑھ سے شادی نہیں کر سکتا۔'' میری نگاہوں میں رفعت کی شکل دوڑ رہی تھی۔

''تمہارے لیے یہ کہنا آسان ہے کہ ہم یہ رشتہ ختم کر دیں لیکن ہمارے لیے یہ موت اور زندگی کا سوال ہے۔'' اماں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''کچھ بھی ہے، میں ثمینہ سے نہ منگنی کروں گا اور نہ ہی شادی۔'' میں بھی فیصلہ کن انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ اماں کچھ کہتیں میں اندر چلا گیا۔

شام تک ہمارے گھر کی دیواروں کے اندر ہر فرد تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ میں نے ثمینہ سے منگنی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ گھر کا ہر فرد حیران اور افسردہ سوچ میں مبتلا تھا۔ سارے گھر والے ایک کمرے میں جمع تھے اور ابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر مجھ سے پوچھا۔

''تم نے ثمینہ سے منگنی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''جی ہاں۔''

''کیوں؟''

''میں وجہ اماں کو بتا چکا ہوں۔'' میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ابا کو کیونکہ اماں نے ایک ایک بات بتا دی تھی اس لیے وہ چپ ہو گئے۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولے۔

''کچھ بھی ہے۔ ہم نے زبان دی ہے۔ اس لیے تمہاری منگنی ثمینہ سے ہی ہو گی۔'' ابا نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''میں ثمینہ سے کسی قیمت پر منگنی نہیں کروں گا۔ وہ ان پڑھ ہے۔'' میں اپنے انکار پر قائم رہا۔

''بس...... میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں سنوں

گا۔ جو میں نے کہہ دیا، سو کہہ دیا۔'' میری بات سنتے ہی ابا نے ہاتھ اُٹھا کر درشت لہجہ اپنا لیا۔

میرے اعصاب پر رفعت کا حسن چھایا ہوا تھا۔ ماں باپ کی عزت اور ان کی دی ہوئی زبان سے زیادہ مجھے رفعت کی چاہ تھی۔ اس لیے میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھا اور بولا۔

''اگر آپ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' میں سب کو دم بخود چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

اپنے کمرے میں جا کر میں ایک جگہ بیٹھ گیا اور رفعت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا حسن اور خوبصورتی میری آنکھوں کے سامنے تھی اور میرا دل اسے پانے کے لیے ایسا مضطرب تھا کہ مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔

گھر والے کمرے میں براجمان تھے۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد ابا نے مجھے ایک بار پھر کمرے میں بلایا۔ میں بادل نخواستہ چلا گیا۔ ابا جان کے چہرے پر گہری متانت تھی۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے میں میرے سوا کوئی نہ ہو۔ کچھ توقف کے بعد ابا نے کہنا شروع کیا۔

''تم نے ایک فضول ضد کی ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بحث اور تجھے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال اس معاملے کو کچھ دن کے لیے چھوڑ دیں تاکہ تم اچھی طرح سے سمجھ لو اور کوئی ایسا فیصلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ جو ہم سب کے لیے بہتر ہو۔ ہم ثمینہ کے گھر والوں کو کہہ دیں گے کہ منگنی کچھ دن بعد ہوگی۔'' ابا کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ نہ چاہتے ہوئے مجبوری کے عالم میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں۔

''میرے دوست کی شادی ہے۔ پہلے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ ایسا کرتا ہوں کہ کل سویرے ہی میں وہاں چلا جاتا ہوں آپ ان سے کہہ دینا کہ مجھے آفس سے بلاوا آ گیا تھا اور مجھے جانا پڑا، کچھ دنوں بعد آپ انکار کر دینا......'' میں نے ان کو منگنی روکنے کا راستہ بتایا تو ابا نے میری طرف گھور کر دیکھا شاید انہیں میری یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ کچھ دنوں کے بعد انکار کر دینا......وہ مجھے سوچنے کا موقع دینا چاہتے تھے اور میں اپنی اسی بات پر قائم تھا۔

''تم سویرے اپنے دوست کی طرف چلے جانا لیکن ہم تجھے سوچنے کا موقع دے رہے ہیں...... میں نے یہ نہیں کہا کہ تم اپنی اسی بات پر بضد رہو۔'' ابا نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ میں چپ ہو گیا۔

میں کوئی بحث کرنے کی بجائے اب چاہتا تھا کہ سویرے ہی یہاں سے سیدھا رفعت کے پاس چلا جاؤں اور اس کے ساتھ شادی کرنے کا جو میرے دماغ میں منصوبہ سانپ کی طرح رینگ رہا تھا، اس پر عمل کر کے انتہائی خوبصورت اور حسین رفعت کو اپنا لوں۔

رات چپ چاپ گزر گئی اور سویرے ہی میں گھر سے نکل گیا۔ میرے انکار اور ضد کے باوجود میری ماں نے جاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے ڈھیروں دعائیں دینے کے بعد کہا۔ ''پتر......اپنی سوچ بدل کر آنا...... ہماری دی ہوئی زبان کا پاس کرنا۔''

میں اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔

میں سیدھا شبیر کے گھر پہنچا تو وہ ایک بار پھر مجھ سے تپاک سے ملا اور مجھے اندر لے گیا۔ پُرتکلف ناشتا ہوا اور پھر میں نے کہا۔

''مجھے رفعت سے ملنا ہے۔''

''میں ادھر ہی بھیج دیتا ہوں۔'' شبیر کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔

دس منٹ کے بعد نقاب کیے اور اپنے وجود کو بڑی سی چادر میں چھپائے رفعت اندر آ گئی۔ اسے اس طرح سے دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اس کا حسن آسمان پر چمکتے پورے چاند کی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے وقت ضائع کرنے کی بجائے کہا۔ ''ایک بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے؟'' رفعت نے چونک کر پوچھا۔

''چچا جلال سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ وہ لوگ بدمعاشی پر اُتر آئے ہیں اور اچھا خاصا ہنگامہ ہوا ہے۔ مراد بھی واپس آ گیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ وہ غصے کا بہت تیز ہے۔ اس نے ایک عجیب فیصلہ کر دیا ہے......'' میں کہہ کر جان بوجھ کر چپ ہو گیا۔

''مراد بھائی نے کیا فیصلہ کر دیا ہے؟'' رفعت کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تم اپنے بھائی کو بہتر سمجھتی ہو۔ کیا وہ ایسا ہی ہے کہ ایک بار منہ سے بات نکال دے تو پھر پوری کر کے ہی چھوڑتا ہے۔'' میں بولا۔

"ہاں وہ ایسے ہی ہیں۔ لیکن انہوں نے فیصلہ کیا کیا ہے۔" وہ جاننے کے لیے بے تاب تھی۔

"اس نے قسم کھائی ہے کہ یہ سارا فساد کیونکہ تمھاری وجہ سے ہو رہا ہے اس لیے......" میں پھر چپ ہو گیا۔

"آپ بتائیں......رک کیوں جاتے ہیں۔" رفعت کی بے چینی اور بھی دو چند ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مراد جو کہتا ہے وہ کر کے چھوڑتا ہے۔

"مراد نے کہا ہے کہ سارا قصہ ختم کرنے کے لیے تم کو جان سے مار دے گا۔ نہ تم رہو گی اور نہ ہی ہنگامہ برپا ہوگا۔" میں نے اپنی سوچی ہوئی بات پر عمل کرتے ہوئے جھوٹ کا فیصلہ رفعت کو سنا دیا جسے سن کر رفعت کا چہرہ ساکت ہو گیا اور وہ پتھر کی مورتی بنی میری طرف دیکھنے لگی۔

کچھ خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ "اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔"

"مراد بھائی نے ایسا کہا ہے؟" رفعت کی دھیمی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز میں دم نہیں تھا۔

"بالکل ایسا ہی کہا ہے۔ چچا جلال بہت پریشان ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی طرح سے تمھاری جان بچ جائے ورنہ مراد اپنی بات پوری کر کے ہی دم لے گا۔" میں نے کہا۔ رفعت کو اپنانے کا جنون تھا اس لیے میں صرف موجودہ وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رفعت کو اپنانے کے بعد مجھے کیا کرنا ہے اس کے لیے بھی میرے دماغ میں دو، تین باتیں تھیں، جن میں سے ایک پر عمل کر کے میں رفعت سے شادی کے بعد چچا جلال، مراد اور اپنے گھر والوں سے بچنے کے لیے ایک نئے جھوٹ کا جال بچھا کر خود اور رفعت کو بچا سکتا تھا۔

"اب میں کیا کروں۔" رفعت پریشان ہو گئی۔

میں آگے بڑھا اور اس کی طرف متانت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں اس کا ایک ہی حل آ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری جان بچ جائے۔ تم ایسا کرو کہ مکمل تم میرے تحفظ میں آ جاؤ......"

میری بات سن کر رفعت نے اپنی سحر انگیز آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "میں کچھ نہیں......"

"ہمارا بڑا خاندان ہے۔ ہم لوگ اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ اس لیے تم ایسا کرو کہ مجھ سے شادی کرلو۔ تمھاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔" میں نے بات کہہ دی۔

میری بات سن کر رفعت کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی اور اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی۔ میرا موبائل فون بجنے لگا۔ اسکرین پر چچا جلال کا نمبر تھا۔ میں فون سننے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ جیسے ہی میں نے فون کان کو لگایا چچا جلال کی آواز آئی۔

"ہاں بھئی تم دونوں خیریت سے ہو......"

"یہاں کیا حالات چل رہے ہیں؟" میں نے جواب دینے کی بجائے پہلے وہاں کے حالات جاننا چاہے تاکہ اس کے مطابق جواب دے سکوں۔

"یہاں انا کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ سمجھ لو کہ دونوں طرف جنگ لگی ہوئی ہے۔ مراد بھی واپس آگیا ہے۔ تم بتاؤ رفعت کیسی ہے......"

"چچا ایک بات پوچھوں تو غصے میں آنے سے پہلے جواب دو گے ناں۔" میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔" چچا جلال نے کہا۔

"رفعت کے کسی عباس نام کے لڑکے کے ساتھ تعلقات بھی تھے۔" میں نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا۔ میری بات سنتے ہی چچا جلال کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا اور وہ اس غصے میں کیا کچھ کہتے رہے کہ میں چپ سنتا رہا جب وہ ذرا چپ ہوئے تو میں نے غنیمت جانتے ہوئے فوراً کہا۔

"جب ہم گھر سے نکلے تو وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اور گاؤں پہنچنے سے پہلے وہ دونوں مجھے دغا دے کر نکل گئے......"

"بکواس کر رہے ہو تم...."

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے اس جھوٹ سے کیا لینا دینا۔" میں نے شاطرانہ انداز میں کہا تو چچا جلال چپ ہو گئے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں کہ مجھے جھوٹ بولنے کا کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ اب وہ میری نیت تو جانتے نہیں تھے۔

"اگر یہ سچ ہے تو میں رفعت کو جان سے مار دوں گا۔" کچھ سوچنے کے بعد وہ غرائے۔

"جی ایک منٹ آواز نہیں آ رہی......آپ نے کیا کہا ذرا پھر سے کہنا......" میں کہتا ہوا تیزی سے کمرے کے اندر گیا اور موبائل فون کا اسپیکر آن کر کے رفعت کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دوسری طرف سے غصے سے بھری چچا جلال کی آواز آئی۔

"میں خود رفعت کے ٹوٹے کر دوں گا......" رفعت سنتے

ہی خوف سے کانپنے لگی اور میں نے اسپیکر بند کردیا کہ کہیں چچا جلال اگلی بات ایسی نہ کہہ دیں جس سے اصل بات کا چہرہ سامنے آجائے۔ اور میں فون کو کان سے لگا کر پھر باہر چلا گیا۔

چچا جلال کی بر وقت کال اور ان کا وہ بات کہہ دینا، میرے حق میں بہتر ہوگیا تھا۔ اس بات کو سننے کے بعد رفعت کے دل میں کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔ چچا جلال میرے ساتھ بات کرتے رہے اور غصے میں جانے کیا کیا کہتے رہے اور میں 'ہوں' 'ہاں' کرتا رہا۔ کال ختم ہوئی تو میں سیدھا کمرے میں چلا گیا۔

رفعت بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کا نقاب اتر چکا تھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ایک ایسی لڑکی جس کو میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا اور جب وہ میرے سامنے آئی تھی تو اس نے اپنے آپ کو نقاب کے پیچھے چھپایا ہوا تھا، ایسی لڑکی پر میں نے تہمت لگا دی تھی۔ ایسی بات کرتے ہوئے میرے ضمیر میں ذرا بھی ہلچل نہیں ہوئی تھی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جب انسان شیطان کے حصار میں چلا جاتا ہے تو پھر اس کا ضمیر سو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ میں رفعت کو اپنانے کے لیے جو کھیل کھیل رہا تھا وہ خطرناک تھا۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے مجھے کئی جھوٹ بولنے پڑتے لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی اور میں رفعت کو اپنانے کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس نے میری طرف دیکھنے کی بجائے اپنا سر جھکائے رکھا اور آنسو بہاتی رہی۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ اور بھی سمٹ گئی۔

"تم رونا بند کرو۔ ہم ابھی نکاح کرلیتے ہیں۔ تم میری بیوی بن جاؤ گی اور میرے گھر چلو گی۔ پھر تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا۔"

ایک بار پھر میرا فون بجنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ چچا جلال کا فون تھا۔ میں نے جیسے ہی فون کان کو لگایا دوسری طرف سے مجھے تیز لہجے میں مراد کی آواز سنائی دی۔ وہ بغیر تامل کیے بولا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ رفعت کسی عباس نام کے لڑکے کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے اور یہ عباس ہے کون......؟"

"مجھے کیا پتا کہ وہ کون ہے۔"

"وہ ایسا نہیں کرسکتی۔ مجھے سچ بتاؤ ...... سچ کیا ہے؟" مراد بہت غصے میں تھا۔ اس کا غصیلہ لہجہ سن کر ایک لمحے کے لیے تو میرا دل بھی کانپ سا گیا تھا۔ وہ غصے کا تیز ہی نہیں بلکہ اس کی آواز میں بھی رعب اور دبدبہ تھا۔

"میں نے سچ ہی بتایا تھا۔" میں اُٹھ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

"تم کہاں ہو......؟" اس نے پوچھا۔

"میں اپنے گھر میں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔ میں نے فون کان کو لگائے رکھا اور ایسے بات کرنے لگا جیسے دوسری طرف مراد میرے ساتھ بات کر رہا ہو۔

"تم دونوں باپ بیٹے کو کیا ہوگیا ہے، رفعت کو اس لیے جان سے مار دو گے کہ اس کی وجہ سے تم دونوں کے گھر آفت آئی ہوئی ہے۔ اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے......" میں کہہ کر چپ ہوگیا جیسے میں یہ سن رہا ہوں کہ وہ آگے سے کیا کہہ رہا ہے۔ کچھ توقف کے بعد میں نے پھر بولنا شروع کیا۔ "دیکھیں آپ اتنے جذباتی نہ ہوں۔ اس میں رفعت کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جھگڑا ختم کرنے کے لیے رفعت کو ہی مار دینا عقل مندی نہیں ہے...... ہیلو...... ہیلو......" میں نے یوں ظاہر کیا جیسے انہوں نے میری پوری بات سننے سے قبل ہی فون کاٹ دیا ہو۔ اپنا موبائل فون اپنے کان سے الگ کرتے ہی میں نے رفعت کی طرف دیکھا وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور اس غمزدہ صورتِ حال میں بھی اس کا چہرہ چاند کی طرح خوبصورت تھا۔

"وہ نہیں مان رہے......" میں نے آہستہ سے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ رفعت کا چہرہ متانت میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہی ہو۔ اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ "آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔"

اس کی بات سن کر میں چونکا۔ "کیوں......؟"

"میرے مرنے سے اگر میرے گھر والوں پر آئی مصیبت ختم ہوتی ہے تو مجھے اپنے باپ اور بھائی کے ہاتھوں مارے جانے پر کوئی افسوس نہیں ہے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی اور میں پریشان ہوگیا کہ یہ اس نے کیا فیصلہ کرلیا ہے۔ میری دانست میں تو یہ تھا کہ وہ خوفزدہ ہوکر اپنی تقدیر کا فیصلہ مجھ پر چھوڑتے ہوئے میرے نکاح میں آجائے گی کیونکہ زندگی تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔ لیکن میری سوچ

کے برعکس اس نے تو کچھ اور ہی فیصلہ کرلیا تھا۔
''تم پاگل ہوگئی ہو۔ میں تمہیں تمہارے گھر بالکل چھوڑنے نہیں جاؤں گا بلکہ ہم ابھی شادی کریں گے پھر دیکھتا ہوں کہ تمہیں کون دھمکاتا ہے۔'' میں کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔
وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''اگر آپ مجھے چھوڑنے نہیں جاسکتے تو میں ابھی خود چلی جاتی ہوں۔''
''تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ ہم ابھی نکاح کررہے ہیں۔''
''براہ مہربانی مجھ سے نکاح کی بات مت کریں۔'' رفعت کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ وہ اس وقت مجھے ایک طاقتور لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔
''میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔ ہم ابھی نکاح کررہے ہیں۔ میں مولوی صاحب کا انتظام کرتا ہوں۔'' میں کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا تاکہ شبیر سے کہہ کر مولوی صاحب کو یہاں بلوالوں۔
وہ ایک دم سے میرے عقب سے غصیلے لہجے میں بولی۔ ''کیوں کروں میں آپ سے شادی......؟''
''میں چاہتا ہوں کہ تمہاری زندگی بچ جائے۔'' میں اس کی طرف گھوما۔
''مجھے اس طرح سے اپنی زندگی نہیں بچانی۔ میں نے اپنی زندگی اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر گزاری ہے۔ اپنے باپ اور ماں کی عزت کا ہمیشہ خیال کیا ہے۔''
میں اس کے تیور میں تغیر دیکھ کر اس کے پاس گیا اور بولا۔ ''تم جانتی نہیں ہو کہ حالات کتنے سنگین ہوگئے ہیں۔ تمہارا باپ اور بھائی تم کو اس لیے مار دینا چاہتے ہیں کہ تمہاری وجہ سے جس فساد کا ان کو سامنا ہے وہ ختم ہوجائے۔ تم مجھ سے ابھی نکاح کرلوگی تو پھر تمہارا تحفظ میرا فرض ہے۔''
''مجھے اپنے باپ اور بھائی سے ملنا ہے۔'' وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔
''تم پاگل ہوگئی ہو؟'' میں بولا۔ ''وہ تمہیں مار دیں گے۔''
''مجھے باپ اور بھائی کے ہاتھوں مرنا منظور ہے لیکن اس طرح کسی سے نکاح نہیں کرسکتی۔'' میں اس کی بات سن کر کانپ گیا۔ اس کے لہجے اور چہرے پر عجیب بات تھی۔ ایسا اعتماد میں نے اس سے قبل اس کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا۔ میری دانست میں تھا کہ وہ موت کے خوف سے میرے ساتھ نکاح کرلے گی۔ لیکن وہ تو اپنے والدین کی عزت کی خاطر مرنے کو تیار تھی۔
میں نے دیکھا کہ رفعت اس طرح سے ماننے والی نہیں ہے۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ مجھے اس سلسلے میں شبیر سے مدد لینی پڑے گی۔ ایسی خوبصورت اور سراپا حسن لڑکی کو میں کسی قیمت پر نہیں کھوسکتا تھا۔
میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر برآمدے میں شبیر اکیلا ہی کرسی پر بیٹھا اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے شبیر کو کیا کہانی سنانی ہے اور پھر اس کے پاس چلا گیا۔
''آؤ بیٹھو......'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔
''بیٹھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' میں وقت ضائع کیے بغیر بولا۔
''خیر تو ہے ناں؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔
''دراصل بات یہ ہے کہ یہ لڑکی رفعت اور میں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ یہ میرے ساتھ اسی لیے یہاں آئی تھی کہ ہم شادی کرلیں گے۔ لیکن یہاں آتے ہی اب اس کا ارادہ بدل گیا ہے اور یہ واپس جانا چاہتی ہے۔'' میں اٹکتے ہوئے بولا۔
''لیکن تم نے مجھے کچھ اور بتایا تھا۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔
''میں چاہتا تھا کہ تم کو اطمینان سے بتادوں گا۔''
''دوستی میں جھوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا جس سے صاف عیاں تھا کہ اسے میری اس بات سے تکلیف ہوئی ہے۔
''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں نے سوچا تھا کہ میں بعد میں بتادوں گا اور تمہیں اب بتادیا ہے۔ دیکھو میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اسی لیے اسے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اسی کی وجہ سے میں نے ثمینہ سے شادی سے انکار کردیا تھا۔ اب وہ نہیں مان رہی ہے۔''
''محبت صرف تم اس سے کرتے ہو؟'' اس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔
''وہ بھی کرتی ہے۔'' میں جلدی سے بولا۔
''پھر اس نے انکار کیوں کیا؟'' شبیر کی ٹٹولنے والی نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔
''بس وہ ڈرگئی ہے......'' ابھی میں نے اتنا کہا ہی تھا کہ رفعت تیزی سے باہر نکلی اور وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''یہ جھوٹ بول رہے ہیں.....'' اس کے ساتھ ہی اس نے یہاں تک آنے کی ساری کہانی شبیر کو سنا دی۔ میں دم بخود اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ رفعت ایسا بھی کر سکتی تھی؟ جونہی وہ چپ ہوئی میں نے شبیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے.....''

شبیر نے اپنے قدم رفعت کی طرف اٹھائے اور وہ رفعت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی چادر اس کے سر پر رکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

''مجھے دوستی میں جھوٹ پسند نہیں ہے۔ اگر یہ مجھے سچ بتا دیتا تو میں کچھ بھی ہوتا اس کا ساتھ دیتا۔ لیکن اس نے مجھ سے حقیقت چھپائی...... مجھے اس کا افسوس ہے۔ آپ فکر مت کرو۔ اور اندر چلی جاؤ۔ آپ کے گھر تک چھوڑنا اور وہ لوگ جو آپ کے گھر والوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں، ان سے نمٹنا میری ذمہ داری ہوگی۔'' پھر شبیر نے اپنا موبائل فون رفعت کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''یہ لو اپنے گھر والوں سے بات کر لو۔''

رفعت نے اسی وقت نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی بات کرنے لگی۔ پہلے تو اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف شاید مراد تھا جو اسے بولنے نہیں دے رہا تھا، پھر اچانک رفعت نے تیز لہجے میں بولنا شروع کیا تو جو میں نے کیا تھا وہ سب اسے بتانے لگی۔ رفعت بولتی رہی۔ پھر وہ چپ ہوئی تو دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا اور اس کے بعد مطمئن ہو کر اس نے موبائل فون شبیر کی طرف بڑھا کر ایسے کہا جیسے وہ مجھے سنا رہی ہو۔

''بات واضح ہو گئی ہے۔ جس جھوٹ کو پھیلا کر اس نے مسافت شروع کی تھی اس مسافت میں سوائے تھکن کے کچھ نہیں ملے گا..... میرا بھائی یہاں آنا چاہتا ہے آپ انہیں اس جگہ کا پتا سمجھا دیں۔''

رفعت چند ثانیے وہاں کھڑی رہی اور پھر اندر چلی گئی۔ شبیر نے فون پر بات کی اس جگہ کا پتا سمجھانے کے بعد وہ میری طرف آیا اور غصے سے بولا۔

''تم نے برسوں کی دوستی اپنے جھوٹ کی وجہ سے ختم کرنے کی کوشش کی ہے.....''

''تم میری بات سنو۔'' میں نے کہنا چاہا۔

''اب میں کچھ نہیں سنوں گا۔ بہتر ہے کہ تم اس جگہ سے چلے جاؤ۔'' شبیر کا لہجہ بڑا عجیب تھا کہ میری جرأت ہی نہیں ہوئی کہ میں اس سے بات کر سکوں۔ میں کچھ دیر اس جگہ کھڑا رہا۔ اور پھر ناچار مجھے وہاں سے جانا پڑا۔

☆......☆

میں کئی گھنٹے شبیر کے گاؤں کے باہر بیٹھا رہا۔ میری اداسی کی انتہا نہیں تھی اور مجھے رفعت کے ہاتھ سے نکل جانے کا بہت دکھ تھا۔ اب مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ مجھے شبیر کو سچ بتا دینا چاہئے تھا۔ پھر وہ میرا ضرور ساتھ دیتا۔ سورج غروب ہو گیا تو میں بس پکڑ کر اپنے گاؤں چلا گیا۔

اپنے گھر پہنچا تو گھر والے سو رہے تھے۔ میری ماں دروازہ کھولا، مجھ سے روٹی کا پوچھا میرے انکار پر وہ کمرے میں چلی گئیں۔

میں ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا ملا؟ وہ خوبصورت تھی تو کیا تھا، میں اتنا بہک کر شیطانیت پر کیوں اتر آیا تھا؟ میرے ذمے تو اس کی حفاظت تھی اور میں خیانت پر اتر آیا؟

ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ سویرے ہی شبیر کا فون آ گیا۔ وہ مجھے بتانے لگا۔ ''رفعت کو میں اس کے بھائی کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ مراد بہت غصے میں تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وہ تمہیں گولی سے اڑا دے۔ لیکن میرے روکنے پر وہ بمشکل رکنے پر آمادہ ہوا۔ تم اکیلے بیٹھ کر سوچنا کہ تم نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔''

شبیر کا فون بند ہو گیا۔ اور میں اور بھی پریشان ہو گیا۔ صبح..... میری ماں مجھے ناشتا دینے آئیں تو میں نے ماں کو اپنے پاس بیٹھا لیا اور ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

''اماں میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ میں ثمینہ سے ہی شادی کروں گا۔ آپ لوگوں کو ناراض کر کے میں خوش نہیں رہ سکوں گا۔''

ماں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہارے انکار کے بعد ہم نے بہت سوچا۔ اور پھر ہم نے بھی ایک فیصلہ کیا اور ثمینہ کے ماں باپ کے پاس جا کر اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بھی رضامند ہو گئے۔ اور ہم سب کی عزت بھی رہ گئی۔''

''کیا فیصلہ کیا ہے آپ لوگوں نے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ماں نے بتایا۔'' آج ثمینہ کی منگنی تمہارے چھوٹے بھائی ریاض کے ساتھ ہو گی۔''

ماں بتا کر مسکرائیں اور کمرے سے چلی گئیں جبکہ میں ساکت بیٹھا سوچ میں گم ہو گیا۔